جلد ۳۳ | بابت ماہ محرم الحرام ۱۳۸۵ھ مطابق مئی ۱۹۶۵ء | شمارہ (۱)

اگر اس دائرہ میں ( ) سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۵ مئی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کاغذ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیجئے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اس کی اطلاع ۲۵ تاریخ تک آجانی چاہیے ورنہ رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

[illegible] نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

۴۲واں سال — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — شمارہ نمبر ۱

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

آج کے ہندوستان میں کوئی مسلمان، خواہ وہ کتنا ہی پکا اور پرانا نیشنلسٹ کیوں نہ ہو، اگر وہ عملاً دین سے کچھ بھی تعلق رکھتا ہو یا کم از کم مسلمانوں کے دکھ درد میں ملی جذبے کے ساتھ شریک ہوتا ہو، وہ اکثریت کے اہلِ سیاست کی نظر میں بلاشبہ "مسلمان" پہلے" ہو اور ہندوستانی "بعد" میں۔ اسلیے مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اور ان کے مختلف حلقہائے فکر سیاسی نظریات کے لحاظ سے آپس میں اگرچہ کتنے ہی مختلف الخیال ہوں لیکن ہیں ایک ہی کشتی میں سوار۔ وہ آپس میں جسقدر چاہیں تفریق کرلیں مگر جن اکثریت سے واسطہ ہے اُن کی نظر میں کوئی فرق ان سب میں حقیقت کے اعتبار سے نہیں ہے۔

یہ بات کوئی راز نہیں ہو جسے ہم پہلے پہل فاش کر رہے ہوں بلکہ مذکورہ بالا خصوصیات رکھنے والا جو جتنا پکا اور پرانا نیشنلسٹ ہو اس کا دل اس حقیقت کو سب سے زیادہ جانتا ہے۔ لیکن پھر یہ کونسی ہوشمندی ہے کہ ہمارے جس نیشنلزم کی کوئی قیمت نہیں اس میں ایک دوسرے سے فائق تر ہونے کے دعووں کی بساط بچھائیں۔ اور ایک جماعت دوسری جماعت کی طرف انگلی اٹھائے کہ

"فکر و عمل کے لحاظ سے وہ متحدہ قومیت اور سیکولرازم کی مخالف ہے"۔

اور — "آج اپنا مستقبل سنوارنے کی فکر میں متحدہ قومیت اور سیکولرازم کا دم بھرنے لگی ہے"۔

ہمیں بہت ہی افسوس ہوا جب ہم نے ایک جماعت کی طرف سے یہ شکایت پڑھی کہ ایک دوسری جماعت کے انتہائی ذمہ دار عہدیدار نے اپنے ایک سرکلر میں (یہ بتانے کیلئے کہ ان کی جماعت ہی کا راستہ صحیح ہے) اس طرح کے جملے اس جماعت کے بارے میں تحریر کیے ہیں۔ اور پھر یہ سرکلر اپنے اخبار میں بھی شائع کیا گیا۔ البتہ یہ غنیمت ہو کہ سرکلر میں اس جماعت کا صاف نام نہیں لیا گیا تھا جسکے بارے میں یہ باتیں کہی گئی تھیں صرف اشاروں پر اکتفا کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس رجحان کو بہرحال اچھا نہیں کہا جا سکتا ہم ان معاملات میں رقیبانہ انداز کی باتیں اشاروں میں بھی کسی طرح مناسب نہیں، کسی جماعت کے ذمہ دار

اگر اپنے لوگوں کے بجائے یا تم اشارات کی زبان میں لائیں گے تو ارکان کی زبانوں سے اس کی شرح بھی ہوگی اور پھر اس کا نقصان اگر کوئی یہ سمجھتا ہو کہ اسی ایک جماعت تک محدود رہے گا تو یہ انتہائی بھول اور بڑی نادانی ہے۔ ایک جماعت تو بڑی چیز ہے کسی فرد واحد کو بھی اگر آپ ہندستان کے موجودہ حالات کے اندر اس قسم کے معاملات میں مطعون کرتے ہیں تو نتیجۃً آپ سارے مسلمانوں کے مطعون کیے جانے کا سامان کرتے ہیں۔ یہاں انصاف کی فضا نہیں ہے کہ ایک کی بات ایک ہی کے سر رہے یہاں تو ثبوت سے بھی پہلے ایک کے سر الزام کا خمیازہ آئے دن سیکڑوں اور ہزاروں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کیا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات ہے؟ دن رات ہم یہ تماشہ نہیں دیکھ رہے ہیں؟ پھر یہ آخر کیسی نادان رقابت ہے کہ اتنا خطرناک انجام بھی نظر انداز ہو جائے! یہ وقت تو ایک دوسرے کی پشت پناہی کا ہے نہ یہ کہ ایک دوسرے کیلئے مشکلات پیدا کریں۔ نظریات کا کچھ بھی اختلاف ہو کشتی ایک ہے۔ اس ایک کشتی کے اندر رہتے ہوئے ایک دوسرے کو ڈبونے کی کوشش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ پوری کشتی ڈوب کر رہے۔ آپ اپنے زعم میں کتنا ہی فرق آپس میں کر لیجئے مگر حالات نے سب کو اس طرح ایک دوسرے سے باندھ دیا ہے کہ اب تفریق کی کوشش خودکشی کے سوا کچھ نہیں — یہ بات ان لوگوں کے لیے ہم سے کہیں زیادہ قابل توجہ ہے جو مسلمانوں کی کسی جماعت کی قیادت کر رہے ہوں۔

اس ناخوشگوار قضیے سے قطع نظر، جہاں تک متحدہ قومیت اور سیکولرزم کا تعلق ہے، ملک کے سیاسی ماحول میں جو مرتبہ بھی ان چیزوں کا ہو اسلامی نقطۂ نظر سے ان میں سے کسی بات کا بھی قائل ہونا قابل فخر کسی حالت میں نہیں، اور نہ ہی اہل دین کی کسی جماعت کیلئے زیبا ہے کہ وہ کسی مسلمان کو ان باتوں کے قائل نہ ہونے پر مطعون کرے۔ ہندستان کے اہل دین میں جن لوگوں نے بھی ان سیاسی تصورات کی حمایت کی ہے، ان کا مطمح نظر یہی رہا ہے کہ موجودہ دور کے اندر ہندستان جیسے ملک میں شرعاً مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ وہ ان تصورات پر قائم ہونے والے سیاسی نظام پر راضی ہو جائیں۔ نہ یہ کہ اسے کوئی قابل فخر آئیڈیل بنا لیں! اس لحاظ سے ہمیں انتہائی حیرت بھی ہے کہ ان بزرگوں کے جانشین کسی مسلمان گروہ کے اس معاملے میں مختلف الخیال ہونے پر اس طرح طعن کریں جیسے یہ کوئی بڑا عیب ہو، اور اس کے ساتھ اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ جن لوگوں پر طعن کیا گیا ہے انھیں صاف صاف یہ کہنے میں کیا جھجک ہے کہ ہندستان کے سیکولر نظام ریاست کے بارے میں ان کا وہ ٹھیک موقف کیا ہے جو [illegible] جاتے ہیں [illegible]

دو ہیں کر دیا تو انھیں جرأت سے کہنا چاہیے کہ ہم بیشک مخالف تھے مگر حالات نے ہماری رائے بدل دی ہے اب ہم [illegible]
یا پھر صفائی سے یہ کہنا چاہیے کہ ہم آج بھی سیکولر ریاست کے تصور کے علی الاطلاق مخالف ہیں۔
سیکولر ریاست کے تصور کی کچھ بھی تعبیر کی جائے "اجتماعی معاملات میں خدائی احکام سے بے نیازی" کے عنصر کو اس کے مفہوم سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

مثلاً ہندوستان کے سیکولرزم کی تعبیر اگر کوئی شخص یہ کرتا ہے کہ "گورنمنٹ کا کوئی مذہب نہیں ہے" تو اس میں بھی یہ عنصر پوری صفائی کے ساتھ موجود ہے۔ جس گورنمنٹ کا کوئی مذہب ہی سرے سے نہیں ہوگا اس کے متعلق یہ تصور بھی کیسے کیا جا سکتا ہے کہ وہ اجتماعی معاملات میں خدائی رہنمائی کی قائل ہوگی۔ پس اس تعبیر پر اگر آپ کا جواب یہ ہو کہ "ہم اس معنیٰ میں سیکولرزم کے ہرگز مخالف نہیں ہیں" تو پھر اس کے بعد یہ کہنا بالکل بے کار ہے کہ

"لیکن اگر اس کے معنیٰ الحاد کے ہوں تو یقیناً ہم اس کے خلاف ہیں۔"

کیونکہ جب آپ اجتماعی معاملات میں خدائی احکام سے بے نیازی کو بھی "الحاد ہی کی ایک قسم" قرار دے رہے ہیں تو الحاد کی یہ قسم تو مذکورۂ بالا تعبیر میں بھی موجود تھی۔ لہذا اقرار ہو تو اقرار ہی ہونا چاہیے اور انکار ہو تو انکار ہی ہونا چاہیے۔ معنیٰ اور حقیقت ایک ہوتے ہوئے محض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ اگر اور مگر کا استعمال کوئی بھی معنیٰ نہیں رکھتا، بات صاف ہونی چاہیے اور اس میں ضرورت ہو کہ مسئلہ کی صحیح نوعیت سامنے رکھی جائے۔ مسئلہ صرف یہ ہو کہ ملک کا دروبست ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے، جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے یا جو فیصلہ کن پوزیشن رکھتے ہیں (اور وہ غیر مسلم ہیں) وہ کسی بھی مذہب کی رہنمائی سے آزاد رہ کر اگر ریاست کا نظام چلانا چاہیں تو کیا اس پر راضی ہو جانا اور ضرورت کی حد تک اس نظام سے تعاون کرنا کوئی گناہ ہے؟۔

ہمارا خیال ہو کہ اگر سیکولرزم کے معنیٰ کے ساتھ ساتھ یہ صورت مسئلہ بھی سامنے رکھی جائے تو شاید دو ٹوک جواب کا مرحلہ آسان ہو جائے۔

مؤتمر عالم اسلام نمبر

امسال مکۂ معظمہ کی اسلامی کانفرنس بہت غیر معمولی اہمیت کی تھی۔ جولائی [illegible] کا الفرقان ان شاء اللہ اس کانفرنس کے اہم مقالات [illegible] پر مشتمل ہوگا۔ —مدیر

مکتوبِ حجاز

از : ———— مولانا محمد منظور نعمانی

(حضرت مولانا امسال رابطۂ عالم اسلامی (حجاز) کی مجلس تاسیسی کے رکن کی حیثیت سے حجاز تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں سے مناسکِ حج سے فراغت کے بعد جو پہلا مفصل مکتوب موصول ہوا ہے اس کا کچھ حصہ ہدیۂ ناظرین ہے ———— عتیق)

یہاں مکہ معظمہ پہنچے آج بیسواں دن ہے، الحمد للہ پوری صحت و عافیت نصیب ہے گھر سے چلتے وقت دانت کے درد اور بازو کے زخم کی جو تکلیفیں تھیں اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ یہاں ان میں سے کوئی بھی نہیں رہی، احرام کے زمانہ میں سر کھلے رہنے سے مجھے بڑا خطرہ تھا مگر جیسا کہ ذکر کیا جا چکا اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور کوئی تکلیف نہیں پیدا ہوئی، مکہ معظمہ کے قیام میں ہر قسم کی راحتیں اللہ تعالیٰ نے نصیب فرما رکھی ہیں اگر حج کے ایام بھی انھی راحتوں کے ساتھ گزرتے تو حج کے مجاہدہ کا کوئی حصہ نہ ملتا، اللہ تعالیٰ کے کرم نے اس سے بھی محروم نہیں رکھا اپنی موٹر ساتھ ہوتے اور اسی طرح ضرورت و راحت کے سارے دوسرے سامان موجود ہوتے ہوئے اتفاقی اور اضطراری طور پر مجاہدہ کا بھی خوب حصہ میں آیا خاص کر مزدلفہ سے منیٰ آتے ہوئے بڑا حصہ تیز دھوپ میں پیدل طے کیا قربانی بھی بہت تعب اٹھا کر اور پہاڑیوں کو عبور کر کے کی جا سکی، پھر کل جب کہ منیٰ سے واپسی ہونے لگی تو کافی دور پیدل چلنا ہوا اور خاص اسباب کی وجہ سے میں نے اور مولانا نے دو تین گھنٹہ کیا تھا اور نہ وہ پہر کو کھانا کھایا تھا بس سمجھئے انتہائی ضعف تھا جب حالت

یہ ہوگئی کہ خاص کر مولانا کو خشکی اور ضعف کی وجہ سے ایک ایک قدم اٹھانا مشکل تھا تو ایک موٹر ملی لیکن راستہ صاف نہ ہونے کی وجہ سے حرم شریف سے تقریباً آدھا میل پہلے اس کو بھی چھوڑ کر پیدل حرم شریف آئے۔

الحمدللہ مناسک سے تو اب فراغت ہوگئی مؤتمر جو پہلے پروگرام کے مطابق ۱۵؍اپریل سے شروع ہونے والی تھی دو دن تاخیر سے ۱۷؍اپریل شنبہ کے دن سے شروع ہوگی اور ۲۴؍اپریل تک چلے گی اس کے بعد دو تین دن رابطہ کی نشستیں ہوں گی، اس حساب سے مدینہ طیبہ روانگی اخیر اپریل میں ہوسکے گی کم از کم ہفتہ عشرہ وہاں قیام رہے گا اس کے بعد ان شاء اللہ واپسی۔

اس مرتبہ حجاج کی تعداد سال گزشتہ سے بھی زیادہ ہوگئی ابھی خود سعودی عرب کے حجاج کے اعداد و شمار معلوم نہیں ہوئے، بیرونی ممالک کی تعداد تین لاکھ سے کچھ ہی کم تھی اندازہ یہ ہے کہ سعودی عرب کے حجاج کی تعداد آٹھ دس لاکھ کے لگ بھگ رہی ہوگی معلوم نہیں کیوں ٹریفک وغیرہ کے انتظامات میں بہت ڈھیل دیکھنے میں آئی۔

حجاج کی بے عنوانیاں دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ یہ صحیح اور برحق ہے کہ حج کے موسم بلکہ اسکے ایک ایک دن میں یہاں اللہ کا جتنا نام لیا جاتا ہے اور جتنی اخلاص سے دعائیں کی جاتی ہیں اور جس طرح کی جاتی ہیں اتنی ساری دنیا میں نہ ہوتی ہوں گی، مگر حجاج کی عام عملی اور اخلاقی حالت بہت ہی مایوس کن ہے یہ باتیں خواہ مخواہ زبان پر اس وقت آگئیں اس طرح خطوط میں ان باتوں کے لکھنے سے بظاہر کوئی فائدہ نہیں، اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ دل میں اس کا فکر اور درد پیدا ہو اور اسکی اصلاح کے لئے الحاح کے ساتھ دعائیں اور امکان بھر کوششیں ہوں۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے حادثہ کی اطلاع

یہاں دوسرے دن یعنی سنیچر کی شام کو ہم لوگوں کو ملی تھی لیکن ذریعہ اس وقت تک قابل وثوق نہیں تھا اور یہاں موسم حج میں اس طرح کی کتنی خیر خبریں معلوم نہیں کیوں اکثر اڑا کرتی ہیں اس لئے ہم لوگوں نے یقین نہیں کیا، اتوار کے دن ظہر کی نماز کے لئے جب ہم لوگ حرم شریف گئے تو اتفاق سے میری نظر ڈاکٹر اسمٰعیل صاحب پر پڑ گئی یہ خبر انہی کے نام کے حوالہ سے گشت کر رہی تھی یہ ہمارے دوستوں میں سے ہیں کراچی کے رہنے والے ہیں کئی سال سے سعودی عرب کے محکمہ صحت سے وابستہ ہیں۔ میں جلدی سے اٹھ کر ان سے ملا۔ انھوں نے بتایا کہ میں پرسوں جمعہ کے دن کراچی تھا اور اسی دن مجھے یہاں کے لئے روانہ ہونا تھا، پانچ بجے شام کے مجھے ایک دوست نے فون سے بتایا کہ لاہور میں حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کا اچانک وصال ہو گیا پھر کراچی کے تبلیغی مرکز مکی مسجد سے بھی اسکی تصدیق ہو گئی۔ میں کراچی سے اسی شب میں روانہ ہو کر کل شب میں جدہ پہنچا اور آج ہی مکہ معظمہ پہنچ سکا ہوں، خبر صحیح اور مصدق ہے۔ اس وقت ہم لوگوں کو بھی یقین کرنا پڑا، پورے عالم اسلامی کے لئے اور خاص کر ملت اسلامیہ ہندیہ کے لئے یہ بہت ہی بڑا حادثہ ہے جو لوگ نہیں جانتے وہ شاید مبالغہ سمجھیں گے لیکن یہ بالکل واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امت میں دینی حرکت اور فکر آخرت پیدا کرنے کا کام جتنے وسیع پیمانہ پر صرف بیس سال کی مدت میں مولانا مرحوم سے لیا اسکی نظیر قریب کی پچھلی صدیوں میں تلاش کرنے سے بھی مشکل سے ملے گی کم از کم میرے علم میں تو نہیں ہے۔ اللہ کی شان ہے ہندوستان میں اللہ کا ایک بندہ ایک مسجد میں بیٹھ کر لاکھوں بندوں کو، حقیقۃً لاکھوں بندوں کو دین کی فکر اور کوشش میں متحرک کئے ہوئے تھا دنیا کے دور دراز ملکوں میں جماعتوں پر جماعتیں بھیج رہا تھا ہزاروں غریب ملک بملک اسکے حکم سے پیدل پھرتے تھے سفروں میں ہر قسم کی تکلیفیں اٹھاتے تھے دین سیکھتے سکھاتے تھے اور دوسروں کو اسی کی دعوت دیتے اور اسی کے لئے اٹھاتے تھے اسی طرح ہزاروں صاحب استطاعت ریلوں اور موٹروں سے اسی مقصد کے لئے قافلوں کے ساتھ بستیوں اور ملکوں کے لئے نکلتے تھے، بہت سے لوگ ہوائی جہازوں

سے دور دراز ملکوں کا سفر اسی کام کے لئے کرتے تھے امت میں ایمان اور ایمانی زندگی پیدا کرنے کے لئے اتنی وسیع حرکت اور جد و جہد صدیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی اللہ تعالےٰ نے یہ کام ہندوستان سے کر کے دکھایا اور اپنے ایک بندہ کو اس کا ذریعہ بنایا۔

هو الذي ينزل الغيث من بعد ما قنطوا وينشر رحمته وهو الولي الحميد.

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے وقت تک کام بہت محدود اور ابتدائی درجہ میں تھا لیکن اس وقت یہ بھی امید نہ تھی کہ جس درجہ میں اب ہو رہا ہے یہ بھی باقی اور جاری رہ سکے گا لیکن اللہ تعالےٰ نے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے ذریعہ سینکڑوں درجہ آگے بڑھا دیا اسکی رحمت سے کچھ بعید نہیں ہے بلکہ ہمیں یہی امید کرنی چاہیئے کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی وفات کے بعد بھی اسکی قدرت و رحمت اسی طرح اپنا کام کرے گی۔

دوسری قسط

حضرت شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلویؒ کے روابط

حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ اور اُن کے خاندان سے

مراسلات کی روشنی میں

از ـــــــــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب حضرت شاہ اہل اللہ[1] پھلتیؒ برادر خرد حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ بنام شاہ ابوسعید حسنیؒ

بخدمت حقائق و معارف آگاہ فضیلت و کمالات دستگاہ سیدنا سید ابوسعید جیو سلمہم اللہ و ابقاہم ـــــ از فقیر اھل اللہ بعد از سلام ملتمس است کہ خط بہجت خط

---

[1] الشیخ الکبیر اھل اللہ بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین العمری الحنفی الپھلتی احد علماء الربانین و عباد اللہ الصالحین

آپ نے اپنے بڑے بھائی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے اخذ علوم دین کیا۔ طب بھی پڑھی اور اس میں کمال حاصل کیا۔ آپ کی کئی تالیفات و تصنیفات ہیں ان میں سے ایک مختصر ہدایۃ الفقہ ہے جو کہ ہدایہ کا انتخاب ہے (۲) مختصر تفسیر قرآن (۳) جہار باب (در فقہ و عقائد) (۴) تکملہ ہندیہ (در علم طب) غالباً [illegible] میں انتقال ہوا جیسا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے ایک مکتوب (محررہ [illegible]) سے واضح ہوتا ہے۔

ماخوذ از نزہۃ الخواطر جلد ۶۔ (مزار پھلت ضلع مظفر نگر میں ہے۔ احقر نے زیارت کی ہے)

رسید آنچہ از راہ مہربانگی و شفقت کہ در بارہ ایں فقیر مبذول میدارند عنایات و توجہات ظاہری و باطنی مصروف فرمودند شکر آں بکدام زبان بیان نمودہ آید........

حضرت سبحانہ و تعالیٰ ترقیات دارین و کمالات کونین نصیب آں باذل نفسہ فی مرضات اللہ گرداند چنانچہ ایں نیازمند را از فکرِ معاش نجات بخشیدند او جل و علا از جمیع حاجات از دین و دنیا ذاتِ سامی را خلاص و نجات عنایت فرماید ــــ توقع آنست کہ ایں وردکہ بہ بخشی رام حوالہ شدہ است بوضعِ جریان دادہ شود کہ اینجا یا بہ دیگر پرگنہ کہ بلا کلفت میسر آمدہ باشد ماہ بماہ بلا دقت بدست می آمدہ باشد زیادہ چہ ـ و ہر چہ صلاح دید صاحب بود بہتر است ـ بخدمت میاں محمد عتیق جیو سلام رسد ـ حسب الایمائے خط شکر گذاری بخان رفعت نشان مرقوم شدہ اگر مناسب دانند بگذرانند ـــ

ترجمہ ـــــ حقائق و معارف آگاہ، فضیلت و کمالات دستگاہ سیدنا سید ابوسعید صاحب سلمہم اللہ والقاہ ـــ کی خدمت میں فقیر اہل اللہ کی طرف سے بعد از سلام نیاز عرض ہے کہ خط بہجت نمط پہونچا ـــ از راہ مہربانی و شفقت ـــــ جو کہ اس فقیر پر مبذول فرماتے رہتے ہیں ـــ جو کچھ ظاہری و باطنی عنایات و توجہات آپنے کی ہیں اس کا شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے ..... اللہ تعالیٰ آپ کو کہ آپ اس کی مرضیات میں اپنی جان کو خرچ کرنے والے انسان ہیں ـــ ترقیات دارین اور کمالات کونین نصیب فرمائے ـــ آپ نے جس طرح اس نیازمند کو فکرِ معاش سے نجات دی اللہ جل شانہ آپ کو بھی دین و دنیا کی جمیع حاجات سے بے فکر فرمائے ـــ امید یہ ہے کہ یہ وظیفہ جوکہ بخشی رام کے حوالے کیا گیا ہے اس طور پر برابر جاری رہے گا کہ اس جگہ (ڈہلت) یا کسی دوسرے پرگنے میں ماہ بماہ بلا دقت حاصل ہو جایا کرے گا ـــ زیادہ کیا لکھوں ـ جو بھی آپ کی صوابدید ہو بہتر ہے ـــ میاں محمد عتیق صاحب کی خدمت میں سلام پہونچے ـ آپ کے حسب الایماء خان رفعت نشان (ابراہیم خلیل خاں) کو بھی خط شکر گذاری مرقوم کر دیا گیا ہے اگر مناسب سمجھیں تو (آپ ہی) اس کو وہاں پہونچا دیں ـ

ایک مکتوب گرامی میں حضرت شاہ اہل اللہؒ حضرت رائے بریلوی کو تحریر فرماتے ہیں۔

احوالِ یومیہ کہ از توجہ وجیہہ صورت	احوالِ یومیہ جو آپ کی توجہ سے
گرفتہ است بفضلِ الٰہی تاحال	درست ہوگئے ہیں تادمِ تحریر ہذا
تحریر جاری است و ایں نیازمند	ٹھیک چل رہے ہیں۔ یہ نیازمند اپنے
با دیگر کس و کوئے خود رطب اللسان	متعلقین سمیت آپ کی شکرگذاری
شکرگزاری است اللہ تعالیٰ دیرگاہ	میں تر زبان ہے۔ اللہ تعالیٰ دیر
سلامت دارد فقیر زادہ محمد مقرب اللہ	تک آپ کو سلامت رکھے فقیر زادہ
سلام نیاز می رساند ـــ زیادہ	محمد مقرب اللہ سلام کہتا ہے زیادہ
چہ نویسد ـ	کیا لکھوں ـ

مکتوب حضرت شاہ اہل اللہ بنام شاہ ابو اللیث[1] حسنی ملقب بہ ابو العیش فرزند حضرت شاہ ابو سعید حسنیؒ

عزیز القدر سیادت مرتبت سید ابو العیش سلمہ ربہٗ بعد از سلام شوق التیام مطالعہ نمایند کہ شوقِ دیدار ایشان از استماعِ سعادت مندیٔ شان زبانیٔ والدِ بزرگوار بحدِ کمال است اللہ سبحانہٗ تعالیٰ بعافیتِ طرفین و خیریتِ جانبین ملاقاتِ مسرت آیات میسر فرماید ـــ یقین است کہ باشتغال علوم ظاہری و تحصیل سلوک باطنی از جناب قبلہ گاہ خود کہ مجمعِ کمالاتِ دارین اند مشغول خواہید بود کہ بزرگ زادۂ خاندانِ عالیہ را

---

[1] السید الشریف ابو اللیث بن ابی سعید بن محمد ضیاء بن آیت اللہ بن الشیخ الکبیر علم اللہ النقشبندی البریلوی احد الرجال المعروفین بالفضل والصلاح ـــ آپ نے اپنے والد سے علم حاصل کیا اور انھیں سے طریقہ اخذ کیا اور ارشاد و تلقین میں اپنے والد ماجد کے جانشین ہوئے۔ سفر حرمین میں اپنے والد کے ہمراہ تھے وہاں میں اقامت اختیار کرلی تھی ایک زمانہ تک وہاں رہ کر روحانی فیض پہنچایا اسی علاقے میں انتقال ہوا۔ آپ کی قبر بندرگاہ کوٹیال میں ساحل سمندر پر ہے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۲) آپ کا لقب ابو العیش تھا۔ ان مکتوبات اکابر کے جامع آپ ہی ہیں۔

ازیں ہر دو چیز ناگزیر است۔ زیادہ بجز شوق و دعا چہ نویسد۔

ترجمہ ــــ عزیز القدر سیادت مرتبت...... بعد از سلام شوق مطالعہ کریں۔ مجھے تمہارے دیکھنے کا اشتیاق بحدِ کمال ہے اس لیے کہ میں نے تمہارے والد بزرگوار کی زبانی تمہاری سعادت مندی کی باتیں سُنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ طرفین و جانبین کی خیر و عافیت کے ساتھ ملاقات میسر فرمائے ــــ یقین ہے کہ تم اپنے والد کی خدمت میں ــــ جو کہ مجمع کمالاتِ دارین ہیں ــــ اشتغالِ علوم ظاہری اور تحصیل سلوک باطنی کے اندر مشغول ہوگے اس لیے کہ خاندانِ عالی کے ایک بزرگ زادے کے لیے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ زیادہ بجز شوق و دعا اور کیا لکھوں۔

مکتوب مولانا نور اللہ[1] بڈھانوی بنام حضرت شاہ سید ابو سعید حسنی

مجمع محامد و فضائل معدنِ محاسن و فواضل، سعادت و کرامت مآب معارف و کمالات انتساب کرمی مہربان میر سید ابو سعید جیو سلمہ اللہ المجید ــ ازیں فقیر نور اللہ بعد سلام نیاز مطالعہ فرمایند۔ ملاطفت نامہ وصول فرمود ابتہاج و سرور بخشید یاد آوریٔ بزرگان بشارتِ سعادت است الحمد للہ علیٰ ذلک ــ اکثر اوقات بذکر اخلاق و اشفاق

---

[1] الشیخ العالم الکبیر المحدث نور اللہ الصدیقی البڈھانوی احد فحول العلماء ــــ آپ قصبہ بڈھانہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی۔ بچپن ہی سے تحصیل علم میں مشغول ہوئے۔ تحصیل علم ہی کے لیے دہلی کا سفر کیا اور شیخ الکبیر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے۔ طویل زمانے تک حضرت شاہ صاحبؒ کی تعلیم و تربیت اور فیض صحبت سے مستفیض ہوئے۔ آپ کا شمار اپنے استاد معظم کی حیات ہی میں اکابر علماء میں ہونے لگا تھا۔ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے آپ سے کتب علم فقہ پڑھیں۔ حضرت شاہ عبد العزیزؒ آپ کے داماد تھے۔ غالباً ۱۱۸۰ھ میں انتقال ہوا جیسا کہ حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے ایک مکتوب گرامی سے اندازہ ہوتا ہے (نزہۃ الخواطر جلد ۲) حضرت مولانا شاہ عبد الحیٔ ابن ہبۃ اللہ بڈھانویؒ رفیق حضرت سید احمد شہیدؒ، مفتی مولانا شاہ نور اللہ بڈھانویؒ کے پوتے تھے۔

رطب اللسان است اللہ تعالیٰ بجمعیت قلبی و قالبی محفوظ دارد و از نا مرضیات محفوظا ـــ از مژدۂ عزم قدوم میمنت لزوم اشتیاقِ دیدارِ فرحت آثار دو بالا شد ـ او تعالیٰ زود بوجہِ احسن مشتاقان را بملاقاتِ سامی مسعود سازد ـ بالجملہ فقیر بدعائے خیر مشغولی دارد اِنَّہٗ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ـــ و نام شخصے کہ از اقربائے اینجانب است محمد راجی است اگر آنجا باشد البتہ پیشِ خود طلبیدہ فرمایند کہ خبر خیریت بنویسد ـ نیاز مند عطاء اللہ مع برادران و قاضی جیو و میاں سراج الدین و دیگر اعزہ سلام نیاز میرسانند ...

ترجمہ ـــ مجمع محامد و فضائل ..... مکرمی مہربان میر سید ابو سعید صاحب سلمہ اللہ اس فقیر نور اللہ کی طرف سے بعدِ سلام مطالعہ فرمائیں ـــ التفات نامہ وصول ہوا، مسرت بخشی ـ بزرگوں کی یاد آوری بشارت سعادت ہوتی ہے ـ الحمد للہ علیٰ ذالک ـــ اکثر اوقات آپ کے اخلاق و اشفاق کے ذکر میں رطب اللسان رہتا ہوں ـ اللہ تعالیٰ آپ کو جمعیتِ ظاہری و باطنی کے ساتھ محفوظ رکھے اور اپنی نامرضیات سے محفوظ ـــ آپ کی تشریف آوری کے قصد کا مژدہ پڑھ کر اشتیاقِ دیدار دوبالا ہوگیا ـــ اللہ تعالیٰ جلد بوجہ احسن مشتاقوں کو ملاقاتِ گرامی سے سعادت اندوز فرمائے ـــ بالجملہ فقیر دعائے خیر میں مشغول ہے ـ اِنَّہٗ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ـــ اور اس شخص کا نام جو میرے اقربا میں سے ہے محمد راجی ہے اگر وہاں ہو تو اپنے پاس بلا کر فرمائیں کہ دکم از کم اپنی خیریت تو لکھ کر بھیج دے ـــ عطاء اللہ مع برادران، قاضی صاحب اور میاں سراج الدین نیز دیگر اعزہ سلام پہونچاتے ہیں ......

مکتوبات حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ[1] بنام حضرت شاہ ابو سعید حسنیؒ

مکتوب (۱) ـ سیادت و نقابت مرتبت خلاصۂ دودمان (نجابت) حقائق و معارف آگاہ فضائل دستگاہ میر ابو سعید جیو سلمہ اللہ تعالیٰ ـــ بعد از سلام اشتیاق الیت اعلام آنکہ

---

[1] الشیخ العالم الکبیر المحدث محمد عاشق بن عبید اللہ بن محمد الصدیقی البھلتیؒ ـــ بچپن ہی سے آپ نے علم سے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

فقیر محمد عاشق مشہود ضمیر معارف تخمیر باد کہ الحمد للہ علی العافیۃ و نسئل اللہ تعالیٰ ان یدیم لنا ولکم ایاھا ـــــ اشفاق نامہ کہ بنام میاں شاہ نور اللہ جیو و فقیر ارقام فرمودہ بودند ورود تودد نمود ـــــ الحال کہ فقیر بجہت تحصیل شرف ملاقات ملازمت حضرت قبلہ کونین مدّ اللہ ظلہم العالی رسیدہ عرضی ایشاں را کہ بجناب حضرت ارسال داشتہ بودند مطالعہ نمود و مواجید خاصہ کہ بفضل الٰہی نصیب ایشاں شدہ ملاحظہ کردہ دریں معنیٰ موجب نہایت خوشی و شادی گردید و حمد الٰہی و شکر وے تعالیٰ بجا آورد اللّٰھُمَّ زِد فزد ثم زد ـــ ان شاء اللہ تعالیٰ بعد وصول وطن نیاز نامہ بخدمت خواہد نوشت اُمید کہ بدعائے خیر یاد دارند ـــ زیادہ حد التماس نماید والسلام ـــ میاں محمد عتیق جیو سلام مطالعہ نمایند از محمد فائق سلام مطالعہ باد ـــ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) انتقال رکھا اور حضرت شاہ ولی اللہ فاروقی محدث دہلویؒ کی خدمت میں تکمیل کی۔ آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے ماموں زاد بھائی تھے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے آپ نے علم و معرفت کو اخذ کیا حرمین شریفین کے سفر (۱۱۴۳ھ تا ۱۱۴۵ھ) میں آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے ہمراہ تھے۔ حرمین کے جو اساتذہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ہیں وہ آپ کے بھی ہیں جن میں سب سے بڑے حضرت شیخ ابو طاہر محمد ابن ابراہیم کردی مدنیؒ ہیں۔ حضرت شیخ ابو طاہر کردیؒ نے بھی آپ کو اجازت حدیث دی۔ آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ اور خلفاء میں سب سے اونچا مرتبہ رکھتے ہیں۔ آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے صاحب السر تھے جیسا کہ شیخ ابو طاہر کردیؒ نے اپنے اجازت نامے میں اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے اور آپ کو حضرت شاہ صاحبؒ کا آئینۂ کمال قرار دیا ہے حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی اپنے عربی اشعار میں آپ کو کمالات عالیہ کی خوشخبری دی ہے۔ حضرت شاہ عبد العزیزؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ ابو سعید حسنی رائے بریلویؒ جیسے باکمال مشائخ اور ایک خلق کثیر نے آپ سے اخذ فیض کیا ہے۔ آپ کے مصنفات میں سے ایک کتاب سبیل الرشاد ہے جو فارسی زبان میں سلوک کے اندر ایک مبسوط کتاب ہے القول الجلی فی مناقب الولی بھی آپ کی کتاب ہے جس میں اپنے شیخ و مربی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حالات و مناقب لکھے ہیں۔ ایک کتاب شرح دعاء الاعتصام ہے۔ اصل کتاب پیر و مرشد کی ہے جو حقائق و معارف کے بیان میں ہے۔ اور آپ کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ نے مصفی شرح موطا للشیخ ولی اللہ المحدثؒ کا مبیضہ تیار کیا حضرت شاہ صاحب کے علوم و معارف زیادہ تر آپ کے ذریعہ محفوظ اور اشاعت پذیر ہوئے۔ مکتوبات شاہ صاحب کو بھی آپ نے اور آپ کے صاحبزادے شیخ عبد الرحمٰن مرحوم نے جمع کیا تھا ـــ آپ کی وفات غالباً ۱۱۸۷ھ میں ہوئی جیسا کہ حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے ایک مکتوب گرامی سے ظاہر ہوتا ہے۔ (ماخوذ از نزہۃ الخواطر جلد ۶)

ترجمہ مکتوب (۱) ــــــ سیادت و نقابت مرتبت ...... میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ
بعد از سلام اشواق التیام فقیر محمد عاشق کی طرف سے واضح ہو کہ الحمد للہ عافیت سے ہوں، اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور آپ کو ہمیشہ عافیت سے رکھے ــــ اشفاق نامہ جو میاں شاہ نور اللہ (بڈھانوی) اور فقیر کے نام (مشترک طور پر) ارقام فرمایا تھا پہونچ گیا تھا ــــ اس وقت فقیر شرف ملاقات حاصل کرنے کی غرض سے حضرت قبلۂ کونین مد اللہ ظلہم العالی (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) کی خدمت میں شاہجہان آباد (دہلی) آیا ہوا ہے ــ آپ کی وہ عرضداشت جو حضرتِ والا کو آپ نے بھیجی ہے نظر سے گذری۔ اس میں آپکے اذواق و مواجیدِ خاصہ جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ کو نصیب ہوئے ہیں مطالعہ کیے ــ اس سے بڑی مسرت حاصل ہوئی اور حمدِ الٰہی اور اس کا شکر بجا لایا ــ اے اللہ اس ذوق کو زیادہ اور زیادہ اور زیادہ کر ــــ اللہ نے چاہا تو وطن (پھلت) پہونچنے کے بعد آپ کی خدمت میں (دوسرا) نیاز نامہ لکھوں گا ــ امید کہ دعائے خیر میں یاد رکھیں گے ــ زیادہ کیا لکھوں ــ والسلام ــ میاں محمد عتیق صاحب سلام مطالعہ کریں ــــ محمد فائق کی طرف سے سلام قبول فرمائیں ــ

مکتوب (۲) ــ فضائل و کمالات دستگاہ میر ابو سعید صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ ــــ
فقیر محمد عاشق کان اللہ لہٗ بعد سلام نیاز تمام میرساند کہ الحمد للہ تعالیٰ جمیع احوالِ ایں نیاز مند مستوجب حمد و شکر ایزدِ متعال است جمعیت صوری و باطنی و استقامت امورِ ظاہری و باطنی آں کرم فرمائے من از جناب مجیب الدعوات مسئول و مامول است ــ شوقے کہ بملاقاتِ فیض آیاتِ ایشاں است بر عالم الغیب والشہادۃ نیک روشن است آنرا بزبانِ قلم دادن خلافِ طریقۂ اہلِ دل میداند لہذا ...... بدعائے دیگری پرداخت ــ عنایت نامہ مشتمل بر شکایت ایذائے بعض الاقارب کا لعقارب و سعیٔ خلل اندازی مکار دیدہ کہ بفضلِ الٰہی تا بازگی در تصرف آمدہ رسیدہ ــ مطالعہ آں موجبِ تشویشِ خاطرِ فاتر گردید علی بے اختیار طبعی است کہ بفضلِ الٰہی خویش مخالف را اقتدار ایذا نہ بخشد و توفیق و فسادش را

کرامت فرماید و مساعیٔ مخالفت را ابراد نرساند۔ بالفعل خطے در باب بذل مساعیٔ جمیلہ در شدرہ مدِ خیال ایذا و مخالفت در سرکار نواب شجاع الدولہ بہادر بخان ذی شان سید شمور علی خاں کہ بخدمت ایشاں ہم غالب است کہ رابطۂ اخلاص داشتہ باشد۔ نوشتہ ارسال نمودہ است۔ غالب است کہ توفیق ایں امیر خیر بیابد۔ و با نجیب الدولہ فقیر را چنداں نوشت و خواند نیست مع ہٰذا از مقدور دریغ نیست۔ دیگر آنکہ از مرحمت نامہ، وعدۂ توجہ با بمصوب قبل رمضان یا بعد آں واضح شدہ بود۔ وعدۂ قبل رمضان خود رفت و بعدیت قریبۂ رمضان ہم تمام شد باید دید کہ تمنائے وصال کے رو نماید۔ حق سبحانہٗ زود میسر آرد امید از خدمت گرامی آنکہ دعائے درحق ایں نیازمند مبذول شود تا حق سبحانہٗ از آفت ہستی و خود پرستی نجات کرامت فرماید۔ زیادہ بجز شوق ملاقات فیض سمات چہ نگارد والسلام اولاً و آخراً ظاہراً و باطناً۔ فقیر زادہ محمد فائق سلام نیاز خود فرا یاد میدہد۔ حاجی بلال و محمد سلیم سلام نیاز میرسانند۔ دیگر التماس آنکہ خطے کہ حضرت میاں صاحب بایشاں نوشتند نقل آں برداشتہ بایں فقیر عنایت فرمایند و ہمچنیں نقل خطوط سابقہ نیز مرحمت فرمایند و دریں باب ہرگز تغافل تجویز نہ نمایند۔

ترجمہ مکتوب (۲) ـــــ فضائل و کمالات دستگاہ میر ابو سعید سلمہم اللہ تعالیٰ ـــــ فقیر محمد عاشق کان اللہ لہٗ ـــــ بعد سلام لکھتا ہے کہ الحمد للہ تمام احوال اس نیازمند کے لائق حمد و شکر ایزد تعالیٰ ہیں ـــــ مجیب الدعوات سے آپ کے لیے جمعیت صوری و معنوی اور استقامت امور ظاہری و باطنی کی درخواست ہے۔ شوق ملاقات کا جو عالم ہے اس کو عالم الغیب والشہادۃ خوب جانتا ہے۔ اس شوق کو زبان و قلم کے حوالے کرنا خلاف طریقۂ اہل دل سمجھتا ہوں لہٰذا...... دوسری بات لکھتا ہوں ـــــ عنایت نامہ جو بعض اقارب کی تکلیف دہی اور جائداد ـــــ جو آپ کے تصرف میں دیکھی آئی ہے ـــــ کے کاموں میں خلل اندازی کی شکایات پر مشتمل تھا۔ پہونچا ـــــ اس کے مطالعے سے دل کو تشویش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ سے میرا دل بے اختیار التجا کرتا ہے کہ وہ محض اپنے فضل و کرم سے مخالف کو ایذا کی قدرت نہ دے اور مخالفت

کی توفیق عطا فرمائے۔ نیز مخالف کی مساعی کو کامیاب نہ کرے۔ مخالف کی ایذا کا اندیشہ کرتے ہوئے سرکار شجاع الدولہ بہادر میں خان ذی شان سید تہور علی خاں کو ایک خط لکھ دیا ہے غالباً وہ آپ سے بھی رابطۂ اخلاص رکھتے ہوں گے امید کہ وہ امر خیر کی توفیق پائیں گے۔ نجیب الدولہ سے فقیر کی چنداں خط و کتابت نہیں ہے اس کے باوجود ممکن کوشش سے دریغ نہ ہوگا۔ ایک بات یہ لکھنا ہے کہ آپ کے مرحمت نامے سے اس طرف قبل رمضان یا بعد رمضان آنے کا وعدہ واضح ہوا تھا۔ وعدۂ قبل رمضان تو ختم ہوا ہی تھا اب رمضان کی بعدیت قریبہ بھی ختم ہوگئی دیکھنا چاہیے کہ تمنائے وصال کب پوری ہو۔ اللہ تعالیٰ جلد ملاقات میسر کرے۔ آپ کی ذات گرامی سے یہ امید ہے کہ اس نیازمند کے حق میں دعا کرتے رہیں گے کہ اللہ تعالیٰ آفت خودی و خود پرستی سے نجات دے۔ زیادہ بجز شوق ملاقات کے اور کیا لکھوں۔ والسلام اولاً و آخراً ظاہراً و باطناً فقیر زادہ محمد فائق بھی اپنا سلام یاد دلا رہا ہے۔ حاجی بلال اور محمد سلیم اپنا سلام پہونچاتے ہیں۔ دیگر التماس یہ ہے کہ وہ خط جو حضرت میاں صاحب (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) نے آپ کو لکھا ہو اس کی نقل کر کے اس فقیر کو عنایت فرمائیں۔ اسی طرح خطوطِ سابقہ کی بھی نقل مرحمت فرمائیں اس بارے میں تغافل کو ہرگز جائز نہ رکھیں۔

مکتوب (۳) — حق سبحانہٗ ذاتِ مجمع کمالات آں عارف المکاشف صاحب الاذواق والمواجید (را) مصدرِ فیوضِ ظاہری و باطنی گرداناد آمین برب العباد — فقیر محمد عاشق عفی عنہ (بعد از) تبلیغ سلام و اظہار شوق و عزام ملاقات فیض آیات مشہود ضمیر منیر میگرداند کہ مدتے مدید و عہدے بعید برآمدہ کہ سوائے یک مکتوب کہ مشحون حقائق و معارفِ جلیلہ بود نرسیدہ — بنا برآں دل اینجا مہجور بالضرور مشتاق لقائے بہجت افزائے و شوق مند مطالعہ کلماتِ معارف سمات می باشد — اللہ تعالیٰ بمحض عنایتِ خویش لطیفہ انگیزد کہ حجاب بُعدِ صورت از میاں برخیزد و تمنائے دلی بوجہ احسن میسر آید — معلوم نیست کہ دریں ایام بکدام مقام تمکن دارند — امید کہ بہت آئندہ از اسرار و قائع آں اطلاع بخشند تا مشتاقان ہم ازاں حظے و لذتے حاصل نمائیم — دیگر الحمد للہ کہ

بفضل اللہ سبحانہ ما فقرائے باب اللہ دریں ایام فتن کہ بخصوصیت دریں ملک از دست
بکہ..... حادثہ رو دادہ کہ تذھل کل مرضعۃ عما ارضعت و تضع کل ذات
حمل حملھا ـــــ حکایت از آں میتواں شد ــ بہمہ وجوہ محفوظ ماندیم ــ [5]

گر بر تن من زباں شود ہر موئے
یک شکر تو از ہزار نتوانم کرد

امید کہ ایں فقیر را مع الاولاد والاحباب والاصحاب بدعائے ظہر الغیب یاد فرمایند
تا در فتن صوریہ و معنویہ محفوظ مانیم و بر صراط مستقیم ثابت قدم باشیم ــ زیادہ بجز استدعائے
یاد آوری چہ اظہار نماید والسلام علیکم اولاً و آخراً ــ مخدوم زادہ میر ابو العیش سلمہ اللہ
سلام و شوق مطالعہ نمایند ــ فقیر زادہ محمد فائق و وحید الزماں و محمد احسان و محمد نعمان
و ابو الفتح و عبد السلام سلام نیاز میرسانند حاجی بلال نیز ـــ
بخدمت گرامی میاں سید علی جیو صاحب کہ فقیر غائبانہ مشتاق ملاقات فیض آیات
ایشان است سلام رسانند و التماس دعا، دعا نمایند کہ حق سبحانہ بیمن آں از آفت خودی و
خود پرستی نجات کرامت فرماید و حاجی میر محمد نعمان جیو سلمہ اشتیاقیہ مطالعہ نمایند، میاں
آل محمد و میاں محمد ہمام و قائم خاں سلام شوق مطالعہ نمایند ـــ

---

[5] حضرت سید محمد عدل عرف سید لعل بن سید محمد بن حضرت شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی۔ آپ نے اپنے بھائی سید محمد حکم سے اخذ علوم کیا پھر اپنے والد سے طریقۂ نقشبندیہ حاصل کیا اور درجۂ کمال کو پہونچے اور اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ سرزمین اودھ میں اپنے زمانہ کے یگانۂ روزگار بزرگ تھے آپ سے مولانا ازھار الحق فرنگی محلی، مولانا ذو الفقار علی دیوی، قاضی عبد الکریم جوراسی، مولانا احمدی بن محمد نعیم کرسوی، شیخ محمد یحییٰ بن محمد ضیاء جائسی، سید محمد نعمان ابن محمد نور نصیر آبادی وغیرہم کثیر التعداد علماء و مشائخ نے فیض حاصل کیا۔ ۱۲۹۲ھ میں انتقال ہوا تکیہ شاہ علم اللہ حسنیؒ میں مزار ہے۔ (نزھۃ الخواطر جلد ۶) مؤلف آئینۂ اودھ نے ص ۲۵۵ پر آپ کو حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ کی پانچویں پشت میں بتایا ہے جو غلط ہے ـــ درحقیقت آپ حضرت شاہ علم اللہ قدس سرہ کے ابن الابن ہیں ـــ یعنی دوسری پشت میں ہیں۔

ترجمہ مکتوب (۳) ـــــ اللہ تعالیٰ آں عارف مکاشف، صاحب اذواق و مواجید کو مصدر فیوض ظاہری و باطنی بنائے آمین ـــــ فقیر محمد عاشق عفی عنہ تبلیغ سلام اور اظہار شوق ملاقات کے بعد لکھتا ہے کہ ایک مدت دراز ہوگئی کہ سوائے ایک مکتوب کے جو کہ حقائق و معارف جلیلہ سے بھرا ہوا تھا اور کوئی مکتوب نہیں پہونچا اس بنا پر اس مہجور کا دل مشتاق دیدار اور شوق مند مطالعہ کلمات معارف رہتا ہے! اللہ تعالیٰ محض اپنے کرم سے ایسی صورت پیدا کردے کہ یہ ظاہری پردۂ دوری درمیان سے اٹھ جائے اور تمنائے دلی بوجہ احسن میسر آئے ـــــ معلوم نہیں کہ ان دنوں آپ کون سے مقام سلوک پر فائز ہیں، مجھے امید ہے کہ کسی آنے والے کے ہاتھ اپنے (موجودہ) اسرار و آثار سے اطلاع بخشیں گے تاکہ ہم مشتاق بھی اس سے حظ و لطف حاصل کرلیں ـــــ دوسری بات یہ ہے کہ الحمدللہ ہم آستانۂ خداوندی کے فقیر ان ایام فتن میں کہ خصوصیت کے ساتھ اس علاقے میں سکھوں کے ہاتھ سے حادثہ رونما ہوا اور جو قیامت کا نمونہ تھا ـــــ بہمہ وجوہ محفوظ رہے ـــــ اگر جسم کے تمام رونگٹے زبان بن جائیں تب بھی اللہ تعالیٰ کا ہزار میں سے ایک شکر ادا نہیں ہوسکتا ـــــ امید ہے کہ اس فقیر کو اور اس کی اولاد، احباب اور اصحاب کو غائبانہ دعا سے یاد کرتے رہیں گے تاکہ ہم ظاہری و باطنی فتنوں سے محفوظ اور صراط مستقیم پر ثابت قدم رہیں ـ زیادہ بجز استدعائے یادآوری اور کیا لکھوں ـ والسلام علیکم اولاً و آخراً ـ مخدوم زادہ ابوالعیش سلمہٗ سلام و شوق مطالعہ کریں، فقیر زادہ محمد فائق کے علاوہ، وحید الزماں، محمد احسان، محمد نعمان، ابوالفتح، عبدالسلام، سلام کہتے ہیں اور حاجی بلال بھی ـــــ میاں سید لعل صاحب کی خدمت گرامی میں ـــــ کہ فقیر غائبانہ ان کا مشتاق ملاقات ہے ـــــ سلام پہونچادیں ـــــ اور دعا کی استدعا کریں تاکہ حق تعالیٰ اس دعا کی برکت سے مجھے آفت خودی و خود پرستی سے نجات بخشے ـــــ حاجی میر محمد نعمان سلمہٗ اور میاں محمد ہمام اور قائم خاں سلام شوق مطالعہ کریں ـ

مکتوب (۴) ـ بگرامی خدمت حقائق آگاہ و معارف دستگاہ سلالۂ سادات عظام

نقادۂ دودمان سلف کرام میر ابو سعید جیو سلمہم اللہ تعالیٰ ــــ فقیر محمد عاشق عفی عنہ بعد ادائے سلام واشواق واضح میگرداند کہ عنایت نامہ، مُنبی از قدوم بہجت لزوم در اسعد ساعات ورود نمود بمطالعۂ آں ابواب خوشی وشادی ہرچہ تمام تر بر روئے دل مُستہام کشود ــ از روزیکہ شقۂ شریف مُشعر از توجہ باین دیار وتشریف آوری تا بلشکر رسیدہ بود ہمیشہ انتظار قدوم مسرت لزوم میداشت خصوصاً دریں روزہا کہ لشکر باین سمت متوجہ شدہ، شب وروز گوش بر آواز مژدہ میداشت ــ الحمد للہ کہ آں نوید فرحت جاوید رسید اشواق دل مُقتضی آں بود کہ بمجرد اصغائے ایں مُژدہ بتعجیل ہرچہ تمام تر خود را بخدمت رساند لیکن بعضے مخلصان کہ دلداری شاں نیز از اہم مہمات است سدِ راہ تعجیل شدند پس جہت ضرورت توقف بمیان آمد ــ ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب میرسم بخاطر جمع در آنجا کہ خانۂ ایشاں است تشریف دارند در دل صفا منزل، تشویش راہ راہ ندہند ان شاء اللہ تعالیٰ زود ایں فقیر را رسیدہ دانند واز مُژدۂ آنکہ مکاتیب فیض اسالیب حضرت قبلہ ام رضی اللہ عنہ ہمراہ شریف آوردہ اند بغایت شادی روئے آورد ــ شکر ایں عنایت بکدام زبان نمودہ آید کہ از احصائے خارج است ــ زیادہ بجز التماس اینکہ بخاطر جمع در آنجا تشریف دارند ایں فقیر زود میرسد ــ چہ اظہار نماید والسلام از فقیر زادہ محمد فائق سلام نیاز مطالعہ نمایند ــ حاجی ہلال وغیرہ سلام نیاز می رسانند ــ بعالیجناب شاہ اہل اللہ آداب وتسلیمات ملتمس است، محمد مقرب اللہ ومیاں محمد شاہ ورحم علی وہمہ یاران سلام مطالعہ نمایند ــ فقط

ترجمہ مکتوب (۲) ــــ حقائق آگاہ معارف دستگاہ..... میر ابو سعید صاحب سلمہم اللہ کی خدمت میں فقیر محمد عاشق عفی عنہ بعد ہدیۂ سلام وشوق فراواں واضح کرتا ہے کہ عنایت نامہ جو قدوم بہجت لزوم کی اطلاع دینے والا تھا سعید ترین ساعت میں وارد ہوا، اس کے مطالعے سے مسرت وخوشی کے دروازے کامل طریقے سے دل پریشاں پر کھل گئے ــ (اس سے پہلے) اُس روز سے جبکہ آپ کا رقعہ اس علاقے کی طرف توجہ فرمانے اور لشکر تک تشریف لانے کا پہونچا تھا ہمیشہ انتظار قدوم

سنت لزوم تھا ـــــ خصوصاً ان ایام میں کہ لشکر اس طرف متوجہ ہوا ہے۔ شب و روز اپنے کانوں کو آپ کی تشریف آوری کی خوشخبری سننے کی طرف متوجہ رکھتا تھا ـــــ الحمد للہ کہ وہ نوید فرحت[1] جاوید پہونچی۔ شوق دل کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اس خبر کو سنتے ہی ممکن تعجیل کے ساتھ خود کو آپ کی خدمت میں پہونچا دوں لیکن بعض مخلصین کہ اُن کی دلداری بھی بہت ضروری ہے تعجیل سے مانع ہوئے ـــــ پس ضرورت کی وجہ سے چند روز کا توقف ہو گیا اللہ نے چاہا تو جلد پہونچ رہا ہوں۔ اطمینان کے ساتھ وہاں (پھلت میں) تشریف رکھیں وہ گھر آپ ہی کا ہے ـــــ دل صفا منزل میں کسی قسم کی تشویش کو راہ نہ دیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ جلد اس فقیر کو وہاں پہونچا ہوا جانیں۔ اس خوشخبری سے کہ آپ حضرت قبلہ رضی اللہ عنہ (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) کے مکتوبات بھی اپنے ہمراہ لائے ہیں۔ بہت ہی خوشی رونما ہوئی آپ کی اس مہربانی کا شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے کہ احاطۂ بیان سے خارج ہے۔ زیادہ بجز اس کے کیا التماس کرے کہ اطمینان کے ساتھ وہاں تشریف رکھیں فقیر جلد پہونچ رہا ہے ـــــ اور کیا اظہار کروں ـــــ فقیر زادہ محمد فائق کی طرف سے سلام مطالعہ فرمائیں۔ حاجی بلال وغیرہ بھی سلام پیش کرتے ہیں ـــــ بجالیخدمت شاہ اہل اللہ (پھلتی) سلام عرض ہے، محمد مقرب اللہ۔ میاں محمد شاہ اور رحم علی نیز (پھلت کے) تمام احباب سلام مطالعہ فرمائیں۔

مکتوب (۵) ...... الحمد للہ تا حالت تحریر کہ بست و دوم شہر ذی قعدہ سن ہشتاد بعد الالف و المأتہ است، احوال ایں فقیر مع صغیر و کبیر مستوجب شکر و ثنائے حق جل

---

[1] اس مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ جب پھلت ضلع مظفر نگر پہنچے تو شاہ محمد عاشق پھلتی مع اہل و عیال دہلی میں تھے۔ تشریف آوری حضرت شاہ ابوسعیدؒ کی خوشخبری آپ کو دہلی میں ملی ـــــ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا وصال ہو چکا ہے۔ پچھلے مکتوب میں حضرت شاہ صاحبؒ کے مکتوبات کا مطالبہ حضرت شاہ محمد عاشقؒ نے کیا تھا اب وہ اس تقاضے کے مطابق مکتوبات ہمراہ لائے ہیں۔ یہ مکتوبات وہی ہیں جن کا پہلی قسط میں اندراج ہو چکا ہے۔ کتنی خوشی ہو مکتوبات کے ہمراہ لانے کی۔ درحقیقت اسی شوق و ذوق نے بزرگوں کے علمی تبرکات کو ہم تک پہونچانے میں مدد دی ہے۔

است ..... گاہ گاہ مصحوب آیندگان ایں صوب از کوائف عافیت واز اذواق و مواجید خاصۂ خویش شرف اطلاع بخشیدہ باشند ___ و اشتیاق بوصال فیض مالامال چہ نویسد کہ بہ تحریر نمی گنجد .... ہ

اشتیاقیکہ بدیدار تو دارد دل من
دل من داند و من دانم و داند دل من

بعد ہٰذا آنکہ فقیر بحسب قسمت در موضع نوگانواں سادات کہ قریب بلدۂ امروہہ است رسیدہ بود در آنجا معلوم شد کہ پسر غلام انبیاء کہ عاشق علی نام دارد بے رخصت از خانہ ہمراہ دو یک اطفال دیگر عزم آں دیار کردہ واز مدتے از حال وے خبرے نرسیدہ ازیں جہت جد و مادر وے اضطراب تمام دارند و پدر وے شنیدہ است کہ مشارٌ الیہ بخدمت شریف رسیدہ بود و چند روز اقامت نمودہ ___ بنابراں ازیں فقیر استدعائے کردہ کہ بخدمت گرامی خطے متضمن استفسار احوال وے نویسد لہٰذا متصدع اوقات شریف گردیدہ ___ اگر آں سید زادہ در آنجا بودہ باشد یا از احوال وے اطلاع باشد البتہ البتہ اطلاع بخشند زیادہ بجز استدعائے دعائے ظہر الغیب چہ التماس نمودہ آید۔ والسلام مع الاکرام۔ میر ابو النعیش سلام شوق مطالعہ نمایند، میر محمد نعمان سلام مطالعہ فرمایند ___ از میاں آل محمد، و میاں رحم علی و میاں غلام امام و محمد قاسم سلام مطالعہ باد ___ دیگر آنکہ صاحبزادہائے مع قبائل باخیر و خوبی در بدعا نہ تشریف می دارند۔ میاں اہل اللہ صاحب و شاہ نور اللہ جیو بخیریت اند ___ محمد فائق و محمد مقرب اللہ و وحید الزماں و محمد احسان و میاں محمد جواد و حاجی بلال و جمیع خورد و کلاں بخیریت اند و بخدمت شریف سلام می رسانند ___

ترجمہ مکتوب (۵) .... الحمد للہ اس وقت تک کہ ۲۲ ر ذی قعدہ ۱۲۳۱ھ ہے۔ اس فقیر کے حالات مع صغیر و کبیر لائق شکر و ثنائے حضرت حق ہیں ..... کبھی کبھی اس طرف کے آنے والوں کے ہاتھ اپنے کوائف عافیت اور اذواق و مواجید خاصہ سے مطلع فرماتے رہا کریں۔ شوق ملاقات کا حال کیا لکھوں کہ احاطۂ تحریر میں نہیں سما

سکتا ......ہ

اشتیاقیکہ بدیدار تو دارد دلِ من عـہ
دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

اس کے بعد تحریر ہے کہ فقیر بجب قسمت موضع زگانواں سادات عـہ جو کہ شہر امروہہ کے قریب ہے گیا تھا وہاں معلوم ہوا کہ (سید) غلام انبیا عـہ کا لڑکا جس کا نام عاشق علی ہے گھر والوں کی اجازت کے بغیر دو ایک لڑکوں کے ساتھ اس طرف (ادھر) کو چلا گیا ہے اور ایک مدت سے اس کے حال کی کوئی خبر نہیں آئی اس وجہ سے اس کے ماں باپ بہت مضطرب ہیں۔ اس کے باپ نے سنا ہے کہ عاشق علی مذکور آپ کی خدمت میں بھی پہونچا تھا اور چند روز (رائے بریلی میں) اقامت کی تھی اس بنا پر انھوں نے (سید غلام انبیا نے) مجھ سے استدعا کی کہ میں ایک خط آپ کو اس کے احوال کے استفسار میں لکھوں اسی وجہ سے میں آپ کے اوقات شریف میں مخل انداز ہوا ہوں۔ اگر وہ سیدزادہ وہاں ہو یا اس کے احوال سے اطلاع ہو تو ضرور ضرور تحریر فرمائیں۔ زیادہ بجز غائبانہ دعائے خیر کے آپ سے اور کیا التماس کیا جائے والسلام: مع الاکرام میر ابو العیش سلام شوق مطالعہ کریں اور میر محمد نعمان بھی سلام مطالعہ کریں، میاں آل محمد، میاں رحم علی میاں غلام امام اور محمد قاسم کی طرف سے آپ سلام مطالعہ فرمائیں ــــ دوسری بات یہ ہے کہ (اس وقت) صاحبزادگانِ حضرت شاہ صاحبؒ مع متعلقین بخیر و عافیت قصبہ

عـہ کتنا وجد انگیز اور کیف آور شعر ہے۔ یہ ان اشعار میں سے ہے جن کا ترجمہ کرنا اصل کیفیت کا زائل کرنا اور بے ذوقی کا ثبوت دینا ہے۔

عـہ زگانواں سادات امروہہ سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ حضرت بابا فریدالدین مسعود قدس سرہ کے داماد سید بدرالدین اسحٰقؒ کی اولاد میں یہاں کے اکثر باشندے ہیں مگر ایک دو گھر چھوڑ کر یہ سب شیعہ ہو گئے ہیں۔ اب تقریباً دو سو سال پیشتر کا اس بستی کے اندر کئی خانقاہیں تھیں آج ایک کا بھی نشان نہیں۔

عـہ اللہ تعالیٰ نے سید غلام انبیا اور ان کے صاحبزادے عاشق علی اور عاشق علی کی نسل کو اہلسنت و جماعت کے مسلک پر قائم رکھا۔ حاجی سعادت علی پسر عاشق علی کا ذکر خیر انوار العارفین اور تذکرۃ الکرام میں بحیثیت ایک اہل دل درویش کامل کے موجود ہے۔ حاجی [illegible] کا سفر حج سے واپسی میں انتقال ہوا تھا۔ (انوار العارفین)

بڈھانہ ضلع مظفرنگر میں تشریف رکھتے ہیں۔ میاں اہل اللہ صاحب اور شاہ نور اللہ صاحب بخیریت ہیں۔ محمد فائق، محمد مقرب اللہ، وحید الزماں، محمد احسان، میاں محمد جواد، حاجی بلال اور تمام خرد و کلاں بخیریت ہیں اور آپ کی خدمت میں سلام پہونچاتے ہیں۔

مکتوب (۶) بنام سید ابو اللیثؒ ملقب بخواجہ ابو العیش صاحبزادہ حضرت شاہ سید ابو سعید حسنی رائے بریلویؒ

سلالۂ سیادت، خلاصۂ نجابت خواجہ ابو العیش عاش سعیداً و حمیداً از فقیر محمد عاشق عفی عنہ بعد سلام و ادعیۂ درویشاں مطالعہ نمایند کہ اطوار سعادت آں نقاوۂ صفوت و شوق ملاقات ایں فقیر مسموع گردید از یں معنی نہایت فرح و سرور بدل رسید حق سبحانہ ملاقات باحسن وجوہ میسر کناد و سعادت مند کونین را بترقیات کمالات صوری و معنوی باقصی الغایات رساناد و از علم و فضل بہرۂ وافی بخشاد و در شریعت و طریقت تقویٰ و طہارت رسوخ کمال کہ موروث خاندان حضرت میر صاحب قدس سرہ است کناد و در سیر حقیقت باعلیٰ المراتب فائز گرداناد والسلام علیکم اولاً و آخراً ظاہراً و باطناً۔ از فقیر زادہ محمد فائق سلام مشتاقانہ مطالعہ نمایند۔

ترجمہ۔۔۔ سلالۂ سیادت خلاصۂ نجابت ..... فقیر محمد عاشق عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام اور درویشانہ دعاؤں کے مطالعہ کریں۔ تمھاری سعادتمندی کا طور طریق اور اس فقیر سے تمھارا شوق ملاقات سننے میں آیا اس بنا پر دل کو بڑی خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ باحسن وجوہ تم سے ملاقات میسر کرائے اور سعادتمند کونین کو (یعنی تمھیں) کمالات صوری و معنوی میں ترقی عطا کرکے انتہائی درجے پر پہونچائے نیز علم و فضل سے بہت کچھ حصہ عنایت کرے اور شریعت و طریقت، تقویٰ و طہارت میں۔۔۔ جو کہ حضرت شاہ میر علم اللہ قدس سرہ کی میراث ہے۔ کمال نصیب کرے اور سیر حقیقت میں اعلیٰ مرتبے پر فائز فرما دے۔

والسلام اولاً و آخراً ظاہراً و باطناً

فقیر زادہ محمد فائق کی طرف سے سلام مشتاقانہ مطالعہ کریں۔

(تصحیح متعلق قسط اوّل۔ ص ۱۶۔ سطر ۷ میں لفظ "فاطر" کو "فاتر" بنا لیا جائے۔)

تحقیق کے نئے گوشے

(از :- جناب وحید الدین خاں صاحب)

علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب " الغزالی " کے دوسرے حصہ میں " معاد یا حالات بعد الموت " کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں ____ " مذہب کی روح رواں جو کچھ کہو، معاد کا اعتقاد ہے۔ مذہب میں جو کچھ تاثیر ہے اور افعال انسانی پر مذہب کا جو اثر پڑتا ہے، وہ اسی اعتقاد کی بدولت ہے۔ لیکن جس قدر وہ مہتم بالشان ہے اسی قدر عسیر التصور ہے۔ ایک بدوی شاعر الحاد کے لہجہ میں کہتا ہے :-

اَموتٌ ثم بعثٌ ثم نشرٌ — مرنا، پھر زندہ ہونا، پھر چلنا پھرنا!
حدیثُ خرافۃٍ یا امّ عمرو — میری بیگم! یہ تو خرافات کی باتیں ہیں

اس مرحلے میں جو مشکلیں ہیں ان میں پہلا اور سب سے مشکل بقائے روح کا مسئلہ ہے۔ یعنی یہ ثابت کرنا کہ روح جسم سے جدا کوئی چیز ہے۔ مادیین کا خیال ہے کہ روح کوئی جداگانہ چیز نہیں، بلکہ جس طرح دواؤں کی ترکیب دینے سے ایک مزاج خاص پیدا ہو جاتا ہے یا تاروں کی خاص ترکیب سے خاص خاص راگ پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح عناصر کی خاص طور پر ترکیب پانے سے ایک مزاج خاص پیدا ہو جاتا ہے جو ادراک اور تصور کا سبب ہوتا ہے اور اسی کا نام روح ہے۔

روح کے ثابت کرنے کے بعد دوسرا مرحلہ اس کی بقا کا ثابت کرنا ہے یعنی یہ کہ جسم کے فانی ہونے پر وہ باقی رہ سکتی ہے۔" (صفحہ ۷۲-۱۰۱)

اس کے بعد مضمون صغیر اور مضمون کبیر سے امام غزالی کے خیالات ان مباحث

پر نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :- " امام صاحب نے روح کی جو حقیقت بیان کی اور اس پر جو دلائل پیش کئے، یونانیوں سے ماخوذ ہیں۔ ارسطو نے اثولوجیا میں بعینہ یہی تقریر کی ہے۔ اور بوعلی سینا نے اس کو مختلف پیرایوں میں آب و رنگ دے کر ادا کیا ہے، لیکن یہ امر بظاہر تعجب انگیز ہے کہ جو سب سے مقدم امر تھا یعنی روح کا اثبات، امام صاحب نے اسی کو چھوڑ دیا۔ روح کا جوہر ہونا، غیر جسمانی ہونا، یہ فرعی امور ہیں۔ پہلے یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ روح کوئی شے بھی ہے یا نہیں " (صفحہ ۱۷۴)

اس کے بعد اپنی طرف سے لکھتے ہیں ـــــ " اصل یہ ہے کہ روح کا وجود ایک وجدانی امر ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادراک و تعقل محض مادہ کا کام نہیں: مادہ ایک بے حس، بے جان اور لاتعقل چیز ہے۔ دقیق خیالات اور علوم و فنون مادہ سے انجام نہیں پاسکتے۔ بلکہ کوئی اور جوہر لطیف ہے جس سے یہ کرشمے سرزد ہوتے ہیں اور اسی کا نام روح ہے لیکن یہ استدلال وجدانی ہے۔ (بوعلی سینا نے روح کے اثبات پر اشارات میں لمبی چوڑی دلیل پیش کی ہے، لیکن وہ یونانیوں کے عام دلائل کی طرح صرف لفظوں کا کھیل ہے) اگر کوئی منکر، انکار پر آمادہ ہو اور کہے کہ ـــــ " تم نے جو کچھ کہا عین دعوے کا اعادہ ہے، دلیل نہیں۔ ممکن ہے مادہ ہی ایک خاص ترکیب پا کر ان نیرنگیوں کا مظہر ہو۔ کلوں سے جو عجیب و غریب حرکتیں ظاہر ہوتی ہیں، ارغنون سے جو دلکش اور موثر نغمے پیدا ہوتے ہیں، ان میں روح کا کون سا شائبہ ہے " تو ہم دلیل سے اس کی زبان بند نہیں کرسکتے۔ یہی سبب تھا کہ امام صاحب نے روح کے ثبوت پر کوئی منطقی دلیل نہیں پیش کی " (صفحہ ۱۷۵)

مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے اس بحث کو یہیں ختم کر دیا ہے اور ایک عالم کی ۱۹۰۱ء کی تصنیف میں شاید اتنا ہی کہا بھی جا سکتا تھا۔ مگر میں اس پر یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ جدید تحقیقات نے واقعات و حقائق کے کچھ ایسے نئے گوشے کھولے ہیں جس کے بعد ایک حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ روح کا جسم سے الگ ایک مستقل وجود ہونا یا جسم کے فنا ہونے کے بعد روح کا باقی رہنا محض وجدانی چیز نہیں رہا، بلکہ ایک ایسی حقیقت بن چکا ہے جس کو تجرباتی دلیل سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

جسم کے بارے میں سائنس نے دریافت کیا ہے کہ وہ بے شمار چھوٹے چھوٹے خلیوں (CELLS) کا مرکب ہے جن کی تعداد ایک متوسط جسم میں ایک ہزار ارب کے قریب ہوتی ہے۔ یہ خلیے ہر آن ٹوٹ کر ختم ہوتے رہتے ہیں۔ غذا ہضم ہو کر ہمارے جسم کے لئے وہ خلیے مہیا کرتی ہے جو ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے ہر روز درکار ہوتے ہیں۔ گویا جسم نام ہے ایک ایسی عمارت کا جو کھربوں اینٹوں سے مل کر بنا ہو اور ہر آن اپنی اینٹوں کو بدلتا رہتا ہو۔ اب اگر روح جسم ہی کا ایک مظہر ہے تو جس طرح مشین کا ایک پرزہ ٹوٹنے سے پوری مشین متاثر ہو جاتی ہے اور باجے کا ایک تار خراب ہونے سے اس کی آواز پر اثر پڑجاتا ہے اسی طرح جسم کے مرکبات بدلنے یا ضائع ہونے سے روح میں بھی تبدیلیاں ہونی چاہئیں مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ روح جسم سے الگ ایک چیز ہے جو بذات خود اپنا وجود رکھتی ہے۔ چنانچہ ایک سائنسداں نے انسانی ہستی کو اس کے جسم کے مقابلے میں ایک ایسی مستقل بالذات چیز قرار دیا ہے جو مسلسل تغیرات کے اندر غیر متغیر حالت میں اپنا وجود باقی رکھتی ہے۔ اس کے الفاظ میں:-

PERSONALITY IS CHANGELESSNESS IN CHANGE

اس خیال کی مزید تصدیق نفسیات کے اس انکشاف سے ہوتی ہے جس کو تحت شعور یا لاشعور کہا جاتا ہے اور جو انسانی ذہن کا نسبتاً زیادہ بڑا حصہ ہے۔ لاشعور کے بارے میں اب یہ تقریباً مسلمہ طور پر مان لیا گیا ہے کہ جو خیالات اس کے اندر جگہ پاتے ہیں وہ تاحیات کل یکساں حالت میں باقی رہتے ہیں۔ فرائڈ اپنے اکتیسویں لکچر میں کہتا ہے:-

"منطق کے قوانین ملکہ اضداد کے اصول کو، لاشعور کے عمل پر حاوی نہیں ہوتے مخالف خواہشات ایک دوسرے کو زائل کئے بغیر اس میں پہلو بہ پہلو ہمیشہ موجود رہتی ہیں...... لاشعور میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نفی سے مشابہت رکھتی ہو اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لاشعور کی دنیا میں فلسفیوں کا یہ دعویٰ غلط ہو جاتا ہے کہ ہمارے تمام دماغی افعال وقت اور فاصلہ کے درمیان واقع ہوتے ہیں۔ لاشعور کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو وقت کے تصور سے مطابقت رکھتی ہو۔ لاشعور میں

وقت کے گزرنے کا کوئی نشان نہیں اور یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے جس کے معنی سمجھنے کی طرف ابھی تک فلسفیوں نے پوری توجہ نہیں کی کہ وقت کے گزرنے سے ذہنی عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ایسے خیالات (CONATIVE IMPULSES) جو کبھی لاشعور سے باہر نہیں آتے بلکہ وہ ذہنی تاثرات بھی جنھیں روک کر لاشعور میں دبا دیا گیا ہو، فی الواقع غیر فانی ہوتے ہیں۔ اور دسیوں سال تک اس طرح سے محفوظ رہتے ہیں گویا ابھی کل وجود میں آئے ہیں"

NEW INTRODUCTORY LECTURES ON PSYCHO-ANALYSIS (LONDON 1949) P.99

لاشعور کے عمل کا وقت کی گرفت سے آزاد ہونا، ظاہر کرتا ہے کہ لاشعور جسم سے الگ اپنا کوئی وجود رکھتا ہے۔ کیونکہ جسم کے بارے میں یہ مسلم ہے کہ وہ وقت اور فاصلہ کے قوانین کا پابند ہے اور انھیں حدود کے اندر اسکے تمام مظاہر واقع ہوتے ہیں۔ اب اگر روح جسم ہی کا ایک ظہور خاص ہوتی تو جسم کی طرح اس کو بھی لازماً وقت اور فاصلہ کے قوانین کا پابند ہونا چاہیئے تھا اور جبکہ تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ایسا نہیں ہے تو اس کا لازمی مفہوم یہ ہے کہ روح اپنی نوعیت میں جسم سے مختلف ایک چیز ہے جو اس سے الگ اپنا مستقل وجود رکھتی ہے۔ جسم سے روح کا تعلق مشین اور حرکت یا باجے اور راگ کا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جس طرح حرکت اور راگ پر بعینہ وہی قوانین مرتب ہوتے ہیں جو مشین اور باجے پر مرتب ہوتے ہیں۔ اسی طرح روح پر بھی یقیناً انھیں قوانین کا ترتب ہوتا جو جسم کے اوپر اثر انداز ہوتے ہیں۔

دوسری چیز جس کا میں یہاں حوالہ دینا چاہتا ہوں وہ سائیکیکل تحقیقات (PSYCHICAL RESEARCH) کے نتائج ہیں جو خالص تجرباتی اور مشاہداتی سطح پر موت کے بعد زندگی کے وجود کو ثابت کرتے ہیں۔ اس میں ہمارے نقطۂ نظر سے مزید دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ بقائے محض کو ثابت نہیں کرتے بلکہ عین اس شخصیت کی بقا کو ثابت کرتے ہیں جس سے ہم موت سے پہلے واقف تھے۔

انسان کی بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جو بذات خود تو پہلے سے موجود تھیں مگر ان پر سائنسی انداز سے غور و فکر نہیں ہوا تھا۔ مثلاً خواب دیکھنا انسان کی قدیم ترین خصوصیت ہے۔ مگر جدید دور میں خواب کے مطالعہ سے جو نفسیاتی حقائق معلوم کئے گئے ہیں ان سے قدیم دور کے لوگ ناآشنا تھے۔ اسی طرح کچھ اور مظاہر ہیں جن کے متعلق موجودہ زمانے میں باقاعدہ اعداد و شمار جمع کیے گئے اور سائنسی انداز سے ان کا تجزیہ کیا گیا۔ اس طرح جدید مطالعہ کے ذریعہ ان واقعات سے نہایت اہم نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ انہی میں سے ایک سائی کیکل ریسرچ ہے جو جدید نفسیات کی ایک شاخ ہے اور جس کا مقصد انسان کی ما فوق العادت صلاحیتوں کا تجرباتی مطالعہ ہے۔ اس قسم کی تحقیقات کے لئے سب سے پہلا ادارہ ۱۸۸۲ء میں انگلینڈ میں قائم ہوا اور ۱۸۸۹ء میں اس نے سترہ ہزار اشخاص سے رابطہ قائم کر کے وسیع پیمانے پر اپنی تحقیقات شروع کر دیں۔ یہ اب بھی مطالعہ نفسیات کا ادارہ (SOCIETY FOR PSYCHICAL RESEARCH) کے نام سے موجود ہے اور اسی نوعیت کے دوسرے ادارے دوسرے ملکوں میں کام کر رہے ہیں۔ ان اداروں نے مختلف مظاہروں اور تجربات کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی شخصیت کسی پراسرار شکل میں باقی رہتی ہے۔

ایک سفری ایجنٹ مسوری (امریکہ) میں سینٹ جوزف ہوٹل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا اپنے آرڈر نوٹ کر رہا تھا کہ "یکایک" وہ لکھتا ہے "مجھے احساس ہوا کہ میرے دائیں جانب کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا تو صاف طور پر مجھے نظر آیا کہ وہ میری بہن ہے۔" اس کی یہ بہن نو سال پہلے مر چکی تھی۔ کچھ دیر بعد بہن کا یہ پیکر اس کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ مگر اس واقعہ سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اپنا سفر جاری رکھنے کے بجائے وہ دوسری ٹرین سے اپنے وطن سینٹ لوئی (ST. LOUIS) واپس ہو گیا۔ گھر آ کر اس نے واقعہ کی پوری تفصیل اپنے اعزہ کو بتائی۔ جب وہ کہتے کہتے اس جملہ پر پہنچا کہ — "میں نے بہن کے چہرے کے دائیں طرف سرخ رنگ کی ایک روشن خراش دیکھی۔" تو اس کی ماں یکایک کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور اس نے بتایا کہ "لڑکی کی موت کے بعد

ایک اتفاقی سبب سے مجھ سے یہ خراش اس کے چہرے پر پڑ گئی تھی۔ اس بدنمائی کا مجھے سخت احساس ہوا اور فوراً پاؤڈر لگا کر میں نے خراش کے تمام آثار اس کے چہرے سے مٹا دیئے اور پھر کبھی کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔"

HUMAN PERSONALITY AND ITS SURVIVAL OF BODILY DEATH, BY F.W.H. MYERS.
N.Y. 1903, VOL. II, 27-30

اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جو مرنے کے بعد شخصیتوں کی موجودگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح کے واقعات کو وہم و خیال نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ چہرے کی خراش کا علم یا تو ماں کو تھا یا مردہ لڑکی کو۔ تیسرا کوئی بھی شخص اس کو قطعاً نہیں جانتا تھا۔

دوسرے قسم کے واقعات جو زندگی بعد موت کا تجرباتی ثبوت فراہم کرتے ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جن کو خودکار (AUTOMATISTS) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مرد یا عورتیں ہیں جن سے ایسے افعال ظاہر ہوتے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کسی مرنے والے کی روح اس کے اندر رہتی ہے۔ ایسا شخص اپنے تجربہ کرنے والوں کے سامنے چند ایسے جزئی واقعات پیش کرتا ہے جن کو صرف ایک مرا ہوا آدمی جانتا ہے اور جو چند دن بعد صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح مثلاً دیکھا جاتا ہے کہ وہ کسی شخص سے بات کر رہا ہے اور اسی کے ساتھ ہاتھ میں پنسل لئے ہوئے بالکل دوسرے موضوع پر لکھ رہا ہے جس کے مضمون کی اسے خود بھی اس وقت تک اطلاع نہیں ہوتی جب تک وہ لکھنے کے بعد اسے پڑھ نہ لے۔ گویا اس کے اندر اس کے سوا کوئی اور شخصیت ہے جو اس کے ہاتھ سے لکھوا رہی ہے۔

A PHILOSOPHICAL SCRUTINY OF RELIGION, 407-10

اس استدلال کو قبول کرنے میں بہت سے جدید ذہنوں کو تامل ہے۔ سی، ڈی، براڈ (C. D. BROAD) لکھتا ہے:-

"سائیکیکل ریسرچ کے شعبہ ہستثنا کے علاوہ سائنس کی مختلف شاخوں میں سے کوئی شاخ زندگی بعد موت کا ادنیٰ امکان بھی ثابت نہیں کرتی۔"

RELIGION, PHILOSOPHY AND PSYCHICAL RESEARCH
(LONDON 1953) P.236

مگر یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ " سوچنا " ایک مشتبہ فعل ہے۔ کیونکہ انسان کے سوا کوئی ایسا وجود اس کائنات میں ہمارے تجربے میں نہیں آیا جو " سوچنے " کے مظہر کی تصدیق کرتا ہو۔ ظاہر ہے کہ زندگی کا باقی رہنا یا باقی نہ رہنا ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اس لئے نفسیات ہی سے اس کا ثبوت یا عدم ثبوت ملے گا۔ کسی اور سائنس میں اسکی تصدیق ڈھونڈنا ایسا ہی ہے جیسے سوچنے کے فطری مظہر کو سمجھنے کے لئے نباتات اور فلزیات سے تصدیق طلب کی جائے۔ یہی نہیں، بلکہ خود انسان کے جسمانی حصے کے مطالعہ کو بھی اسکی تصدیق یا تردید کے لئے بنیاد بنایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ جس چیز کی بقا کا دعویٰ کیا گیا ہے، وہ موجودہ مادی جسم نہیں، بلکہ وہ روح ہے جو جسم سے ماسوا جسم کے اندر موجود رہتی ہے۔

چنانچہ فلسفہ نفسیات کے بہت سے علماء جنھوں نے ان شواہد کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہے، وہ زندگی بعد موت کو بطور واقعہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ براؤن یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر رہے، ڈوکاس (C. J. DUCASSE) نے اپنی کتاب کے سترھویں باب میں زندگی بعد موت کے تصور کا فلسفیانہ اور نفسیاتی جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر موصوف اگرچہ مذہب کے معنوں میں اُخروی زندگی کے تصور پر عقیدہ نہیں رکھتے مگر ان کا خیال ہے کہ ایسے شواہد موجود ہیں کہ مذہب کے عقیدے سے الگ کر کے زندگی کے بقا کو ہمیں ماننا پڑتا ہے۔ اس باب کے آخری حصے میں وہ سائیکیکل ریسرچ کی تحقیقات کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں :-

" کچھ بہت ہی ذہین اور نہایت ذی علم افراد جنھوں نے سالہا سال تک نہایت تنقیدی نظر سے متعلقہ شہادتوں کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کم از کم کچھ شواہد ایسے ضرور ہیں جن میں صرف بقائے روح کا فرضیہ ——— (SURVIVAL HYPOTHESIS) ہی معقول اور ممکن نظر آتا ہے۔ ان کی دوسری کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ اس فرضیے کے انتہائی نمایاں افراد میں سے

چند کے نام یہ ہیں:۔

الفرڈ رسل ولیس (ALFRED RUSSEL WALLACE)
سر ولیم کروکس (SIR WILLIAM CROOKES)
ایف، ڈبلیو، ایچ، میرس (F. W. H. MYERS)
کیسر لومبراسو (CESARE LOMBROSO)
کیمل فلیمیرین (CAMILLE FLAMMARION)
سر اولیور لاج (SIR OLIVER LODGE)
ڈاکٹر رچرڈ ہاگسن (DR. RICHARD HODGSON)
مسز ہنری سڈوک (MRS. HENRY SIDGWICK)
پروفیسر ہسلوپ (PROFESSOR HYSLOP)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد زندگی کا عقیدہ جس کو بہت سے لوگ مذہبی طور پر مانتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ صحیح ہو سکتا ہے بلکہ شاید وہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس کو تجرباتی دلیل (EMPIRICAL PROOF) سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر ایسا ہو تو قطع نظر اس من گھڑت کے جو زندگی بعد موت کی نوعیت کے متعلق اہل مذاہب نے فرض کر لی ہے، قطعی معلومات بالآخر اسکے بارے میں حاصل ہو سکیں گی مگر ایسی صورت میں اسکی مذہبی نوعیت کو ماننا ضروری نہیں ہوگا۔"

A PHILOSOPHICAL SCRUTINY OF RELIGION, P. 412

یہاں تک پہنچنے کے بعد زندگی بعد موت کے متعلق مذہبی عقیدے کو نہ ماننا ایسا ہی ہے جیسے کسی دیہاتی آدمی کا اصرار ہو کہ ایسی کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ دو آدمی ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے آپس میں بات کر لیں۔ اس کے بعد اس کے ایک عزیز کو دور کے شہر سے ٹیلی فون کر کے ریسیور اس کے کان پر لگا دیا جائے۔ مگر جب وہ بات کر چکے تو کہے ـــــ "کیا ضروری ہے کہ وہ میرے عزیز کی آواز ہو، ہو سکتا ہے کوئی مشین بول رہی ہو۔"

دربارِ عالمگیری

(از مولانا مصطفےٰ حسن علوی۔ ایم اے پی ایچ ڈی)

(۲)

ملا جیون کی تصانیف

یوں تو عام طور پر مشہور معلومات یہی ہیں کہ ملا جیون نے نورالانوار اور تفسیر احمدی یہ دو کتابیں لکھی تھیں لیکن یہ واقعہ کے خلاف ہے، غالباً یہ شہرت اس بنیاد پر ہے کہ نورالانوار مطبوع ہو کے درس نظامیہ کے نصاب میں عام طور پر مدارس عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے اور عموماً تذکرہ نویس تفسیر احمدی کا بھی ذکر دیتے ہیں لیکن حقیقت الامر یہ ہے کہ آپ کی عمر ابھی ۱۲ سال سے قدرے متجاوز ہوئی تھی کہ آپنے اسرار و سلوک میں آداب احمدی لکھی عیدین اور جمعہ کے خطبات بکمال فصاحت و بلاغت ترتیب دیے۔ اپنے جد امجد شیخ عبید اللہ اور شیخ علیم اللہ کی کتابوں کو ایڈٹ کیا اور ایک رسالہ علم تجوید قرأت میں لکھا۔ بزرگوں کے حالات میں مناقب الاولیاء کے نام سے فارسی میں کتاب لکھی۔ غلبۂ سکر و محبت میں مولانا رومی کے طرز پر ایک مثنوی بھی فارسی میں لکھی جس میں چھ دفتر اور ۲۵ ہزار اشعار تھے۔ حافظ شیرازی کے رنگ میں [illegible] ہزار اشعار لکھے قصیدہ بردہ کی روش پر تقریباً ۲۲۰ اشعار کا ایک قصیدہ اس کے علاوہ ہے۔ اس پر مستزاد جدّہ پہونچتے ہی اس کی شرح بھی عربی میں لکھ ڈالی۔[1] اور غلبۂ شوق و اشتیاق عربی میں تقریباً ۲۹ قصائد مزید لکھے اور علماء حرمین شریفین نے ان کی داد دی۔ مدینہ کے دوران قیام میں ایک رسالہ سوانح پر مجازات لوائح جامی علم تصوف میں بھی ان کے قلم سے نکلا۔

---

[1] سوانح خود نوشت ملا جیون۔ قلمی

علم اصول الفقہ اور نورالانوار (ملاجیونؒ)

آج بالخصوص ہندوستان کے مدارس عربیہ کا کون منتہی اور فاضل ہے جو ملاجیونؒ کے اس شاہکار سے واقف نہیں۔ خاصکر جس نے فقہ حنفی پڑھی اور اس کی درسیات میں یہ موضوع داخل تھا درس نظامیہ کے عنوان سے جو نصاب شائع ذائع ہے اس کا پڑھنے والا کتاب الاصول الشاشی پڑھکے اصول فقہ سے فی الجملہ روشناس ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نورالانوار میں اسے اجنبیت کا شکوہ نہیں ہوتا نہ اسے غیریت محسوس ہوتی ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کے مختلف مطابع میں چھپی ہے اور اس کے حواشی صاحب قمرالاقمار مولانا عبدالحلیم کی توضیحات اور تشریحات سے مزین ہیں۔ یہ کتاب ایسی کچھ ہردلعزیز ہوئی کہ اس کا خلاصہ مولانا رستم علی قنوجی نے بنایا اور اس کا اردو میں مولانا عبدالجبار نے جلاء الابصار کے نام سے ترجمہ بھی کر دیا۔ نورالانوار دراصل امام ابوالبرکات عبداللہ ابن احمد حافظ الدین نسفی المتوفی سنہ ۷۱۰ھ کی کتاب منارالانوار کی شرح ہے ابوالبرکاتؒ رحمہ اللہ احناف کے ایک جلیل القدر عالم گزرے ہیں اور جن کی کتاب کے متعلق حاجی خلیفہ کشف الظنون میں یوں رقم طراز ہیں۔[1]

متن متین جامع مختصر نافع و هو فیما بین کتبه المبسوطة و مختصراته المضبوطة اکثرها تداولاً واقربها تناولاً. لکنه مع صغر حجمه و جازة نظمه بحر محیط بدرر الحقائق الخ.	عبارت ٹھوس اور قوی ہے مختصر ہے جامع ہے اور نفع بخش ابوالبرکاتؒ کی مختصر اور مطول تمام کتابوں میں یہ ہی زائد پڑھی جاتی ہے اور سہل الحصول بھی ہے۔ ہے تو چھوٹا سا رسالہ اور عبارت میں مصنف نے ایجاز سے کام لیا ہے لیکن حقائق کے موتیوں کا ایک بڑا سمندر ہے۔

اس منارالانوار کی ایک شرح خود مصنف نے لکھی اور دوسری ہندوستان کے ایک

[1] کشف الظنون حاجی خلیفہ جلد دوم ص ۱۸۲۵۔

سعدالدین ابوالفضائل دہلوی المتوفی سنہ ۸۹۱ھ نے افاضۃ الانوار فی اضاءۃ اصول المنار کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے علاوہ سید یوسف جمال ملتانی نے کتاب توجیہ الکلام میں بھی اسی کی شرح کی تھی۔ ملا عبدالسلام دیوی مضافات بارہ بنکی اودھ نے بھی ایک شرح لکھی۔ کتاب نورالانوار کیا ترتیب مضامین کیا قوت استدلال کیا استنباط مسائل کتاب سنت اجماع قیاس وغیرہ کے مباحث ضروریہ سے مالامال ہے۔ طرز بیان دلکش اور اس کے افہام کے طریقے آسان اور سہل تر ہیں۔ عبارت میں ثقل نہیں کہ پڑھنے والے کو بوجھل ہو جائے سطروں میں غموض نہیں کہ الجھن پیدا کرے ادبیت کا وہ رنگ نہیں کہ طالب علم اسی میں کھو جائے اور کتب لغات اور قاموس کی طرف مراجعت کی اسے ضرورت لاحق ہو۔ ایک متوسط استعداد والا دقیق مباحث اور نکات کو سمجھے نہ سمجھے تاہم ترجمہ سمجھ لے گا۔

ملا صاحب نے یہ کتاب مدرسہ نبوی میں بیٹھ بیٹھ کے لکھی تھی اور تائید ایزدی اور مدد غیبی آپ کے شامل حال تھی کہ اس کی تالیف میں صرف دو ماہ ربیع الاول اور ربیع الثانی سنہ ۱۱۱۲ھ صرف ہوئے اور جب عرب اور عجم کے حلقۂ علماء میں پہونچی تو مقبول اور نہایت مقبول ہوئی۔

جہاں تک معلومات کا تعلق اور تحقیق کی رسائی ہے ارباب علم و تحقیق امام شافعیؒ کو اصول فقہ کا موجد اور بادا آدم سمجھتے ہیں اور بقول امام رازی رحمہ اللہ امام شافعی نے ہی سب سے پہلی اینٹ اس عمارت کی رکھی تھی چنانچہ فرماتے ہیں۔

اعلم ان نسبۃ الشافعی الی	علم اصول فقہ کا امام شافعیؒ کے ساتھ
علم الاصول کنسبۃ ارسطا	وہی تعلق ہے جو علم منطق کا ارسطا
طالیس الی علم النطق وکنسبۃ	طالیس اور علم عروض کا خلیل بن احمد
الخلیل بن احمد الی علم العروض	کے ساتھ۔

یہ واقعہ ہے کہ علم منطق کو ارسطا طالیس کی تنظیمی شکل میں لانے سے پہلے لوگ اپنی اپنی سلامتی طبع کو ہی دلائل اور براہین کے لیے کام میں لاتے لیکن شایان شان ترتیب نہ ہوتی اور نتائج نکالنے اور اخذ کرنے میں اضطراب بے ڈھنگا پن ظاہر رہتا اور جب ارسطا طالیس نے

حدود اور مصطلحات قائم کردیں اور غور وفکر کے بعد قوانین وضع کردیے تو ان کا تتبع آسان ہوگیا۔ ایسے ہی جیسے کہ شعرار عرب وجاہلیت اشعار لکھتے اور وہ موزوں ہوتے۔ لیکن لاقانونیت کے تحت۔ اور جب خلیل نے تتبع اور استقرا سے علم عروض کے نام سے اوزان شعری کے قوانین وضع کردیے تو شعرار کی طبائع نے فی الجملہ گویا اسی کی تقلید شروع کردی۔ اور بالکل اسی طرح فقہار اسلام استدلال لانے اور مخالف کے سامنے معارضہ کرنے میں اپنی طبائع سلیمہ کو کام میں لاتے جو افہام اور تفہیم کے لیے معاون اور مددگار ہوتیں۔ لیکن اللہ جزائے خیر دے امام شافعیؒ کو کہ انھوں نے غور وفکر تتبع استقرا سے ان امور کو ایک قانونی اور آئینی شکل دے کے مدون کردیا اور ان قوانین کو شرعی دلائل سمجھنے اور سمجھانے میں معاون اور مساعد بنادیا۔ عام وخاص ناسخ منسوخ اجماع رائے اجتہاد قیاس کی اصطلاحیں قائم کرکے ان کی جامع اور مانع تعریفیں مدون کردیں۔ اور ان کے دائرے متعین کردیے بہرکیف بقول علمار اسلام اصول فقہ سے امام شافعی کو وہی نسبت ہے جو علم عروض کو خلیل اور علم منطق کو ارسطاطالیس سے۔ کہتے ہیں کہ امام شافعی نے اس فن پر ایک رسالہ بغداد کے قیام کے دوران لکھا تھا جو گو مختصر تھا مگر اس میں قواعد وقوانین ضروریہ سب ہی آگئے تھے۔ ان سے ہی متاخرین علمار نے اس میں اضافات کیے۔ جو بھی کیے لیکن ابن ندیم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن حسن شیبانی نے بھی ایک رسالہ اسی فن پر لکھا تھا۔ لیکن امام شافعی کا رسالہ اب بھی موجود ہے اور امام محمد کے رسالہ کا کہیں بھی کتب خانوں میں سراغ نہیں ملتا واللہ اعلم۔ کاش یہ رسالہ مل جاتا تو اس کو سامنے رکھ کے علمار اور اہل تنقید وتحقیق کو اس کے مواقع حاصل ہوتے کہ معلوم کرلیں کہ امام شافعی نے اس پر کیا کیا اضافات کیے ان سے کیا کیا استفادے اور کہاں تک ان کی خود طبیعت نے معقول اختراعات کیے اس لیے کہ ان اختراعات کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ مخترعہ قواعد کے تحت ہی قرآن حدیث اجماع اور قیاس سے مسائل شرعیہ کا استنباط آسان تھا اور انھیں اصول کے تحت فروع کی تفریع اور استخراج سہل۔ امام شافعی نے ان اصول اور قواعد کو اپنے رسالہ ہی میں لکھ کے انھیں پر اکتفا نہیں کی بلکہ

اپنی کتاب "کتاب الام" میں بھی موقع موقع سے کچھ مزید تفصیلیں لکھیں اور نئے قواعد تحریر فرمائے[۵]

امام شافعیؒ کی اس فن میں اسبقیت کے متعلق سطور بالا میں روشنی ڈالی جا چکی لیکن امام ابو الہلال عسکری نے لکھا ہے[۶] کہ اس فن کا بانی اور موجد واصل ابن عطا ہے۔

وھو اول من قال الحق یعرف	واصل ہی پہلا شخص ہے جس نے یہ
من وجوہ اربعۃ کتاب ناطق	بتایا کہ شرعی احکام کے استنباط کے
وخبر مجتمع علیہ وحجۃ عقل	چار ذرائع ہیں۔ کلام اللہ، حدیث صحیح
واجماع من الامۃ۔	اجتہاد اور اجماع امت۔

لیکن ان بیانات میں تطبیق اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ مشہور فقہاء اسلام میں اس فن کو منصۂ تحریر میں لانے کا سہرا اور ایک خاص تنظیم کا امتیاز امام شافعیؒ کو ہی حاصل ہوا، گو اس سے پہلے بھی اس کی بنیاد فی الجملہ قائم ہو چکی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مدتوں امام شافعی نے ابو الہذیل العلاف معتزلی کی شاگردی اختیار کی تھی، طریقہ استنباط و استدلال کے انداز انھیں سے سیکھے تھے اور یہ ابو الھذیل عثمان بن خالد الطویل کے شاگرد تھے اور خالد الطویل واصل بن عطاؒ کے بہر کیف شہرت اسی کو ہے کہ امام شافعی اس کے موجد اور مخترع تھے اور وہ بھی اس شکل موجودہ کے ساتھ اور ان کے بعد علماء انھیں کے نقش قدم پر چلے اور شاید ابو الھذیل وغیرہ کے طرز انشاء کی جھلک اس میں کہیں کہیں پائی بھی جاتی ہو، اس لیے کہ اصول فقہ میں علم کلام کے کچھ انداز بیان[۷] ملتے جلتے ہیں۔

علماء اصول فقہ نے اپنی کتابوں میں دو مسلک اختیار کیے تھے۔ ایک متکلمانہ اور دوسرا فقیہانہ۔ متکلمانہ مسلک میں زیادہ تر توجہ قواعد، قوت استدلال اور دفع اعتراضات وغیرہ پر

---

[۵] الرازی صفحہ ۱۵۵ اور ۱۵۷ و کتاب الشافعی و منہج اصول الفقہ مصنفہ استاد مصطفیٰ عبد الرزاق [۶] کتاب الاوائل (مخطوطہ ندوۃ العلماء) [۷] المنیۃ والامل فی شرح کتاب الملل والنحل امام مہدی لدین اللہ مرتضیٰ الیمانی مطبوعہ دکن۔ [۸] کشف الظنون جلد اول صفحہ ۱۱۳۔

کی جاتی ہے اور فقیہانہ مسلک میں قواعد کے ساتھ امثلہ اور نظائر بھی پیش کر دی جاتی ہیں۔ نیز فقہی نکات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی مسائل کی تفریع کر دیتے ہیں۔ انھیں متکلمانہ انداز میں لکھنے والوں کی دو جماعتیں اور دو علیحدہ علیحدہ گروپ ہوئے ہیں۔ ایک تو معتزلہ اور دوسرے اشاعرہ۔ اور چونکہ بقول شخصیکہ اس فن کی عمارت خشت اول معتزلہ ہی نے رکھی یا داغ بیل انھیں نے ہی ڈالی اس لیے معتزلیوں میں اس کا لٹریچر بھی بہت زائد اور خاصی تعداد میں کتابیں بھی لکھی ہوئی ملتی ہیں چنانچہ حاجی خلیفہ بھی اس حقیقت کو ظاہر کرنے پر مجبور ہو گیا وہ لکھتا ہے

واکثر التصانیف فی اصول الفقہ لاھل الاعتزال[۵] — اصول فقہ پر زیادہ تر کتابیں معتزلیوں نے لکھیں۔

انھیں معتزلیوں کی کتابوں میں دو کتابوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی ایک تو کتاب العہد ہے جو قاضی عبد الجبار معتزلی نے اور دوسری کتاب العہد کی شرح ہے جو ابو الحسن بصری نے لکھی تھی۔ اسی طرح اشاعرہ کی دو کتابیں خاص الخاص اہمیت سے متصف ہیں۔ ایک کا نام کتاب البرہان جو امام الحرمین کی تصنیف ہے اور دوسری امام غزالی کی المستصفیٰ۔ امام رازی نے انھیں چار کتابوں کا ایک خلاصہ بنایا تھا جو کتاب المحصول کے نام سے مشہور ہے پھر ان چار کتابوں یعنی کتاب العہد شرح کتاب العہد کتاب البرہان اور مستصفیٰ الاصول کا بھی سیف الدین آمدی کتاب الاحکام کے نام ملخص تیار کیا تھا اسی کتاب المحصول اور آمدی کی کتاب الاحکام کو سامنے رکھ کے امام بیضاوی نے منہاج الاصول ایک کتاب تیار کی۔

علماء احناف میں سے امام ابو زید دبوسی نے تقویم الادلہ اور اس کے کچھ زمانہ بعد امام فخر الاسلام بزدوی نے کشف الاسرار یہ دو کتابیں اصول فقہ میں لکھیں۔

(باقی)

---

۵ کشف الظنون جلد اول ص۱۱۱

مجاہد کبیر مولانا محمد یوسفؒ

از مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف (مدیر المنبر لائل پور)

آج سے شاید ۳/۴ سال قبل کا ذکر ہے۔ محترمی مختار احمد صاحب انجینیر ٹیلی فون، لائلپور میں تھے، ایک رات ان کا فون آیا کہ صبح لاہور کا پروگرام ہے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی تقریر نماز فجر کے بعد ہوگی۔ ہم تین بجے (سحری کے وقت) یہاں سے روانہ ہوں گے اگر آپ ہمارے ساتھ چلیں تو آپ کو گھر سے لیتے جائیں، ہم حسب پروگرام لائلپور سے چلے فجر کی نماز غالباً "چیچکی" میں ادا کی، بلال پارک پہونچے تو مولانا کا خطاب ہو رہا تھا حسب معمول مولانا پورے جوش سے خطاب فرما رہے تھے، دنیا کی حقیقت کو بے نقاب کرنے اور آخرت کی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے بے پناہ دلائل دیے چلے جا رہے تھے اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک لاوا ہے جو پورے جوش و خروش کے ساتھ پھوٹ رہا ہے۔ اور ماحول کو گرمائے بلکہ پگھلائے جا رہا ہے۔ ۸ ½ بجے خطاب ختم ہوا۔ محب مکرم مولانا مفتی زین العابدین صاحب کی عنایت خاص سے ناشتہ کرنے کے بہانے حضرت مرحوم و مغفور کی معیت کا شرف حاصل ہوا اور قریب سے یہ دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا کہ شرق و غرب میں پھیلنے والی اس دعوت کا داعی کس انداز سے سوچتا ہے۔ اسے اپنی دعوت سے کس قدر لگاؤ ہے اور اس کی اپنی ذات پر یہ اجتماعی جد و جہد کس قدر غالب ہے۔

اللہ اللہ! انہماک محیر العقول تھا، اور اللہ کے اس بندے کا دل صحیح معنوں میں اس بات کے لیے تڑپ رہا تھا کہ جو شخص بھی انھیں مل جائے وہ اس کے دل و دماغ

کو دستک دیں، موثر سے موثر انداز میں اپنی دعوت اس کے سامنے رکھیں اور مدلل ترین طریق سے اسے یہ سمجھائیں کہ اسلام کا وہی مفہوم و معنی اور وہی ماحول عند اللہ مقبول اور دنیا و آخرت میں فلاح و کامرانی کا ذریعہ ہے جو سید الکونین بابا تنا ہو د امہاتنا صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت میں لوگوں نے سنا اور دیکھا تھا۔

مولانا محمد یوسف نور اللہ مرقدہ نے، ناشتہ کے دسترخوان پر بیٹھتے ہی گفتگو شروع فرمادی اور اس انداز سے فرمانے لگے کہ کوئی شخص ان کی گفتگو کے زور، استدلال کی ندرت اور مطالب کی آمد کا مشاہدہ کر کے یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہیں جو ابھی تین گھنٹے کے زوردار خطاب سے فارغ ہوئے ہیں ——— یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ایک تازہ دم خطیب ہیں، ایک ایسے داعی مصروف گفتگو ہوئے ہیں تاریخ کے صفحات جن کے سامنے کھلے پڑے ہیں اور وہ ایک ایک واقعہ سے عہد رسالتؐ کی تصویر کشی اس انداز سے کر رہے ہیں کہ سننے والے کا دماغ ہی نہیں دل بھی یقین کر رہا ہے کہ آپ درست فرما رہے ہیں۔

اس یادگار صحبت میں مولانا علیہ الرحمۃ اس عنوان پر گفتگو فرما رہے تھے کہ بعض لوگ اپنے موجودہ ماحول میں رہتے ہوئے یہ دریافت کرتے ہیں کہ اسلام فلاں مشکل کو کیسے حل کرتا ہے اور فلاں پیچیدگی کو کس طرح دور کرتا ہے۔ مثلاً یہ پوچھا جاتا ہے کہ عہد حاضر کی معاشی مشکلات کو اسلام کس طرح حل کرتا ہے؟

مولانا نے فرمایا:

"جب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو جن چند افراد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ایمان کو قبول کیا حضورؐ نے ان کے معاشی مسئلے کے بارے میں جو رویہ اختیار فرمایا تھا وہ یہ تھا کہ آپؐ نے سب سے پہلی بات تو یہ فرمائی کہ تم جتنے اوقات معاش کے لیے وقف کیے ہوئے ہو، ان کا بیشتر حصہ اسلام کے لیے فارغ کر دو۔ دوسرا ارشاد یہ ہوا کہ فلاں ذریعہ کو ترک کر دو، یہ ناجائز ہے فلاں معیشت سے دستکش ہو جاؤ، یہ تمہارے رب کو ناپسند ہے ——— معیشت کے ان دو حکموں کے بعد تیسرا ارشاد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیا کہ جو کچھ تم کماتے

ہو، یہ صرف تمہارا حق ہی نہیں ہے اس میں تمہارے ان بھائیوں کا بھی حق ہے جو وسائل معیشت سے تہی دامن ہیں اور چوتھی بات آپؐ نے یہ ارشاد فرمائی کہ جو کچھ تم کماؤ، اس میں سے بہت سا دین کی خدمت، خدا کے لیے کلمۃ الحق کی سربلندی اور بنی نوع انسان تک اپنی دعوت کو پہونچانے اور راہِ خدا میں جہاد کرنے میں صرف کرو۔ ——— گویا حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا یہ کہ صحابہؓ اسلام قبول کرنے سے پہلے جو کچھ کماتے تھے اس کا دائرہ محدود کیا، جتنے اوقات کمانے پر صرف کرتے تھے ان کی مقدار کم کر کے ان اوقات کو دین کے لیے وقف فرمانے کا حکم دیا، جو کچھ کماتے تھے اس میں دوسروں کا حصہ مقرر فرما دیا اور اس کے بعد بھی جو بچا اس کے بارے میں بھی یہ حکم دیا کہ اس کا ایک حصہ اسلام پر خرچ کرو ——— یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اس زندگی کے مسائل و مشکلات حل کرنے کا۔"

راقم مولانا ممدوح کی یہ گفتگو سن رہا تھا اور محو حیرت تھا کہ یہ معاشی فلسفہ ہے کس کتاب میں؟ اور پھر خود ہی اپنے آپ کو جواب دیا کہ بلاشبہ قرآن، سنت اور تاریخ عہد نبوت تو اس فلسفہ معیشت کو پیش کرتے ہیں، البتہ ولٰکن اکثر الناس لا یعلمون۔

اس کے ساتھ جس بات کا گہرا اثر راقم الحروف نے اس مجلس میں لیا وہ یہ تھی کہ مولانا محمد یوسف نورہ اللہ برحمتہ تین گھنٹے کے خطاب کے بعد اس کمرے میں (آہ! یہ وہ کمرہ تھا، جہاں آپ نے اس حیات ناپائیدار کے آخری لمحات گزارے) تشریف تو لائے تھے ناشتے کے لیے مگر آپ اپنی دعوت کے ایک پہلو کی وضاحت میں اس قدر مستغرق تھے کہ نہ صرف یہ کہ انھیں ناشتے کی جانب کوئی توجہ نہیں تھی بلکہ ہوا یہ کہ ایک رفیق نے چائے کی پیالی پیش کی تو آپ نے پکڑ لی۔ دس پندرہ منٹ تک وہ یونہی پیالی ہاتھ میں پکڑے رہے اور پھر ایک شریک مجلس کے توجہ دلانے پر آپ نے وہ چائے جو اب پانی کی طرح ٹھنڈی ہو چکی تھی، حلق میں انڈیل لی۔ دوسری پیالی یہ کہہ کر پیش کی گئی کہ حضرت یہ گرم ہے، پی لیجیے اور یہ بسکٹ بھی تناول فرمائیے تو اللہ کے اس بندے نے اس پیالی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا، گفتگو میں مستغرق رہے اور ۱۰۔۱۵ منٹ بعد اسے

بھی پانی کی طرح پی لیا۔

اس کے بعد اٹھے اور ایک دوسرے اجتماع میں تقریر کے لیے تشریف لے گئے اور یہ پہلے سے معلوم تھا کہ دوپہر سے قبل ایک تیسرا خطاب بھی آپ کو فرمانا ہے۔

یہ مجاہدہ ــــــ ٹھیک عملی شہادت تھی۔ اس تصور مجاہدہ کی جو حضرت مرحوم و مغفور اپنی تقریروں میں پیش فرمایا کرتے تھے ــــــ گویا قول و عمل دونوں میں وہ صادق بھی تھے اور یکساں بھی (رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً)۔

مولانا علیہ الرحمۃ سے ملاقات اور بالمشافہ آپ کے خطابات سننے سے پہلے راقم اس سوء فہمی کا شکار تھا کہ تبلیغی جماعت کے اکابرین کا فکر صرف ان ہی چھ باتوں یا چھ اصولوں تک ہی محدود ہے جو حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ نے پیش فرمائے تھے ــــــ ــــــ اسی طرح یہ پریشانی بھی اس کو لاحق تھی کہ تبلیغی جماعت تو اپنے کام اور افراد کی تعداد کے اعتبار سے بڑھ رہی ہے لیکن اس کے ذمہ دار حضرات اس جماعت کی ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کا کوئی مداوا نہیں کر رہے ــــــ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خیال تھا کہ وہ ان کمزوریوں کو محسوس ہی نہیں کر رہے ــــــ جو اس قسم کی بڑھنے اور پھیلنے والی جماعتوں میں ہمیشہ پیدا ہوا کرتی ہیں اور جماعتیں ان ہی اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے ہی ختم ہو جایا کرتی ہیں ــــــ اس پریشانی کو بیک وقت دو چیزوں نے بڑی حد تک کم کیا۔ ایک تو محب مکرم مولانا مفتی زین العابدین صاحب کی شخصیت اور اس عنوان پر ان کے احساسات نے اور دوسرا سہارا اس پریشانی کو مغلوب کرنے کے لیے میسر آیا۔ مولانا محمد یوسف (رحمہ اللہ تعالیٰ) کی چند مختصر صحبتوں اور چند مفصل خطابات کے سننے سے ــــــ مولانا علیہ الرحمۃ ان تمام نفسیاتی امراض سے کماحقہٗ آگاہ تھے جو تبلیغی جماعت کی طرح پھیلنے والی جماعتوں اور داعی و مبلغ کی حیثیت سے دوسروں کو نصیحت اور تبلیغ کرنے والے افراد میں پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ میں نے دیکھا کہ مولانا رائے ونڈ کے اجتماعات میں خصوصیت سے، دنیا کی محبت، شہرت کی ہوس، دین کے نام پر کام کرنے والوں کی طمع و حرص اور آپس میں مسابقت، منافست اور بالآخر مشاجرت و نفاق اور اسی طرح نمازوں کا اہتمام

کرنے والوں میں، غرور نفس، بے جا زعم، اپنے کام پر فخر اور اسی قسم کے دوسرے عنوانات بڑی وضاحت سے بیان فرماتے، بڑے موثر اور مدلل انداز میں فرماتے اور حق یہ ہے کہ ایک ایسے قائد کی حیثیت سے فرماتے جو ایک جانب تو کام کی توسیع کے لیے اپنی توانائیوں کو داؤں پر لگانے کا فیصلہ کر چکا ہو اور دوسری طرف وہ اس غم سے پگھلا جا رہا ہو کہ جو قافلہ وہ تیار کر رہا ہے کہیں وہ ان بیماریوں کا شکار نہ ہو جائے جو اس سے پہلے اس قسم کے قافلوں کو ناکام و نامراد بنانے کا باعث بن چکی ہے۔

اللہ کی راہ میں بے پناہ محنت، اپنی دنیا سے یکسر غافل ہو کر، ہر وقت دین کا فکر اور امت کی بہی خواہی کا کرب رکھنے والا یہ انسان، اس دنیا میں بلاشبہ اللہ کی ایک حجت تھا اور اللہ وہاب حقیقی نے اپنے اس بندے کو بیک وقت، قول، عمل، تبلیغی نور، ایمان و یقین اور جہاد و اجتہاد ہر قسم کی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ وہ سفر و حضر میں یکساں رہتا تھا، نوافل، ذکر، دعا، خطاب، گفتگو، غرض ہر کام میں وہ دوسروں پر فائق رہتا تھا اور بیسیوں اہل علم و اصحاب رشد گواہ ہیں کہ جس غیرت و جوش ایمانی سے ہزاروں انسانوں کو اپنے رب کی جانب، دین کی عظمت رفتہ کو واپس لانے اور امت کی اصلاح و بہبود کے لیے جد و جہد کرنے کی دعوت دیتا تھا، وہ جب خلوت میں اپنے رب سے مناجات کرتا اور جب اسے اپنے رب کے گھر میں حاضری کا موقع ملتا، تو وہ غلاف کعبہ کو ہاتھ میں تھامے، بچوں کی طرح بلبلاتا، روتا "یا رب البیت یا رب البیت" کہہ کر دھاڑیں مار مار کر روتا اور کفر کے باہمی ٹکراؤ، اسلام کی سربلندی اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ہدایت و رفعت کی دعائیں اس انداز سے کرتا کہ سننے دیکھنے والوں کو اس کی آہ و زاری پر ترس آنے لگتا۔

آہ! ہم اس عظیم المرتبت، داعی اور رفیع المنزلت مجاہد سے اس کی معرفت بھری تقریروں سے اور اس آہ سحر گاہی اور بیت اللہ کے دروازے پر رو رو کر اس کے دعا کرنے کی برکت و رحمت سے محروم ہو گئے۔ یقیناً آج مولانا محمد یوسف علیہ الرحمۃ کی والدہ ماجدہ مستحق ہیں کہ ملت کے کروڑوں افراد ان سے اظہار ہمدردی کریں کہ اس

پیرانہ سالی میں انھیں یہ عظیم صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ آج حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نفعنا اللہ بطول حیاتہ۔ لائق تعزیت ہیں کہ ان کا قابل فخر داماد اس دنیا سے رخصت ہو گیا اور آپ کو ضعیفی کے عالم میں ان کی جدائیگی کا زخم سہنا پڑا۔ آج مولانا محمد ہارون بلاشبہ مستحق ہیں کہ ان کے بلند مرتبہ باپ کی رحلت پر ان سے تعزیت کی جائے لیکن حق یہ بھی ہے کہ آج ہر وہ شخص ان تینوں شخصیتوں کی طرح تعزیت کا مستحق ہے جس نے مرحوم کو پہچانا، ان سے محض اللہ کے لیے لگاؤ پیدا ہوا اور اس دور زوال میں اس نے مرحوم و مغفور مولانا محمد یوسف کو اسلام کی خدمت کے لیے قابل اعتماد پایا۔

مولانا کی رحلت اگر صدمہ ہے تو سب مسلمانوں کے لیے اگر نقصان ہے تو پوری امت کا۔ اللّٰھم لاتحرمنا اجرہ ولاتفتنا بعدہ۔ (شکریہ المنبر لائلپور)

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۶)

کیا جائے۔ (مغربی بنگال)

۴۔ انگریزی اور ہندی دونوں کو سرکاری زبان بنایا جائے (وزیر اعلیٰ مدراس)

۵۔ ہندوستان کی کوئی بھی زبان ہو مگر انگریزی کو ختم کیا جائے (ڈاکٹر رام منوہر لوہیا)

۶۔ مشترکہ زبان کا درجہ صرف انگریزی کو دیا جائے اور دستور کے سترھویں حصہ کو ختم کیا جائے (راجہ جی)

۷۔ ہندوستان کی مشترکہ زبان سنسکرت تسلیم کی جائے اور جب تک سنسکرت انگریزی کی جگہ لینے کے قابل ہو انگریزی کو سرکاری زبان رکھا جائے اور اس غرض کے لیے دستور میں تبدیلی کی جائے۔ (اکھل بھارتیہ سنسکرت بھاشا سمیلن کلکتہ)

مرکزی حکومت نے تامل ناڈ کے مظاہرین کو یقین دلایا ہے کہ پنڈت نہرو کی اس یقین دہانی کو لسانی ایکٹ میں ترمیم کر کے قانونی شکل دے دی جائے گی جب تک غیر ہندی علاقوں کے لوگ چاہیں گے اس وقت تک سرکاری زبان کی حیثیت سے ہندی کے ساتھ انگریزی باقی رہے گی۔ لسانی ایکٹ میں ترمیم کا مسودہ ابھی تک عام نہیں کیا گیا ہے اس لیے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اسی لیے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مجوزہ ترمیم کا مسئلہ کا حل ثابت ہو سکے گی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ کوئی مستقل حل نہیں ہے بلکہ عارضی ہے۔ (باقی)

"اللہ والوں کا اجتماع"

آنکھوں دیکھا حال

از جناب ——— محمد اسلم صاحب

[مندرجہ بالا عنوان کے ساتھ ذیل کا یہ مضمون جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی وفات سے صرف ایک ہفتہ پیشتر کے ایک ایسے تبلیغی اجتماع کے مشاہدات و تاثرات پر مشتمل ہے جس میں حضرت مرحوم نے خطابات فرمائے۔ معاصر شہاب لاہور کے شکریہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہے ——— ادارہ]

کافی دنوں سے شہر کی اکثر مساجد میں یہ دیکھنے میں آ رہا کہ عصر یا مغرب کی نماز کے بعد ایک صاحب کھڑے ہوتے اور بڑی نرمی سے یوں گویا ہوتے۔

"بھائیو! دعا کے بعد تشریف رکھئے دین کی بات ہوگی"

کہنے والے کی اتنی سی بات میں جو سادگی اور خلوص ہوتا، وہ سب کو مجبور کر دیتا کہ رُک جائیں۔ اس کے بعد امام صاحب دعا کرتے اور پھر انہی کہنے والوں میں سے کوئی ایک اللہ کا بندہ کھڑا ہو جاتا اور بغیر کسی تصنع کے ۱۰، ۱۵ منٹ نہایت سادہ الفاظ میں کچھ بیان کرتا جس کا خلاصہ یہ ہوتا کہ اس دنیا کی زندگی چند روزہ ہے، اس طرح کے کام کریں کہ حشر کے میدان میں رسوائی سے بچ جائیں۔ بات واقعی دل کو لگتی اور جی چاہتا کہ یہ اسی طرح بولتا رہے تاکہ سنتے سنتے شاید اس دنیا کی بے ثباتی کا یقین آ جائے۔ آخر میں یہ کہا جاتا کہ اس مہینے کی ۲۱، ۲۲، ۲۳ کو لاہور کے قریب رائیونڈ میں ایک اجتماع ہو رہا ہے جس میں حضرت

کی زندگی کے بارے میں باتیں ہوں گی۔ آخر ۲۰ تاریخ بھی آن پہونچی، شوق ابھرا کہ چلو دیکھیں کم خرچ کی زندگی کے کیا نقشے بنائے جاتے ہیں۔ کچھ دوستوں کو آمادہ کیا، شام کو چلتے وقت کچھ بزرگوں سے تذکرہ کیا انھوں نے بروقت ہی اطلاع دینے کا گلہ کیا۔ ندامت ہوئی کہ اس دنیا کے جھمیلوں میں لگے رہے اور پہلے سے کیوں نہ حاضر ہو سکے۔

رات ۱۰ بجے اسٹیشن پہونچے، ٹکٹ خریدنے لگے دیکھا کہ ہزاروں لوگ کھڑے ٹکٹ لے رہے ہیں۔ اپنی باری آئی ۱۲ آنے نکال کر "بابو" کو دیئے۔ ٹکٹ دیکھا ۹ پیسے کا تھا جبکہ دو پیسے واپس ملنے چاہئیں تھے۔ شاید ان دو پیسوں کی کوئی حیثیت نہ جانتے ہوئے واپس کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ اور گرد کے لوگوں سے پوچھا سبھی سے ۱۲ آنے (۷۵ پیسے) لیے جا رہے تھے۔ اندازہ لگایئے صرف ان دو تین دنوں میں کیا کچھ جمع ہوا ہوگا۔ اور آخر کیوں نہ ہو ریلوے کے محکمے کو ۹، پیسے دینے کے بعد ان "خدمت" کرتے والوں کو بھی تو دو پیسے بچ جانے چاہئیں۔

کراچی ایکسپریس ۱۰ بج کر ۲۵ منٹ پر چلی، کوئی ڈبہ ایسا نہ تھا جو اندر اور باہر بھرا نہ ہو۔ بڑے اطمینان سے سفر گزرا، کوئی تو تکار نہ ہوئی، کوئی دھکم پیل نہ ہوئی۔ دوسرے کے لیے جگہ خالی کرنے کا جذبہ موجود تھا۔ سوا گیارہ بجے رائے ونڈ اسٹیشن پر اتر گئے کوئی تین فرلانگ پر اجتماع گاہ تھی، سادہ سی مسجد، باہر صحن میں شامیانے تنے ہوئے اور تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ ایک طرف بیسیوں لمبی لمبی کاریں کھڑی تھیں، دوسری طرف تین چار بسیں معلوم ہوا کہ ہیلی کالج اور چیف کالج کے طالب علم اکٹھے ہو کر بسوں میں آئے ہیں۔ مسجد کے فرش پر جو جس کے پاس تھا بچھا لیا گیا اور چند گھنٹے آرام کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

---

۲۱ کی صبح نماز فجر کے بعد دہلی سے تشریف لائے ہوئے مولانا محمد یوسف صاحب کا (جو اس جماعت کے امیر ہیں اور مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے بھی) خطاب ہوا تین گھنٹے تک لوگ ہمہ تن بیٹھے سنتے رہے، باتوں میں وزن تھا حقیقت تھی، خلوص تھا۔ آخر اللہ اور اس کے رسول کی باتوں میں یہ سب کچھ کیوں نہ ہوتا۔ مولانا نے فرمایا۔

"بھائیو! انسان اس دُنیا میں دو چیزوں پر محنت کرتا ہے۔ ایک اس دُنیا کی چیزوں پر دوسرے اپنی ذات پر، اس دُنیا کی چیزوں پر ـــــ مثلاً مکان، دوکان، زمین، تجارت، کارخانے، ملازمت، غرضیکہ جس چیز پر بھی محنت کی جائے گی پورا دھیان اس طرف ہوگا۔ دل انہی چیزوں میں اٹکا رہے گا نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنی ذات کی تکمیل رہ جائے گی۔ مرنے پر ان چیزوں پر کی گئی محنت ساری کی ساری دھری رہ جائے گی اور انسان اس دنیا سے بالکل خالی جائے گا اور جب حشر کے میدان میں اپنی ذات پر محنت کرنے والوں کو دیکھے گا تو اپنے آپ پر پڑے گا، اتنا روئے گا کہ آنسوؤں کے دریا بہہ نکلیں گے۔"

پھر فرمایا:۔

"اپنی ذات پر محنت کرتے (یعنی اپنی زبان پر محنت، اپنے کانوں پر محنت، اپنی آنکھوں پر محنت، اپنے دل پر محنت، غرض ہر حصۂ جسم پر محنت کرنے سے) اس درجہ تک پہونچ جائے گا کہ صرف ایک آنکھ کے جھپکنے سے اس پوری کائنات سے کروڑوں درجے زیادہ قیمتی جنت عطا کی جائے گی۔ آپ جا رہے ہیں سامنے سے غیر محرم عورت پر نگاہ پڑی، دل نے کہا بس اب اگر آنکھ اٹھائی تو برباد ہو جاؤ گے۔ آنکھ دوسری طرف پھر گئی۔ اس ایک بار کے پھرنے سے اللہ رب العزت وہ کچھ عطا فرمائیں گے، تصور ناممکن، ان عطا کی جانے والی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی اگر اس دُنیا میں آجائے تو پوری دُنیا حاصل کرنے کے لیے لڑ پڑے۔"

باتیں دل میں اُترتی چلی گئیں، اپنے آپ ندامت ہوئی کہ زندگی یوں ہی گزر گئی جس طرح اب تک گزری تو کیا ہوگا؟ آٹھ سے دس ہزار کا مجمع، جس طرف نظر اٹھی انسان ہی نظر آئے وہ انسان جو محض اللہ کی خاطر اتنی دور دراز سے سفر کر کے صعوبتیں جھیل کر اس ویرانے میں اکٹھے ہو گئے تھے۔

مولانا نے فرمایا:۔

"محض اللہ کی خاطر یوں جمع ہونے والوں پر اللہ کے فرشتے آسمان سے زمین تک حلقہ بناتے اور سلامتی بھیجتے ہیں، اللہ کرے آج دنیا میں صرف اللہ ہی کی خاطر لوگ جمع ہوا کریں تاکہ اللہ کی رحمتیں اس زمین پر اتریں اور انسان سکون قلب سے ہمکنار ہوں۔"

اس مجمع میں امیر بھی تھے، غریب بھی، چھوٹے بھی تھے، بڑے بھی، بچے بھی تھے بوڑھے بھی، پنجابی بھی تھے، سندھی بھی، سرحدی بھی تھے بنگالی بھی، عرب سے آئے ہوئے بھی تھے، ہندوستان سے بھی، ملوں والے بھی تھے اور خوانچہ فروش بھی، دینی مدارس کے طلبا بھی تھے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم بھی، غرض کہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے محض خدا کی خوشنودی کی خاطر جمع ہو گئے تھے۔ جس کو مسجد میں جگہ نہ مل سکی وہ باہر ہی بیٹھ گئے، خواہ امیر تھا یا غریب۔ کوئی نمائش گاہ نہ تھی۔ کوئی تین تین چار چار رنگے بڑے بڑے پوسٹر نہ تھے کوئی پچھلی کارگزاریوں کے بیان نہ ہوئے بس ایک ہی تڑپ تھی کہ ہم سدھر جائیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کو اپنی ذات کی کوتاہیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کا احساس تھا۔ دوپہر کو الگ الگ حلقوں میں بٹ کر تعلیم ہوئی۔ سنا گیا کہ نماز کیا ہے، دعا کیا ہے، نمازیں پڑھنے سے کیا ملے گا اور جن لوگوں نے یوں پڑھی انھوں نے کیا پایا۔ دعاؤں سے کیا ہوتا ہے۔ جس طرح دعا مانگنے کا حق ہے اس طرح مانگی جائے تو کیا ملتا ہے۔ اور اس طرح جنھوں نے مانگی کیا پایا۔ پچھلوں کے تذکرے تھے۔ دولت والوں کا تذکرہ آیا تو قارون و ہامان کی دولتوں کے نقشے بتائے گئے، عزت کا ذکر ہوا تو صحابہ کرام کی زندگیوں کے واقعات بتائے گئے۔

فاقوں کا ذکر چھڑا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بتلائی گئی۔ خدا کو خوش کرنے والوں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ یہ معلوم ہوا۔ دو گھنٹے کی تعلیم کے بعد کھانے اور نماز کا وقت ہوا۔ ایک طرف کھانے کا انتظام کیا گیا تھا دکان داروں نے دکانیں بھی لگائی ہوئی تھیں۔ جس کا جہاں جی چاہا کھا لیا۔ اجتماع والوں کی طرف سے کھانے کا کوئی پیسہ نہ لیا جاتا۔ عصر کے بعد لائل پور کے مفتی زین العابدین صاحب کا بیان ہوا۔ تھوڑے سے وقت میں بہت کچھ سمجھا دیا گیا۔ خدا نے بولنے کا خوب ملکہ دیا ہے سن کر وجدانی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ بتایا گیا کہ

"انسان جب اپنے آپ محنت کرتے کرتے اس درجہ پر پہونچتا ہے جس پر اللہ راضی ہو کر اس کے صرف ہاتھ اٹھنے پر ہی فیصلے فرما دیتے ہیں تو دنیا میں کیا ہوتا ہے دنیا کس طرح اسکے پیچھے آتی ہے۔ آج ہم لوگ دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں اور وہ ہے کہ ہاتھ ہی نہیں آتی"

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے واقعات سنائے گئے اور کچھ اس انداز سے کہ ایمان تازہ ہوگیا۔ بتایا گیا کہ

" انسان جب بیتلہے تو اس ڈرسے کہ اس کے مرنے کے بعد کہیں فرشتے اسے غسل اور دفن نہ کرنے لگ جائیں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم عجلت سے غسل دیتے اور جلدی جنازہ لے جاتے ہیں۔ اللہ کے پاک رسول جنازہ کے ساتھ پنجوں کے بل چلتے ہیں اور پوچھنے پر فرمایا جاتا ہے کہ اتنے فرشتے آسمان پر سے اتر کر ساتھ ہو لیے ہیں کہ پورا پاؤں رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔"

مغرب کے بعد عرب سے آئے ہوئے اللہ کے ایک بندے کا بیان شروع ہوا، زبان عربی تھی لہجہ انتہائی خوبصورت، جی چاہتا اللہ اور اس کے پیارے رسول کی زبان بولتا رہے۔ مترجم ساتھ بیٹھ گئے۔ پون گھنٹہ دین کے مختلف پہلوؤں پر نہایت وضاحت سے روشنی ڈالتے رہے، عدل و انصاف، معاشرت و معیشت اور دنیا کے مختلف علاقوں میں اسلام کی دعوت کے پھیلاؤ پر معلوماتی تقریر کی۔

رات کے خطاب میں مولانا محمد یوسف صاحب کا بیان ہوا۔ لاہور اور قریب ہر شہر کے مختلف حلقۂ فکر کے علمائے کرام موجود تھے۔ مولانا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی، کھانسی اور نزلہ کا زور رہا لیکن دین کی محبت کچھ اس طرح غالب ہے کہ کسی چیز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مسلسل بولتے ہیں۔ عام اجتماع ہو یا خاص، شہری حضرات کے اجتماع میں بولنا ہو یا میواتی حضرات میں' اس بولنے اور پوری قوت سے بولنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی، بتایا جاتا رہا ہو کہ

" نمرود کی خدائی پوری قوت سے اس کوشش میں لگی رہی کہ آج کی رات کسی بچے کے وجود کی بنیاد نہ پڑنے پائے، تمام ملک کے مرد الگ اور عورتیں الگ کر دی گئیں۔ پہرے دار بٹھا دیے گئے۔ لیکن ہوا کیا۔ خدا کے حکم کے بموجب جو کام ہونا تھا ہو کے رہا۔ دشمن کے گھر ابراہیم علیہ السلام پل رہے ہیں۔ تو خدا جب کرنے پر آتا ہے دنیا کی کوئی طاقت کچھ نہیں کر سکتی۔"

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعات بتائے جاتے رہے۔ ایک طرف اس دنیا

اور اس کے اندر کی تمام چیزوں کی بے بسی، دوسری طرف خدائے بزرگ و برتر کی عظمت، دل میں یہ سب کچھ یوں نقش ہوتا رہا جیسے ہونے کا حق ہے۔ آخر کیوں نہ ہو کہنے والا پورے یقین سے کہہ رہا ہے، زبان کے ساتھ دل کی گہرائیوں کی آواز شامل ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ

• اگر کوئی فاسق اور جھوٹا شخص تمھارے پاس اس قسم کی خبر لائے کہ کوئی گروہ یا فرد تمھارے مال اور جان کے بارے میں برے ارادے کر رہے ہیں تو اس امر کے باوجود کہ اس کا جھوٹا ہونا تمھارے نزدیک مسلم ہے تم اپنے مال اور جان کی فکر میں لگو گے۔ لیکن جس اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارا یہ ایمان ہے کہ سچے نبی ہیں۔ اگر اس ایمان میں کچھ بھی کمی ہے تو ہم مسلمان ہی نہیں، وہ فرما رہے ہیں کہ اے لوگو! اس دنیا کی حقیقت کچھ نہیں اللہ کے نزدیک اس کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں، مردہ بکری کے بچے کے برابر بھی نہیں، جو کچھ بھی ہے آخرت کی زندگی ہے۔ اس کے لیے کچھ کر لو ورنہ اس نہ ختم ہونے والی زندگی میں تڑپوگے لیکن یہ سن کر ہمیں یقین نہیں آتا۔ کیوں؟ اس دنیا کے مال و اولاد ہمارے مشاہدے میں ہیں اور آخرت کی زندگی غیب میں۔ بس اسی کا نام ایمان بالغیب ہے۔ جب دیکھ لیا تو غیب کہاں رہا۔"

"رات گیارہ بجے تک یوں ہی دین و ایمان کی باتیں ہوتی رہیں، نماز پڑھی گئی! ایک ہی صف میں ہر درجے، ہر زبان، ہر عمر اور مختلف رنگ و نسل کے دینی بھائی اللہ کے حضور میں یوں کھڑے ہوئے جیسے ان کا وجود ہی نہیں ہے۔ چاروں طرف ایک سناٹا۔ امام صاحب ان سب کی طرف سے اللہ کے حضور عرض گزار رہے ہیں۔ بارہ بجے کچھ آرام کی فکر میں لگ گئے کچھ اللہ سے باتیں کرنے میں، ۴ بجے آنکھ کھلی، آگے پیچھے دائیں بائیں، بہتوں کو کھڑے پایا۔ اللہ اکبر۔ کیا سرور ہے اس کھڑے ہونے میں۔

۲۲ کی صبح نماز کے بعد پھر تقریر ہوئی، دوپہر کو تعلیمی حلقے بنائے گئے، عصر کے بعد ہندوستان سے آئے ہوئے علی گڑھ یونی ورسٹی کے گریجویٹ اور پھر علم دین سے پورے واقف مولوی محمد عمر صاحب کی تقریر ہوئی۔ خوب سلیقے سے بیان فرماتے ہیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے وقت میں ہر انداز کا خوب مواد ذہنوں میں سمایا، زبان اللہ کی عظمت کے ترانے خود بخود گانے لگی۔

غرض اس طرح یہ تین دن کا روح پرور اجتماع چلتا رہا۔ احساس دلایا جاتا رہا کہ سب بگاڑ اپنی ذات میں ہے اگر یہ درست ہو جائے تو سب درست ہو جائے گا۔

آخری اسعد اللہ کے راستے میں اپنی ذات پر محنت کرنے کے لیے جن لوگوں نے وقت دیئے اُن کی تشکیل جماعتوں کی شکل میں ہوئی، ہر جماعت میں ۹ سے بارہ تک اللہ کے بندے جمع کر دیئے گئے۔ سو کے قریب جماعتیں بن گئیں جن کو ملک کے کونے کونے میں بھیجا گیا تاکہ ان فانی چیزوں سے کچھ دیر کے لیے کٹ کر آدمی اپنی ذات پر محنت کر سکے، ہر جماعت کا ایک امیر مقرر کر دیا گیا۔ اپنے اپنے بستر، اپنا اپنا خرچ اور اپنی اپنی ذات پر محنت کرنے کا جذبہ اور دوسرے بندگان خدا تک اللہ کی بات پہونچانے کی فکر، یہ سب منظر اس قدر روح کو بالیدگی بخشنے والے کہ سینکڑوں وعظ بھی یہ نہ کر سکیں۔ اختتام پر دعا ہوئی، مولانا محمد یوسف صاحب نے دُعا کی اپنے گناہوں کی توبہ، مغفرت، آخرت کی سرخروئی، دین کی عظمت، تمام انسانوں کے لیے ہدایت طلبی، یہ سب باتیں اللہ سے طلب کی گئیں۔ دعا یوں مانگی گئی جس طرح مانگنے کا حق ہوتا ہو۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو روئی نہ ہو، کوئی زبان نہ تھی جو ہلی نہ ہو، کوئی دل نہ تھا جو پھوٹ پڑنے پر نہ آیا ہو، بس ایک ہی احساس تھا کہ اتنی زندگی جو گزری ناکامی میں گزری، میں ہی سراپا معصیت ہوں سب برائیاں مجھ ہی میں ہیں، اے اللہ ان سب کوتاہیوں کو معاف فرما اور میری زندگی کو اپنے راستے پر لگا دے۔

اس طرح ۲۲ر کی دوپہر کو یہ مبارک اجتماع ختم ہو گیا۔

ضروری بات

۱۔ دفتر الفرقان اور کتب خانہ الفرقان سے جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر صرف "منیجر" کے نام فرمائیے کسی شخص کا نام نہ لکھئے۔

۲۔ ادارتی امور میں براہ راست اڈیٹر کو لکھئے۔ دفتری خطوط کے اندر ان امور کے بارے میں کچھ نہ لکھا جائے ——— منیجر

حالاتِ حاضرہ

ہندوستان میں زبان کا مسئلہ

ایڈیٹر صاحب "مدینہ" بجنور

ہندوستان کا دستور بننے سے پہلے طے تھا کہ مرکز کی سرکاری زبان ہندوستانی ہوگی جو ناگری اور فارسی دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے گی۔ ہندوستانی کی تعریف یہ کی گئی تھی کہ جو زبان شمالی ہندوستان کے عوام بولتے ہیں اور جسے اردو اور ہندی دونوں ناموں سے پکارا جاتا ہے وہ ہندوستانی ہے۔ یہ فیصلہ اس بنا پر کیا گیا تھا کہ ہندوستان کی ہر دوسری زبان کے مقابلہ میں ہندوستانی ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان کے ہر گوشہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر ہندوستان کی قومی زبان بن جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہندوستان فی زمانہ قومی زبان کی نعمت سے محروم ہے سوائے ہندوستانی کے یہاں کی سب زبانیں علاقائی ہیں۔ قومی زبان وہی ہو سکتی ہے جسے ہندوستان کی اکثریت بولتی اور سمجھتی ہو اور جس میں اپنے روزمرہ کے کام انجام دیتی ہو۔ ہندوستان مختلف مذاہب، مختلف تہذیبوں اور مختلف کلچروں کا گہوارہ ہے۔ اس لیے یہاں کی قومی زبان میں ان سب کے اظہار کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے۔ جو زبان بھی اس صلاحیت سے محروم ہوگی وہ ہندوستان کی قومی زبان کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔

ہندوستان کا دستور بننے سے پہلے ہندوستان کے لیڈروں نے اور کانگریس نے ہندوستانی کے حق میں نہ صرف فیصلہ ہی کیا تھا بلکہ اس فیصلہ کی عام اشاعت بھی کی تھی مگر دستور سازی کے وقت یہ فیصلہ طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا اور صرف ہندی دیوناگری رسم الخط میں مرکزی حکومت کی سرکاری زبان تسلیم کی گئی۔ یہ بات جاننے والوں کے لیے انوکھی نہ تھی کیونکہ بقول علامہ دتاتریہ کیفی سب جانتے تھے کہ حکومت کے نیتاؤں کو مہاتما جی کے اس فارمولے کی ذرا پروا نہیں ہے کہ ہندوستان

کی سرکاری زبان ہندوستانی ہوگی جو اردو اور ناگری حروف میں لکھی جائے گی۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رو سے جب صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہوئی تھیں تو کئی صوبوں میں حکومت کے اطوار سے معلوم ہو گیا تھا کہ پوری آزادی ملنے پر ان کا طرز عمل زبان کے بارے میں کیا ہوگا؟ بہر حال دستور کا سترھواں حصہ سرکاری زبان سے متعلق ہے جس کے دو باب ہیں۔ پہلا باب یونین (مرکز) کی زبان سے متعلق ہے اور دوسرے باب کا تعلق علاقائی زبانوں سے ہے۔ باب اول کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دستور سازوں نے ناگری رسم الخط میں ہندی کو یونین کی سرکاری زبان تسلیم تو کر لیا ہے مگر انہیں اپنے اس فیصلہ کی صحت کا یقین نہیں ہے چنانچہ انھوں نے یہ بات تو صاف طور پر کہدی ہے کہ آئندہ پندرہ برس تک یونین کی سرکاری زبان انگریزی رہے گی مگر ہندی کے مکمل نفاذ کے لیے کوئی میعاد یا تاریخ مقرر نہیں کی ہے بلکہ اس کے بتدریج نفاذ کی راہ کو بھی طرح طرح کی رکاوٹوں سے ناہموار بنا دیا ہے، یہ صورت حال اس حقیقت کی غماز ہے کہ ہندی کے حق میں جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ بادل نخواستہ کسی مجبوری یا مصلحت کی بناء پر کیا گیا ہے۔

۱۹۳۶ء کی بات ہے کہ آل انڈیا ریڈیو بمبئی نے اپنے سننے والوں سے پوچھا کہ وہ کس زبان میں پروگرام سننا پسند کریں گے۔ جواب ملاحظہ ہو۔

ہندوستانی (اردو) ۲۵۶۷۔ انگریزی ۲۳۲۵، گجراتی ۱۴۲۲، مرہٹی ۱۵۵۹، ہندی صفر۔
احاطہ بمبئی کے پانچ ہزار ریڈیو سیٹ رکھنے والوں میں سے ساٹھ فیصدی اردو کے یعنی ہندوستانی کے حق میں تھے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر صرف ایک ہی زبان میں براڈ کاسٹ کیا جائے تو کون سی زبان کو ترجیح دی جائے گی، جواب ملاحظہ ہو۔

ہندوستانی (اردو) ۳۶۵۰، انگریزی ۱۰۴۰، گجراتی ۹۲۰، مرہٹی ۳۵۰، ہندی صفر۔
یہی سوالات کلکتہ، مدراس اور دہلی والوں سے بھی پوچھے گئے تھے۔ جواب ملاحظہ ہوں۔
کلکتہ۔ ہندوستانی (اردو) ۳۵۵۹، انگریزی ۱۷۵۴، بنگالی ۳۹۹، ہندی صفر۔
مدراس۔ ہندوستانی (اردو) ۲۵۳۵، انگریزی ۱۷۸۱، تامل ۳۸۴، تیلگو ۲۲۹، ہندی صفر۔
دہلی۔ ہندوستانی (اردو) ۴۴۶۰، انگریزی ۱۷۴۶، ہندی صفر۔

[نوٹ: ابتدائی سطور میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے پیش نظر ہندوستانی کو اردو کا نام دینا اور ہندی کو ہندوستانی سے خارج کر دینا عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن جس زمانے کے اعداد و شمار دیے گئے ہیں اس زمانے کے ہندوستانی اور آج کے ہندی نشریات کی زبان کے فرق کو اگر سامنے رکھ لیا جائے تو پھر تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہندوستانی نشریات اردو نشریات ہی تھے۔ دوسرے جس زمانے کا ذکر ہے اسی زمانہ میں مسٹر آر ایس شکلا نے "آل انڈیا ریڈیو کی لسانی پالیسی" نام کی ایک کتاب لکھی تھی جس میں ہندوستانی نشریات کو اردو کی نشریات بتا کر ہندی کا کیس پیش کیا تھا۔ اس کتاب کا دیباچہ سمپورنانند جی نے لکھا تھا اور اسے ہندی ساہتیہ سمیلن یوپی نے شائع کیا تھا۔]

مذکورہ بالا اعداد و شمار جہاں ہندی کی کل ہند حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں وہاں اردو کی مقبولیت کا پتہ بھی دیتے ہیں! ان حالات میں ہندی کو یونین کی زبان تسلیم کرتے وقت دستور سازوں کے سامنے اگر کچھ خدشات اور خطرات نمایاں ہونے لگے تھے اور وہ تذبذب میں مبتلا ہو گئے تھے تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ بہرحال ہندی یونین کی سرکاری زبان قرار پاگئی۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ہندی کو قومی زبان بنانے کی کوشش کا آغاز کیا جاتا لیکن ہوا اس کا بالکل الٹا، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہندی کو عام فہم بنایا جاتا، دوسری علاقائی زبانوں کے الفاظ شامل کیے جاتے اور بالخصوص ہندوستانی یا اردو کے سرمایہ سے فائدہ اٹھایا جاتا مگر ہوا یہ کہ ہندی کو سنسکرت کے نامانوس اور ثقیل الفاظ سے لادا جانے لگا اور اسے اتنا مشکل بنا دیا گیا کہ اس کے عوامی زبان بننے کے سارے امکانات ختم ہو گئے، مستزاد یہ کہ دوسری علاقائی زبانوں اور خاص کر اردو کے وہ الفاظ نکال کر پھینک دیے گئے جو زبان زد عوام و خواص تھے اور ان کی جگہ سنسکرت کے وہ الفاظ اپنی اصلی شکل میں استعمال ہونے لگے جن سے کسی کے کان آشنا نہ تھے۔ ہندی کا اپنا سرمایہ بہت قلیل تھا، اس کی عمر ہی کیا تھی۔ تقریباً سو برس ہوئے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں اس کا جنم ہوا تھا۔ سو برس کا زمانہ ایک نئی زبان کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک زبان سو برس میں کیا بنے گی، ہزار برس کے بعد بھی اس میں نئے نئے الفاظ، نئی نئی اصطلاحیں، نئی نئی تشبیہیں اور نئے نئے استعارے شامل ہوتے رہتے ہیں بلکہ یہ عمل زبان کی زندگی کے ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔ ہندی والوں نے اپنی زبان کو سرکاری حیثیت دلا کر یہ سمجھ لیا کہ ان کی زبان ہندوستان کی اور دنیا کی تمام زندہ زبانوں سے بے نیاز ہے بلکہ اسے ایک مردہ زبان کا سہارا

کافی ہے جسے سنسکرت کہتے ہیں مگر اس طرح انھوں نے ہندی کو قومی زبان بن جانے سے محروم کر دیا۔ دوسری ایسی ہی غلطی ان سے یہ ہوئی کہ ہندی ریاستوں میں اردو کو نیست و نابود کرنے کی مہم شروع کر دی۔ کبھی ارشاد ہوا کہ اردو کوئی جداگانہ زبان نہیں ہے بلکہ ہندی ہی کا ایک روپ ہے جبکہ اسی دستور نے جس نے ہندی کو سرکاری حیثیت عطا کی ہے اردو کو ہندی سے علیحدہ ایک زبان تسلیم کیا ہے۔ کبھی کہا گیا کہ اردو ملکی زبان نہیں ہے غیر ملکی ہے مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ پاکستان کے علاوہ جو کل تک ہندوستان ہی میں شامل تھا اور اردو کس ملک کی زبان ہے؟ کبھی فرمایا گیا کہ اردو عوامی زبان نہیں ہے بلکہ اس میں "ہے" اور "نہیں" کے علاوہ تمام الفاظ عربی اور فارسی کے ہیں جبکہ بقول فراق گورکھپوری اردو میں دو چار ہزار الفاظ عربی اور فارسی کے اور پچاسوں ہزار خود ہندی کے شامل ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اردو کے خلاف بے سر و پا اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اور ساتھ ہی ہندی ریاستوں نے اردو کے دستوری حقوق بھی دینے سے انکار کر دیا۔ مثال کے طور پر حکومت ہند نے ۱۴ر جولائی ۱۹۵۸ء کو لسانی پالیسی کے متعلق ایک بیان شائع کیا جن پر ہندی ریاستوں نے مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔

اس اعلان میں اردو سے متعلق اکثر غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کے ازالہ کے ساتھ تسلیم کیا گیا تھا کہ جن علاقوں اور خطوں میں اردو زبان رائج ہے ان میں مندرجہ ذیل سہولتیں مہیا کی جائیں (۱) پرائمری درجوں میں ان طلبا کو جن کے والدین یا سرپرست یہ بیان کریں کہ ان کی مادری زبان اردو ہے، اردو میں تعلیم حاصل کرنے اور امتحانات دینے کی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ (۲) اردو کے اساتذہ کی تربیت اور اردو میں موزوں نصابی کتابیں مہیا کرنے کے انتظامات کیے جائیں (۳) ثانوی درجوں میں بھی اردو میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں مہیا کی جائیں (۴) تمام دفاتر اور عدالتیں اردو میں دستاویز قبول کریں۔ ان کے ترجمہ یا کسی دیگر زبان کے رسم الخط میں ان کو منتقل کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ دفاتر اور عدالتیں اردو میں عرضیاں اور درخواستیں بھی قبول کریں۔ (۵) جن علاقوں میں اردو رائج ہے اور جن کو اس غرض کے لیے مخصوص کر دیا جائے وہاں اہم قوانین، قواعد و ضوابط اور اعلانات اردو میں جاری کیے جائیں۔ اعلانیہ میں اس دفعہ کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ "یہ ضروری نہیں کہ مجالس قانون ساز اردو میں قوانین پاس کریں۔ یا ہر ایک قانون اردو میں جاری کیا جائے بلکہ اہم قوانین، قواعد

وضوابط اور اعلانوں کو مشتہر کرنے کی غرض سے مخصوص علاقوں میں ان کو یا ان کے بعض مضامین کو اردو میں جاری کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح اگر دو ریاستوں کے درمیان کوئی سرحدی علاقہ دو زبانوں والا خیال کیا جاتا ہے تو یہ ضروری ہے کہ حکومت ان اعلانوں کو اردو زبان میں شائع کرے۔" خاص سہولتوں کے ضمن میں مذکورہ بالا دفعات کے بعد چھٹی دفعہ میں تاکید مزید کے طور پر کہا گیا ہے۔" ہندی کو نہ صرف ہمارے آئین میں ممتاز مقام حاصل ہے بلکہ یہ اتر پردیش اور بہار نیز ہندوستان کی کچھ دیگر ریاستوں میں بھی سرکاری زبان ہے۔ ہندی اور اردو کے درمیان کسی رقابت کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ لازمی طور پر ان ریاستوں میں ہندی کو بلند ترین مقام حاصل ہے لیکن آئین کی دفعات کے منشا کے مطابق ہندوستان کی ایک زبان کی جسے لوگوں کی بہت بڑی تعداد بولتی اور استعمال کرتی ہے، حوصلہ افزائی کے خیال سے، جو لوگ اسے استعمال کرنے کے عادی رہے ہیں اور جو اپنی مادری زبان خیال کرتے ہیں ان کو اردو استعمال کرنے میں آسانیاں مہیا کرنا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا مناسب ہے۔ اس کا اطلاق خاص طور پر اتر پردیش اور بہار نیز دہلی پر ہوگا جو سینکڑوں برس سے اردو کے اہم مراکز رہے ہیں۔"

مرکزی حکومت کے اعلانیہ اور اس پر ہندی ریاستوں کی مہر تصدیق کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ ہوا کہ چند معمولی احکام جاری ہوئے جن پر عملدرآمد کی ضرورت برائے نام سمجھی گئی اور اردو کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ یہی حال سہ لسانی فارمولے کا ہوا کہ اس کے فائدے سے اردو کو محروم کر دیا گیا۔ یہ تمام حالات غیر ہندی ریاستوں سے بھی پوشیدہ نہ تھے اور نہ آج ہیں ہندی ریاستوں نے اردو کے ساتھ جو غیر منصفانہ برتاؤ کیا ہے وہ ہندوستان کے غیر ہندی علاقوں کی نگاہوں میں ہے۔ ان کے ذہن میں یہ حقیقت رچ بس گئی ہے کہ ہندی نے مسند اقتدار پر بیٹھ کر جو سلوک اردو کے ساتھ کیا ہے اس سے دوسری زبانیں بھی محفوظ نہیں رہ سکتیں۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ لسانی مسئلہ از سر نو پیدا ہو گیا ہے اور طرح طرح کی تجویزیں سامنے آ رہی ہیں۔ مثلاً

۱۔ ہندی کو ہندوستان کی مشترک زبان بنایا جائے (ہندی ریاستیں)

۲۔ انگریزی کو مشترک زبان کی حیثیت سے باقی رکھا جائے (مدراس)

۳۔ دستور میں جو ۱۴ زبانیں درج ہیں ان سب کو سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا

(باقی صفحہ [illegible])

ALFURQAN (Regd. N.L. 353). LUCKNOW

الفرقان لکھنؤ
سنہ آغاز
۱۹۳۳ء
33 (2)
مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی
مسئول
محمد منظور نعمانی
فی پرچہ ساڑھے تین پیسے

بھی نصیب ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے جس کے ہاتھ میں بندوں کے قلوب ہیں طواف میں بھی پھر کتنی
طواف میں بھی اور اس کے بعد ملتزم پر بھی دعا نصیب فرمائی۔ اس کے بعد زمزم شریف پر آ کر اس کا
تازہ تازہ پانی پیا اور الحمدللہ خوب پیا اور دعا کی۔ اس سال دیکھا کہ زمزم شریف کے اوپر والی
عمارت ختم کردی گئی ہے اور زمزم شریف میں مشین لگا کے اور پائپ کے ذریعہ دور تک اس کا
پانی دوڑا کے اور پھر دو طرفہ سیکڑوں ٹونٹیاں لگا کے ایسا انتظام کردیا گیا ہے کہ سیکڑوں حجاج
بیک وقت ان ٹونٹیوں کے ذریعہ زمزم کا تازہ تازہ پانی پی سکتے ہیں اور اپنے برتنوں میں بھر سکتے ہیں۔
ایک جانب کی ٹونٹیاں مردوں کے لیے مخصوص ہیں اور دوسری جانب کی خواتین کے لیے۔
یہ انتظام بلاشبہ بہت اچھا کیا گیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ حجاج میں جو ایک بڑی تعداد ناتربیت
یافتہ اور بے سلیقہ لوگوں کی ہوتی ہے اس کی وجہ سے وہاں بھی ہر وقت کشمکش کا سماں رہتا ہے۔
اس کے بعد ہم حجر اسود کا استلام کرکے سعی کے لیے صفا پر آئے، پہلے دعا کی، پھر "اَبْدَأُ
بِمَا بَدَأَ اللّٰہُ بِہٖ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰہِ" کہہ کے سعی شروع کی اور سات
پھیرے پورے کیے، ہر پھیرے کے خاتمہ پر صفا اور مروہ پر دعا کا اہتمام نصیب ہوا۔ آخری
شوط کے بعد مروہ پہ دعا کر کے سعی سے فارغ ہوئے اور حلق کے لیے قریب ہی کی حجام کی ایک
دکان پر آگئے اور حلق کرایا۔ـــــ الحمدللہ عمرہ پورا ہوا۔ جس رب کریم نے یہ عمرہ نصیب
فرمایا وہی قبول بھی فرمائے۔

تبلیغی اخوان واحباب حضرت مولانا سعید احمد خاں صاحب، بھائی فضل کریم صاحب
اور قاری سلیمان صاحب وغیرہ کو ہماری آمد کی اطلاع ہوگئی تھی وہ حضرات ہماری
تلاش میں حجام کی اس دکان ہی پر آگئے ـــــ برسوں کے بچھڑے ایسے باخدا
دوستوں کا ملنا اور اللہ کے ایسے نیک اور مقبول بندوں کی زیارت اور ان کی دعاؤں سے مستفیض
ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔

رابطہ کے ارکان اور مدعوئین کے قیام وغیرہ کا انتظام رابطہ کی طرف سے عام طور
سے سرکاری مہمانوں کی طرح ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔ لیکن مولانا علی میاں ہمیشہ اپنے طور پر مولانا

ہمارے بہت ہی عزیز دوست ارشد صاحب مرحوم جو ہمارے اس سفر سے ہم ہی مہینے پہلے ایک تبلیغی سفر میں حالتِ احرام میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان موٹر کے ایک حادثہ میں شہید ہوگئے تھے، ان کے اہل و عیال جدہ ہی میں مقیم ہیں۔ ۲۰ مارچ کی صبح سب سے پہلے مرحوم کی تعزیت میں اُن کے گھر گئے (ان کے سب گھر والے مولانا علی میاں سے بہت ہی خاص تعلق رکھتے ہیں) پھر ظہر کی نماز جدہ ہی میں پڑھ کے اور اپنے خاص عنایت فرما الحاج عبدالقادر نوروِلی صاحب کے ہاں کھانا کھا کے اور تھوڑی دیر آرام کرکے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ اور ایسے وقت وہاں پہونچے کہ حرم شریف میں عصر کی اذان ہو رہی تھی۔

اس رب کریم کا شکر کس طرح ادا کیا جائے جس نے پھر اپنے حرم پاک کے در و دیوار دکھلائے اور حاضری کی توفیق دی۔ اندر داخل ہونے کے بعد بیت اللہ شریف پر نظر پڑی اور دل و زبان نے کہا

اللّٰھم زد بیتك ھذا تشریفاً	(اے اللہ اپنے اس مقدس بیت کی تشریف
وتعظیماً وتکریماً ومھابۃ وزد	وتکریم اور تعظیم و ہیبت میں اضافہ فرما اور
من شرفہ وکرمہ ممن حجہ او	حج و عمرہ کرنے والے جو بندے اس کی تعظیم و
اعتمرہ تشریفاً وتکریماً وبرّاً	تکریم کریں اُن کی بھی تشریف و تکریم اور ان کے
اللّٰھم انت السلام ومنك السلام	ساتھ احسان میں مزید اضافہ فرما، اے اللہ
فحینا ربنا بالسلام	تو سراپا سلامتی ہے اور سلامتی کا تو ہی
اس کے علاوہ اور بھی جن دعاؤں کی توفیق ملی۔	سرچشمہ ہے۔ تو ہمیں سلامتی کا تحفہ دے۔)

اللہ کے ہزاروں بندے بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے پورا مطاف گویا بھرا ہوا تھا اس لیے حجر اسود کے قریب جانے کا ارادہ بھی نہ کرسکے دور ہی سے استلام پر قناعت کی اور عمرہ کا طواف شروع کیا۔ بار بار اپنے قلم سے لکھنے اور پچاسوں سیکڑوں دفعہ دوسروں کو بتانے کے باوجود طواف شروع کرتے وقت میں خود رمل کرنا بھول گیا۔ مولانا علی میاں یا مولانا معین اللہ صاحب نے یاد دلایا تو رمل شروع کیا ــــ سات چکر پورے کرکے طواف ختم کیا اور رکعتین طواف پڑھیں۔ طائفین کے اس سمندر ہی میں کسی طرح باب کعبہ اور حجر اسود کے درمیان ملتزم تک پہونچا

کی بنا پر آسانی سے اور جلدی ملنے کی امید بھی نہیں تھی اس لیے میرا ارادہ یہ ہوا کہ میں رابطہ کی رکنیت قبول کرنے سے شکریہ کے ساتھ معذرت کر دوں۔ لیکن رفیق محترم مولانا علی میاں نے (جو رابطہ کی تاسیس کے پہلے دن سے اس کے رکن ہیں) اور دوسرے دوستوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا، اور سب کی یہ رائے ہوئی کہ رکنیت قبول کر لینی چاہیے اور پاسپورٹ کے لیے پوری کوشش کرنی چاہیے ___ مجھے چونکہ طبعاً ایسے کاموں سے بہت بُعد ہے جن کے لیے سرکاری دفاتر میں جانا پڑے اور ملازمت باب اقتدار سے عرض معروض کرنی پڑے، اس لیے ان سب باتوں کے بعد بھی میری طبیعت آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ آخر ایک دوست نے ذمہ داری لی کہ اس سلسلے میں جو کچھ کرنا ہوگا وہ خود کریں گے اور مجھے صرف درخواست پر دستخط کرنے ہوں گے۔ اس بات نے میرا خاص عذر تو ختم کر دیا لیکن رکنیت کے قبول کرنے میں بعض دوسری وجوہ سے بھی مجھے تردد تھا، چنانچہ میں نے کئی دن استخارہ کیا اور بالآخر آخر رمضان میں میں نے رابطہ کو منظوری کی اطلاع دے دی۔

اسی درمیان اخبارات سے معلوم ہوا کہ ہماری حکومت کی وزارت خارجہ نے یہ طے کیا ہے کہ جن لوگوں کو رابطہ کی طرف سے مدعو کیا جائے گا حکومت اُن کے لیے پاسپورٹ وغیرہ میں سہولت فراہم کرے گی ___ وسط شوال میں میری طرف سے پاسپورٹ کی درخواست دی گئی اور جن مخلص دوست نے ذمہ داری لی تھی اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے انھوں نے ہی ساری کوشش اور دوڑ دھوپ کی اور خلاف توقع چند ہفتوں میں سے مجھے انٹرنیشنل پاسپورٹ مل گیا۔

رابطہ کی مجلس تاسیسی کا اجلاس مکہ مکرمہ میں ۲۷ مارچ سے شروع ہونے والا تھا، ہم لوگ (رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا معین اللہ صاحب ندوی اور یہ عاجز) ۲۲ مارچ کو لکھنؤ سے روانہ ہو کر ۲۳ کی صبح دہلی پہونچے، پی فارم کی کارروائی (جس کے بغیر ملک سے باہر کا سفر نہیں کیا جا سکتا) ۲۴ تک اس کی تکمیل ہو سکی اس لیے ہم ۲۵ مارچ کی شام کو دہلی سے جدہ کے لیے روانہ ہو سکے، راستہ کراچی اور بحرین ہو کر اختیار کرنا پڑا اور ان دونوں جگہ ہوائی جہاز بدلنے کے لیے کافی ٹھہرنا پڑا جس کی وجہ سے جدہ ۲۶ اور ۲۷ کی درمیانی شب میں پہونچ سکے۔

حرمین پاک کی حاضری

محمد منظور نعمانی

شکر نعمتہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو
عذر تقصیرات ما چنداں کہ تقصیرات ما

اب سے دو سال پہلے اللہ تعالیٰ نے حرمین پاک کی حاضری نصیب فرمائی تھی، حج کے متعلق جو قانون ہمارے ملک میں کئی سال سے نافذ ہے اس کے ہوتے ہوئے ہم جیسوں کے لیے پانچ سال تک تو حاضری کا بظاہر کوئی امکان ہی نہیں تھا، لیکن رب کریم نے محض اپنے فضل سے ایک شکل پیدا فرمائی اور اس سال پھر حاضری نصیب فرمائی — چونکہ اس سفر کے تذکرہ میں ذکر کرنے والے کے لیے بھی لذت و سرور کا سامان ہے اور سننے اور پڑھنے والوں کے لیے بھی اس لیے کچھ باتیں حوالۂ قلم کی جاتی ہیں۔

محمد منظور نعمانی

رمضان مبارک سے چند دن پہلے دسمبر کی آخری تاریخوں میں اچانک مجھے اطلاع ملی کہ "رابطہ عالم اسلامی" (مکۂ مکرمہ) نے مجھے اپنی مجلس تاسیسی کا رکن منتخب کر لیا ہے (اس مجلس کا اجلاس سال میں کم از کم ایک دفعہ مکۂ مکرمہ میں ہوتا ہے) — انتخاب کی اس اطلاع کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ رابطہ کا اجلاس حج سے کچھ پہلے مکۂ مکرمہ میں ہوگا، نیز رابطہ ہی کی دعوت پر پورے عالم اسلام کی ایک مؤتمر بھی اس سال حج کے بعد متصلاً مکۂ مکرمہ میں منعقد ہوگی اور عنقریب ان دونوں کا دعوت نامہ بھی مجھ کو مل جائے گا۔

میرے پاس چونکہ ہندوستان سے باہر سفر کے لیے پاسپورٹ نہیں تھا اور بعض تجربوں

میں اپنے حصے کی نمائندگی کرنے کے لیے مسٹر چھاگلا کے وجود پر سخت سے سخت اعتراض اور احتجاج کریں کیونکہ وہ مسلمانوں سے برسرِپیکار ہونے کے بعد نہ تو اُن کے نام سے کچھ پانے کا استحقاق رکھتے ہیں اور نہ ایسی صورت میں مسلمانوں کے کسی مسئلے میں اُن سے کوئی متوازن رہنمائی کا بینہ کو مل سکتی ہے۔ وہ اگر مسلمانوں کو برسرِ غلط سمجھتے ہیں اور اُن کی اصلاح کے لیے اُن سے جنگ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی جگہ مسلمانوں کے نام سے پائی ہوئی وزارت کی کرسی نہیں ہے، یہ کام وہ راجیہ سبھا کے محض ایک ممبر کی حیثیت سے راجیہ سبھا میں کریں یا اور زیادہ ہمت ہو تو پبلک میدان میں نکل کر آئیں۔ لیکن وزارت کی کرسی پر رہتے ہوئے نہ صرف اُن کے لیے اس کا کوئی جواز نہیں ہے بلکہ کسی غیر مسلم وزیر کے لیے بھی اُس وقت تک اس کا کوئی حق نہیں تسلیم کیا جا سکتا جب تک ہندوستان کی حکومت کو ایک مشترک اور جمہوری حکومت کہا جاتا ہے۔

مسئلے کی یہ نہایت صاف اور واضح تصویر ہمیں اس بات کا سو فی صدی حقدار بناتی ہے کہ ہم وزیرِ اعظم اور صدرِ جمہوریہ ہند سے مسٹر چھاگلا کی حکومت ہند سے علیحدگی کا مطالبہ کریں۔ اور یہی نہیں بلکہ اس تصویر میں ہمارے لیے ہر پہلو سے اس بات کا بھی جواز موجود ہے کہ ہم اس مطالبہ کو حکومت سے تعاون اور عدم تعاون کی شرط بنالیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ذمہ داری اُن لوگوں کی ہے جو باضابطہ یا بے ضابطہ طور پر حکومت یا حکمراں پارٹی کو کسی بھی قسم کا سیاسی تعاون دیتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ان کے دل ملت کے درد سے بیگانہ نہیں ہو گئے ہیں۔ یقیناً ان لوگوں کا اس وقت کوئی جرأت مندانہ قدم مسلمانوں کے ہاتھ بے حد مضبوط کر سکتا ہے۔ لیکن اگر ہماری بدقسمتی سے ان میں سے کوئی بھی اس جرأت قلندرانہ کا حامل نہیں نکل سکتا تب بھی مسلمانوں کی ہر چھوٹی بڑی تنظیم کا فرض ہے کہ وہ مسٹر چھاگلا کی حکومت سے علیحدگی کے مطالبے کو منظم کریں اور تمام مؤثر آئینی ذرائع سے چند دن کے لیے اپنی ساری طاقت اس مطالبے پر لگا دیں۔

ہم اپنی اس گزارش کو پھر دہرانا چاہتے ہیں کہ اگر ہم ہندوستانی جمہوریت میں اپنے ایک ایسے صاف اور واضح حق پر بھی اصرار کرنے کے لیے بے تابانہ کھڑے نہیں ہو سکتے جس میں ملک کے کسی دوسرے طبقے سے ٹکراؤ کا سوال نہیں ہے یعنی یہ کہ ہمارے نام سے جن لوگوں کو شو (Show) کیا جائے وہ کم از کم ہمارے کھلے دشمن نہیں ہونے چاہئیں تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہم اس ملک میں کسی ادنیٰ درجہ کی باعزت زندگی کے بھی حقدار نہیں ہیں، اور پھر ہمارے وہ حقوق تو ابھی سے اسی طرح پامال ہونے چاہئیں جن میں اس ملک کے اندر ہمارا کوئی حریف طبقہ بھی پایا جاتا ہو! ——

جو لوگ مسٹر چھاگلا سے معافی کے مطالبے پر اکتفا کرنا چاہتے ہیں ہمارے نزدیک وہ صحیح نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ہم تو اس کو بھی صحیح نہیں سمجھتے کہ خود مسٹر چھاگلا سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا جائے۔ ہمارا مقدمہ ایک اصول کو منوانے سے تعلق رکھتا ہے اور اس کو منوانے کی شکل صدرِ جمہوریہ اور وزیرِ اعظم سے مطالبہ ہے۔

"یونیورسٹی کے نام کے مسئلے پر یہ آنکھ مچولی اب بند ہو جانی چاہیئے۔"

افسوس ہے کہ طیب جی کو بہت جلد چلا جانا پڑا (ورنہ وہ وزیر تعلیم سے اس کھلے ہوئے اختلاف کے بعد آسانی سے وہ بھی کہاں رک سکتے تھے) اور ابھی وہ نکلے ہی تھے کہ یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر کے ساتھ طلبا کی نہایت نامناسب حرکت کا وہ واقعہ پیش آگیا جسے ۲۵ اپریل کے واقعے سے یاد کیا جا رہا ہے۔ یہ افسوسناک واقعہ گویا ایک سنہرا موقع تھا جس سے فائدہ اٹھا کر مسٹر چھاگلا یونیورسٹی کے ساتھ جو چاہیں کر گزریں اور کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہو۔ چنانچہ مسٹر چھاگلا جتنا زہر اس یونیورسٹی کے خلاف اگل سکتے تھے وہ سب کا سب اس موقع پر انھوں نے اگل دیا۔ اور پھر اس زہر پاشی سے ایسی فضا بنانے میں بھی وہ کامیاب ہو گئے کہ یونیورسٹی کی آئینی خود مختاری کو صدر جمہوریہ کے ایک آرڈی ننس کے ذریعہ معطل کر کے رکھ دیں۔

ہمیں نہ اس آرڈی ننس پر اس وقت کوئی تبصرہ کرنا ہے اور نہ مسٹر چھاگلا کی زہر چکانی پر۔ ہمارے سامنے اس وقت سوال یہ ہے کہ کیا وہ اقلیت باعزت زندگی کا کوئی حق رکھتی ہے جس کے نام کی وزارتیں ایسے لوگوں کو ملاتی ہوں جو اس اقلیت کو بدنام کرنے اور اس کی ہستی کے ایک ایک نشان کو مٹا ڈالنے کی دلچسپی میں اکثریت کے تنگ دل عناصر میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے ہوں اور یہ اقلیت ایک آواز ہو کر کہہ بھی نہ سکتی ہو کہ حکومت میں ہماری نمائندگی کا حصہ ایسے لوگوں کو دیا جانا ناقابل برداشت ہے؟

کہنے کو یہ بات ٹھیک ہے کہ حکومت میں نہ کوئی ہندو ہندوؤں کا نمائندہ ہے اور نہ مسلمان مسلمانوں کا نمائندہ بلکہ سب مشترک نمائندگی رکھتے ہیں کیونکہ واقعی چھاگلا صاحب یا کسی اور کو مسلمانوں نے اپنا نمائندہ بنا کر حکومت میں نہیں بھیجا ہے۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مسلمان یا دوسری اقلیتوں کے افراد کو حکومت میں لیے جانے کا اصل منشا یہی ہوتا ہے کہ حکومت میں ان اقلیتوں کی حصہ داری کا اظہار ہو۔ اور کسی حد تک یہ بھی کہ اقلیتوں کے معاملات میں خود ان کے افراد کے ذریعے زیادہ بہتر معلومات حاصل ہو سکیں۔ بیرونی ممالک میں ہمارے سفارت خانے مسلم وزرا اور دیگر اعلیٰ عہدیداروں کی فہرستیں آخر اور کیا دکھانے کے لیے شائع کرتے ہیں؟ خصوصاً مسٹر چھاگلا کے بارے میں تو یہ خصوصی واقعہ اتنی جلدی ہم کیسے بھول سکتے ہیں کہ گزشتہ سال جب وہ ادارۂ اقوام متحدہ میں کشمیر کے مسئلے پر ہندوستان کی پرزور وکالت کر کے آئے اور پھر دہلی میں ایک جلسہ گویا ان کے اعزاز میں ہوا تو وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے اسی جلسۂ عام میں انھیں یہ ہدایت بھی کی کہ وہ اپنا پورا نام واضح طور سے محمد علی کریم بھائی چھاگلا لکھا کریں تاکہ دنیا کو معلوم ہو کہ وہ ایک مسلمان ہیں۔

ظاہر ہے کہ مسٹر چھاگلا کے اسلامی نام کی نمائش تنہا ان کی ذات کی بنیاد پر تو کوئی فائدہ نہیں دے سکتی تھی اس کا فائدہ تو صرف اس نسبت کی بنیاد پر ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ حکومت ہند میں پانچ کروڑ مسلمانوں کے حصے کی نمائندگی کرنے والے ایک وزیر ہیں۔ پس اسی بنیاد پر مسلمانوں کو پورا پورا حق ہے کہ وہ حکومت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

عتیق الرحمن سنبھلی

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے یوہنی کیا کم مسائل تھے کہ ایک مجسم مسئلہ مسٹر چھاگلا بن گئے ہیں۔ بمبئی ہائی کورٹ کی چیف جسٹسی سے سبکدوش ہو کر جب وہ برطانیہ میں ہندوستانی ہائی کمشنر کی حیثیت سے متعین ہوئے تھے تو انھی دنوں جبلپور وغیرہ کے دلدوز حادثات پیش آئے اور ایک خاص اتفاق کے ماتحت برطانی اخبارات میں ان حادثات کا بہت چرچا ہوا۔ اس وقت مسٹر چھاگلا نے اپنی زندگی میں ہندوستانیت اور قوم پرستی کا سب سے پہلا ثبوت پیش کرتے ہوئے ایک مراسلہ بعض اخبارات کو دیا جس میں بڑی قطعیت کے ساتھ یہ اعلان تھا کہ ان تمام حادثات کے ذمہ دار خود ہندوستانی مسلمان ہیں جو ہمیشہ سے ہندوستان کی قومی زندگی کے دھارے میں ضم ہونے سے انکار کرتے آئے ہیں اور آج بھی علیحدگی پسندی کی راہ پر ہی چلنا چاہتے ہیں جس کے نتیجے میں یہ مصائب ان کے سر آتے ہیں۔

پھر عرصے کے بعد مسٹر چھاگلا مرکزی وزیر تعلیم کے عہدہ پر فائز ہو کر دہلی آ گئے اور اس عہدے کے ذریعے ہندوستان کی جس سب سے بڑی خدمت کا انھوں نے اپنے دل میں عزم کیا وہ شاید یہی تھی کہ یہاں کے مسلمانوں کی زندگی سے علیحدگی پسندی کا "زہر" نکال کر انھیں قومی دھارے میں غرق کر کے ہی دم لیں گے۔ ظاہر ہے وہ وزیر اعظم نہیں وزیر تعلیم تھے۔ اس لیے اپنے خاص میدان کار ہی میں اپنے اس عزم کو جامۂ عمل پہنانے میں کوئی موثر رول ادا کر سکتے تھے۔ چنانچہ اس میدان میں ان کی نگاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف گئی کہ یہ مسلمانانِ ہند کی "علیحدگی پسندی" کا ایک بہت بڑا مظہر ہی نہیں اس کا سرچشمہ بھی ہے۔ اور پھر یہ نگاہ اپنی تمام توجہات کے ساتھ اس پر مرکوز ہی کیوں نہ ہو گئی۔

سب سے پہلے جو چیز اس نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکی وہ یونیورسٹی کے نام میں "مسلم" کا لفظ تھا۔ اور اس لفظ کو ہٹانے کے لیے مسٹر چھاگلا نے اپنے ارادوں کا اظہار شروع کر دیا۔ لیکن یونیورسٹی کی خوش قسمتی تھی کہ ان ایام میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر بدرالدین طیب جی تھے۔ وہ آئے تھے تو خود ان کی ذات سے اندیشہ تھا کہ وہ یونیورسٹی کے مسلم کریکٹر کو فنا کر دینے کے خواہش مندوں کا آلۂ کار بنیں گے لیکن وہ اقبال کی زبان میں

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانوں سے

کا مصداق ثابت ہوئے اور اس سستی نیشنلزم کے سامنے مضبوطی سے کھڑے ہو گئے۔ اور مسلمانوں کی نبض ٹٹولنے والوں کی قوتِ مزاحمت شل کر دینے کے جس انداز میں تھوڑے تھوڑے وقفوں سے یہ بات اٹھائی جا رہی تھی چلتے چلاتے بھی نہایت بے باکی سے اس کے بارے میں کچھ کر گئے کہ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

(فی کاپی ۶۰ پیسے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بحری ڈاک سے ..... ۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے ..... ایک پونڈ
پوسٹل آرڈر بغیر کراس کیے
آنا چاہیے

جلد ۳۳ | بابتہ ماہ صفر المظفر ۱۳۸۵ھ مطابق جون ۱۹۶۵ء | شمارہ (۲)

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہِ اولیں	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	حرمین پاک کی حاضری	محمد منظور نعمانی	۵
۳	حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ کے روابط حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان سے	... ...	...
		مولانا نسیم احمد فریدی امروہی	۱۳
۴	کائنات میں خدا کی گواہی	جناب وحید الدین خان صاحب	۳۲
۵	دربارِ عالمگیری	ڈاکٹر مصطفٰے حسن صاحب علوی	۴۲

اگر اس دائرے میں ○ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ر جون تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

مولوی محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

عبداللہ عباس ندوی کے یہاں قیام کرتے ہیں اور ان ہی کے مہمان ہوتے ہیں۔ مولانا کی رفاقت اور معیت کی وجہ سے ہم لوگوں نے بھی یہی طے کیا تھا اور بلاشبہ مولانا عبداللہ عباس کے مخلصانہ تعلق کا یہی حق ہے۔ انھوں نے اس سال حرم شریف کے بالکل قریب "عمارۃ الاشراف" میں ایک پورا پلاٹ تقریباً ۴۔۵ ہزار ریال کرایہ ادا کر کے لے رکھا تھا۔ یہ مکہ معظمہ کی جدید طرز کی نہایت عظیم الشان دس گیارہ منزلہ ایک عمارت ہے اور اپنی وسعت کے لحاظ سے گویا ایک مستقل آبادی ہے۔ مولانا عبداللہ عباس صاحب کے پاس اس کے ۴۔۵ کمرے تھے ان میں سے پورے دو کمرے انھوں نے ہم لوگوں کے لیے خالی کر رکھے تھے۔ ہمارا سامان وہاں پہونچ چکا تھا۔ عمرہ سے فارغ ہو کر مغرب سے کچھ پہلے ہم لوگ مکان پر پہونچے۔ اسی وقت غسل کیا اور کپڑے پہن کر مغرب کی نماز کے لیے حرم شریف آ گئے۔

رابطہ کا پہلا افتتاحی اجلاس آج بعد مغرب اس کے دفتر "قصر ملکی" میں ہونے والا تھا۔ نماز مغرب سے فارغ ہو کر مولانا علی میاں اور یہ عاجز "قصر ملکی" پہونچے ——— رابطہ کے اجلاس میں شرکت کا میرے لیے یہ پہلا موقع تھا اور میں اس کی نوعیت اور ہیئت ترکیبی سے اسی دن واقف ہوا ——— اس دن تو صرف ابتدائی کارروائی ہوئی۔ پھر اس کے بعد ایک ہفتہ تک رابطہ کی نشستوں کا سلسلہ جاری رہا۔

رابطہ کی ان مجالس، اس کی کارروائیوں اور پھر مؤتمر کے اجلاسوں کے متعلق تو ان شاء اللہ مستقلاً "الفرقان" کی ایک مخصوص اشاعت میں کسی قدر تفصیل سے آئے گا۔ اس صحبت میں تو اس مبارک سفر کے سلسلے کی کچھ دوسری باتیں ذکر کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

(۲)

اس سفر مبارک کی سب سے بڑی نعمت اور برکت تو حج و زیارت اور بیت اللہ کا طواف ہے، اور اس کے بعد دنوں اور راتوں کے وہ سارے اوقات ہیں جو مسجد حرام اور مسجد نبوی میں اللہ کی عبادت، اس کی کتاب پاک کی تلاوت اور اس کی یاد اور دعا و استغفار میں گزریں، اور بڑے مبارک ہیں وہ بندے جو ان نعمتوں کی قدر شناسی کے ساتھ ان سے بھرپور حصہ لیں۔ لیکن اس کی ضمنی برکات و منافع میں سے ایک بڑی برکت اور منفعت ساری دنیا

و لسانی تفریقوں اور جغرافیائی، سیاسی حد بندیوں کو توڑ کر مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک پورے عالم اسلامی کے اہل ایمان خصوصاً ان کے اکابر و اعیان اور علماء و صلحاء کا اجتماع اور ان کی باہم ملاقاتیں و صحبتیں ہیں جو امت مسلمہ کی عالمی برادری کے باہم ربط و تعارف اور ملت اسلامیہ کے بین الاقوامی کردار کی حفاظت و ترقی کا خداوندی انتظام ہے ـــ سوچیے تو ترکی، مصر، شام، الجزائر، مراکش اور مشرق میں چین، جاپان، انڈونیشیا ملایا، دلی اور لکھنؤ سے کس قدر دور ہیں، اور پاکستان اور افغانستان بھی نسبتاً کم دور ہونے کے باوجود درمیان کی سیاسی دیواروں کی وجہ سے کس قدر دور ہو گئے ہیں، اور ان کے رہنے والوں سے ملنا جلنا اور افادہ و استفادہ اب کتنا مشکل ہو گیا ہے لیکن حج کے موقع پر یہ سارے ملک اور وہاں کے رہنے والے مسلمان بلکہ دنیا بھر کے مسلمان مکہ معظمہ میں بلکہ خاص مسجد حرام میں اس طرح یکجا ہو جاتے ہیں جیسے ایک ماں کے بچے اس کی آغوش میں۔

(۳)

حج کا مجمع اس وقت کی امت محمدیہ کا پورا پورا نمونہ ہوتا ہے۔ اللہ کے ایسے بندے بھی نظر پڑتے ہیں جن کا چہرہ اور جن کی آنکھیں بتا دیتی ہیں کہ ان کا دل اللہ کی خشیت و محبت سے لبریز ہے۔ اور یہ "اتہامی سوز ندومی گداز ند" کے پورے مصداق ہیں لیکن جس طرح آج امت محمدیہ میں یہ عنصر کمیاب ہے اسی طرح حج کے مجمع میں بھی اللہ کے ایسے بندے کچھ زیادہ تعداد میں نظر نہیں پڑتے۔ بڑی تعداد ایسوں کی ہوتی ہے جن کو اسلام کا اچھا اور معیاری نمونہ نہیں کہا جا سکتا۔ اور افسوس ہے کہ خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جن کا حال دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ بے چارے اسلام سے بالکل ناواقف اور حرم پاک کے ابتدائی ادب سے بھی ناآشنا ہیں۔ امت میں اس عنصر کا ہونا اور اچھی خاصی تعداد میں ہونا کوئی نیا انکشاف نہیں ہے لیکن حج کے مجمع میں اور خاص کر حرمین پاک میں ان نمونوں کو دیکھ کر بڑی روحانی اذیت ہوتی ہے۔ قریب قریب ہر ملک سے آنے والوں میں اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ وہ طبقے ہوتے ہیں جو مسلمان خاندانوں میں پیدا ہوئے لیکن دین کی حقیقت جاننے اور اس کی تربیت حاصل کرنے کا انھیں

کبھی موقع نہیں ملا۔ اور حج کے لیے چلے آئے۔ اس صورت حال کی اصلاح کے سلسلہ میں بنیادی ضرورت تو اس کی ہے کہ ملک یہ ملک عوامی پیمانہ مسلمانوں میں اسلامیت کا صحیح شعور اور ان کی دینی تربیت کی جدوجہد ہو لیکن خاص موسم حج میں حکومت حجاز یا حکومت کے پورے تعاون سے کوئی دینی و اصلاحی ادارہ اگر صحیح طریقہ پر ایک منصوبہ بنا کر اس کے لیے کام کرے اور معلمین کو اس کے لیے استعمال کرے اور پہلے خود معلمین کو تربیت کے ذریعہ تیار کیا جائے تو بہت بڑا کام ہو سکتا ہے۔ اور یہ کام پورے عالم اسلامی کی دینی اصلاح کا ذریعہ اور وسیلہ بن سکتا ہے۔ بعض حضرات نے اس کے لیے ایک مفصل اسکیم بنا کر پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے ۔

قادیانی، سعودی حکومت کی نظر میں

اب کے ایک قابل ذکر واقعہ یہ پیش آیا کہ کلکتہ کے قادیانیوں کی ایک جماعت نے حج کو جانے کا پروگرام بنایا۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ اس حج کے ذریعہ کلکتہ اور اسکے نواح میں قادیانیت کی تبلیغ کے لیے زمین ہموار کر سکیں گے، وہاں سے واپس آکر وہ مسلمان عوام کو بتائیں گے کہ عقائد کی بنیاد پر ہماری مخالفت بس یہ ہندوستان ہی کے مولوی کرتے ہیں۔ مکہ مدینہ میں کسی نے ہماری کوئی مخالفت نہیں کی اور ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو ایمان والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ الغرض وہ اس حج کو اپنے لیے ایک سند لوسرٹیفکیٹ بنانا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اس کا اچھا خاصا پروپیگنڈا بھی کیا تھا ــــ کلکتہ کے چند حساس اور بیدار مسلمانوں نے اس خطرہ کو محسوس کیا، اور ایک خط ملک حجاز شاہ فیصل کو لکھا کہ قادیانیوں کی ایک جماعت اس طرح حج کے موقعہ پر حجاز مقدس پہونچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ اپنے کو مسلمان بتا کر سفر کریں گے۔ حالانکہ یہ قادیانی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی اور رسول مانتے ہیں۔ ان کے یہ نام ہیں اس خط کی ایک کاپی مملکۃ سعودیہ عربیہ کے مفتی اکبر کو، ایک رابطۂ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری کو اور ایک ہندوستان کے سعودی سفارت خانہ کو بھی بھیجی گئی ــــ

اس کوشش کے نتیجہ میں ان لوگوں کو ویزا نہ دیئے جانے کا حکم آگیا۔ چنانچہ بمبئی کے ویزا آفس نے سو آدمیوں کی اس پوری جماعت کو ویزا دینے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ ان کی سیٹیں ہوائی جہازوں میں ریزرو تھیں ــــ لیکن "ہبلی" (جنوبی ہند) کے بعض قادیانی خفیہ طور پر حجاز مقدس پہونچ گئے۔ دارالعلوم دیوبند کے ایک نوجوان فاضل مولانا ریاض احمد صاحب فیض آبادی (جو جنوبی ہند میں قادیانی فتنہ کا مقابلہ کر رہے ہیں) وہ بھی اس سال حج میں تھے۔ انھوں نے حجاز مقدس میں "ہبلی" کے ان قادیانیوں کا تعاقب کیا، اور حکومت حجاز کو اطلاع دی کہ اس طرح چند قادیانی خفیہ طور پر آ گئے ہیں۔ حکومت کی جانب سے ان کی تلاش ہوئی، ان میں سے صرف دو کا پتہ چلا اور وہ گرفتار کیے گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ابتدائی بیان میں قادیانی ہونے سے قطعی انکار کیا۔ لیکن جب ان کی ڈائری وغیرہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ واقعتہً یہ قادیانی ہیں تو بعد میں انھوں نے اقرار کر لیا۔ اس کے بعد اتمام حجت کے لیے ان کو تبلیغ کی گئی اور توبہ کے لیے کہا گیا، انھوں نے توبہ کی اور تحریری توبہ نامہ داخل کیا۔

اس سال کے ان واقعات کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو گئی ہے کہ حکومت حجاز قادیانیوں کو مسلمان نہیں مانتی۔ اور اس بنا پر ان کو حج کے لیے حجاز مقدس پہونچنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ان میں سے جو لوگ جاتے ہیں وہ چوری چھپے جاتے ہیں۔

اعتذار اور اعلان

الفرقان کا یہ شمارہ وقت پر کاغذ نہ مل سکنے کی وجہ سے ۱۰-۱۲ دن کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔
آئندہ اشاعت، جس میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق مضامین ہوں گے انشاء اللہ اپنے وقت پر یعنی جولائی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوگا۔

اس کے بعد

اگست و ستمبر کا مشترک شمارہ "رابطۂ عالم اسلامی نمبر" ہوگا جو مکہ مکرمہ کی موتمر عالم اسلامی کی کارروائی، قراردادوں اور اہم مقالات اور تقاریر پر مشتمل ہوگا۔

ــــــــــــ ادارہ

حضرت شاہ ابو سعید حسنی رائے بریلویؒ کے روابط حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان سے

مراسلات کی روشنی میں

از ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوبات حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ بنام حضرت رائے بریلویؒ

مکتوب (۱) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ——— حقائق و معارف

آگاہ فضیلت و کمالات دستگاہ السید الحبیب النسیب النجیب النقیب السید ابو سعید الحسنی سلمہ اللہ واوصلہ الیٰ فوق مناہ آمین ——— الحمد للہ الذی فتح البنۃ اولیائہ لمعارف لا تعد ولا تحصیٰ وکشف علیہم عوارف لا عدھا یرجیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الاولیاء محمد ن المصطفیٰ واحمد المجتبیٰ وعلیٰ آلہٖ واصحابہ بدورالدجیٰ ونجوم الھدیٰ ——— اما بعد ——— از فقیر حقیر عبد العزیز عفا اللہ عنہ، والحمد بسلفہ الصالحین فی المکارم والمآثر مطالعہ فرمایند ——— الحمد للہ علی العافیۃ والمسئول من جنابہ الکریم ان یعافینا وایاکم آمین ——— ہر چند بذکر جمیل الشیال پیوستہ رطب اللسان

بودیم و در پیش ارباب بصیرت دفتر مناقب و احوال ایشان میکشودیم لیکن بحسب عدم وصول مکاتیب بہجت اسالیب کہ بمنزلہ نصف الملاقات است بلابل شوق در بساتین ارواح نغمات یا آسفی علی یوسف چوں ہزار داستان در ترنم می آمد و نیران اشتیاق در کانون سرائر شعلہ بر می زد و عساکر اندوہ و فراق بر ولایات قلوب میتاخت و طائع جنان را بلجام افکار در ریاضت می انداخت ــــــ الحمدللہ کہ صحیفۂ شریفہ متضمن معارف حقہ و وجدانیات مطابقۂ خاطر فاتر را گل گل شگفاینده و از قید انتظار رہا نیدــــ

نقلتُ لہٗ اہلاً و سہلاً و مرحبا۔ بخیر کتاب جاء من خیر کاتب فان کان عنی فی العیان مغیبا فلیس لدی صدری و قلبی بغائب ــ ہر او قد طالعتُ معارفکم المکتوبۃ فی ذیل الصحیفۃ توجدتہا صحیحۃ المعانی راسخۃ المبانی زاد اللہ فی عرفانکم در رفع شأنکم ــــ الّا آنکہ درین معارف تفصیل دیگر کہ از ملاقاتِ حضرت ولی نعمت قدس اللہ سرہ واز مدرکات این فقیر است نیز فہم باید کرد و آن آنست .... این حالت عجب حالت است کہ بہ سبب غلبۂ ..... سکھ و مرہٹہ و جٹ بر بلاد مسلمین و نہب اموال ایشان و انتہاک حرمتِ ایشان دل و جان آسائش را فراموش نمودہ چنانچہ فقیر نیز مع قبائل مرادآباد انتقال نمودہ است و تمام میان دوآب زیر و زبر بر نعال فرسان ایب بدکیشان شد لیکن الحمدللہ کہ این فقیر و قریۂ بہلت و برادر صاحب کلاں ہمہ یا بر و ناموس جان و مال بسلامت ماندیم والسلام ــ از طرف ہمہ صغار و کبار اینجا خصوصاً والدہ صاحبہ و میاں رفیع الدین و عبدالقادر و خواجہ محمد امین جیو و سائر یاراں سلام شوق خوانندــــــ

ترجمہ ــــــ بسم اللہ الرحمن الرحیم ــــــ حقائق و معارف آگاہ فضیلت و کمالات دستگاہ ...... السید ابوسعید حسنی ــ اللہ تعالیٰ اُن کو سلامت رکھے اور اس درجہ پر پہونچائے جس کی وہ تمنا کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ مرتبے پر فائز کرے آمین ـــــ

اللہ کی حمد ہے کہ اس نے اپنے اولیاء کی زبانوں کو بے شمار معارف کے ساتھ گویا اور ان پر وہ عوارف ظاہر فرمائے جن کو گنا نہیں جا سکتا ـــ صلوٰۃ و سلام سید الانبیا

والاولیا حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ پر اور ان کے آل و اصحاب پر جن میں سے ہر ایک بدر الدجیٰ اور نجم الہدیٰ تھا ——— بعد حمد و صلوٰۃ ——— فقیر حقیر عبد العزیز کی طرف سے مطالعہ فرمائیں ——— اللہ تعالےٰ اس کے گناہ معاف کرے اور اس کو مکارم و مآثر میں سلفِ صالحین سے لاحق فرمائے ——— الحمد اللہ عافیت سے ہوں اور ربّ کریم سے یہی درخواست ہے کہ وہ ہم کو اور آپ کو عافیت سے رکھے آمین ———
چونکہ آپ کے ذکرِ جمیل سے ہم ہمیشہ رطب اللسان رہتے تھے اور ارباب بصیرت کے سامنے آپ کے دفترِ مناقب و احوال کھولتے رہتے تھے۔ لیکن چونکہ آپ کے مسرت آمیز خطوط نہیں آرہے تھے جو کہ نصف ملاقات کی مانند ہوتے اس لیے ہم سب کے عنادلِ شوق باغاتِ ارواح کے اندر غم جدائی میں چہچہا رہے تھے اور اشتیاق کی آگ دلوں کی بھٹی میں بھڑک رہی تھی نیز اندوہِ فراق کے لشکر ممالکِ قلوب پر چڑھائی کر رہے تھے اور ہم کو افکار میں مبتلا کر رکھا تھا۔ الحمد اللہ کہ (ایسی حالت میں) صحیفۂ شریفہ پہونچا جو کہ معارفِ حقہ اور وجدانیات مطابقہ پر مشتمل تھا اور جس نے دلِ غمگین کو پھول کی طرح شگفتہ کر دیا اور قیدِ انتظار سے رہائی دی ——— میں نے کہا کہ مرحبا اچھے کاتب کے پاس سے اچھا خط آیا ہے اگرچہ وہ کاتب میری نظر سے غائب ہے مگر میرے سینے اور قلب سے غائب نہیں ہے ——— میں نے آپ کے لکھے ہوئے معارف کا مطالعہ کیا جو اس مکتوب کے ذیل میں تھے ——— میں نے اُن کو معارف کو صحیح اور پختہ پایا۔ اللہ تعالےٰ آپ کے عرفان کو اور بڑھائے اور آپ کی منزلت کو بلند فرمائے ——— مگر اتنی بات ہے کہ ان معارف میں ایک اور تفصیل بھی سمجھ لینی چاہیے جو حضرت ولی نعمت قدس اللہ سرہٗ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ذوق کی چیز ہے اور اس فقیر کے مدرکات میں سے ہے ———
(آگے وہ تفصیل ہے جو یہاں پر دقیق ہونے کی بنا پر پیش نہیں کی گئی) ....
اس وقت عجیب عالم ہے کہ بلادِ مسلمین پر غلبۂ سکھ و مرہٹہ و جٹ کے باعث اور ان کے اموالِ مسلمین کو لوٹنے اور مسلمانوں کی بے آبروئی کرنے کی وجہ سے دل و جان نے آسائش و آرام کو فراموش کر دیا ہے چنانچہ فقیر بھی مع قبائل و متعلقین مراد آباد

آگیا ہے۔ دوآبے کی تمام سرزمین مذکورہ بالا قوموں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے زیر و زبر ہو گئی ہے۔ الحمد للہ فقیر اور قریہ پھلت کے ساکنین اور بڑے بھائی شیخ محمد[1] (قصبہ بڈھانہ میں) بعزت و آبرو اور جان و مال کی سلامتی کے ساتھ ہیں ــــ والسلام ــ یہاں کے تمام خرد و کلاں کی طرف سے خصوصاً والدہ ماجدہ کی جانب سے اور میاں رفیع الدین، عبد القادر اور خواجہ محمد امین[2] صاحب نیز تمام دوستوں کی طرف سے سلام پہونچے۔

مکتوب (۲) سلالۂ دودمانِ نجابت، خلاصۂ خاندانِ کرامت، مجمع المحاسن میر ابوسعید اسعدہم اللہ تعالیٰ بعد تحیاتِ اشتیاق مرتسمات از فقیر عبد العزیز واضح باد ــــ الحمد للہ علی العافیہ والسلامۃ منہ، والمسئول من اللہ سبحانہ، ان یدیمہما فینا وفیکم ــــ قبل ازیں دو مرتبہ مکاتیب محبت اسالیب رسید، متضمنِ وقائع عجیبہ و

---

[1] الشیخ العالم المحدث محمد بن ولی اللہ بن عبد الرحیم العمری الدہلویؒ احد رجال العلم والطریقۃ آپ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بڑے صاحبزادے (حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زوجۂ اولیٰ کے بطن سے تھے) دہلی میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے والد بزرگوار سے مکمل تعلیم حاصل کی اور ان کے انتقال کے بعد قصبہ بڈھانہ ضلع مظفر نگر میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۲۰۸ھ میں انتقال فرمایا۔ بڈھانہ کی جامع مسجد میں آپ کا مزار ہے {نزہۃ الخواطر جلد ۷}

[2] الشیخ العالم الکبیر الخواجہ محمد امین الولی اللّٰہی الکشمیری ــــ آپ اصل کے لحاظ سے کشمیری اور سکونت کے لحاظ سے دہلوی ہیں۔ آپ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بڑے خلفاء میں سے ہیں (آپ پہلے وہ شخص ہیں جو حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف نسبت کر کے ولی اللّٰہی کہے جاتے تھے۔ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد ان سے بھی اخذ علم کیا ہے جیسا کہ عجالۂ نافعہ سے واضح ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ان کے لیے بھی بعض رسائل تصنیف فرمائے ہیں۔ ان کی وفات غالباً ۱۱۸۷ھ میں ہوئی ہے۔ جیسا کہ حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے اگلے مکتوب گرامی سے ظاہر ہے {نزہۃ الخواطر جلد ۶}

کشوف صحیحہ بود خیلے مسرور گردانید حق تعالیٰ در ترقیات مراتب عالیہ افزائش کناد۔ توقع کہ ہموارہ یاد فرمابودہ براحوال سعادت مآل مطلع فرمودہ باشند کہ باعث زیادت اطمینان خواہد بود مزاج فقیر از مدت یکساں بلکہ زیادہ بسبب عارضہ برودت در طوبت گسلمند میباشد الحمد للہ دریں ایام اکثر عوارض زائل شدہ طبیعت رو بصحت کلی آوردہ۔ مگر گاہ گاہ اندک اثرے ظاہر میشود تدارک آں بادویہ مجربہ نمودہ می آید۔ خاطر جمع دارند۔ برادران عزیز القدر سلمہم اللہ تعالیٰ سلام می رسانند۔ رفیع الدین بفضل الٰہی از تحصیل علوم فارغ شدہ در مجلس ..... کہ مجمع علماء و فقرا بود دستار تبرک بستہ اجازت درس دادہ شد۔ الحمد للہ مردم بسیارے از تعلیم وے مستفید اند عبدالقادر ہم اکثر کتب تحصیل را خواندہ است بمرتبہ فضیلت رسیدہ ان شاء اللہ ببرکت ادعیہ طیبہ عنقریب فارغ التحصیل خواہد شد۔ عبدالغنی قرآن را ختم نمودہ در رمضان مبارک گزشتہ در محراب استادہ شد باہتمام تمام در حفظ قرآن شریف اہتمام نمود۔ الحال کتب فارسی شروع کردہ است بعد ماہ مبارک آئندہ قصد ہست کہ شروع در صرف و نحو کنانیدہ خواہد شد والسلام۔ میر ابواللیث و دیگر فرزنداں را سلام ہمہ ہا رسانند برادر صاحب بزرگ شیخ محمد صاحب سلام شوق می رسانند۔ والدہ صاحبہ نیز سلام و دعا گفتہ اند فقیر محمد امین (کاتب تحریر) سلام شوق ابلاغ می نماید ـــــ

ترجمہ ـــــ سلالۂ دودمانِ نجابت، خلاصۂ خاندانِ کرامت، مجمع المحاسن میر ابوسعید اسعدہم اللہ تعالیٰ فقیر عبدالعزیز کی طرف سے بعد سلام واضح ہو کہ میں عافیت و سلامتی کے ساتھ ہوں اور اللہ تعالیٰ سے درخواست ہے کہ وہ ہم کو اور آپ کو ہمیشہ عافیت سے رکھے ـــــ اس سے پہلے دو محبت آمیز مکتوب ملے جو وقائع عجیبہ اور کشوف صحیحہ پر مشتمل تھے، انھوں نے بہت مسرور کیا۔ حق تعالیٰ مراتب عالیہ میں مزید ترقی عطا فرمائے ـــــ امید ہے کہ (اسی طرح) ہمیشہ یاد فرما کر احوالِ سعادت مآل سے مطلع فرماتے رہیں گے تاکہ زیادت اطمینان کا موقع ملے ـــــ فقیر کا مزاج ایک سال سے بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے عارضۂ برودت

درطویت کے سبب کسلمند رہتا ہو۔ الحمد اللہ ان ایام میں اکثر عوارض زائل ہو گئے ہیں اور طبیعت صحت کلی کی طرف متوجہ ہو مگر کبھی کبھی تھوڑا بہت (بیماری کا) اثر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور اس کا تدارک مجرب دواؤں سے کیا جاتا ہے۔ خاطر جمع رکھیں ـــ رفیع الدین بفضل الٰہی تحصیل علوم سے فارغ ہو گئے ہیں ...... مجمع علماء و فقراء میں دستار تبرک ان کے سر پر باندھ کر اجازت درس دے دی گئی ہے۔ الحمد اللہ بہت سے لوگ ان کی تعلیم سے مستفید ہوئے ہیں۔ عبد القادر نے بھی اکثر کتب درسیہ کو پڑھ لیا ہے اور وہ بھی فضیلت و مولویت کے درجے کو پہونچ گئے ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو اور ولیٔ طلبہ کی برکت سے عنقریب وہ بھی فارغ التحصیل ہوں گے ـــ عبد الغنی نے قرآن شریف ختم کر لیا ہے۔ گزشتہ رمضان المبارک میں انھوں نے پہلی محراب سنائی۔ کامل استعداد کے ساتھ حفظ قرآن میں انھوں نے اہتمام کیا ہے ـــ اب انھوں نے کتب فارسی پڑھنی شروع کر دی ہیں۔ اگلے ماہ مبارک (رمضان) کے بعد قصد ہے کہ صرف و نحو شروع کرا دی جائے۔ والسلام ـــ میر ابو اللیث اور دیگر فرزندوں کو سب کا سلام پہونچائیں۔ برادر بزرگ شیخ محمد صاحب سلام شوق پہونچاتے ہیں۔ والدہ صاحبہ بھی سلام و دعا فرماتی ہیں۔ فقیر محمد امین (کاتب تحریر) سلام شوق پہونچاتا ہے۔

مکتوب (۳) بزبان عربی ...... السید الجید والشریف الاید طُرّۃ ناصیۃ السیادۃ غُرّۃ جبھۃ السعادۃ، نبوی الاخلاق والمآثر علوی الاعراق والمفاخر سید ابوسعید اکرمہ اللہ بشہود وجودہ وافاض علیہ برکات آبائہ وجُدُودہ الفقیر عبدالعزیز یرفع علیکم التحیات الوافیہ والدعوات الذاکیہ بُکرۃً وعشیًّا ویذکر مکارمکم السنیّہ ومناقبکم العَلیّہ اناء الصباح واطراف المساء .... ھذا وقد مضیٰ زمانٌ طویل لم نطّلع علیٰ خبرٍ من اخبارکم ولم نعرف اثرًا من آثارکم ولا اکرمتمونا فی ھذہ المدۃ المدیدۃ بصحیفۃٍ وماکان ذلک ظنًّا بکم فالمرجو منکم ان لاتنسونا من لطیف مکاتیبکم فانّ

المکاتیب نوع مواصلتہ۔ والسلام

الشیخ الکبیر محمد و رفیع الدین و عبدالقادر و عبدالغنی و شیخ محمد عاشق و مولانا نوراللہ و بابا فضل اللہ و خواجہ محمد امین و شیخ محمد جواد و شیخ محمد فائق کلہم یسلمون علیکم و یقبلون یدیکم والسلام۔

ترجمہ ——— ...... السید الجید دالشریف الاید ... سید ابوسعید اللہ تعالیٰ ان کو اپنے شہود سے مکرم کرے اور ان پر ان کے آباد اجداد والے فیوض و برکات برسائے

فقیر عبدالعزیز صبح و شام آپ کے لیے دعاہائے فراواں اور رات دن آپ کے مکارم اخلاق اور مناقب عالیہ کا تذکرہ کرتا رہتا ہے ...... ایک طویل زمانہ گزر گیا کہ آپ کی کوئی خیر خبر نہیں ملی اور آپ کے آثار میں سے کوئی اثر معلوم نہ ہو سکا اور نہ آپ نے اس مدتِ مدیدہ میں اپنے مکتوب گرامی سے سرفراز فرمایا۔ آپ سے ایسی امید نہ تھی آپ سے تو یہ امید ہے کہ ہمیں اپنے مکاتیب سے فراموش نہ فرمائیں گے اس لیے کہ مکاتیب ایک قسم کی ملاقات ہوتے ہیں ——— والسلام ——— برادر بزرگ شیخ محمد، رفیع الدین، عبدالقادر، عبدالغنی، شیخ محمد عاشق، مولانا نوراللہ، بابا فضل اللہ، خواجہ محمد امین، شیخ محمد جواد اور شیخ محمد فائق (ابن شیخ محمد عاشق) یہ سب کے سب آپ کو سلام کہتے ہیں اور آپ کی دست بوسی کرتے ہیں۔ والسلام۔

مکتوب۔ میر ابوسعید رائے بریلویؒ بنام صاحبزادگان شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ۔

(بہ زبان عربی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ——— الحمد للہ الذی جعل المحدثین المجتبین والعلماء ورثۃ الانبیاء وعلمہم اسرار شیوناتہ وتنزلاتہ فی مدرستہ الازلیہ ...... وعززہم بالعزۃ القدسیۃ حیث تعالیٰ ذوالعظمۃ والکبریاء انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء والصلوٰۃ والسلام علیٰ افضل الرسل والانبیاء وعلیٰ الہ واصحابہ الذین ہم نجوم الاہتداء وعلیٰ مشایخنا الکرام والنقباء ——— اما بعد فتم الکلام بمفاتح التحفۃ الصبر والاکرام فیسلم

علیکم وَیَبْلُ احوالکم الکریمہ المحب المخلص الداعی الی جناب العالی ابوسعید .... مولانا و محمد ومنا الشیخ عبد العزیز و شیخ محمد و شیخ رفیع الدین و شیخ عبد القادر و شیخ عبد الغنی سلمکم اللہ تعالیٰ بالبرکات وامکث اللہ وجودکم فی الدنیا بالحفظ والامان ویسرکم فی الدار الآخرۃ باعلی الجنان وصانکم اللہ من الآفات والعاہات بحرمۃ النبی آخر الزمان وبعد فان سألتم عن احوالی فللّٰہ الحمد والمنۃ شرفنا اللہ تعالیٰ بزیارۃ الحرمین الشریفین زادھما اللہ شرفاً وتعظیماً ودخلنا فی شہر ربیع الثانی فی مکۃ الشریفۃ فی آخر ثلث اللیل وکان الوقت مبارکاً منوراً بجذبنا الیہا حتی دخلنا من باب السلام مع ابنی ورفقائی بین یدی الکعبۃ المبارکۃ وشغفناھا ودعونا فی حقنا وفی حق مشائخنا واصولنا وفروعنا و جمیع المؤمنین والمؤمنات ما کان ینبغی لہم وأدّینا العمرۃ وسعینا بین الصفا والمروۃ ولبثنا فیہا .... واعطانا اللہ فیہا برکۃً معنویۃً ـــــ یوماً کنتُ فی منزلی مضطجعاً متیقظاً متفکراً فی سرّ الکعبۃ الشریفۃ وطوافہا وخصوصیتہا فی ھذا المکان المخصوص دون مکان آخر۔ نبّانی اللہ تعالیٰ حقیقۃ الکعبۃ وسرّ طوافہا وھی الخ............. والملتمس من حضرتکم اذا وصل ھذا الورق الی جنابکم الاعلیٰ ان تلاحظوا مضمونہا وتدعون ما کان الخیر فی حقنا ان اللہ لا یضیع اجرکم کتبت عجلۃً لا تنظروا الی قصورنا فی العلم۔ العاقبۃ بالعافیۃ والسلام والاکرام۔

ترجمہ مکتوب شاہ ابو سعید حسنیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ...... بعد الحمد والصلوٰۃ ..... دعا گو ابو سعید آپ حضرات کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے ..... "آپ حضرات" سے میری مراد ....

مولانا و مخدومنا شیخ عبدالعزیز، شیخ محمد، شیخ رفیع الدین، شیخ عبدالقادر اور شیخ عبدالغنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو برکات کے ساتھ سلامت رکھے اور دنیا میں آپ کا وجود حفظ و امان کے ساتھ قائم رکھے نیز آخرت میں اعلیٰ جنت نصیب فرمائے اور (اس جہان میں) آفات و بلیات سے محفوظ رکھے۔ بحرمۃ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم ......

... اللہ کی حمد ہے اور اس کا احسان ہے کہ اس نے ہم کو حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف فرمایا۔ زادہما اللہ شرفاً و تعظیماً۔ ہم مکہ معظمہ میں ربیع الثانی کے مہینے میں رات کے آخری تلث میں پہونچے تھے۔ وہ وقت بڑا ہی مبارک اور منور تھا اور اس وقت ایک خاص کشش خانۂ کعبہ کی طرف تھی ـــــ چنانچہ ہم اپنے لڑکے (میر ابواللیث) اور اپنے رفقاء کے ساتھ باب السلام سے (مسجد الحرام میں) داخل ہوئے اور کعبۂ مبارکہ کے سامنے جاکر کھڑے ہو گئے۔ ہم نے خانۂ کعبہ کی زیارت کی اور اپنے حق میں اور اپنے مشائخ، اصول و فروع اور جمیع مومنین و مومنات کے حق میں دعائے خیر کی۔ پھر ہم نے عمرہ ادا کیا اور (طواف کے بعد) صفا و مروہ کے درمیان سعی کی ـــــ مکہ معظمہ میں ہم کئی دن ٹھہرے اللہ تعالیٰ نے ہم کو مکہ معظمہ میں برکت معنویہ عطا فرمائی ـــــ وہاں ایک دن میں اپنی قیام گاہ میں لیٹا ہوا تھا۔ جاگ رہا تھا اور کعبۂ شریفہ کی حقیقت کے سلسلے میں سوچ رہا تھا کہ اس کے طواف میں کیا مصلحت ہے اور دوسرے مقامات کو چھوڑ کر اسی مکان مخصوص کی کیا خصوصیت ہے؟ اس وقت اللہ تعالیٰ نے مجھے حقیقتِ کعبہ اور اس کے طواف کی مصلحت و خصوصیت سے آگاہ فرمایا اور وہ یہ ہے ...... [یہ ایک دقیق اور خالص الہامی مضمون ہے اس لیے اس کو یہاں درج نہیں کیا گیا] (آخر میں) ہم آپ حضرات سے التماس ہے کہ جب یہ مراسلہ آپ کی خدمت عالی میں پہونچے تو اس کے مضمون کو ضرور ملاحظہ فرمالیں اور ہمارے حق میں جو خیر ہو اس کی دعا فرمائیں ـــــ اللہ تعالیٰ آپ کا اجر ضائع نہیں فرمائے گا ـــــ میں نے یہ خط عجلت میں لکھا ہے ـــــ ہمارے قصور علمی پر نظر نہ فرمائیے گا ـــــ انجام عافیت کے ساتھ ہو ـــــ والسلام والاکرام ـــــ

جواب از طرف حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (بہ زبان عربی)

مکتوب (۲) ـــــ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ـــــ الحمد للہ الذی کشف اسرار العوالم صغیرھا وکبیرھا وکلھا وجُزءھا وغیبتھا وشہادتہا وارواحھا ومثالھا علیٰ من یشاءُ ـــ لا سیماً النبی الاُمّی الھاشمی البالغ الغایۃ القصویٰ فی الاعتلاءِ صلّی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصُحبہٖ ما دامت الارض والسماء ـــــ الی السیدِ الحبیبِ النسیبِ العارف اللبیبِ صاحب الکمالاتِ العالیہ والمعارف السَنیۃ ـــ حاج الحرمین الشریفین زائر المکانین المحترمین وارث الاسرار بالاستحقاق، مصداق السعید من سعد فی بطن اُمّہٖ بلاخلاف وشقاق سلمہ اللہ تعالیٰ وعجّل لنا بالخیر والسلامۃ لُقیاہُ من الفقیر عبدالعزیز وسائر اخوانہٖ المشاقین الی لقائکم الراغبین الی اللہ فی طول بقائکم ـــ اما بعد ـــ فقد وصلت الرقیمہ الکریمہ منبئۃً عن سلامۃِ ذاتکم مخبرۃً عن تفاصیل حالاتکم مُبشّرۃً بحصول الحج الشریف والزیارۃ المنیف لکم ولولدکم الارشد ورفقائکم وانکم قد دعوتُم فی ذلک المکان المعظم والمکرم المجسم فی تلک الساعۃ المیمونۃ المبارکۃ المفخمہ لجمیع المومنین والمومنات ولذوی الحقوق منکم علی التخصیص المرجوانّ دعائکم ان شاء اللہُ مستجابٌ بلاشکٍ ولاارتیاب جزاکم اللہُ تعالیٰ احسن الجزاء ورزقکم حُسن المآب ـــــ فحمدنا اللہ تعالیٰ علیٰ کلّ ذلک وشکرناہ وغبطنا لانفسنا وتمنیناہ ان اللہ تعالیٰ علیٰ تحصیلہ لنا قدیر ...... واماما اشرتم الیہ من حصول البرکات المعنویہ فی تلک الاماکن العالیہ فذلک ھو الیقین والصواب وقرّۃُ عین الاحباب ادام اللہ لکم الترقیات وشرّفکم العوالی التجلیات واماما کتبتم

فی سرّ الکعبۃ وطوافہا فہو امر مطابقٌ لکشف الکبار من الاولیاء رضوان اللہ علیہم اجمعین .... وبالجملۃ مکشوفکم حق وصواب ھنیئاً لکم امثال ھذہ المعارف الحقیہ والعلوم العمیقۃ الدقیقۃ واما التمستم من الدعاء فنحن نلتمس منکم اضعافہ ولانغفل عن الدعاء فی حقکم وفی حق ولدکم وکل من توسّل بکم طرفۃ عینٍ ــ تقبّل اللہ منّا ومنکم ورزقنا وایاکم سعادۃ الدارین والسّلام۔ وقد توفّی الی رحمتہ من اصحاب سیّدنا وشیخنا قدّس سرّہٗ الشیخ اھل اللہ والشیخ محمّد عاشق والشیخ نور اللہ وخواجہ محمد امین وحاجی محمّد سعید البریلوی فادعوا اللہ تعالیٰ فی حقّہم ــــــــ

ترجمہ ــــ یہ خط عبدالعزیز اور اس کے تمام بھائیوں کی طرف سے ہے ــــــ جو مکتوب الیہ کی ملاقات کے مشتاق اور ان کی طول عمر کے اللہ تعالیٰ سے خواہاں ہیں۔ ــــ اور حبیب ونسیب، عارف لبیب، صاحب کمالات ومعارف عالیہ حاجی حرمین شریفین زائر مکانین محترمین ...... (میر ابوسعید) کی طرف لکھا جا رہا ہے ــ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے اور خیر وعافیت کے ساتھ ہم کو جلد ان کی ملاقات میسر کرائے ــ ــــ بعد حمد وصلوٰۃ واضح ہو کہ مکتوب گرامی ملا جو آپ کی سلامتی کی اطلاع اور آپ کے تفصیلی حالات کی خبر دینے والا تھا ــــ اس میں حصول حج وزیارت کی خوشخبری بھی تھی اس خط سے معلوم ہوا کہ آپ کے ساتھ آپ کے صاحبزادے (میر ابوللیث) اور آپ کے رفقاء کو بھی یہ سعادت حج وزیارت نصیب ہوئی ــــ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے اس مقام معظم ومکرم (مسجد الحرام) میں ساعتِ سعید کے اندر تمام مومنین ومومنات کے لیے عموماً اور اہل حقوق کے لیے خصوصاً دعا فرمائی۔ امید تو یہی ہے کہ آپ کی دعا ان شاء اللہ تعالیٰ بے شک وشبہ مستجاب ہوگی ــــ اللہ تعالیٰ آپ کو بہترین جزا دے اور آخرت کی بھلائی عطا کرے ــــ ہم نے (آپ کا خط پڑھ کر) مندرجہ مکتوب باتوں پر اللہ کی حمد کی اور اس کا شکر ادا کیا۔ ہم کو آپ کی اس کامیابی پر غبطہ و رشک ہوا اور اس

کامیابی کی اپنے لیے بھی تمنا کی ـــــ اللہ تعالےٰ اس سعادت و کامیابی کے حاصل کرانے پر قادر ہے ...... آپ نے ان مقامات مقدسہ میں حصولِ برکاتِ معنویہ کا جو ذکر فرمایا ہے وہ بالکل حق و صواب اور احباب کی آنکھوں کا نور ہو۔ اللہ تعالےٰ آپ کی ترقیات کو دائماً برقرار رکھے اور آپ کو تجلیات سے مشرف فرمائے ـــــ آپ نے کعبہ اور طوافِ کعبہ کی حقیقت پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی صحیح اور کبار اولیاء رحمہم اللہ کے کشف کے مطابق ہے ـــــ ...
.... حاصل کلام یہ ہے کہ آپ کا مکشوف بالکل صحیح و درست ہے۔ آپ کو اس طرح کے معارفِ حقّیہ اور علوم دقیقہ مبارک ہوں ـــ اور آپ نے دعا کا جو التماس کیا ہو تو ہم بھی آپ سے زیادہ سے زیادہ دعا کی درخواست کرتے ہیں اور آپ کے اور آپ کے صاحبزادے اور آپ کے متوسلین کے حق میں دعا کرنے سے ایک لمحہ غافل بھی نہیں ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ ہماری اور آپ کی دعا قبول کرے اور ہمیں اور آپ کو سعادتِ دارین نصیب فرمائے ـــــ سیدنا و شیخنا قدس سرہٗ (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) کے اصحاب میں سے یہ حضرات وفات پاکر جوارِ رحمت خداوندی میں پہونچ گئے ہیں ـــــ

(۱) شیخ اہل اللہ[۱] (۲) شیخ محمد عاشق (۳) شیخ نور اللہ (۴) خواجہ محمد امین (۵) حاجی محمد سعید بریلوی ـــــ ان حضرات مرحومین کے حق میں دعائے مغفرت فرمائیں ـــــ

---

[۱] الشیخ العالم الصالح محمد سعید بن محمد ظریف بن خان محمد بن یار محمد ابن خواجہ احمد الافغانی الدہلوی ـــــ ـــــ آپ افغانستان میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشو و نما پائی۔ تحصیل علم کے لیے دہلی کا سفر کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہو کر کمالاتِ علمیہ سے مالا مال ہوئے۔ آپ بھی سفرِ حجاز میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ہمراہ تھے۔ اپنے شیخ کی حیات میں برابر خدمتِ اقدس میں رہے۔ بعد وفاتِ شاہ صاحبؒ آپ دہلی سے بانس بریلی تشریف لے آئے۔ حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں نے آپ کو اپنے صاحبزادے عنایت خاں کا معلم مقرر کیا۔ چنانچہ آپ نے بریلی ہی میں اقامت کر لی۔ اور وہیں ۱۱۸۰ھ سے کچھ پہلے انتقال فرمایا۔ آپ کے پوتے مولانا نجم الغنی نے صاحب نزہۃ الخواطر

(باقی بر صفحہ ۴۶)

مکتوب سید محمد نعمان حسنی بنام حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ۔

[جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے آخری حالات اور دیگر نادر معلومات پر مشتمل ہے۔]

باسمہٖ سبحانہ وتعالیٰ شانہٗ ـ الحمد للہ علی النعماء والرضا علی القضا والصبر علی المصیبۃ والبلاء ـ والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الشاکرین وزبدۃ الراضین وقدوۃ الصابرین شفیع المذنبین ورحمۃ للعٰلمین محمدٍ وآلہٖ وصحبہٖ الطیبین الطاہرین وعلیٰ ورثتہٖ علماء الراسخین واولیاء المرشدین الیٰ یوم الدین بعد ھذا ـ اگر شرح سوگواری . . . واقعۂ ارتحال امام سنت وجماعت ومقتدائے ارباب کرامت، پیشوائے عرفائے زماں سرآمد اولیائے جہاں قطب زمانی، محبوب سبحانی سیدنا ومرشدنا ولی اللہ فاروقی مجدد آئۃ دوم الف ثانی رضی اللہ عنہ ازین عالم پُر ملال بصوب دار الافضال بوصال ذو الجلال بر صفحۂ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳)
کو ہی سنِ وفات بتایا ہے۔ مکتوب حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے بھی قریب قریب یہی سنِ وفات معلوم ہوتا ہے ــــ {نزہۃ الخواطر جلد (۶)} ــــ تاریخ کا یہ ابہام ... ست ساکھ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے کامل ربط رکھنے والی پانچ اہم اور باکمال شخصیتیں ایک سال کے اندر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں ـ اس کا انکشاف حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے مکتوب گرامی ہی سے ہو ... حضرت شاہ ابوسعید حسنی ۱۲۳۷ھ میں حجاز کو روانہ ہوئے اور ۱۲۳۹ھ میں واپس آئے ہیں۔ واپسی پر ۱۲۳۹ھ میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے ان کو یہ مکتوب لکھا ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ ۱۲۳۹ھ میں ان سب حضرات کا انتقال ہوا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ۱۲۴۰ھ سب کا سال وفات ہو یا بعض کا ۱۲۴۰ھ میں اور بعض کا ۱۲۳۹ھ میں وصال ہوا ہو لیکن مولانا نجم الغنی نے اپنے دادا کے متعلق یہ جو دی ہو کہ ۱۲۴۰ھ سے کچھ پہلے یعنی ۱۲۳۹ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے جس سے حاجی محمد سعیدؒ کے لیے ۱۲۳۹ھ متعین ہے مگر دوسرے چار حضرت کے متعلق پھر احتمال ۱۲۴۰ھ کا بھی ہے۔ اسی وجہ سے صاحب نزہہ نے احتیاطاً ان بقیہ چار بزرگوں کی تاریخ وفات کو ان الفاظ میں لکھا ہے "قد توفی ھو سنۃ سبع وثمانین ومائۃ والف" نزہۃ الخواطر جلد ۶ میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے جس مکتوب گرامی کا کئی جگہ ذکر ہے وہ یہی مکتوب (۱۴) ہے ــــ

سلہ مولانا سید محمد نعمان بن سید محمد ابن سید محمد ... ابن عارف باللہ سید محمد علم اللہ حسنی رائے بریلوی قدس سرہم۔

روزگار ثبت یابد ہر آئینہ مانند حالِ ما غریبان سر دے

چہ بخاطر رسید یار مرا
که بہجران کشید کار مرا

وامصیبتاہ ـــــ ایں چہ بے نیازی .... است کہ ہمچنیں روح مقتدائے ما

در کمتر وقت بہ رخصت ودود ساگی نداء ارجعی الی ربک راضیۃً مرضیہ دادند و اصحاب بدع و ضلال

را عشرت آگین نمودند و اصحاب دین را اندوہگین کردند یعنی بتاریخ سلخ محرم الحرام ۱۱۷۶ھ

یک ہزار و یکصد و ہفتاد و شش یوم السبت وقت الظہر بامر داعی برحق روح مطہر آنحضرت

از قالبِ عنصری مفارقت نمودہ باوج علیین نشیمن ساختہ ...... حالتِ تمام اصحاب و احباب

از مفارقتِ آنجناب چناں تباہ و خراب بود کہ از حیزِ تحریر بیرون است ..... إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ

رَاجِعُوْن ـ رحمۃ اللہ علیہ وَعلیٰ من بجنابہ یتوسلون آمدیم بر اینکہ از فضل الٰہی و تصدق

جناب حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم جاذبۂ حضرت ایشاں علیہ الرحمۃ ایں

عاصی را بسوئے خود کشید بشہر ذی قعدہ در بڈھانہ رفتہ بتقبیل آستانۂ متبرکہ استسعاد یافتہ

و بملازمت جناب قدسی القاب مشرف گردید و بہ حالات خود توجہات عالیات بیش از

بیش یافتہ از انجا کہ حضرتِ ایشاں بجہت تدادی و تدابیر در ماہ ذی حجہ تاریخ نہم بشہر

دہلی بمکان با بافضل اللہ در مسجد روشن الدولہ بچوک سعد اللہ خاں نزول فرمودند از فرزندان

گرامی میاں محمد صاحب و میاں عبد العزیز و میاں رفیع الدین مدظلہم العالی ـــــ

و میاں محمد عاشق صاحب و میاں اہل اللہ صاحب و میاں محمد فائق و میاں محمد جواد و

محمد امین وغیرہ یاران حاضر خدمت بودند و این غلام و میر محمد عتیق و میر قاسم علی کہ در وقت

آخریں شرفِ انتساب بیعت یافتہ ـــ ہر روز بشرف حضور پر نور و خدمت گاری وسیلۂ

حضور در حضور سعادت اندوز میشدیم ـ متفقا ایں مجلسِ آخریں عجب مجلسے بود بر فیض و اثما

مہبطِ ملا ملکوت و نزول ارواح طیبہ ارکان عالم ناسوت میگردید و نفحاتِ انس و رحمت و

رشحات قدس و برکت بمثالِ نزول غیث می بارید ـ اکثر یارانِ اہل نسبت بوجدانِ صحیح

خودی دریافتند ـــــ واحسرتا اہل اللہ و عرفا لا یزال در ہر زمان می باشند اما ایں

چنیں مرد با جمعیتِ اوصاف حمیدہ اعلم بکتاب و سنت باجتہاد مطلق و در حقائق و

و معارف بحرِ مواج و در علوم دیگر محض فیاض پس از صدہا سال می آید ؎

دورہا باید کہ تا یکمرد صاحبدل شود بایزید اندر خراسان یا سہیل اندر یمن

یاران می باید کہ مصابرت و شکیبائی ورزیدہ نسبتِ رابطۂ حضرت شیخ را بمجامع ہمت در تصور نہادہ بمراقباتِ معلومہ مشغول باشند ان شاء اللہ تعالیٰ فیض صحبت و رابطہ برابر خواہد بود کما یفیض من بعض رسالاتہ رحمۃ اللہ علیہ — و الحمد للہ رضامندی حضرت صاحب قدس سرہ از آنصاحب و توجہاتِ عالیات برحال ایشان زیادہ از حد بیان یافتہ اکثر اوقات استفسارِ احوالِ سامی می فرمودند ماجرائے غارتگری ابدالیان و رسیدنِ آنصاحب در عین رستخیز و انطفاء یافتن التہابِ نہیب بسبب قدوم گرامی از زبان دُرفشان مودّی ساختند و شاید کہ منظور لقائے آخرین بضمیر منیر بودہ باشد مرّۃً فرمودند کہ "میر ابوسعید ارادۂ آمدن دارند اگر زود برسند بہتر باشد" صاحب من ظاہر صحبتِ ایشان را باستتار کشیدہ تصنیفات آنحضرتؒ قریب نود بل زیادہ در علوم دین از تفسیر و اصول و فقہ و کلام و حدیث مثل حجۃ اللہ البالغہ و اسرار فقہ و منصور و ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء و ترجمہ قرآن کہ ہر واحد قریب ہشتاد و نود جزو کلاں بحجم خواہد بود و دیگر رسائل در حقائق و معارف مثل الطاف القدس و ہمعات و فیوض الحرمین و انفاس العارفین و غیرہم کہ نشان از صحبت و برکت خدمت می دہند می باید کہ عزیمت بر این آرند کہ ہمہ را نویسانیدہ رائج نمایند باندک توجہات سرانجام خواہد یافت و مثل این تصنیفات واللہ اعلم در اسلام تصنیف شدہ باشد یا نہ۔ چنانچہ ارباب بصیرت عبرت یافتہ اعتراف دارند و کلام ایشان در ہر باب کہ نوشتہ اند اصول است ...... و یقین این فقیر و دیگر صاحبزادہا و یارانِ حضرت بملاحظۂ فرطِ محبتِ سامی بجنابِ حضرت۔ انیست کہ بمجردِ شنیدنِ این حادثۂ عظیمہ جہتِ فاتحہ و روحانیت و زیارت مرقد مطہر راہی ایں صوب خواہند شد — لہٰذا منتظرِ قدوم ہستم اگر زود تشریف بیارند بارے بملاقات سامی مسرور الوقت شوم و اگر توقف در آمدن باشد اعلام نمایند کہ فقیر ہم عزم مراجعتِ وطن دارد — و دیگر آنکہ میاں محمد عاشق صاحب بعد سلام فرمودہ اند کہ میر ابوسعید جیو را بنویسید کہ ہر مکاتیب

حضرتِ ایشان کہ بجناب آنصاحب شرف صدور یافتہ باشند نقل آنہا البتہ بغرض پسند کہ داخلِ مکاتیب نمودہ شود از حضرت میاں اہل اللہ صاحب و دیگر یاراں و صاحبزادہ اسلام اسم باسم مطالعہ فرمائند — و کیفیت ارتحال و وصالِ مرحوم و مغفور غفران پناہ بھائی محمد معین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ..... بجناب عالی حضرت صاحبؒ قبلہ در مقام بڈھانہ عرض کردم فاتحہ بروحانیت خواندند و تاسفہا نمودند ——

ترجمہ — باسمہ سبحانہ و تعالےٰ شانہٗ — اللہ تعالےٰ کی حمد ہے اس کی نعمتوں پر نیز جذبۂ رضا بالقضا کے حصول پر اور مصیبت و بلا میں صبر کے حاصل ہونے پر اور درود و سلام سید الشاکرین، زبدۃ الراضین، قدوۃ الصابرین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ پر اور (آپ کے ضمن میں) آپ کے آل و اصحاب پر جو کہ طیب و طاہر تھے اور آپ کے وارثین یعنی علماء راسخین اور اولیاء مرشدین پر۔ تا قیامِ قیامت ——

حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ امام سنت و جماعت، مقتدائے اربابِ کرامت، پیشوائے عرفائے زمان، سرآمد اولیاء جہاں، قطبِ زمانی، محبوبِ سبحانی سیدنا و مرشدنا ولی اللہ فاروقی مجدد وقت رضی اللہ عنہ کے انتقالِ پُرملال کا واقعہ اگر تفصیل سے لکھا جائے تو ہم جیسے غمزدہ لوگوں کے مناسب حال ہے —— ہمارے دوست کے دل میں کیا آیا کہ ہمیں فراق و مہجوری میں مبتلا کر گیا —— وامصیبتاہ — اللہ تعالےٰ کی شانِ بے نیازی کا عجیب نمونہ ہے کہ ایسے مقتدا کی روح کو صرف ۶۲ سال کی عمر میں ارجعی الیٰ ربکِ راضیۃ مرضیہ (اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف راضی اور پسندیدہ ہو کر رجوع ہوجا) کی ندا دے دی گئی اور بدعت و ضلالت والوں کو خوش اور اصحاب دین کو اندوہگین کر دیا گیا —— یعنی محرم الحرام ۱۱۷۶ھ کی آخری تاریخ میں ہفتے کے دن ظہر کے وقت حکم خداوندی کے مطابق حضرتِ اقدس کے طائر روحِ مطہر نے اوجِ علیین پر اپنا نشیمن بنالیا ....

اصحاب و احباب کی حالت، آنجنابؒ کی مفارقت سے ایسی خراب و خستہ تھی کہ احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتی .... اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ ——

اللہ تعالیٰ کی رحمت آپ پر اور آپ کے متوسلین پر نازل ہو ـــــــ

اب میں اصل مقصد کی طرف آتا ہوں ـــــ فضلِ الٰہی سے اور درگاہِ حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ وسلم کے صدقے میں اس عاصی کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی کشش نے اپنی طرف کھینچا چنانچہ ذی قعدہ (۱۱۷۵ھ) کے مہینے میں بڈھانہ ضلع مظفر نگر جاکر آستاں بوسی کی سعادت حاصل ہوئی اور جناب قدسی القاب (حضرت شاہ صاحبؒ) کی صحبتِ اقدس سے مشرف ہوا۔ بڈھانہ سے حضرتِ ایشاں ۷ ذی الحجہ (۱۱۷۵ھ) کو بغرض علاج شہر دہلی تشریف لے آئے اور وہاں بابا فضل اللہ کے مکان پر مسجد روشن الدولہ[1] کے احاطے میں جو چوک سعد اللہ خاں میں واقع ہے۔ فروکش ہوئے ـــــ فرزندان گرامی قدر میں سے میاں محمد میاں عبد العزیز، میاں رفیع الدین مدظلہم العالی (اور اقربا و متوسلین میں سے) میاں محمد عاشق صاحب، میاں اہل اللہ صاحب، میاں محمد فائق، میاں محمد جواد (پھلتی) اور خواجہ محمد امین وغیرہ حاضرِ خدمت تھے۔

یہ غلام اور میر محمد عتیق نیز میر قاسم علی (ساکنان رائے بریلی) جو کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے آخری ایام میں شرفِ بیعت سے مشرف ہوئے تھے۔ ہر روز حاضری اور خدمتگاری سے سعادت اندوز ہوتے رہتے تھے ـــــــ

شفیق من! یہ آخری مجلسیں بھی عجیب پُرکیف اور پُرفیض تھیں ..... نفحاتِ اُنس و رحمت اور رشحات قدس و برکت بارش کی طرح برستے تھے۔ اکثر اہل نسبت حضرات اپنے وجدانِ صحیح سے اس کو محسوس کرتے تھے ـــــ ..... اہل اللہ اور عارف تو ہمیشہ ہر زمانے میں ہوتے ہیں مگر ایسا مردِ حقانی جو جمیع اوصافِ حمیدہ کا حامل ہو اور جو

---

[1] مسجد و مدرسہ روشن الدولہ ـــ شاہجہاں آباد (دہلی) کی دو عمارتیں (دریبے کے اندر) نواب روشن الدولہ کی بنوائی ہوئی ہیں۔ ۱۱۴۲ھ میں نواب موصوف نے بنوائی تھیں ـــ مسجد کے برج سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں اور نہایت خوبصورت ہیں۔ بڑے در کی پیشانی پر کتبہ کندہ ہے مدرسہ کا مکان ۱۲۲۲ھ سے کوتوالی کے متعلق ہو گیا ہے (واقعات مولفہ مولوی عبد الحی دہلوی)

کتاب و سنت کا اجتہادی شان سے بہترین عالم ہو نیز حقائق و معارف میں بحر مواج ہو اور دیگر علوم میں دریائے زخار ہو ۔۔۔ صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہو (عہ) بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا ...... دوستوں کو چاہیے کہ صبر و شکیبائی کو اختیار کرکے حضرت شیخ کی نسبت رابطہ کو ہمت کے ساتھ تصور میں لاکر مراقبات معلومہ میں مشغول رہیں۔ اگر اللہ تعالے نے چاہا تو فیض صحبت و رابطہ برابر باقی رہے گا جیسا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعض رسائل سے یہ بات واضح ہوتی ہے ۔۔۔ یہ امر بھی لائق حمد ہے کہ حضرت صاحب قدس سرہ کی آپ سے رضامندی اور آپ پر ان کی توجہات عالیہ کو میں نے حد بیان سے زیادہ پایا۔ اکثر اوقات آپ کے حالات دریافت فرماتے رہتے تھے ۔۔۔ ابدالیوں کی جنگ کا واقعہ اور آپ کا عین اس ہنگامۂ قیامت خیز میں پہونچنا اور آپ کے قدوم گرامی سے آتش فتنہ کا فرو ہو جانا۔ ان باتوں کو حضرت قدس سرہ اپنی زبانِ دُرفشان سے بیان فرمایا کرتے تھے ۔۔۔ شاید آپ سے آخری ملاقات کی تمنا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں تھی چنانچہ ایک مرتبہ یوں فرمایا "میر ابو سعید آنے کا ارادہ کر رہے ہیں اگر وہ جلدی آجائیں تو اچھا ہو" ۔۔۔

صاحب من! حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ظاہری صحبت تو اب میسر نہیں آسکتی البتہ علوم دینیہ میں ان کی تصنیفات نوے کے قریب بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں ۔۔۔ تفسیر، اصول فقہ، کلام اور حدیث میں ۔۔۔ جیسے حجۃ اللہ البالغۃ، اسرار فقہ (عہ)، منصور (عہ)، ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء جن میں سے ہر ایک کی کافی بڑی ضخامت ہے ۔۔۔ ان کے علاوہ دیگر رسائل ہیں جو حقائق و معارف پر مشتمل ہیں۔ جیسے الطاف القدس، ہمعات، فیوض الحرمین اور انفاس العارفین وغیرہا یہ کتابیں آپ کے فیوض و برکات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ آپ قصد اس امر کا کریں کہ ان تمام کتابوں کو لکھوا کر رائج فرمائیں۔ یہ کام تھوڑی سی توجہ سے انجام پا سکتا ہے ۔۔۔ معلوم نہیں کہ ایسی تصنیفات گزشتہ دور میں ہوئی ہیں یا نہیں؟ واللہ اعلم ۔۔۔ ارباب بصیرت ان کتابوں کی افادیت کا اقرار کرتے ہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ

عہ، عہ یہ دونوں کتابیں حیات ولی کی فہرست تصانیف میں موجود نہیں ہیں۔

کا کلام ہر باب میں اصولی حیثیت رکھتا ہے ...... اس فقیر کو اور صاحبزادگان نیز تمام یاران حضرتؒ کو آپ کی محبت کے پیش نظر یہ یقین ہے کہ جیسے ہی آپ اس حادثہ عظیمہ (وفات حضرت شاہ صاحبؒ) کی خبر سنیں گے (فوراً) فاتحہ پڑھنے اور مرقد مطہر کی زیارت کرنے کے لیے دہلی کو روانہ ہو جائیں گے۔ اسی وجہ سے میں منتظر قدوم ہوں اگر جلدی تشریف لائیں تو میں ملاقاتِ سامی سے مسرور الوقت ہو جاؤں — اگر تشریف لانے میں کچھ دیر ہو تو مطلع فرما دیں کیونکہ فقیر بھی وطن کو واپس جانے کا قصد رکھتا ہے — دوسری بات یہ ہے کہ میاں محمد عاشق صاحب (پھلتی) بعد سلام فرماتے ہیں کہ میر ابوسعید کو لکھو کہ حضرت اقدسؒ کے جتنے مکتوبات بھی ان کے نام صادر ہوئے ہیں ان کی نقول ضرور بھیجیں تاکہ ان کو داخلِ مکاتیب کیا جائے۔ حضرت میاں اہل اللہ صاحب اور دیگر متوسلین نیز صاحبزادگان کی طرف سے نام بنام سلام مطالعہ فرمائیں۔ میں نے بڈھانہ میں حضرت اقدسؒ کی خدمت میں مرحوم و مغفور بغفران پناہ بھائی محمد معین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی کیفیت بیان کر دی تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی روح کو ایصال ثواب کیا تھا اور بڑا افسوس ظاہر فرمایا تھا۔

کائنات میں خدا کی گواہی

(جناب وحید الدین خاں صاحب)

زمین پر زندگی کے پائے جانے کے لیے اتنے مختلف حالات کی موجودگی ناگزیر ہے کہ ریاضیاتی طور پر یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ اپنے مخصوص تناسب میں محض اتفاقاً زمین کے اوپر اکٹھا ہو جائیں۔ اب اگر ایسے حالات پائے جاتے ہیں تو لازماً یہ ماننا ہوگا کہ فطرت میں کوئی ذی شعور رہنمائی موجود ہے جو ان حالات کو پیدا کرنے کا سبب ہے۔

زمین اپنی جسامت کے اعتبار سے کائنات میں ایک ذرہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی مگر اس کے باوجود وہ ہماری تمام معلوم دنیاؤں میں اہم ترین ہے کیونکہ اس کے اوپر حیرت انگیز طور پر وہ حالات مہیا ہیں جو ہمارے علم کے مطابق اس وسیع کائنات میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

سب سے پہلے زمین کی جسامت کو لیجیے۔ اگر اس کا حجم کم یا زیادہ ہوتا تو اس پر زندگی محال ہو جاتی۔ مثلاً یہ کرۂ زمین اگر چاند اتنا چھوٹا یعنی اس کا قطر موجودہ کی نسبت سے $\frac{1}{4}$ ہوتا تو اس کی کشش ثقل، زمین کی موجودہ کشش کا $\frac{1}{6}$ رہ جاتی۔ کشش کی اس کمی کا نتیجہ یہ ہو جاتا کہ وہ پانی اور ہوا کو اپنے اوپر روک نہ سکتی جیسا کہ جسامت کی اسی کمی کی وجہ سے چاند میں واقع ہوا ہے۔ چاند پر اس وقت نہ تو پانی ہے اور نہ کوئی ہوائی کرہ ہے۔ ہوا کا غلاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ رات کے وقت بے حد سرد ہو جاتا ہے اور دن کے وقت تنور کی مانند جلنے لگتا ہے۔ اسی طرح کم جسامت کی زمین جب کشش کی کمی کی وجہ سے پانی کی اس کثیر مقدار کو روک نہ سکتی جو زمین پر موسمی اعتدال کو باقی رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے اور اسی بنا پر ایک سائنسداں نے اس کو عظیم توازنی پہیہ GREAT BALANCE WHEEL

ؔ MAN DOES NOT STAND ALONE P. 28

کا نام دیا ہے۔ اور ہوا کا موجودہ غلاف اڑ کر فضا میں گم ہو جاتا تو اس کا حال یہ ہوتا کہ اس کی سطح پر درجہ حرارت چڑھتا تو انتہائی حد تک چڑھ جاتا اور گرتا تو انتہائی حد تک گر جاتا۔ اس کے برعکس اگر زمین کا قطر موجودہ کی نسبت سے دگنا ہوتا تو اس کی کشش ثقل بھی دگنی بڑھ جاتی۔ کشش کے اس اضافہ کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا، جو اس وقت زمین کے اوپر پانچ سو میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے، وہ کھنچ کر بہت نیچے تک سمٹ جاتی۔ اس کے دباؤ میں فی مربع انچ ۱۵ تا ۳۰ پونڈ کا اضافہ ہو جاتا جس کا ردعمل مختلف صورتوں میں زندگی کے لیے نہایت مہلک ثابت ہوتا۔ اور اگر زمین سورج سے اتنی بڑی ہوتی اور اس کی کثافت برقرار رہتی تو اس کی کشش ثقل ڈیڑھ سو گنا بڑھ جاتی۔ ہوا کے غلاف کی دبازت گھٹ کر پانچ سو میل کے بجائے صرف چار میل رہ جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا کا دباؤ ایک ٹن فی مربع انچ تک جا پہنچتا۔ اس غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے زندہ اجسام کا نشوونما ممکن نہ رہتا۔ ایک پونڈ وزنی جانور کا وزن ایک سو پچاس پونڈ ہو جاتا۔ انسان کا جسم گھٹ کر گلہری کے برابر ہو جاتا اور اس میں کسی قسم کی ذہنی زندگی ناممکن ہو جاتی۔ کیوں کہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لیے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے اور اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجہ کی جسامت ہی میں پایا جا سکتا ہے۔

بظاہر ہم زمین کے اوپر ہیں۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم اس کے نیچے سر کے بل لٹکے ہوئے ہیں۔ زمین گویا فضا میں معلق ایک گیند ہے جس کے چاروں طرف انسان بستے ہیں۔ کوئی شخص ہندستان کی زمین پر کھڑا ہو تو امریکہ کے لوگ بالکل اس کے نیچے ہوں گے اور امریکہ میں کھڑا ہو تو ہندستان اس کے نیچے ہوگا۔ پھر زمین ٹھہری ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل گھوم رہی ہے۔ ایسی حالت میں زمین کی سطح پر ہمارا انجام وہی ہونا چاہیے جیسے سائیکل کے پہیے پر کنکریاں رکھ کر پہیے کو تیزی سے گھما دیا جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک خاص تناسب سے زمین کی کشش اور ہوا کا دباؤ ہم کو ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ زمین کے اندر مقناطیسی قوت کشش ہے جس کی وجہ سے وہ تمام چیزوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور اوپر سے ہوا کا مسلسل دباؤ پڑ رہا ہے۔ اس دو طرفہ

عمل نے ہم کو زمین کے کرے پر چاروں طرف لٹکا رکھا ہے۔ ہوا کے ذریعہ جو دباؤ پڑتا ہے وہ جسم کے ہر ایک مربع انچ پر تقریباً ساڑھے سات سیر تک معلوم کیا گیا ہے۔ یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً ۲۰۰ من کا دباؤ۔ آدمی اس وزن کو محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ ہوا جسم کے چاروں طرف ہے۔ دباؤ ہر طرف سے پڑتا ہے اسی لیے آدمی کو محسوس نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پانی میں غوطہ لگانے کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہوا — جو مختلف گیسوں کے مخصوص مرکب کا نام ہے، اس کے بے شمار دیگر فائدے ہیں جن کا بیان کسی کتاب میں ممکن نہیں۔

نیوٹن اپنے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ مگر اجسام کیوں ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں۔ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے کہا کہ میں اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکتا —

وائٹ ہیڈ (A.N. WHITEHEAD) اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔

"نیوٹن نے یہ کہہ کر ایک عظیم فلسفیانہ حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ فطرت اگر بے روح فطرت ہے تو وہ ہم کو توجیہہ نہیں دے سکتی ویسے ہی جیسے مردہ آدمی کوئی واقعہ نہیں بتا سکتا۔ تمام عقلی اور منطقی توجیہات آخری طور پر ایک مقصدیت کا اظہار ہیں۔ جبکہ مردہ کائنات میں کسی مقصدیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔"

THE AGE OF ANALYSIS P. 85.

وائٹ ہیڈ کے الفاظ کو آگے بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ کائنات اگر کسی صاحب شعور کے زیر انتظام نہیں ہے تو اس کے اندر اتنی معنویت کیوں پائی جاتی ہے۔

زمین اپنے محور پر چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے فرض کرو اس کی رفتار دو سو میل فی گھنٹہ ہو جائے اور یہ بالکل ممکن ہے، ایسی صورت میں ہمارے دن اور ہماری راتیں موجودہ کی نسبت سے دس گنا زیادہ لمبے ہو جائیں گے۔ گرمیوں کا سخت سورج ہر دن تمام نباتات کو جلا دیگا۔ اور جو بچے گا وہ لمبی رات کی ٹھنڈک میں پالے کی نذر ہو جائے گا۔ سورج جو اس وقت

ہمارے لیے زندگی کا سرچشمہ ہے اس کی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ کا ٹمپریچر ہے اور زمین سے اس کا فاصلہ تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔ اور یہ فاصلہ حیرت انگیز طور پر مسلسل قائم ہے۔ یہ واقعہ ہمارے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اگر یہ فاصلہ گھٹ جائے۔ مثلاً سورج نصف کے بقدر قریب آجائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ اس گرمی سے کاغذ جلنے لگے اور اگر موجودہ فاصلہ دگنا ہو جائے تو اتنی ٹھنڈک پیدا ہو کہ زندگی باقی نہ رہے۔ یہی صورت اس وقت پیدا ہوگی جب موجودہ سورج کی جگہ کوئی دوسرا غیر معمولی ستارہ آجائے۔ مثلاً ایک بہت بڑا ستارہ ہے جس کی گرمی ہمارے سورج سے دس ہزار گنا زیادہ ہے۔ اگر وہ سورج کی جگہ ہوتا تو زمین کو آگ کی بھٹی بنا دیتا۔

زمین ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتی ہوئی فضا میں جھکی ہوئی ہے۔ یہ جھکاؤ ہمیں ہمارے موسم دیتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آبادکاری کے قابل ہو گیا ہے اور مختلف قسم کی نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں۔ اگر زمین اس طرح سے جھکی ہوئی نہ ہوتی تو قطبین پر ہمیشہ اندھیرا چھایا رہتا۔ سمندر کے بخارات شمال اور جنوب کی جانب سفر کرتے اور زمین پر یا تو برف کے ڈھیر ہوتے یا صحرائی میدان۔ اس طرح کے اور بہت سے اثرات ہوتے جن کے نتیجے میں بغیر جھکی ہوئی زمین پر زندگی ناممکن ہو جاتی۔

یہ کس قدر ناقابل قیاس بات ہے کہ مادہ نے خود کو اپنے آپ اس قدر موزوں اور مناسب شکل میں منظم کر لیا۔

اگر سائنسدانوں کا قیاس صحیح ہے کہ زمین سورج سے ٹوٹ کر نکلی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتداءً زمین کا درجہ حرارت وہی رہا ہوگا جو سورج کا ہے۔ یعنی بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ۔ اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن کا ملنا اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک زمین کا درجہ حرارت گھٹ کر چار ہزار ڈگری پر نہ آجائے۔ اسی موقع پر دونوں گیسوں کے باہم ملنے سے پانی بنا۔ اس کے بعد کروڑوں سال تک زمین کی سطح اور اس کی فضا میں زبردست انقلابات ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ غالباً ایک بلین سال پہلے زمین اپنی موجودہ شکل میں تیار ہوئی۔ زمین کی فضا میں جو گیسیں تھیں ان کا

ایک بڑا حصہ خلا میں چلا گیا، ایک حصہ نے پانی کے مرکب کی صورت اختیار کی، ایک حصہ زمین کی تمام چیزوں میں جذب ہو گیا اور ایک حصہ ہوا کی شکل میں ہماری فضا میں باقی رہ گیا جس کا بیشتر جزو آکسیجن اور نائٹروجن ہے۔ یہ ہوا اپنی کثافت کے اعتبار سے زمین کا تقریباً دس لاکھواں حصہ ہے ـــــ کیوں نہیں ایسا ہوا کہ تمام گیسیں جذب ہو جاتیں۔ یا کیوں ایسا نہیں ہوا کہ موجودہ کی نسبت سے ہوا کی مقدار زیادہ ہوتی۔ دونوں صورتوں میں انسان زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ یا اگر بڑھی ہوئی گیسوں کے ہزاروں پونڈ فی مربع انچ بوجھ کے نیچے زندگی پیدا بھی ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ وہ انسان کی شکل میں نشو و نما پا سکے۔

زمین کی دوہری پرت اگر صرف دس فٹ موٹی ہوتی تو ہماری فضا میں آکسیجن کا وجود نہ ہوتا جس کے بغیر حیوانی زندگی ناممکن ہے۔ اسی طرح اگر سمندر کچھ فٹ اور گہرے ہوتے تو وہ کاربن ڈائی آکسائڈ اور آکسیجن کو جذب کر لیتے اور زمین کی سطح پر کسی قسم کی نباتات زندہ نہ رہ سکتیں۔

اگر زمین کے اوپر کی ہوائی فضا موجودہ کی نسبت سے لطیف ہوتی تو شہاب ثاقب جو ہر روز اوسطاً دو کروڑ کی تعداد میں اوپری فضا میں داخل ہوتے ہیں اور رات کے وقت ہم کو جلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ زمین کے ہر حصے میں گرتے۔ یہ شہابیے چھ سے چالیس میل تک فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں۔ وہ زمین کے اوپر ہر آتش پذیر مادے کو جلا دیتے اور سطح زمین کو چھلنی کر دیتے۔ شہاب ثاقب کی بندوق کی گولی سے نوے گنا زیادہ رفتار آدمی جیسی مخلوق کو محض اپنی گرمی سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی۔ مگر ہوائی کرہ اپنی نہایت موزوں دبازت کی وجہ سے ہم کو اس آتشیں بوچھار سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہوائی کرہ ٹھیک اتنی کثافت رکھتا ہے کہ سورج کی کیمیاوی اہمیت رکھنے والی شعاعیں (Actinic Rays) اسی موزوں مقدار سے زمین پر پہونچتی ہیں جتنی نباتات کو اپنی زندگی کے لیے ضرورت ہے۔ جس سے مضر بیکٹیریا مر سکتے ہیں، جس سے وٹامن تیار ہوتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

کمیت کا اس طرح عین ہماری ضرورتوں کے مطابق ہونا کس قدر عجیب ہے۔

زمین کی اوپری فضا چند گیسوں کا مجموعہ ہے جس میں تقریباً ۷۸ فیصدی نائٹروجن اور ۲۱ فیصدی آکسیجن ہے۔ باقی گیسیں بہت خفیف تناسب میں پائی جاتی ہیں۔ اسی

فضا سے زمین کی سطح پر تقریباً پندرہ پونڈ فی مربع انچ کا دباؤ پڑتا ہے جس میں آکسیجن کا حصہ تین پونڈ فی مربع انچ ہے۔ موجود آکسیجن کا بقیہ حصہ زمین کی تہوں میں جذب ہے اور وہ دنیا کے تمام پانی کا ۸/۹ حصہ بناتا ہے۔ آکسیجن تمام خشکی کے جانوروں کے لیے سانس لینے کا ذریعہ ہے اور اس مقصد کے لیے فضا کے سوا کہیں اور سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انتہائی متحرک گیس کس طرح آپس میں مرکب ہوئیں اور ٹھیک اس مقدار اور اس تناسب میں فضا کے اندر باقی رہ گئیں جو زندگی کے لیے ضروری تھا۔ مثال کے طور پر آکسیجن اگر ۲۱ فیصدی کے بجائے پچاس فیصدی یا اس سے زیادہ مقدار میں فضا کا جزو ہوتا تو سطح زمین کی تمام چیزوں میں آتش پذیری کی صلاحیت اتنی بڑھ جاتی کہ ایک درخت میں آگ پکڑتے ہی سارا جنگل بھک سے اڑ جاتا۔ اسی طرح اس کا تناسب گھٹ کر دس فیصدی رہتا تو ممکن ہو زندگی صدیوں کے بعد اس سے ہم آہنگی اختیار کر لیتی مگر انسانی تہذیب موجودہ شکل میں ترقی نہیں کر سکتی تھی۔ اور اگر آزاد آکسیجن بھی بقیہ آکسیجن کی طرح زمین کی چیزوں میں جذب ہو گئی ہوتی تو حیوانی زندگی سرے سے ناممکن ہو جاتی۔

آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ اور کاربن گیسیں الگ الگ اور مختلف شکلوں میں مرکب ہو کر حیات کے اہم ترین عناصر ہیں۔ یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر زندگی قائم ہے۔ اس کا ایک فی ارب بھی امکان نہیں ہے کہ وہ تمام ایک وقت میں کسی ایک سیارہ پر اس مخصوص تناسب کے ساتھ اکٹھا ہو جائیں۔ ایک عالم طبیعات کے الفاظ میں:

SCIENCE HAS NO EXPLANATIONS TO OFFER FOR THE FACTS, AND TO SAY IT IS ACCIDENTAL IS TO DEFY MATHEMATICS (P. 33)

یعنی سائنس کے پاس ان حقائق کی توجیہ کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔ اور اس کو اتفاق کہنا ریاضیات سے کشتی لڑنے کے ہم معنی ہے۔

ہماری دنیا میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جن کی توجیہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اس کی تخلیق میں ایک برتر ذہانت کا دخل تسلیم کیا جائے۔

پانی کی مختلف نہایت اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ برف کی کثافت (Density) پانی سے کم ہوتی ہے۔ پانی وہ واحد معلوم مادہ ہے جو جمنے کے بعد ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ چیز بقائے حیات کے لیے زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ برف پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے اور دریاؤں، جھیلوں اور سمندروں کی تہہ میں بیٹھ نہیں جاتا۔ ورنہ آہستہ آہستہ سارا پانی ٹھوس اور منجمد ہو جائے۔ یہ پانی کی سطح پر ایک ایسی حاجب تہہ بن جاتا ہے کہ اس کے نیچے کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے اوپر ہی اوپر رہتا ہے۔ اس نادر خاصیت کی وجہ سے مچھلیاں اور دیگر آبی جانور زندہ رہتے ہیں۔ اس کے بعد جونہی موسم بہار آتا ہو برف فوراً پگھل جاتا ہے۔ اگر پانی میں یہ خاصیت نہ ہوتی تو خاص طور پر سرد ملکوں کے لوگوں کو بہت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب امریکہ میں انڈوتھیا (Endothia) نام کی بیماری شاہ بلوط (Chestnut) کے درختوں پر حملہ آور ہوئی اور تیزی سے پھیلی تو بہت سے لوگوں نے جنگل کی چھتری میں شگاف دیکھ کر کہا "یہ شگاف اب پُر نہیں ہوں گے۔" امریکی شاہ بلوط کی بالادستی کو ابھی تک کسی اور قسم کے اشجار نے نہیں چھینا تھا۔ اونچے درجے کی دیرپا عمارتی لکڑی اور اس طرح کے دوسرے فوائد اس کے لیے خاص تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۰ء میں ایشیا سے انڈوتھیا نام کی بیماری کا ورود ہوا۔ اس وقت تک یہ جنگلات کا بادشاہ خیال کیا جاتا تھا۔ مگر اب جنگلات میں یہ درخت تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔

لیکن جنگلات کے یہ شگاف جلد ہی پُر ہو گئے۔ کچھ دوسرے درخت (Trees) اپنی نشوونما کے لیے شاید انہیں شگافوں کا انتظار کر رہے تھے۔ شگاف پیدا ہونے سے پہلے تک یہ درخت جنگلات کا معمولی حصہ تھے اور شاذ ہی بڑھتے اور پھولتے تھے۔ لیکن اب شاہ بلوط کی عدم موجودگی کا کسی کو احساس تک نہیں ہوتا۔ کیونکہ اب دوسری قسم کے درخت پوری طرح ان کی جگہ لے چکے ہیں۔ یہ دوسرے درخت سال بھر میں ایک انچ موٹے اور چھ فٹ لمبائی میں بڑھتے ہیں۔ اتنی تیزی کے ساتھ بڑھنے کے علاوہ بہترین لکڑی جو بالخصوص بانسوں کے کام آسکتی ہے ان سے حاصل کی جاتی ہے۔

اسی صدی کا واقعہ ہے۔ ناگ پھنی کی ایک قسم آسٹریلیا میں کھیتوں کی باڑھ قائم کرنے کے لیے بوئی گئی ہے۔ آسٹریلیا میں اس ناگ پھنی کا کوئی دشمن کیڑا نہیں تھا چنانچہ وہ بہت تیزی سے بڑھنا شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ انگلینڈ کے برابر رقبہ پر چھا گئی۔ وہ شہروں اور دیہاتوں میں آبادی کے اندر گھس گئی، کھیتوں کو ویران کر دیا۔ اور زراعت کو ناممکن بنا دیا۔ کوئی تدبیر بھی اس کے خلاف کارگر ثابت نہیں ہوتی تھی۔ ناگ پھنی آسٹریلیا کے اوپر ایک ایسی فوج کی طرح مسلط تھی جس کا اس کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔ بالآخر ماہرین حشرات الارض دنیا بھر میں اس کا علاج تلاش کرنے کے لیے نکلے۔ یہاں تک کہ ان کی رسائی ایک کیڑے تک ہوئی جو صرف ناگ پھنی کھا کر زندہ رہتا تھا۔ اس کے سوا اس کی کوئی خوراک نہیں تھی۔ وہ بہت تیزی سے اپنی نسل بڑھاتا تھا اور آسٹریلیا میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اسی کیڑے نے آسٹریلیا میں ناگ پھنی کی ناقابل تسخیر فوج پر قابو پا لیا اور اب وہاں سے اس مصیبت کا خاتمہ ہو گیا۔

قدرت کے نظام میں یہ ضبط و توازن (CHECKS AND BALANCES) کی عظیم تدبیریں کیا کسی شعوری منصوبے کے بغیر خود بخود وجود میں آجاتی ہے۔

کائنات میں حیرت انگیز طور پر ریاضیاتی قطعیت پائی جاتی ہے۔ یہ جامد بے شعور مادہ جو ہمارے سامنے ہے۔ اس کا عمل غیر منظم اور بے ترتیب نہیں بلکہ وہ متعین قوانین کا پابند ہے۔ "پانی" کا لفظ خواہ دنیا کے جس خطہ میں اور جس وقت بھی بولا جائے۔ اس کا ایک ہی مطلب ہوگا ——— ایک ایسا مرکب جس میں ۱۱ فیصد ہائیڈروجن اور ۸۹ فیصد آکسیجن۔

ایک سائنسداں جب تجربہ گاہ میں داخل ہو کر پانی سے بھرے ہوئے ایک پیالے کو گرم کرتا ہے تو وہ تھرمامیٹر کے بغیر یہ بتا سکتا ہے کہ پانی کا نقطۂ جوش ۱۰۰ درجہ سنٹی گریڈ ہے جبکہ ہوا کا دباؤ (ATMOSPHERIC PRESSURE) ۷۶۰ ایم ایم ہے۔ اگر ہوا کا دباؤ اس سے کم ہو تو اس حرارت کو وجود میں لانے کے لیے کم طاقت درکار ہوگی جو پانی کے سالمات توڑ کر بخارات کی شکل دیتی ہے۔ اس طرح نقطۂ جوش سو درجہ سے کم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر ہوا کا دباؤ ۷۶۰ ایم ایم سے زیادہ ہو تو نقطۂ جوش بھی اسی لحاظ سے زیادہ ہو جائے گا۔ یہ تجربہ اتنی بار آزمایا گیا ہے کہ اس کو یقینی طور پر پہلے سے بتایا جا سکتا ہے کہ

پانی کا نقطۂ جوش کیا ہے۔ اگر مادہ اور توانائی کے عمل میں یہ نظم اور ضابطہ نہ ہوتا تو سائنسی تحقیقات اور ایجادات کے لیے کوئی بنیاد نہ ہوتی۔ کیونکہ پھر اس دنیا میں محض اتفاقات کی حکمرانی ہوتی اور علمائے طبیعات کے لیے یہ بتانا ممکن نہ رہتا کہ فلاں حالت میں فلاں طرح عمل کے دہرانے سے فلاں نتیجہ پیدا ہوگا۔

کیمیا کے میدان میں نووارد طالب علم سب سے پہلے جس چیز کا مشاہدہ کرتا ہے وہ عناصر میں نظم اور دوریت ہے۔ سو سال پہلے ایک روسی ماہر کیمیا منڈلیف (MENDELEEV) نے جوہری قدر کے لحاظ سے مختلف کیمیائی عناصر کو ترتیب دیا تھا جس کو دوری نقشہ (PERIODIC CHART) کہا جاتا ہے۔ اس وقت تک موجودہ تمام عناصر دریافت نہیں ہوئے تھے اس لیے اس کے نقشہ میں بہت سے عناصر کے خانے خالی تھے جو عین اندازے کے مطابق بعد کو پُر ہوگئے۔ ان نقشوں میں سارے عناصر جوہری نمبروں کے تحت اپنے اپنے مخصوص گروپوں میں درج کیے جاتے ہیں۔ جوہری نمبر سے مراد مثبت برقیوں PROTONS کی وہ تعداد ہے جو ایٹم کے مرکز میں موجود ہوتی ہے۔ یہی تعداد ایک عنصر کے ایٹم اور دوسرے عنصر کے ایٹم میں فرق پیدا کر دیتی ہے۔ ہائیڈروجن جو سب سے سادہ عنصر ہے اس کے ایٹم کے مرکز میں ایک پروٹون ہوتا ہے۔ ہیلیم میں دو اور لیتھیم میں تین۔ مختلف عناصر کی جدول تیار کرنا اسی لیے ممکن ہو سکا ہے کہ ان میں حیرت انگیز طور پر ایک ریاضیاتی اصول کارفرما ہے۔ نظم و ترتیب کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ عنصر نمبر ۱۰۱ کی شناخت محض اس کے ۱۰۱ پروٹونوں کے مطالعہ سے کر لی گئی۔

قدرت کی اس حیرت انگیز تنظیم کو ہم دوری اتفاق (PERIODIC CHANCE) نہیں کہتے بلکہ اس کو دوری ضابطہ (PERIODIC LAW) کہتے ہیں۔ مگر نقشہ اور ضابطہ جو یقینی طور پر ناظم اور منصوبہ ساز کا تقاضا کرتے ہیں، اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنس اگر خدا کو نہ مانے تو وہ خود اپنی تحقیق کے ایک لازمی نتیجے کا انکار کرے گی

"۱۱ اگست ۱۹۹۹ء میں ایک سورج گرہن واقع ہوگا جو کارنوال (CORNWALL) میں مکمل طور پر دیکھا جا سکے گا" ــــ یہ محض ایک قیاسی تخمین کوئی نہیں ہے:

علمائے فلکیات یقین رکھتے ہیں کہ نظام شمسی کے موجودہ گردشی نظام کے تحت اس گہن کا پیش آنا یقینی ہے۔ جب ہم آسمان میں نظر ڈالتے ہیں تو ہم لاتعداد ستاروں کو ایک نظام میں منسلک دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ ان گنت صدیوں سے اس فضائے بسیط میں جو عظیم گیندیں معلق ہیں وہ ایک ہی متعین راستے پر گردش کرتی چلی جارہی ہے۔ وہ اپنے مداروں میں اس نظم کے ساتھ آتی اور جاتی ہیں کہ ان کے جائے وقوع اور ان کے درمیان ہونے والے واقعات کا صدیوں پیشتر بالکل صحیح طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پانی کے ایک حقیر قطرے سے لے کر فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے دور دراز ستاروں تک ایک فقید المثال نظم وضبط پایا جاتا ہے۔ ان کے عمل میں اس درجہ یکسانیت ہے کہ ہم اس بنیاد پر قوانین مرتب کرتے ہیں۔

نیوٹن کا نظریہ کشش فلکیاتی کروں کی گردش کی توجیہ کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں (J.C. ADAMS) اور لاویرے (U. LEVERRIER) کو وہ بنیاد ملی جس سے وہ دیکھے بغیر ایک ایسے سیارے کے وجود کی پیشین گوئی کرسکیں جو اس وقت تک نامعلوم تھا۔ چنانچہ ستمبر ۱۸۴۶ء کی ایک رات کو جب برلن آبزرویٹری کی دوربین کا رخ آسمان میں ان کے بتائے ہوئے مقام کی طرف کیا گیا تو فی الواقع نظر آیا کہ ایسا ایک سیارہ نظام شمسی میں موجود ہے جس کو اب ہم نیپچون (NEPTUNE) کے نام سے جانتے ہیں۔

کس قدر ناقابل قیاس بات ہے کہ کائنات میں یہ ریاضیاتی قطعیت خود بخود قائم ہوگئی ہے

دربارِ عالمگیری

(از جناب مولانا مصطفےٰ حسن صاحب علوی ایم اے پی ایچ ڈی)

(۳)

تفسیر احمدی۔ ان چند الفاظ کو چھوڑ کے جو دوسری زبانوں کے ہیں یہ واقعہ ہے کہ پورا قرآن عربی زبان میں نازل ہوا جو الفاظ عربی نہیں ان کو معرب کر کے اُن پر بھی عربی کے ہی قاعدے اور قوانین کا عمل درآمد ہوا۔ اس کا اسلوب بیان سب عربی کنایہ، تشبیہہ، استعارہ، مجاز حقیقت کے مفاہیم سب عربوں کے نہج اور طریقے کے۔ اور پھر باوجود عربی ہونے کے یہ ضروری نہیں کہ اہل عرب ان کو سب کا سب سمجھتے ہی ہوں شیکسپیر کے ڈرامے، ملٹن کی نظمیں انگریزی میں ہیں مگر ایسا نہیں کہ انگریزی جن کی مادری زبان ہے وہ اس کے مفہوم اور معنی سمجھ ہی لیتے ہوں، غالب کا کلام اردو میں ہے اور سودا کے قصائد بھی اُردو میں ہیں مگر یہ اردو دانوں کو بھی سبقاً سبقاً پڑھائے ہی جاتے ہیں جب وہ اسے سمجھ پاتے ہیں۔ اگر کسی کو الفاظ کے معنی آتے ہیں یا وہ لغت دیکھ کے معنی معلوم کر لے تب بھی اس کا مطلب ہاتھ نہیں لگتا۔ یہ ضروری نہ تھا کہ صحابۂ کرامؓ باوجود عرب ہونے کے پھر بھی اکثر قرآن کے مفاہیم اور معانی ان کی سمجھ سے باہر نہ ہوتے "وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ" میں فجر کے معنی ان کو معلوم تھے لیال کے معنی بھی ان کو معلوم تھے اور عشر کے بھی لیکن اس محل پر اس کا مفہوم بغیر پوچھے ان کے ہاتھ نہ لگا۔ سورۃ انعام کی آیات بیشتر مکی ہیں اور ان میں اصول دین اور اصول احکام بتلائے گئے ہیں۔ ان کے مفاہیم میں غموض نہیں ان کو سب سمجھتے تھے لیکن

قرآن میں وہ آیات بھی ہیں جن میں ابہام ہے جن میں غموض ہے اور جنھیں آیات متشابہات کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں۔ ہر زبان میں بعض جملوں اور فقروں کے مفہوم قرائن سے معلوم ہوتے ہیں اگر قرائن نہوں تو انکے مفاہیم ہاتھ نہیں لگتے۔ ایک شخص کسی سے ملنے آتا ہے کواڑوں پر دستک دیتا ہے اندر سے آواز آتی ہے "آجائیے پردہ ہے" دوسرا شخص آکے یہی عمل کرتا ہے اندر سے آواز آتی ہے "نہ آئیے پردہ ہے"۔ یہ پتہ ہے کی دونوں مرادیں قرائن ہی سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ صحابہ سفر حضر جلوت و خلوت میں ساتھ رہتے اور سبب نزول اُن کے علم میں ہوتا اس لیے مفہوم قرآنی کو بھی آسانی سے سمجھ جاتے لیکن پھر بھی تفاوت فہم کی وجہ سے بہتوں کے ہاتھ صحیح مراد نہ لگتی۔ ایک شخص عبداللہ بن مسعود کے پاس آکے خبر دیتا ہے کہ ایک شخص مسجد میں بیٹھا قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے بتا رہا ہے' اور "یَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ" کے معنی اور مفہوم یہ بتاتا ہے کہ قیامت میں ایک دھواں سا اُٹھے گا اور لوگوں کے تنفس پر اس کا اثر پڑے گا انھیں زکام ہو جائے گا یہ سُن کے عبداللہ بن مسعود نے فرمایا جسے رسالتمآبؐ کے ذریعہ معنی کا پتہ چل گیا ہو وہ تو بیان کر دیا کرے ورنہ اللہ کے علم پر چھوڑ دے۔

من علم علما فلیقل بہ ومن لم 　　　جسے اگر معلوم ہو تو بیان کر دے ورنہ یہ

یعلم فلیقل اللہ اعلم 　　　کہہ دے کہ اس کا مفہوم اللہ جانے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کو وہ ماحول معلوم تھا جب یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ اپنی بدکرداری کی بدولت قریش ایک بار سخت قحط سے دوچار ہوئے تھے کہ انھوں نے اس حالت میں ہڈیاں تک چبا کے بسر کی۔ پریشان ہو ہو کے آسمان کی طرف دیکھتے تو انھیں دھواں سا ہی نظر آتا[۵]

وہ صحابہ جو عادات اور رسوم سے بخوبی واقف تھے کہ ایام جاہلیت میں عرب کس کس طرح حج کرتے اور کیا کیا رسمیں ان میں شائع ذائع تھیں۔ بتوں کو کس طرح پوجتے اور اُن سے کس کس انداز سے مرادیں مانگتے وہ اس صنف کی قرآنی آیات کو خوب خوب سمجھ لیتے جن میں ان ان چیزوں اور ان کے ان ان کرداروں کا ذکر آیا ہے۔ مرور ایام کے ساتھ واعظوں اور قصہ گوؤں نے آیات قرآنی کی عجیب عجیب تفسیریں اور توضیحیں اپنے دل سے پیدا کر کے بیان کر دیں ورنہ صحیح تفسیریں وہی ہیں جو صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کے بیان کیا

۵ موافقات شاطبی۔

اور شاید یہی وجہ ہو کہ امام احمد بن حنبل جیسی باخبر ہستی نے یہاں تک فرما دیا۔

ثلثة ليس لها اصل التفسير — تین موضوع ایسے ہیں تفسیر ملاحم اور مغازی

والملاحم والمغازی — کہ جن کی کوئی اصلیں نہیں۔

اور اس قول کی ان کے شاگردوں کو یوں توجیہ اور تاویل کرنا پڑی کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ

ان الغالب انه ليس له — اس صنف کی اکثر حدیثوں کی سندیں متصل

اسانيد صحاح متصلة[۵] — اور صحیح نہیں ہیں۔

ان بہت سے الفاظ اور آیات ان کے سامنے ایسی بھی آئیں جن کے مفاہیم کو صحابہ اپنی قوت اجتہاد سے حل کرنے پر مجبور ہوئے " ورفعنا فوقکم الطور " میں طور کا مفہوم حضرت ابن عباس ایک مخصوص پہاڑ لیتے اور کوئی بکھرے ہوئے اور منتشر پہاڑ بیان کرتے ہیں، اسی کے ساتھ تابعین کیا بلکہ صحابہ تک جہاں تک ہو تا رائے اور اجتہاد سے گریز ہی اختیار کرتے تھے۔

قرآن تفسیر خاص کر بنی اسرائیل اور پچھلی اقوام کے حالات میں مفسرین کو ان نومسلم یہود و نصاریٰ سے جو تورات اور انجیل کے عالم تھے بہت کچھ سرمائے ہاتھ لگے اور واقعات معلوم ہوئے لیکن ان کے بیانوں میں اختلافات تھے انھیں کی جھلکیاں ان تفسیروں میں بھی دکھائی دینے لگیں، احکام شرعیہ کی تفسیروں اور معمولات کو چھوڑ کر جن میں انھوں نے غیر معمولی احتیاط سے کام لیا۔ باقی امور کی تفسیروں میں اختلافات موجود ہیں۔ تفسیر قرآن کے بارے میں ایسے صحابہ کی جن کے اقوال نے شہرت حاصل کی تعداد تھوڑی ہی ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ عبداللہ بن مسعود عبداللہ بن عباس وغیرہ وغیرہ یہ چند ہستیاں ایسی تھیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جلوت و خلوت میں اختلاط اور اپنی عربیت کی قوت حوادث اور واقعات سے واقفیت اور لغت دانی کی بدولت آیات قرآنیہ کو بہت کچھ حل کیا ان میں بھی عبداللہ بن عباس کو اسبقیت حاصل ہے اور بہت کچھ مشکلات انھیں سے حل ہوتی رہیں اس لیے کہ کاشانۂ نبوت کے یہ ایک فرد ہی تھے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ارباب غرض کو ان کی طرف منسوب کرنے کے بہت کچھ مواقع ہاتھ لگے، حضرت علی بھی

سلہ ۵ اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۷۸

فرد خاندان تھے وہاں بھی شیعیان علی کو ان کے مراتب کی بلندی کے لیے اس کی ضرورت داعی ہوتی رہی تاکہ ان کی علمی پوزیشن کو غیر معمولی انداز سے بڑھاتے ہی رہیں، عباسیوں کا تو کہنا ہی کیا وہ تو حضرت عباس کی اولاد اور اخلاف میں تھے ہی اُن کو خوش کرنے اور ان کے خلفاء کی خوشنودی کے لیے کیا کچھ انتساب ان کی طرف نہ ہوا، اس میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں کہ اگر حضرت علی اور حضرت عبداللہ ابن عباس کی طرف ان تشریحوں اور تفسیروں کا انتساب صحیح نہ تھا تو وہ علمی نقطۂ نظر سے بھی گری ہوئی تھیں۔

عہد تابعین آیا تو اسرائیلیات اور نصرانیات کا تفسیروں میں اور بھی اضافہ ہو گیا ابن جریر کی تفسیر ایسے مواد سے کیا کچھ کم مالا مال ہے۔ انھیں اسرائیلیات کے بیان کرنے والوں میں ابن جریج کا نام بار بار آتا ہے اور کیوں نہ آتا اس لیے کہ یہ نسلاً نصرانی ہی تھے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جس جس عہد میں جن جن علمی تحریکات اور جن مذاہب اور شاخ کے چرچے رہے اس عہد کی تفسیروں پر وہی رنگ غالب رہے۔

عہد صحابہ اور پچھلے تابعین کے وقت کی تفسیروں میں آیات کے لغوی مفاہیم کا رنگ زائد نظر آتا ہے زائد از زائد اسباب نزول پر بھی بڑی ہوئی روشنی مل جاتی ہے۔ اس کے بعد کے دور میں یہود و نصاریٰ کے واقعات اور حوادث ملتے ہیں۔ پھر قضا و قدر کی بحثیں چھڑیں اور صفات کے ازلی اور ابدی ہونے کی باتیں نکلیں۔ جبر و اختیار کے مباحث زبانوں پر آئے پھر اس کے بعد جب فقہ اور فقہا کا دور آیا اور فقہی احکام نکالنے کی ضرورتیں لاحق ہوئیں تو فقہا نے ان آیات کی تفاسیر پر زور دیا جن سے فقہی احکام و قوانین کا استنباط ہوتا ہے۔ ایک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ جب قواعد نحوی اور صرفی بلاغت اور اخلاقیات وغیرہ وغیرہ پر توجہات رہی ہیں تو اس عہد کی تفاسیر میں بھی یہی رنگ غالب رہا ہے۔

یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ خواہ موضوع دینی کچھ بھی ہو خواہ تاریخ ہو خواہ احکام دینی ہوں اور خواہ تفسیرات اور توضیحات قرآنیہ سب کا منبع اور سرچشمہ حدیث ہی رہا ہے۔ ایک محدث حدیث کے ذریعہ فقہی حکم ہی نہیں پہونچاتا، غزوات اور حروب اسلامیہ کا ہی ذکر نہیں کرتا، تاریخ ہی بیان نہیں کرتا، بلکہ اس زمانہ کی معاشرت، اجتماعی حالات

اور دوسرے واقعات بھی بیان کرتا رہا ہے اور اس زمانے کے ذخائر احادیث میں سب کچھ ایک مخلوط شکل میں ملتا ہے، پھر ایک دور آیا جب احکام دینیہ کی احادیث کو الگ کیا گیا سیرت کو الگ فقہ کو الگ چنانچہ محمد بن اسحاق نے وہ احادیث الگ کرلیں جن کا تعلق سیرت سے تھا۔ امام مالک نے مؤطا میں وہ حدیثیں جمع کردیں جن کا تعلق احکام دینیہ اور فقہ سے تھا وغیرہ وغیرہ۔ فنون کو الگ الگ مدون ہوگئے اور ہر فن سے متعلق احادیث الگ الگ بیان کی جانے لگیں پھر بھی محدثین نے اگر کتابیں ترتیب دیں تو عام احادیث کے ساتھ تفسیر کو بھی شامل رکھا۔ بخاری اور مسلم میں تفاسیر کے مستقل ابواب ملتے ہیں جن میں تفسیری حدیثیں شان اور آن کے ساتھ مبوب نظر آتی ہیں۔ سورتوں کے فضائل آیات اور الفاظ کی تفسیریں سلسلوں اور اسناد کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ ملتی ہیں۔ یہ بات ذہن سے نہ جائے کہ ابن جریج کی بیان کردہ تفسیری احادیث سب کی سب صحیح ہی ہیں نہیں بلکہ ان میں سقیم اور صحیح دونوں ہیں۔

ان ابن جریج لم یقصد الصحۃ وانما روی ما ذکر فی کل آیۃ من الصحیح والسقیم۔[1]	ابن جریج نے اسکا ارادہ ہی نہیں کیا کہ وہ تفسیر کے بارے میں صحیح حدیثیں ہی بیان کریں بلکہ ہر آیت کے بارہ میں جو صحیح اور سقیم چیزیں ذکر کی گئی ہیں انھوں نے وہ سب روایت کردی ہیں۔

سدی اور باذان بن نصر کے واسطوں کا تو کہنا ہی کیا ان پر اکثر محدثین کو اعتماد ہی نہ تھا۔[2]
بعض مفسرین کے یہاں یہ اہتمام ملتا ہے کہ سب کی نہیں بلکہ مشکل الفاظ اور جملوں کی تفسیر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ سے ملیں اُن کو لکھتے گئے۔ مرور زمانہ کیساتھ ساتھ کل تک جن الفاظ میں غموض نہ تھا ان میں بھی غموض معلوم ہونے لگا، لوگوں میں وہ عربیت نہ رہی نہ وہ ادبیت۔ انکو آگے چل کر تابعین نے حل کیا اور ان کے آسان کرنے میں بڑی بڑی محنتیں صرف کیں۔ یہ کام بڑی ہی ذمہ داری کا تھا۔ شعبی نے تو یہاں تک احتیاط برتی کہ کہدیا۔

ثلاث لا اقول فیھن حتی اموت	تین موضوع وہ ہیں کہ میں تاحیات

---

[1] الاتقان جلد ۲ صفحہ ۲۲۴ [2] تہذیب التہذیب ابن حجر

القرآن الروح والرای[1]　　ان کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہوں گا قرآن روح اور رائے ہے۔

اصمعی نے باوجود اتنے بڑے لغوی ہونے کے یہی کہا

العرب تقول معنی ھذا کذا ولا اعلم المراد منہ فی الکتاب والسنۃ ای شی ھو[2]　　اہل عرب اس لفظ کے یہ معنی کہتے ہیں لیکن میں جزماً نہیں کہہ سکتا کتاب اللہ اور سنت میں کیا مراد لی گئی ہے۔

تفسیر پر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ نحوی اور صرفی بحثوں غیر مانوس لفظوں، بلاغت اور فصاحت کے معیاروں کو متعین کرنے میں لوگوں کا مستدل صرف قرآن کریم ہی رہ گیا تھا۔ پھر بعض کی توجہ اس کی طرف ہوئی کہ وہ آیات لکھیں اور ان کی تفسیر ظاہر کریں جن کا تعلق مسائل فقہیہ سے ہے چنانچہ فقہ حنفی کے مسلک کو ظاہر کرنے اور آیات قرآنیہ سے تطبیق دینے میں امام ابوبکر جصاص رازی نے احکام القرآن کے نام سے کتاب لکھی، امام شافعی نے لکھی اور داؤد ظاہری نے بھی۔ ادھر امام مالک کے مسلک پر بھی احکام قرآنیہ کے نام سے کتاب تیار ہوئی متکلم مفسرین کی تفسیروں میں عقلی اور فلسفی توحید، عدل، صفات باری تعالیٰ جبر و اختیار کے عناصر تو متمیز و ممتاز شکلوں میں ملتے ہیں لیکن احادیث تفسیر میں حدیثوں کی ایک معمولی سی جھلک ہی بس۔ معتزلیوں نے تفسیریں لکھیں تو اپنے مسلک کے مطابق اور شیعوں اور دوسرے فرقوں نے لکھیں تو اپنے مذہب کی تقویت کی نظر سے۔ "طلعھا کانہ رؤس الشیاطین" کی تفسیر ایک بدشکل گھاس سے کی گئی جو یمن میں پیدا ہوتی تھی کسی نے سانپ کے پھن سے کی لیکن جاحظ نے یوں کی۔

لیس ان الناس رأوا شیطاناً قط علی صورۃ ولکن لما کان اللہ قد جعل فی طبائع جمیع الامم استقباح جمیع صور الشیاطین... وکراھتہ　　ایسا نہیں ہے کہ لوگوں نے شیطان کو کسی شکل میں دیکھا ہو بلکہ جب باری تعالیٰ نے تمام قوموں کی طبائع میں شیطان کو ہر پہلو سے نہایت ہی مکروہ شکل میں ہی

---

[1] ... [2] ... ص ۹۴

واجری علی السنۃ الناس جمیعہم	ظاہر کیا اور بدشکلی میں اس کو سب کے لیے
ضرب المثل فی ذلک بحج بالایحاش	ضرب المثل بنا دیا تو بن ہی بنیاد پر اس سے ڈرانے
.... والاخافۃ ۱	اور وحشت دلانے کا کام لیا۔

چنانچہ عربوں میں دیو بھوت کا تصور بھی ایک ڈراؤنی حقیقت رکھتا اور خوف و دہشت دلانے اور ہراساں کرنے کے لیے اس کو حقیقت واقعیہ کے انداز سے پیش کرتے بطور تہدید کے موقعوں پر اس سے کام لیتے ایام جاہلیت کا شاعر دشمن کو ڈرا تا دھمکاتا ہے تو اس رنگ سے کہ اس کا مجھ پر بس نہیں چل سکتا اور وہ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے شمشیر براں میرے پاس ہے اور بھوتوں جیسے ڈراؤنے دانتوں کی شکل کے نیزے میرے پہلو میں۔

ایقتلنی والمشرفی مصاجعی	ومسنونۃ زرق کانیاب اغوال

ابن جریر طبری کی تفسیر کا یہ ممتاز رنگ ہے کہ وہ پچھلے مفسروں کے اقوال اور تفسیریں نقل کرنے کے بعد جو قول ان کے نزدیک مرجح ہے اس کو ظاہر کر دیتے ہیں اور مزید وجوہ سے اس کی تائید بھی اور توثیق بھی۔ (باقی)

---

۱ کتاب الحیوان جاحظ جلد ۳ ص ۱۳

ان مجمل سوالات کا مفصل جواب
آپ کو
مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان کی تازہ
میں ملے گا

سالانہ چندہ		سالانہ چندہ
ہندستان سے ۶/-	# ماہنامہ الفرقان لکھنؤ	غیر ممالک سے
پاکستان سے ۶/-		۱۲........ شلنگ
ششماہی		ہوائی ڈاک سے
ہندوستان سے ۳/۵۰		ایک پونڈ
پاکستان سے ۴/-	(فی کاپی ۶۰ پیسے)	

جلد ۳۳ | بابتہ ماہ رجب ۱۳۸۵ھ مطابق نومبر ۱۹۶۵ء | شمارہ

تصحیح: ــ گزشتہ شمارہ پر غلطی سے ستمبر کا مہینہ اور نمبر ۱۶ چھپ گیا ہے، اسکو اکتوبر اور نمبر ۱۰ پڑھا جائے۔

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اسکا مطلب ہے کہ آپکی مدتِ خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ نومبر تک آجانی چاہئے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: ــ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت: ــ الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۵ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

عتیق الرحمن سنبھلی

محض خدا کا فضل ہے کہ وہ خطرات جو ہندوستان و پاکستان کے کسی تصادم کی شکل میں مسلمانانِ ہند کے لئے مضمر تھے وہ تین ہفتے کے بھرپور تصادم کے باوجود واقعات کی صورت نہ اختیار کر سکے، لیکن پھر بھی ان حالات میں مسلمانوں کے لئے جو نزاکت پیدا ہو گئی ہے اس سے شاید کوئی دیوانہ ہی انکار کر سکے، اور کم از کم ان لوگوں کو تو اس سے انکار ہونا ہی نہ چاہیئے جو اگرچہ اپنی نسبتوں کے لحاظ سے تختہ دار پر حق کہنے کی روایات کے وارث ہیں اور اس پر فخر ان کا سب سے بڑا سرمایہ ہو، مگر اس نزاکت احساس نے انہیں مجبور کیا کہ اس جنگ میں اپنے وطن کی حمایت کو مسلمانانِ ہند کا وطنی اور سیاسی فریضہ قرار دینے ہی پر قناعت نہ کریں بلکہ ایک مذہبی فریضہ اور شریعت مقدسہ کا تقاضا بھی قرار دیں، اور اسکے باوجود قرار دادیں کہ ملک کے لیڈر بار بار مسلمانوں سے کہہ رہے ہوں کہ یہ کوئی مذہبی جنگ نہیں خالص سیاسی جنگ ہے، لیکن ہم یہ دیکھ کر حیران ہیں کہ وہی لوگ جن کے موجودہ حالات کی نزاکتوں کے احساس کا ایک طرف یہ عالم ہے دوسری طرف وہ ان نزاکتوں سے اس قدر بیگانہ بھی ہیں کہ اپنی جماعتی مصلحتوں کے تحت کسی مشترک ملی پلیٹ فارم کو چھوڑنا ہو تو اسکے اعلان کے لئے بھی انہیں حالات کو منتخب کریں! اور پھر اعلان بھی مجرد قطع تعلق کا نہ ہو بلکہ اور بہت سی جدال انگیز باتوں کے ساتھ ساتھ یہ فردِ جرم بھی اس اعلان کا جزو بنے کہ اس ملی پلیٹ فارم نے ہندستان و پاکستان کی جنگ کے دوران نہایت بے تعلقی اور سرد مہری کا رویہ رکھا حتی کہ اس کی کوئی میٹنگ تک اس سلسلے میں نہیں بلائی گئی، جبکہ پہلے ذرا ذرا سی باتوں پر اس کی میٹنگیں ہوتی رہی ہیں!۔

ہم یہ سطریں بہت ہی ناخوشگواری کے احساس کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری جناب مولانا اسعد مدنی کے اُس بیان پر لکھ رہے ہیں جو مسلم مجلس مشاورت سے استعفے کے طور پر الجمعیۃ اور بعض دوسرے اخبارات میں شائع ہوا ہے اور جس میں ڈاکٹر سید محمود صاحب (صدر مجلس) کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ :-

"ہند و پاکستان کی جنگ کے دوران آپ نے اگرچہ ذاتی طور پر اپنی خدمات محاذ جنگ کے لئے پیش فرمائیں، مگر مجھے تعجب اور حیرت ہو کہ اس سلسلے میں مسلم مجلس مشاورت نے معمولی توجہ دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اور اس اہم اور نازک موقع پر مجلس کا کوئی اجلاس بھی طلب نہیں کیا گیا، حالاں کہ اس سے پہلے معمولی معمولی باتوں پر اجلاس طلب کئے گئے ہیں۔"

الجمعیۃ (سنڈے ایڈیشن) ۲۴ ر اکتوبر ۱۹۶۵ء

راقم حروف کو مولانا اسعد صاحب سے ہمدرسی کی نسبت ہے، اور شاید ہمعصری کی بھی۔ تعلق بھی ان کی محبت و عنایت سے برادرانہ رہا ہے، لیکن وہ جس عظیم ہستی کی یادگار ہیں اس کے اٹھ جانے کے بعد سے برابری کے بجائے اُن کو بڑائی کے مقام پر رکھ کر دیکھنا ہی دل کو پسند رہا۔ علاوہ ازیں وہ جس جماعت کے جنرل سکریٹری ہیں وہ ہمارے بزرگوں کی جماعت ہے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن کی ذات عالی نے اسکی بنیادوں کو عظمت بخشی، حضرت مولانا انورشاہؒ کے تقدس اور پاک نفسی سے بھی اس نے فیض پایا، حضرت علامہ مفتی کفایت اللہؒ کی سرپرستی میں ایک طویل مدت اس نے گزاری اور پھر شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی مدتوں سربراہی کا طغرائے امتیاز بھی اسکے حصے میں آیا، مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اگرچہ اس خاص صف کے نہ تھے مگر انھوں نے جمعیۃ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۲ء تک کے پرآشوب دور میں مسلمانان ہند کی جس قدر وسیع پیمانے پر خدمت کی اور جس مجاہدانہ انداز میں وہ ہر موقع پر اس ستم زدہ ملت کے لئے سینہ سپر ہوئے، یہ چیز اُن کی شخصیت کو بھی جمعیۃ کے لئے ان بزرگوں ہی کی طرح موجب احترام اور باعث اکرام بنا دیتی ہے۔ اس لئے مولانا اسعد صاحب کی ذاتی حیثیت کا سوال ہو یا جمعیۃ کے جنرل سکریٹری ہونے کی حیثیت کا طبعی طور پر دونوں ہی صورتوں میں بڑا مشکل کام ہو کر ان پر کسی بیباک تنقید کا مرحلہ

سر کیا جاتے۔ اور مرحلہ بھی ایسا جس میں اُن کے نازک جذبات کی رعایت بھی ممکن نہ ہوا ——
—— لیکن افسوس ہے کہ زیر نظر بیان پر کسی بھی نسبت اور کسی بھی حیثیت کا لحاظ کرکے خاموشی کی گنجائش نہیں،
یہ جماعتی اور قیادتی رقابت کی کارفرمائیوں کا ایسا نمونہ ہے جو محترم اسعد میاں کی بلند و بالا نسبتوں کے لحاظ
سے ہی افسوسناک نہیں پوری ملت کے مفاد اور مستقبل کے لحاظ سے بھی بے پناہ خطرناک ہے۔

ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں کہ نیشنلزم اور سیکولرزم کے نام پر مسلمانوں کی ایک جماعت کو (جس سے ہمیں بھی سخت اختلاف رہتا ہے) مولانا اسعد میاں کی طرف سے مطعون کئے جانے پر ہم نے بلا نام لئے انہیں ٹوکا تھا کہ یہ باتیں ان کے شایان شان نہیں۔ نہ تو دینی لحاظ سے یہ دونوں اہم قرن کسی تفرد و مباہات کا میدان بننے کے لائق ہیں اور نہ ملی مصلحت کے لحاظ سے ہندوستان کے موجودہ حالات اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ مسلمان علی الاعلان ایک دوسرے کے سیکولرزم اور نیشنلزم کی پیمائش کریں، لیکن یہ گزارش رائیگاں ہی گئی۔ اور اب اس سے بھی آگے بڑھ کر آج کے جیسے نازک حالات میں مولانا اسعد میاں کسی ایک جماعت نہیں بلکہ جمعیۃ علماء کے برسر اقتدار گروہ کے سوا مسلمانوں کی تمام اہم جماعتوں اور مختلف حلقوں کے مشترک پلیٹ فارم کی حب الوطنی کو پیمائش میں لاتے ہوئے اظہار حیرت فرما رہے ہیں کہ اس نے ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے دوران کروٹ بھی نہیں لی! ——
لیکن اسعد میاں کو یہ بات بھولنی نہ چاہیئے کہ انھیں ابھی وطن کی راہ میں کچھ جھیل کر دکھانے کا موقع نہیں ملا ہے جبکہ جس شخص (ڈاکٹر سید محمود صاحب) کو وہ حب الوطنی کا سبق پڑھا رہے ہیں اسکے بال ہی اس راہ میں وہ سب کچھ جھیلتے ہوئے سفید ہوئے ہیں، جو پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور اس صف کے دوسرے اشخاص نے جھیلا تھا۔ جمعیۃ علماء کی قیادت بیشک بڑا مرتبہ ہے مگر اس کا مطلب تو نہیں ہونا چاہیئے کہ آدمی فرق مراتب کو بھی یکسر بھول جائے! مولانا اسعد صاحب اگر جمعیۃ علماء کے بزرگوں کی روایات کا پاس فرماتے تو اُن کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر کسی مسلمان میں کوئی ذاتی کمزوری بھی ہوتی تو وہ اسکی پردہ پوشی فرماتے نہ یہ کہ ڈاکٹر سید محمود جیسے بزرگ محب وطن کی حب الوطنی کو بھی مشکوک قرار دینے کی سعی کی جائے۔ کاش! اسعد میاں محسوس کر سکیں کہ وہ کدھر جا رہے ہیں!

کائنات کا خالق ـــــ خدا یا اتفاق

(از جناب وحید الدین خاں صاحب)

کائنات کے اندر جو حیرت انگیز نظم اور جو غیر معمولی حکمت و معنویت پائی جاتی ہے۔ مخالفین مذہب اس کو بطور واقعہ تسلیم کرتے ہیں مگر اس میں انھیں کسی ناظم و مدبر خدا کا اشارہ نہیں ملتا۔ بلکہ وہ اس کی دوسری توجیہ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ سب کچھ محض "اتفاق" سے ہو گیا ہے۔ ٹی۔ ایچ ہکسلے کے الفاظ میں چھ بندر اگر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جائیں اور کروڑوں سال تک اسے پیٹتے رہیں تو ہو سکتا ہے کہ ان کے سیاہ کیے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں سے آخری کاغذ پر شیکسپیر کی ایک نظم (SONNET) نکل آئے۔ اسی طرح اربوں اور کھربوں سال مادہ کی اندھا دھند گردش کے دوران میں موجودہ کائنات بن گئی۔

THE MYSTERIOUS UNIVERSE. 3-4.

یہ بات اگرچہ بجائے خود بالکل لغو ہے۔ کیونکہ ہمارے آج تک کے تمام علوم ایسے کسی اتفاق سے قطعاً ناواقف ہیں جس کے نتیجہ میں اتنا عظیم، اس قدر بامعنی اور ایسا مستقل واقعہ وجود میں آجائے جیسی کہ یہ کائنات ہے۔ بلاشبہ ہم بعض اتفاقات سے واقف ہیں۔ مثلاً ہوا کا ایک جھونکا کبھی سرخ گلاب کے زیرہ (POLLEN) کو اڑا کر سفید گلاب پر ڈال دیتا ہے جس کے نتیجے میں زرد رنگ کا پھول کھلتا ہے۔ مگر اس قسم کا اتفاق صرف ایک جزئی اور استثنائی واقعہ کی توجیہ کرتا ہے، وہ گلاب کے پورے وجود کائنات کے اندر ایک حالت میں اس کی مسلسل موجودگی اور سارے نظام عالم سے اس کا حیرت انگیز ربط ہوا کے اتفاقی جھونکے سے سمجھا نہیں جا سکتا: اتفاقی واقعہ کے نظام میں ایک جزوی صداقت ہونے کے باوجود کائنات کی توجیہ کے اعتبار سے وہ ایک لغو بات ہے۔ پروفیسر

ایڈون کانکلن (EDWIN CONKLIN) کے الفاظ میں "زندگی کا بذریعہ حادثہ (ACCIDENT) وقوع میں آجانا ایسا ہی ہے جیسے کسی پریس میں دھماکہ ہو جانے سے ایک ضخیم لغت کا تیار ہو جانا۔"

THE EVIDENCE OF GOD, P. 174.

کہا جاتا ہے کہ اتفاق کے حوالے سے کائنات کی توجیہ کوئی الل ٹپ بات نہیں ہے۔ بلکہ سر جیمز جینز کے الفاظ میں وہ خالص ریاضیاتی قوانین اتفاق (PURELY MATHEMATICAL LAWS OF CHANCE) پر مبنی ہے۔ ایک مصنف لکھتا ہے:۔

"اتفاق (CHANCE) محض ایک فرضی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت ہی ترقی یافتہ حسابی نظریہ ہے جس کا اطلاق ان امور پر کیا جاتا ہے جن میں قطعی معلومات ممکن نہیں ہوتیں۔ اس نظریے کے ذریعہ ایسے بے لاگ اصول ہمارے ہاتھ آجاتے ہیں جن کی مدد سے ہم صحیح اور غلط میں بآسانی امتیاز کر سکتے ہیں اور کسی خاص نوعیت کے واقعہ کے صادر ہونے کے امکانات کا حساب لگا کر صحیح صحیح اندازہ کر سکتے ہیں کہ اتفاقاً اس کا پیش آجانا کسی حد تک ممکن ہے"

THE EVIDENCE OF GOD, P. 23

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ مادہ کسی خام حالت میں خود سے کائنات میں موجود ہوگیا اور پھر یہ بھی فرض کرلیں کہ اس میں عمل اور ردعمل کا ایک سلسلہ بھی اپنے آپ شروع ہوگیا ــــ اگرچہ ان مفروضات کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے ــــ جب بھی کائنات کی توجیہہ حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہاں ایک اور اتفاق مخالفین مذہب کی راہ میں حائل ہوگیا ہے۔ بدقسمتی سے ہماری ریاضیات جو قانون اتفاق کا قیمتی نکتہ ہمیں دیتی ہے، وہی اس بات کی تردید بھی کر رہی ہے کہ قانون اتفاق موجودہ کائنات کا خالق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سائنس نے معلوم کرلیا ہے کہ ہماری دنیا کی عمر اور جسامت کیا ہے اور جو عمر اور جسامت اس نے معلوم کی ہے وہ قانونِ اتفاق کے تحت موجودہ دنیا کے وقوع میں آنے کے لیے بالکل ناکافی ہے۔

ے THE MYSTERIOUS UNIVERSE, P. 3

"اگر تم دس سکے لو اور ان پر ایک سے دس تک نشان لگا دو۔ اس کے بعد انھیں اپنی جیب میں ڈال کر اچھی طرح ملا دو۔ اب ان کو ایک سے دس تک بالترتیب اس طرح نکالنے کی کوشش کرو کہ ایک سکہ کو نکالنے کے بعد ہر بار اس کو دوبارہ جیب میں ڈال دو ـــــ یہ امکان کہ نمبر ایک کا سکہ پہلی بار تمھارے ہاتھ میں آجائے دس میں ایک ہے۔ یہ امکان کہ ایک اور دو بالترتیب تمھارے ہاتھ میں آجائیں سو میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک، دو اور تین نمبر سلسلہ وار تمھارے ہاتھ میں آجائیں ایک ہزار میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک، دو، تین اور چار نمبر کے سکے بالترتیب نکل آئیں، دس ہزار میں ایک ہے۔ یہاں تک کہ یہ امکان کہ ایک سے دس تک تمام سکے بالترتیب تمھارے ہاتھ میں آجائیں دس بلین (دس ارب) میں صرف ایک بار ہے۔"

یہ مثال نقل کرنے کے بعد کریسی مارسین (ACRESSY MORRISON) لکھتا ہے:۔

THE OBJECT IN DEALING WITH SO SIMPLE A PROBLEM IS TO SHOW HOW ENORMOUSLY FIGURES MULTIPLY AGAINST CHANCE.

MAN DOES NOT STAND ALONE, P.17

یعنی یہ سادہ مثال اس لیے دی گئی تاکہ یہ امر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ واقعات کی تعداد کی نسبت سے امکانات کی تعداد کتنی زیادہ ہوتی ہے۔

اب اندازہ کیجئے کہ اگر سب کچھ محض اتفاق سے ہو گیا ہے تو اس کے لیے کتنی مدت درکار ہوگی۔ ذی حیات اشیاء کی ترکیب زندہ خلیوں (LIVING CELLS) سے ہوتی ہے۔ خلیہ ایک نہایت چھوٹا اور پیچیدہ مرکب ہے جس کا مطالعہ علم الخلیہ (CYTOLOGY) میں کیا جاتا ہے۔ ان خلیوں کی تعمیر میں جو اجزاء کام آتے ہیں ان میں سے ایک پروٹین ہے۔ پروٹین ایک کیمیائی مرکب ہے جو پانچ عناصر کے ملنے سے وجود میں آتا ہے ـــــ کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک۔ پروٹینی سالمہ (MOLECULE) ان عناصر کے تقریباً چالیس ہزار جواہر (AT IMS) پر مشتمل ہوتا ہے۔

کائنات میں سو سے زیادہ کیمیائی عناصر بالکل منتشر اور بے ترتیب بکھرے ہوئے ہیں۔

اب اس امر کا امکان کس حد تک ہو کہ ان تمام عناصر کے بے ترتیب ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آجائے جو مادے کی وہ مقدار جسے مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ نکل سکتا ہو اور وہ مدت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو، حساب لگا کر معلوم کی جا سکتی ہے۔

سوئٹزرلینڈ کے ایک ریاضی داں، پروفیسر چارلس ایوجین گائی (CHARLES EUGENE GUYA) نے اس کا حساب لگایا ہے اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان 10^{160} کے مقابلہ میں صرف ایک درجہ ہو سکتا ہے (10^{160} کا مطلب یہ ہے کہ دس کو دس سے ایک سو ساٹھ مرتبہ پے در پے ضرب دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ایک کے آگے ایک سو ساٹھ صفر) ظاہر ہے کہ ایک ایسا عدد ہے جس کو الفاظ کی زبان میں ظاہر کرنا مشکل ہے۔[۱]

صرف ایک پروٹینی سالمہ کے اتفاقاً وجود میں آنے کے لیے پوری کائنات کے موجودہ مادہ سے کروڑوں گنا زیادہ مقدار مادہ مطلوب ہوگی جسے یکجا کر کے ہلایا جائے اور اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان 10^{243} سال بعد ہے۔

پروٹین، امینو ایسڈز (AMINO ACIDS) کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقے کی ہے جس سے یہ سلسلے باہم ملیں۔ اگر یہ غلط شکل میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کے بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں۔ پروفیسر جے۔ بی۔ لیتھز (J.B. LEATHES) نے حساب لگایا کہ ایک سادہ سے پروٹین کے سلسلوں کو اربوں اور کھربوں (10^{48}) طریقے سے یکجا کیا جا سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ تمام امکانات ایک پروٹینی سالمہ کو وجود میں لانے کے لیے محض اتفاق سے اکٹھا ہو جائیں۔

واضح ہو کہ اس انتہائی بعید امکان کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ بے شمار مدت کی تکرار کے بعد لازماً یہ واقعہ ظہور میں آجائے گا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ایسا ہو جائے۔ دوسری طرف یہ امکان بھی ہے کہ ہمیشہ دہراتے رہنے کے باوجود کبھی بھی کوئی ایسا واقعہ ظہور میں نہ آئے۔

پھر پروٹین خود محض ایک کیمیائی شے ہے جس میں زندگی موجود نہیں ہوتی، پروٹین کے

---

[۱] واضح ہو کہ سارے انتہائی عدد۔ جا سکھ۔ میں ایک کے آگے ۱۱ صفر لگتے ہیں۔

کے خلیہ کا جزو بننے کے بعد اس میں زندگی کی حرارت کیسے پیدا ہوئی۔ اس کا جواب اس توجیہ میں نہیں ہے پھر یہی خلیہ کے صرف ایک ترکیبی جزو۔ پروٹین ــــ کے صرف ایک ناقابلِ مشاہدہ ذرہ کے وجود میں آنے کی توجیہ ہو جبکہ صرف ایک ذی حیات جسم کے اندر سنکھ مہاسنکھ کی تعداد میں ایسے مرکبات ہوتے ہیں۔

لے کامٹے ڈو نوائے (LECOMTE DU NOUY) نے اس پر بہت عمدہ اور مفصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کے امکان کے ظہور میں آنے کے لیے جس وقت جس مقدارِ مادہ اور جس پہنائی کی ضرورت ہوگی وہ ہمارے تمام اندازوں سے ناقابلِ یقین حد تک زیادہ ہو۔ اس کے لیے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جس کا دائرہ اتنا بڑا ہو جس میں روشنی ۱۰^۸۲ سال نور (ایک کے آگے ۸۲ صفر) سفر کر کے اس کو پار کر سکتی ہو۔ یہ حجم موجودہ کائنات سے بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ ہماری بعید ترین کہکشاں کی روشنی چند بلین سال نور میں ہم تک پہونچ جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئن شائن نے کائنات کی وسعت کا جو اندازہ کیا ہے وہ اس عمل کے لیے قطعاً ناکافی ہو۔ پھر اس مفروضہ کائنات میں پانچ سو ٹریلین حرکت فی سکنڈ کی رفتار سے مادہ کی مفروضہ مقدار کو ہلایا جائے تب کہیں اس امر کا امکان پیدا ہوگا کہ پروٹین کا ایک ایسا سالمہ اتفاق سے وجود میں آئے جو زندگی کے لیے ضروری اور مفید ہے۔ اور اس سارے عمل کے لیے جس مدت کی ضرورت ہے وہ ۱۰^۲۴۳ (ایک کے آگے ۲۴۳ صفر) بلین سال ہے ــــ مگر ہمیں بھولنا نہیں چاہیئے" ڈو نوائے لکھتا ہے کہ "زمین صرف دو بلین سال سے موجود ہے اور یہ کہ زندگی کی ابتدا صرف ایک بلین سال پہلے ہوئی جبکہ زمین ٹھنڈی ہوئی۔"

HUMAN DESTINY, 30-36

سائنس نے اگرچہ ساری کائنات کی عمر دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ موجودہ کائنات پچاس کھرب سال سے موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طویل عمر بھی ایک مطلوبہ پروٹینی سالمہ کو وجود میں لانے کے لیے ناکافی ہے۔ مگر جہاں تک زمین کا تعلق ہو جس پر ہماری معلوم زندگی پیدا ہوئی، اس کی عمر تو نہایت قطعیت کے ساتھ معلوم کر لی گئی ہے۔

ماہرینِ فلکیات کے اندازہ کے مطابق زمین سورج کا ایک ٹکڑا ہے جو کسی بڑے ستارے کی کشش سے ٹوٹ کر فضا میں گردش کرنے لگا تھا۔ اس وقت زمین سورج کی مانند ایک جسم

شعلہ تھی جس میں کسی بھی قسم کی زندگی پیدا ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہو کر منجمد ہوئی۔ اس انجماد کے بعد ہی یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ اس میں زندگی کا آغاز ہو۔

زمین کی عمر، جب سے کہ وہ ٹھوس ہوئی، مختلف طریقوں سے نہایت صحیح طور پر معلوم کی جا سکتی ہے، ان میں سب سے عمدہ طریقہ تابکار عناصر (RADIO-ACTIVE ELEMENTS) کی دریافت سے حاصل ہوا ہے۔ تابکار عناصر کے ایٹم کے برقی ذرات ایک خاص تناسب سے مسلسل خارج ہوتے رہتے ہیں اور اسی لیے وہ ہم کو روشن نظر آتے ہیں۔ اس اخراج یا انتشار کی وجہ سے ان کے برقی ذرات کی تعداد گھٹتی رہتی ہے اور وہ دھیرے دھیرے غیر تابکار دھات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یورنیم اسی قسم کا ایک تابکار عنصر ہے۔ وہ عمل انتشار کی وجہ سے ایک خاص اور متعین شرح سے سیسہ میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہ پایا گیا ہے کہ اس تبدیلی کی شرح کسی بھی سخت ترین حرارت یا دباؤ سے متاثر نہیں ہوتی۔ ہم تبدیلی کی اس رفتار کو اٹل سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ یورنیم کے ٹکڑے مختلف چٹانوں میں پائے جاتے ہیں اور بلاشبہ وہ اس وقت سے چٹان کا جزو ہیں جبکہ یہ چٹان منجمد ہوئی۔ یورنیم کے ساتھ ہم سیسہ پاتے ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ تمام سیسہ جو یورنیم کے ساتھ پایا جاتا ہے وہ یورنیم کے انتشار (DISINTEGRATION OF URANIUM) سے وجود میں آیا ہے۔ کیونکہ یورنیم سے بنا ہوا سیسہ، عام سیسے سے کچھ ہلکا ہوتا ہے۔ اس لیے سیسے کے کسی بھی ٹکڑے کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہے کہ وہ یورنیم سے بنا ہے یا نہیں۔ اس سے ہم حساب لگا سکتے ہیں کہ یورنیم جس چٹان میں ہے وہاں کتنی مدت سے اس پر انتشار کا عمل ہو رہا ہے اور چونکہ یورنیم چٹان میں اس وقت سے ہے جبکہ چٹان منجمد ہوئی اس لیے ہم اس کے ذریعے سے خود چٹان کے انجماد کی مدت معلوم کر سکتے ہیں۔

اس طرح کے اندازے بتاتے ہیں کہ چٹان کے انجماد کو کم از کم چودہ سو ملین سال گزر چکے ہیں یہ اندازے ان چٹانوں کے مطالعہ پر مبنی ہیں جو ہمارے علم کے مطابق زمین کی قدیم ترین چٹانیں ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے زمین کی عمر اس سے بہت زیادہ مثلاً دگنا اور تگنا ہو۔ مگر ارضیاتی مطالعہ کے دوسرے شواہد اس طرح کے غیر معمولی اندازوں کی تردید کرتے ہیں۔ چنانچہ جے ڈبلیو۔ این سولیوان نے زمین کی عمر کا ایک بہتر اوسط دو ہزار ملین سال قرار دیا ہے[1]۔ اب ظاہر ہے کہ جب صرف

[1] LIMITATIONS OF SCIENCE, P. 78

ایک غیر ذی روح پروٹینی سالمہ کے مرکب کو اتفاقاً وجود میں لانے کے لیے سنکھ جہاسنکھ سے بھی زیادہ مدت درکار ہے تو صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر زندہ اور مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ سے زیادہ اور نباتات کی دو لاکھ سے زیادہ اقسام کیسے وجود میں آگئیں۔ اور ہر قسم میں لاتعداد حیوانات و نباتات پیدا ہو کر خشکی اور تری میں کیسے پھیل گئے۔ اور پھر انھیں ادنیٰ درجہ کی ذی روح اشیاء سے اتنی قلیل مدت میں انسان جیسی اعلیٰ مخلوق کیسے وجود میں آگئی جبکہ نظریۂ ارتقاء انواع میں جن اتفاقی تبدیلیوں کے اوپر اپنی بنیاد کھڑی کرتا ہے۔ ان میں سے ہر تبدیلی کا حال یہ ہو کہ ماہر ریاضی پاچو (PATAU) نے حساب لگایا ہے کہ کسی ذی حیات میں نئی تبدیلی کو مکمل ہوتے ہوتے دس لاکھ پشتوں کے گزر جانے کا امکان ہے[1]۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ اگر محض ارتقاء کے اندھے مادی عمل کے ذریعہ کتے کی طرح پانچ انگلیاں رکھنے والے جد امجد کی نسل میں بے شمار تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا مختلف جانور بن گیا ہو، تو اس کے بننے میں کتنا عرصہ درکار ہوگا۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امریکی عالم عضویات ایم۔ بی۔ کریڈر (MARLIN BOOKS KREIDER) کے یہ الفاظ کس قدر صحیح ہیں:۔

> THE MATHEMATICAL PROBABILITY OF A CHANCE OCCURRENCE OF ALL THE NECESSARY FACTORS IN THE RIGHT PROPORTION IS ALMOST NIL.
>
> THE EVIDENCE OF GOD, P. 67

یعنی تخلیق کے تمام ضروری اسباب کا صحیح تناسب کے ساتھ اتفاقاً اکٹھا ہو جانے کا امکان ریاضیاتی طور پر قریب قریب نفی کے برابر ہے۔

یہ طویل تجزیہ محض اتفاقی پیدائش کے نظریے کی لغویت واضح کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہو کہ "اتفاق" سے نہ کوئی ایٹم یا سالمے کیول وجود میں آسکتا ہے اور نہ وہ ذہن پیدا ہو سکتا جو یہ سوچ رہا ہو کہ کائنات کیسے وجود میں آئی۔ خواہ اس کے لیے کتنی ہی طویل مدت فرض کی جائے۔ یہ نظریہ نہ صرف "ریاضیاتی" طور پر محال ہو بلکہ منطقی حیثیت سے بھی وہ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا۔ یہ ایسی ہی لغو بات ہو جیسے

---

[1] THE EVIDENCE OF GOD, P. 71

کوئی کہے کہ ایک گلاس پانی فرش پر گرنے سے دُنیا کا نقشہ مرتب ہو سکتا ہو۔ ایسے شخص سے بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ اس اتفاق کے پیش آنے کے لیے فرش، کشش ارضی، گلاس اور پانی کہاں سے وجود میں آ گئے۔

علم حیاتیات کا مشہور عالم ہیکل (HAECKEL) نے کہا تھا: "مجھے ہوا، پانی کیمیائی اجزار اور وقت دو، میں ایک انسان بنا دوں گا"۔ مگر یہ کہتے ہوئے وہ بھول گیا کہ اس اتفاق کو وجود میں لانے کے لیے ایک ہیکل اور مادی حالات کی موجودگی کو ضروری قرار دے کر وہ خود اپنے دعوے کی تردید کر رہا ہو۔ بہت خوب کہا ہے مارین نے:۔

"ہیکل نے یہ کہتے ہوئے جین (GENES) اور خود زندگی کے مسئلے کو نظر انداز کر دیا۔ انسان کو وجود میں لانے کیلئے اسکو سب سے پہلے ناقابل مشاہدہ ایٹم فراہم کرنے ہوں گے، پھر ان کو مخصوص ڈھنگ سے ترتیب دے کر جین بنانا ہوگا اور اسکو زندگی دینی ہوگی۔ پھر بھی اسکی اس اتفاقی تخلیق کا امکان کروڑوں میں ایک کا ہے۔ اور بالفرض اگر وہ کامیاب بھی ہو جائے تو اسکو وہ اتفاق (ACCIDENT) نہیں کہہ سکتا بلکہ وہ اس کو اپنی ذہانت (INTELLIGENCE) کا نتیجہ قرار دے گا۔"

MAN DOES NOT STAND ALONE, P. 87

اس بحث کو میں ایک امریکی عالم طبیعیات جارج ارل ڈیوس (EARL DAVIS) کے الفاظ پر ختم کروں گا:۔

"اگر ایک کائنات خود اپنے آپ کو پیدا کر سکتی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اندر خالق کے اوصاف رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ کائنات خود خدا ہو۔ اس طرح اگرچہ ہم خدا کے وجود کو تسلیم کر لیں گے لیکن وہ نرالا خدا ہوگا جو بیک وقت مافوق الفطرت بھی ہوگا اور مادی بھی۔ میں اس طرح کے کسی مہمل تصور کو اپنانے کے بجائے ایک ایسے خدا پر عقیدے کو ترجیح دیتا ہوں جس نے عالم مادی کی تخلیق کی ہے اور اس عالم کا وہ خود کوئی جزء نہیں۔ بلکہ اس کا فرماں روا اور ناظم و مدبر ہے۔"

THE EVIDENCE OF GOD, P. 71

مقالات طریقت

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حالات میں ایک نایاب تذکرہ

از، محمد عضد الدین خاں صاحب ایم اے ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

محمد شاہ کی دلی ہے، لوٹ مار، قتل و غارتگری کا دور دورہ ہے، سکھ، جاٹ اور مرہٹے ہر طرف تباہی مچائے ہوئے ہیں، نادر شاہ کا قتل عام اسی سرزمین میں ہو چکا ہے، ایرانی و تورانی امراء نے بادشاہ کو اپنے ہاتھوں میں کھلونا بنا لیا ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی انحطاط اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے جس دور کی ابتدا محمود غزنوی، ایبک اور التمش کی رزم آرائیوں سے ہوئی تھی آج وہ بہادر شاہ اول اور محمد شاہ کی بزم آرائیوں اور ہنگامہ ہائے نائے و نوش میں ختم ہو رہا ہے اور فلسفۂ تاریخ کے مفکر کی یہ صدا فضاؤں میں گونج رہی ہے۔ ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

اس سیاسی بدامنی اور معاشرتی پستی کا اثر مذہبی زندگی پر بھی پڑنا ضروری تھا، اگر اللہ کے چند بیدار مغز بندے اس ظلمت اور توہم پرستی کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لئے کمربستہ نہ ہو جاتے اور ان تیز و تند ہواؤں میں مذہب و ثقافت کے چراغوں کو نہ بچاتے تو ان کا بھی وہی حال ہوتا۔

ان جواں مرد سپاہیوں میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے اور ان کے خاندان کے دوسرے بزرگوں نے ہندوستان میں اسلام کی دینی خدمت کی جو قابل قدر

کے اکابر نے پوری دنیائے اسلام کی انجام دی تھی، افسوس کہ اسلامی ہند کے اس عظیم فرزند کا صحیح اور غیر جانبدارانہ مطالعہ اب تک نہ کیا جا سکا، کسی نے ان کو اپنے ذاتی فلسفے کے لئے آلۂ کار بنایا، کسی نے ان پر صرف عقیدت و محبت کے باسی پھول چڑھائے، کسی نے سب و شتم کی بارش کی، کسی نے ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے، آجکل بعض اشخاص اور اداروں نے کام شروع کیا تو وہ بھی ان کی کتابوں کے ترجمے یا ان ہی پرانی ٹیڑھی ترچھی تصویروں کو دوبارہ سامنے لانے تک محدود رہے۔

متقدمین نے شاہ صاحب کے جتنے بھی تذکرے لکھے، ان میں سے اکثر کا یہی حال ہے، نہ ان میں واقعیت ہے نہ تاریخیت، اس لئے ان کے اکثر بیانات دل کو نہیں لگتے اور تصویر کا صحیح رخ سامنے نہیں آتا، ان تذکروں میں ایک تذکرہ "مقالات طریقت" معروف بہ فضائل عزیزیہ ہے، جسے عبدالرحیم ضیا حیدرآبادی نے لکھا ہے، یہ کتاب طبع تو آج سے تقریباً سو سال پہلے ہوئی تھی، مگر ایک طویل عرصے سے نایاب تھی، اور اس کے حوالے بھی بہت کم ملتے تھے، اسلئے اسکے متعلق کسی طرح کا خیال نہیں ظاہر کیا جا سکتا تھا، اتفاق سے یہ کتاب راقم کو حیدرآباد کے ایک ذاتی کتب خانے سے دستیاب ہوگئی، اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ یہ تذکرہ قدیم ہونے کے باوجود کسی بھی جدید، مفصل اور محققانہ تذکرے سے کم نہیں ہے۔

یہ کتاب تین سو بیس صفحات پر مشتمل شاہ صاحب کے انتقال کے باون سال بعد ۱۲۹۱ھ میں حیدرآباد میں لکھی گئی اور اس کے دوسرے سال یعنی ۱۲۹۲ھ میں حیدرآباد ہی سے شائع ہوئی، تذکرے کے مصنف محمد عبدالرحیم ضیا حیدرآباد دکن کے رہنے والے اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے خلفاء سے قریبی تعلق رکھتے تھے، وہ شاہ اسحٰق صاحب (خلیفہ و نواسہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب) کے خلیفہ اور شاگرد سید شاہ محی الدین صاحب قادری ویلوری کے مرید بھی تھے، فاضل تذکرہ نگار اسکے علاوہ اور کتابوں کے مصنف اور صاحب دیوان شاعر بھی ہیں وہ اس کتاب کے ماخذ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اکثر روایات اہل ہند ثقات سے کہ بعض ان میں صحبت یافتہ حضرت کے ہیں جمع کرکے جو ابواب کہ اس طریق سے حاصل نہ ہوئے، ان کو بذریعہ تحریر جناب فضیلت مآب ...

......مولانا حافظ حاجی محمد عبدالقیوم صاحب دہلوی سلمہ اللہ العزیز القوی داماد و شاگرد حضرت حضرت مولانا محمد اسحاق علیہ الرحمہ سے بعد دریافت و تحقیق کے اس کتاب میں لکھا ہے[1]

یہ کتاب چھ مقالات (ابواب) اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے پہلے مقالے میں مصنف نے شاہ صاحب کے مفصل حالات از ولادت تا وفات درج کئے ہیں، یہ باب چھیالیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس کتاب کا سب سے اہم اور پر از معلومات باب ہے، دوسرا باب امور متعلق بعلوم ظاہر و باطن اٹھاون صفحات میں ہے تیسرا باب شاہ صاحب کی "تعبیر رؤیا" سے متعلق ستر صفحات میں ہے، چوتھا باب جو تیس صفحات کا ہے، شاہ صاحب کے "اجوبہ اسئلہ" سے متعلق ہے، پانچویں باب میں ان کے مختلف سلاسل طریقت کا ذکر بڑی تفصیل سے پینتالیس صفحات میں کیا گیا ہے، آخری باب میں شاہ صاحب کے اہل و ارشد خلفاء کے تفصیلی حالات ساٹھ صفحات میں ہیں، خاتمے میں اپنے پیر و مرشد سید شاہ محی الدین قادری ویلوری کے حالات چوالیس صفحات میں لکھے ہیں، کتاب کے ضمیمے میں مولانا محمد زمان شہید کا تذکرہ جو شاہ صاحب کے خاندان کے مشہور خلفاء میں ہیں، ۲۲ صفحات میں ہے۔

اس اجمالی تعارف کے بعد اس پر تفصیلی نگاہ ڈالی جاتی ہے، تاکہ اسکی افادیت اور اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

کتاب کے شروع میں مصنف نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے سلسلۂ نسب اور آبا و اجداد کے مولد و مسکن وغیرہ کا حال لکھا ہے، اسکے بعد شاہ عبدالرحیم صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کے حالات کسی قدر تفصیل سے دیے ہیں، اسکے بعد رقمطراز ہیں:۔

"حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے اول اپنے ماموں کی دختر سے نکاح کیا تھا ان سے مولوی محمد رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے، آپ بڑے ولی کامل تھے آپ پر جذب بہت غالب تھا...... مزار آپ کا مع دونوں فرزند کے بڈھانہ کی مسجد میں واقع ہے، بعد انتقال والدہ ماجدہ مولوی محمد صاحب کے شاہ صاحب موصوف

---

[1] مقالات طریقت ص ۴

نے دختر نیک اختر سید شاہ اللہ صاحب ساکن قصبہ سونی پت مساۃ بی بی ارادہ رحمۃ اللہ علیہا سے شادی کی۔ ان سے چار فرزند پیدا ہوئے، اولین مولانا شاہ عبدالعزیز دومیں شاہ رفیع الدین، سوم شاہ عبدالقادر، چارمی مولوی عبدالغنی اور ایک دختر مساۃ بی بی امۃ العزیز، دختر مذکورہ کو مولوی محمد فائق بن مولوی محمد عاشق ابن شاہ عبداللہ بن شیخ محمد پھلتیؒ سے شادی کردی، ان کا سلسلہ اب تک باقی ہے"

اس کے بعد شاہ رفیع الدین صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب اور شاہ عبدالغنی صاحب کی زندگی کے اہم واقعات لکھے ہیں، جو دلچسپی اور معلومات سے خالی نہیں، مگر اس مضمون میں اصل مقصد شاہ عبدالعزیز صاحب کے حالات سے بحث ہے، اس لئے طوالت کے خوف سے ان کو حذف کیا جاتا ہے، مگر اس سلسلہ میں ایک اہم بات فاضل مصنف نے یہ بیان کی ہے کہ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے بیعت کے معاملہ میں عام طور پر یہ گمان کیا جاتا ہے کہ چونکہ شاہ ولی اللہ صاحب کے انتقال کے وقت شاہ عبدالعزیز کے تینوں بھائی کم عمر تھے، اس لئے جس طرح شاہ عبدالعزیز صاحب ان حضرات کے ظاہری مربی تھے، اسی طرح باطنی مرشد بھی وہی ہوں گے، مگر عبدالرحیم ضیا کے بیان کے مطابق شاہ رفیع الدین صاحب شاہ محمد عاشق پھلتی صاحب سے بیعت و اجازت رکھتے تھے اور شاہ عبدالقادر صاحب شاہ عبدالعدل دہلوی سے بیعت تھے، جن کا مزار حضرت خواجہ باقی باللہ کے احاطے میں ہے۔

کتاب کا اصل مقصد شاہ عبدالعزیز صاحب کے حالات بیان کرنا ہے، ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ .... دراز قد، لاغر اندام گندم رنگ، کلاں چشم، صاف جسم تھے، گردا گرد چہرے کے ریش مبارک خوشنما باعتدال تھی، اکثر جبہ اس کے نیچے انگرکھا اور پائجامہ شرعی، دستار گشتی کلاہ پنج دار رومال بمبئی یا ک نیلا اور پاپوش زری اور ہاتھ میں عصائے بید رکھتے تھے، اخلاق میں تخلقوا باخلاق اللہ کے مصداق تھے، مزاج میں نہایت خوش طبعی

اور ہر ایک بات کا مذاق تھا۔"

" ولادت آپ کی شب جمعہ بست و پنجم ماہ رمضان ۱۱۵۹ھ میں ہے اور نام تاریخی آپ کا غلام حلیم ہے، کہتے ہیں کہ اسی شب شب قدر بھی تھی، اور آپ ختم قرآن شریف بھی اسی شب کو کرتے تھے، اور ختم میں شیرینی قسم ریوڑی سے تقسیم فرماتے تھے، آپ کی عمر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے انتقال کے وقت سولہ برس چھ مہینے کی تھی، فاتحۂ سوم شاہ ولی اللہ صاحب کا خاں دوران خاں کے محل کلاں میں ہوا۔"

" رسم دستار بندی میں تین چار پیچ مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے سر مبارک پر باندھے۔ جناب مرزا مظہر جانجاناں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک تھے، آپ نے علوم ظاہر و باطن اپنے پدر والا قدر سے پڑھا، اور مولوی شاہ عاشق صاحب پھلتی سے اسکی تکمیل کی۔ اور بابا فضل کشمیری سے جو منجملہ ارشد تلامذہٗ شاہ ولی اللہ صاحب تھے، بعض کتب حدیث کی سند لی، اور علم فقہ اپنے خسر مولوی نور اللہ صاحب جد مولوی محمد عبد الحی صاحب رحمۃ اللہ علیہما سے پڑھا، اور اکثر فیوض ظاہر و باطن مزار پُر انوار پدر بزرگوار سے حاصل کرتے تھے، تھوڑے وقت انکی قبر شریف پر مراقب رہتے تھے، کوئی علم و فن ایسا نہ تھا کہ جس میں آپ کو دستگاہ کامل نہ ہو۔ خط شکست و نسخ خوب لکھتے تھے، علم موسیقی میں ملکہ راسخ تھا کہ استادان فن زانوے ادب تہہ کرتے تھے، تیر اندازی خلیفہ محمد شاکر سے گھوڑے کی سواری ملک بیرا افسر جایک سواران محمد شاہ بادشاہ سے سیکھی، تمام بھفنوں میں برتر اور شاذری میں سب سے بڑھ کر، غرض آپ کی ذات جامع کمالات معاصرین پر فائق بلکہ یکتائے روزگار تھی، اور فیض باطن حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے آپنے پایا ہو....."

" اور تین موضع آپ کی جاگیر تھی، ان کی سند عالم بادشاہ اور دولت راؤ سندیہ نے گذارنی تھی حسن پور اور مراد آباد پرگنہ سکندر آباد سے چار دوں بھائیوں میں شرک اور ایک موضع یعنی محل جنہ پرگنہ بوڈھانہ سے بلا شرکت آپ کے تصرف میں تھا،

چنانچہ وہ موضع اپنے دونوں نواسے مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب کو عطا کیا تھا، اب تک جاری ہے، مولوی نصر اللہ خاں صاحب کہتے ہیں کہ میری عملداری میں محل جنہ کے سالانہ بارہ سو روپئے کلدار ہوتے تھے اور اب بھی وہی ہے سوا اسکے اکثر جا سے فتوحات بلا قید سال وماہ اللہ تعالیٰ پہنچاتا تھا، جو شخص کچھ گذرانتا توقبول فرماتے اور نہ دیتا تو ذکر تک بھی نہ لاتے، خدمت طلبا اور فقرا وغیرہ کی بہت کرتے تھے، گویا جود وکرم آپ کا سرشت تھا، جو سائل آتا تھا بے نیل مرام نہ جاتا تھا۔"

اس کے بعد شاہ صاحب کے درس وتدریس، تربیت باطن اور تصنیف کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

"جاننا چاہئے کہ دنیا میں فیض بخشی کے بہت طریقے ہیں، مگر ان میں تین طریقے مشہور معروف ہیں، ایک تدریس دوسرا تربیت باطن جسے مریدی کہتے ہیں، تیسرا تصنیف اور یہ ابواب منجملہ بہترین باقیات الصالحات ہیں، ان امور میں حضرت کا پایہ بلند اور رتبہ ارجمند تھا، تدریس کا یہ حال کہ ہندوستان وغیرہ میں کوئی عالم کم نکلے گا جس کو حضرت سے واسطہ نہ ہو، کہتے ہیں کہ ایک بدایوں کے عالم نے حدیث شریف پڑھنے کا ارادہ کیا، مگر اس کو نادانی سے یہ خیال آیا کہ اس شخص سے پڑھے کہ جس کے سلسلے میں شاہ عبدالعزیز نہ ہوں، تمام ہندوستان پھرتے پھرتے حیران ہوا، جہاں گیا وہاں حضرت ہی کا فیض پایا، کوئی ایک واسطے سے کوئی دو یا تین واسطے سے حضرت کا شاگرد نکلا، یہ بات ایسی ہے کہ جیسے کسی نے انسانوں میں اپنی نسبت کرنی چاہی مگر یہ قید لگائی کہ اس خاندان میں ہو جس میں حضرت آدم علیہ السلام نہ ہوں۔"

"مگر آپ نے مستقل بجز چار پانچ شخص کے اور دن کو بہت کم پڑھایا ہے یعنی اپنے تینوں بھائیوں کو کہ رفیع الدین صاحب والد کے انتقال کے وقت مبتدی اور عبدالقادر صاحب صرف میر پڑھتے تھے، اور عبدالغنی صاحب قرآن شریف

حفظ کرتے تھے، تمام علوم پڑھایا اور اپنے داماد مولوی عبدالحئی صاحب کو، مولوی عبدالقیوم صاحب، مولانا اسحٰق صاحب علیہ الرحمہ سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا صاحب مجھ سے فرماتے تھے، میں نے کسی کو نہ دیکھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ بعد غلبۂ آشوب چشم کے بھی پڑھائے ہوں مگر تمہارے والد مولانا عبدالحئی صاحب کو اور جناب غلام علی شاہ صاحب مجددی علیہ الرحمہ بھی شاگرد ہیں، بخاری شریف پڑھی ہے۔[1] ان حضرات کے سوا اگر کسی کو پڑھایا ہے تو تین چار سبق سے زیادہ نہیں پڑھایا۔

"اور صبح کو جو ایک رکوع قرآن شریف کا قریب طلوع آفتاب ہر روز ایک تفسیر کے ساتھ سنا کرتے تھے، یہاں تک کہ بروز وفات بھی سنا ہے، اسکے قاری خاص مولانا اسحٰق صاحب ہوتے تھے، .... اور آپ کے برادروں کے ساتھ مولوی مفتی الٰہی بخش صاحب ساکن کاندھلہ اور مولوی قمرالدین صاحب منت تخلص وغیرہ سامع تھے، اسی طریق سے انھوں نے تحصیل کی۔"

شاہ صاحب کے درس اور شاگردوں سے متعلق اس کتاب کی روایت انوکھی اور عجیب سی ہے، مصنف لکھتے ہیں:۔

"مولوی عبدالقیوم صاحب فرماتے ہیں، میں نے مولانا اسحٰق صاحب سے پوچھا کہ حضرت اکثر لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم شاہ صاحب کے شاگرد ہیں، شاہ صاحب نے ہمیں تعلیم کی ہے، اسکی کیا حقیقت ہے، آپنے فرمایا کہ بعد نابینا ہونے کے شاہ صاحب کے پڑھنے کی دو صورتیں تھیں، ایک تو میں صبح کو قرآن شریف کا رکوع پڑھتا تھا اور مدرسہ میں لوگ سامع رہتے تھے، دوسرے یہ کہ علماء و فضلاء اور بڑے بڑے بزرگوار اطراف سے حاضر ہو کر حصول اجازت تیمناً تبرکاً چاہتے تو حضرت شاہ صاحب فرماتے کہ چل قدمی کے وقت پڑھیں میں سنوں گا، اس وقت کچھ بیان بھی کرتے تھے، اس قسم کے شاگرد بے شمار ہیں۔ سوا اسکے جمعہ اور منگل کو قرآن شریف کا درس

---

[1] مضمون کے مصنف تذکرہ نگار نے شاہ ابوسعید صاحب کو بھی شاہ صاحب کا شاگرد بتلایا ہے۔

بطور وعظ کے ہوتا تھا۔ اسکی کیفیت مرزا اعظم علی شاہ صاحب قادری چشتی اپنے استاد مولوی یار محمد صاحب مرحوم کی زبانی جو حضرت کے شاگردوں میں سے تھے، یوں بیان کرتے ہیں کہ آپ کے وعظ میں ہزارہا آدمی رہتے تھے، ان میں جو پڑھے لکھے تھے وہ لوگ ایک ایک تفسیر اپنی اپنی استعداد کے موافق عربی ہو یا فارسی لے کر بیٹھے رہتے، جب کوئی آیت شروع کرتے تو حضرت ہر ایک سے پوچھتے کہ امام رازی کیا معنی کرتے ہیں اور شیخ محی الدین ابن عربی کیا فرماتے ہیں اور قاضی بیضاوی کیا لکھتے ہیں۔۔۔ علیٰ ہذا القیاس جس کے پاس جو تفسیر ہوتی وہ اپنا بیان کرتا، جب سب تفسیریں ہو جاتیں تب آپ فرماتے، خیر یہ سب بیان ہو چکا، اب جو خدائے تعالیٰ نے اس فقیر کے دل پر القا کیا ہے بیان کرتا ہوں، پھر وہ وہ مضامین فرماتے کہ کسی مفسر کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آئے ہوں، سب لوگ کتابیں بند کر کے حضرت کا منہ تکتے رہتے اور ششدر ہو جاتے...... مولوی یار محمد صاحب علیہ الرحمہ مدتوں خدمت فیض درجت میں رہے ہیں اور کئی دورے قرآن مجید کے ان کے روبرو ہوئے ہیں، ان دوروں کا قرآن مجید شروع سے آخر تک محشیٰ ان کے فرزند مولوی محمد اسحٰق صاحب کے پاس موجود ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب بھی اسی طرح درس فرماتے تھے۔ اخیر درس ان کا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ تھا، وہاں سے حضرت نے شروع کیا ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ الخ

حضرت کا آخری درس آیۃ ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم تھا، حضرت کے بعد وہاں سے مولانا اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شروع کیا۔"

شاہ صاحب کے درس و تدریس کی کیفیت سننے کے بعد ان کے تصوف اور طریقہ تربیت باطن کا بھی کچھ حال تذکرہ نگار کی زبانی سنیئے، یوں تو انھوں نے اس کا ایک مستقل باب ہی قائم کیا ہے مگر اس باب میں بھی مختصراً رقمطراز ہیں۔

"تربیت باطن کی یہ کیفیت ہے کہ آپ کو تمامی آداب سلوک اور اشتغال طریقت میں دستگاہ کامل اور ملکۂ راسخہ تھا، جیسا چاہیئے ویسا طالبوں کو حسب استعداد

پہنچاتے تھے، کوئی طریقے کے مقید نہ تھے، کیونکہ اپنے عزیز و اقارب برادروں کی اولاد یعنی مولوی مخصوص اللہ صاحب اور مولوی اسمٰعیل صاحب[1] اور مولوی یعقوب صاحب اور مولانا اسحٰق صاحب وغیرہ سے قادریہ طریقہ میں بیعت لی تھی، اور امراء کو سلسلۂ چشتیہ میں اور دوسروں کو سلسلۂ نقشبندیہ میں مرید کرتے تھے، چنانچہ جناب سید احمد صاحب طریقۂ نقشبندیہ میں مرید تھے مگر مولانا عبدالحئی صاحب کو مولانا شاہ عبدالقادر صاحب سے بیعت تھی، اور شاہ صاحب خود صاحب طریقہ ہیں، کیونکہ آپ نے بعد تکمیل سلوک راہ ولایت اور سلوک راہ نبوت کے خاص ایک طریقہ سلوک راہ ولایت کا برعایت طبائع ابنائے روزگار استخراج کیا ہے، وصول الی اللہ کے واسطے نہایت آسان و سہل ہے، اس ہیچمیرز نے اس خاص سلوک طریقہ علیہ عزیزیہ کو مقالۂ پنجم میں..... لکھا ہے ......اور حضرت کی توجہ وغیرہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا، اگر کوئی خواہاں ہوتا تو فرماتے کہ تم غلام علی شاہ صاحب کے پاس جاؤ کہ وہ صاحب طریقہ ...... اور اس کام کے ذمہ دار ہیں، یہ فقیر طریقۂ تعلیم علوم ظاہری رکھتا ہے، اس پر بھی کوئی بہت خواہش اور الحاح کرتا اور آپ کے ذہن عالی میں آتا تو اس کے واسطے ایک وقت معین فرماتے اور جائے مقرر کرتے، مثلاً کسی کو بعد نماز مغرب اور کسی کو بعد نماز ظہر یا دوسرے وقت جو مناسب جانتے تعین کرتے، جیسے جناب سید احمد صاحب اور سید اللہ دیا صاحب برہان پوری اور مولانا یعقوب صاحب اور شیخ غلام جیلانی صاحب باغپتی اور حافظ قطب الدین صاحب پھلتی، یہ اکابر حضرت سے توجہ لئے ہیں اور تکمیل کو پہنچے ہیں.........“

---

[1] مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحئی صاحب کے شاہ صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب سے بیعت ہونے میں راقم کو اختلاف ہے، عام روایت کے مطابق یہ بزرگ سید احمد شہید سے بیعت تھے، ممکن ہو ان میں سے کسی ایک نے تبرکاً بیعت کی ہو اور باقاعدہ تعلیم بعد میں سید احمد شہید سے حاصل کی ہو، بہرحال یہ بات تحقیق طلب ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی تصانیف کے سلسلے میں بھی اس کتاب کی روایتیں کچھ کم نہیں ہیں اس سے ان کی بہت سی تصانیف کے بارے میں شبہات اور ابہام دور ہو جاتا ہے، لکھتے ہیں:-

"خوبی تصانیف کی تمام زمانے پر ظاہر و باہر ہے، بیان کی احتیاج نہیں، تفسیر فتح العزیز، تحفہ اثناعشریہ، سرالشہادتین، بستان المحدثین، عجالۃ النافعہ، حواشی قول الجمیل، یہ تمام کتابیں مشہور و مطبوع ہیں، سوا ان کے علم معانی میں ایک رسالہ ہے۔ سوا اسکے صدرہ اور میر زاہد رسالہ پر بھی حواشی ہیں، حاجی محمد حسین صاحب سہارنپوری سلمہ اللہ تعالیٰ، مولوی نور اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی ایک تفسیر فارسی تمام قرآن مجید کی اکبرآباد کے قاضی کے یہاں موجود ہے مگر وہ چھپی نہیں۔ تفسیر فتح العزیز کے لکھنے کا سبب یہ ہوا کہ آپ کی ایام جوانی میں عادت تھی کہ بعد نماز عصر تشریف رکھتے، اخبار دیار و امصار گوش زد ہوتے، دوسرے سخن و قصص بھی درمیان آتے اور اشخاص اسی قسم کے جمع ہوتے تھے، چنانچہ ایک کایستھ بھی درباریوں سے بادشاہ شاہ عالم کے اسی وقت حاضر ہو کر قصص دیار عرض کرتا، آخر کار وہ کایستھ فیض صحبت سے مسلمان ہو کر شیخ مصدق الدین نام پایا، اور کمال کو پہنچا، ان ہی کے حسب استدعا ۱۲۰۸ھ میں تفسیر شروع ہوئی، چنانچہ خود بدولت دیباچے میں تفسیر کے یہ کیفیت مفصل تحریر فرمائے ہیں شیخ مصدق الدین کے فرزند مولوی کرم اللہ صاحب بڑے فاضل اور ولی کامل خلفا سے غلام علی شاہ صاحب کے ہوئے ہیں۔"

"مرزا عظم علی شاہ صاحب قادری چشتی اپنے استاد مولوی یار محمد صاحب مرحوم القصہ سے روایت کرتے ہیں، تفسیر کے ناتمام رہنے کی یہ وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے خواب میں جناب شاہ صاحب کو فرمایا کہ تم تفسیر لکھنا موقوف رکھو، اگر تمام کروگے تو اور تمام مفسروں کی محنت بے فائدہ ہوگی، کوئی کسی کی تفسیر نہ دیکھے گا، تمہاری اتنی ہی تفسیر کوئی سمجھے تو تمام قرآن کے مضامین پہ حاوی ہوگا،

آپ نے حسب الحکم موقوف کیا، سورۂ بقرہ ناتمام رہا، واقعی ایسی ہی تفسیر نادر ہے کہ اسکے وصف میں زبان قاصر ہے، باوجود ضوابط علم تفسیر کے صحت روایات و آداب سلوک و اسرار حقایق و نکات معارف ایسے ہیں کہ اور تفاسیر میں کم ہونگے، جناب امام رازی قدس سرہٗ نے آیت کا ربط آیت سے دیا ہے حضرت نے سوا اس کے سورہ کو سورہ سے مربوط کیا ہے، اسکی تحریر کا یہ حال تھا کہ مسودہ کا اتفاق نہ ہوا، اور جو لفظ فرمایا پھر دوبارہ وہ زبان پر نہ آیا، مولوی حیدر علی صاحب منتہی الکلام سلمہ اللہ تعالیٰ نے جو حضرت کے آخر وقت کے مستفیضوں میں سے ہیں، حسب خواہش سکندر بیگم مغفورہ والیہ بھوپال تفسیر مذکور کا تکملہ تائیس جلدوں میں کیا ہے، راقم نے دیکھا ہے، بہت خوب لکھا ہے، اس عصر میں ایسی استعداد و لیاقت کی فرد نایاب ہے دوسرے کا منہ نہیں جو یہ ہمت کر سکے، مگر دونوں کا فرق کرنے والا اپنے حوصلے کے مطابق سمجھ سکتا ہے[1]

"تحفہ اثنا عشریہ بھی آپ کی زندگی میں یعنی ۱۲۱۵ھ میں طبع ہو کر مشہور ہوئی اور وہ بھی ایسی ہی بے ساختہ لکھی گئی،[2] کہتے ہیں کہ جب تحفہ اثنا عشریہ چھپ کر شہرت پائی تو ایک کلکتہ کا کوئی نواب شیعہ مذہب تھا، اس کو نہایت شاق گذرا، اس نے وہ کتاب اور بہت سے روپے ایران کو روانہ کر کے وہاں کے فضلاء اور علما کو لکھا کہ یہاں سنیوں کو اس کتاب کی عبارت اور مضمون پر ناز ہے۔ چاہیے کہ دونوں کا رد ہو دے۔ ایران میں تمام فضلا، اور ارباب تشاء تے جمع ہو کر مدت دراز

---

[1] شاہ صاحب کی تفسیر فتح العزیز کے سلسلے میں بہت سے شواہد اور نادر و معتبر روایات راقم کو فراہم ہوئے ہیں جن کی روشنی میں مختلف اور حیرت انگیز نتائج برآمد ہوتے ہیں، چونکہ یہ بحث طویل ہے اس لئے اسے الگ مقالے کی شکل میں عنقریب پیش کیا جائے گا۔

[2] تحفہ کا یہ نسخہ بہت ہی اہم ہے، یہ پہلی بار تین سو کی تعداد میں ۱۲۱۵ھ میں کلکتہ سے شائع ہوا، راقم کی نظر سے اسکے دو نسخے گذرے ہیں۔

تک تمام کتاب بکرات ومرات دیکھی، کچھ نہ ہو سکا، آخر کو وہ روپے سب چکے چکے کر
اس کے جواب میں ایک نامہ لکھ کر روانہ کیا، اس کا مضمون یہ تھا کہ صاحب تحفہ نے
جو اپنے مذہب کی قدیم کتابوں کا حوالہ دیا ہے، اس ملک میں وہ مذہب صدہا
سال سے اٹھ جانے کے سبب سے وہ کتابیں ہم دست نہیں ہو سکتیں اور جو ہمارے
مذہب کی قدیم کتابیں اس میں مذکور ہیں ہم نے اب تک دیکھا نہیں، مضمون کا رد
تو کتابوں کی قدرت پر موقوف ہے، رہی عبارت ایسی صاف اور بے تعقید
کس منشی کا منہ ہے جو لکھ سکے، سبحان اللہ"

"آپ سے نظم و نثر بھی بہت یادگار ہے، اس محل پر برکت فقط ایک بیت
ایک قطعہ اور ایک قصیدے پر اکتفا کیا۔"[1]

فاضل تذکرہ نگار نے شاہ صاحب کی وفات کی بھی جو کیفیت بیان کی ہے، اسکی
تفصیلات موجودہ روایات میں بیش قیمت اضافہ ہیں، ان سے اصل واقعات کی تمام کڑیاں
مل جاتی ہیں، مصنف رقمطراز ہیں:-

"آپ بہت قلیل الغذا اور کثیر الامراض تھے، جب وقت قریب آیا تو چند
روز سے غذا ترک کی، مرض کی شدت تھی، وعظ کا دن آیا، آپ نے فرمایا مجھ کو پکڑے
رہو، جب بیان شروع کروں تو چھوڑ دینا، ویسا ہی کیا، یعنی قوت روحانی اور
فیض باقی کا غلبہ ہوا، آپ کو چھوڑ دیا، وعظ فرمانے لگے، ہزاروں آدمی جمع ہوئے
اس حال میں بھی جیسا دور والے سنتے تھے ویسا ہی نزدیک والے بھی سنتے تھے،
بعد ازاں آیۂ شریفہ ذوی القربیٰ والیتمیٰ والمسٰکین وابن السبیل کا بیان کیا، اسکے
مطابق نقد اور اسباب سب تقسیم فرمایا، من بعد قریب لاکھ روپئے کے نقد اور

[1] اس کتاب میں جو اشعار ہیں وہ اور ان کے علاوہ دیگر مخطوطات و مطبوعات سے جو اشعار مل سکے
ہیں، انکی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے جو راقم کے پاس موجود ہیں۔ اسکے علاوہ بعض نادر ادبی مرقعے
و تشریحات ایک الگ مضمون کی شکل میں پیش خدمت ہوں گے۔

اصل میں کوشک انور اس جاگیر کا نام تھا، اب زبان زد عوام خوش نزول کا چھتہ مشہور ہے، اور شیخ عبدالرحیم صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب مولوی عبدالغنی صاحب اور مولوی مخصوص اللہ صاحب وغیرہ قدس اللہ اسرارہم، ان سب کے مزار وہیں ایک ہی احاطے میں ہیں۔"

اس کے بعد شاہ صاحب کی تاریخ وفات کے شاہ رؤف احمد مجددی، ارتضا علیخاں صاحب گوپاموی اور حکیم مومن خاں مومن وغیرہ کے قطعات تاریخ درج کئے ہیں، جس سے یہ پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کا انتقال ۱۲۳۹ھ میں ہوا تھا، نہ کہ ۱۲۴۰ھ میں، اصل میں موخرالذکر سال سب سے پہلے سرسید نے شاہ صاحب کے تذکرے میں آثار الصنادید میں غالباً غلطی سے لکھ دیا تھا، اسکے بعد سے متعدد تذکرہ نویسوں، مثلاً رحمان علی[۱]، رحیم بخش[۲] دہلوی اور اسماعیل گودھوری وغیرہ نے، یہی سنہ سرسید سے نقل کر کے لکھا ہے حالاں کہ سرسید کی اس روایت کے خلاف بہت سارے شواہد قلمی خطوط اور تذکرے کی شکل میں موجود ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ یہ قدیم تذکرہ اور اس کے ساتھ مختلف معصروں کے قطعات تاریخ وفات سرسید اور ان سے نقل کرنے والے حضرات کی تردید ہوتی ہے۔

تذکرہ نگار نے اسکے علاوہ اور بہت ساری باتیں اس کتاب میں ایسی درج کی ہیں جو کسی اور تذکرے میں ابتک نہیں ملتیں مگر طوالت کے خوف سے ان کو حذف کیا جاتا ہے اور صرف انکی موسیقی کے سلسلے کی چند روایتیں ناظرین کی خدمت میں پیش ہیں[۳]

"روایت ہے کہ حاجی محمد حسین صاحب سہارنپوری سے وہ روایت کرتے ہیں مولوی وحیدالدین صاحب پھلتی سے کہ" وہ شاگرد ہیں مولانا اسمٰعیل شہید کے اور خلیفہ ہیں سید احمد صاحب قدس سرہٗ کے اور تیرہ سال حضرت شاہ صاحب اور مولانا عبدالقادر صاحب

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند ص۱۲۲ [۲] حیات ولی ص۶۲۴ [۳] شاہ عبدالعزیز صاحبؒ موسیقی کے بہت اچھے عالم تھے، تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ "شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی ایک نایاب تصنیف" معارف، دسمبر ۱۹۶۳ء۔

قدس سرہ کی خدمت میں رہے ہیں، کہا انھوں نے کہ نواب نصر اللہ خاں والی
رامپور کے یہاں ایک قوال مسمی ہمت خاں بڑا صاحب کمال تین سو روپے ماہوار
کا نوکر تھا، تمام گویے اسکو مانتے تھے، ثانی تان سین جانتے تھے، ایک دن اسکو
خیال آیا کہ اگر مجھ کو تمام لوگ بڑا کمال والا جانتے ہیں، اس کا کچھ اعتبار نہیں، میں
اپنے ہنر کو جب تک حضرت کے محک امتحان پر عرض نہ کروں اور ان کی زبان
سے سند نہ لوں تو کیونکر اپنے کو کچھ چیز سمجھوں کس لئے کہ اس زمانے میں اس ذات
جامع الکمالات کی جیسی کوئی ذات نہیں اور کمال وہی معتبر ہے جو اہل کمال
پسند کریں اور داد دیں .... اسی آرزو میں دلی کو آیا وہ حضرت کا
آخر زمانہ تھا کہ بینائی سلب ہوگئی تھی اور تمام حواس میں ضعف طاری تھا، وہ یہ
حاضر ہو کر سلام کیا، آپنے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ تو ہمت خاں اچھے
تو ہو، سنتے ہی نہایت حیران و ششدر ہوا، اور تمام حضار متعجب ہوئے کہ یہ شخص
تو کبھی یہاں نہیں آیا اور نہ کبھی حضرت نے اسکی آواز سنی اور نہ صورت دیکھی،
یہ کیا بات ہے کہ اس کا نام لے کر پکارا، اس نے بھی استفسار کیا تو فرمایا کہ تمھارے
گانے کا لوگ ذکر کیا کرتے تھے کہ ان کی آواز میں یہ بات ہے اور اس طرح
کا اتار چڑھاؤ ہے، وہ بات صاف تمھارے تکلم سے پائی گئی تو میں نے جانا
کہ اس انداز کا تمھارے سوا کوئی نہیں ہے، جب اس نے اپنا مدعا عرض
کیا کہ میں چاہتا ہوں اپنا جوہر حضرت کے روبرو عرض کروں، ارشاد ہوا
کہ مناسب، پھر حضرت نے ایک دن حضرت شاہ رفیع الدین صاحب اور
مولانا عبدالقادر صاحب وغیرہ بڑے بڑے کملاء کو جمع کیا اور کوئی اغیار
سے نہ رہا تب اسکی یاد ہوئی، اور وہ گانے لگا، جو جو چیزیں اس کو یاد تھیں
سب سنا دیں، تمام حضار کو رقت ہوئی، حضرت شاہ رفیع الدین صاحب
کہ نہایت مستقل مزاج تھے، ان کے بھی اشک جاری ہوئے، چادر منہ پر ڈالے
ہوئے بیٹھے رہے، اور حضرت بھی کھنڈولے پر جنباں تھے، جب وہ سب گا چکا

دوسرا اسباب بیش قیمت جو رہا تھا اس میں سے چند ہزار روپیے واسطے زادِ راہ سفر حجاز اور ادائے مناسک حج و عمرہ وغیرہ کے اپنے نواسے مولانا محمد اسحٰق اور مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہما کو عنایت کئے اور چند ہزار روپئے مصارف مراسم وفات و تعزیت کے لئے دیئے، بعد ازاں کچھ اشعار عربی اور فارسی پڑھے، اور بہت شعر ایسے کہ ایک مصرع دوسروں کا اور ایک مصرع اپنا، چنانچہ یہ شعر مشہور قدسی علیہ الرحمہ کا۔[۱]

روز قیامت چوں شود ہر کس بگیرد نامۂ
من نیز حاضر میشوم تصویر جاناں در بغل

بجائے مصرع ثانی آپ نے فرمایا:-

من نیز حاضر میشوم تفسیر قرآں در بغل

پھر فرمایا کہ میرا کفن ایسے کپڑے کا ہو جو میں پہنے ہوں، کرتا آپ کا دھوتر کا اور پائجامہ گاڑھے کا ہوتا تھا اور فرمایا کہ جنازے کی نماز باہر شہر کے ہو، اور بادشاہ میرے جنازے پر نہ آوے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، ساتویں تاریخ ماہ شوال روز یکشنبہ ۱۲۳۹ھ وقت طلوع آفتاب کے روح پر فتوح اس عالم گذران سے جانب عالم جاوداں روانہ ہوئی، جس جائے آپ کو غسل دیا گیا تھا وہ خاک معطر ہوئی تھی، بہت لوگوں نے اپنے مکان میں اس کو رکھا تھا، اول بار دروازہ ترکمان دہلی کے باہر مولانا محمد اسحٰق صاحب نے امام ہوکر نماز پڑھائی، بعد ازاں نصیر الدین صاحب لکھنوی شافعی کے مقبرے میں جماعت سے نماز ہوئی، یہاں تک کہ پچپن[۵۵] بار جنازے کی نماز پڑھی گئی جوق در جوق آتے تھے اور پڑھتے تھے، بعض مقامات میں غائبانہ بھی نماز ہوئی ہے، مزار پر انوار آپ کا شاہجہاں آباد کے باہر دہلی دروازے کی سمت مہندیوں کے قریب خوش نرد کے تکیے میں واقع ہے۔[۲]

---

[۱] یہ جگہ میر دردہ روڈ کے سامنے جیل خانہ اور مولانا آزاد میڈیکل کالج کے پیچھے واقع ہے اور اب قبرستان مہندیوں کے نام سے مشہور ہے، اسی قبرستان میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مرحوم کو بھی دفن کیا گیا ہے۔

تو فرمایا کہ واقعی تم اپنے کمال میں یکتا ہو مگر اسوقت شاید پرتو سے ان فقراء کے ٹھاٹ کے بھی مزاج میں کچھ تغیر واقع ہوا ہوگا کہ فلاں فلاں مقام میں یہ یہ بات رہ گئی ورنہ تم کو بخوبی معلوم ہوگی، اس نے عرض کی کہ پیر و مرشد فدوی کو جو کچھ معلوم تھا سب عرض کیا، یہ جو حضرت نے فرمایا ہو اس کا علم نہیں، کچھ حضرت کی طرف سے ارشاد ہو، جب آپ نے جس جس مقام میں جو جو اتار چڑھاؤ رہ گیا تھا اس کو باحسن وجہ بتایا اور سمجھایا وہ نہایت خوش ہوا اور اپنے کو سب کچھ ہیچ جانا۔

ایک اور جگہ نواب مبارک علی خاں مؤلف کمالات عزیزی کی روایت سے جنھوں نے اپنی کتاب میں بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:۔

"دو قوالوں میں ایک راگ کی تشخیص میں بڑا اختلاف تھا، آخر باتفاق ہمدگر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ راقم (نواب مبارک علی خاں) بھی اسوقت قریب موجود تھا، قوالوں کی تقریر سنکر چلا گیا، مگر وہ اپنا سوال عرض کر چکے تھے، حضرت نے ایسی کیفیت اس راگ کی بیان کی اور اس طرح اس کو سنا دیا کہ دونوں کا اطمینان خاطر ہوا اور دونوں خوش ہو کر دعا دیتے ہوئے چلے گئے"۔

شاہ عبدالعزیز صاحب آخر عمر میں مختلف پریشان کن عوارض میں مبتلا تھے، ان کی طرف بھی مصنف نے کئی جگہ اشارہ کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"روایت ہے مولوی شجاعت حسین صاحب غازی پوری سلمہ اللہ تعالیٰ سے وہ روایت کرتے ہیں اپنے استاد مولوی سخاوت علی صاحب جونپوری سے، وہ شاگرد ہیں مولانا اسمٰعیل دہلوی شہید کے کہا انھوں نے کہ حضرت کو شدت حرارت قلب سے دھڑکے کا عارضہ تھا، تو کبھی کبھی شاہ راہ عام میں جو روبرو دولت سرا کے تھا عصر کے وقت واسطے تخفیف عارضہ اور تفریح طبع کے چہل قدمی کیا کرتے تھے"۔

شاہ صاحب کی یادداشت اور ان کے کمالات کے سلسلے میں ایک طویل قصہ لکھنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:۔

"........ یہ ماجرا اس ایام میں تھا کہ جن روز وں حضرت بسبب قصور ہضم کے دو یا تین تولے غذا اور اسی قدر زنک سلیمانی کھا کر چار ہزار قدم مشی فرماتے تھے"۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے حالات میں ایسے متعدد واقعات اور کیفیات مصنف

نے بیان کئے ہیں جن کو نقل کرنے کی گنجائش اس مقالے میں نہیں ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب کے بہت سے تلامذہ کے تفصیلی حالات جو اب بالکل نایاب ہیں، اس تذکرے میں ملتے ہیں۔ خاص طور پر سید احمد شہیدؒ، شاہ اسحٰق، مولانا یعقوب اور مولانا سراج احمد خورجوی کے حالات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اس مختصر سے تعارف سے ناظرین اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مؤتمر اسلامی[عہ]

افریقہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل

از شیخ محمد ناصر العبودی، رجسٹرار جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ
(ترجمہ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ)
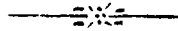
جناب صدر، اور معزز دوستو!

آپ کی اس مؤتمر کانفرنس کے جنرل سکریٹری نے مجھ سے ایک ایسا تفصیلی مضمون لکھنے کی فرمائش کی جس کا موضوع ہو "براعظم افریقہ میں مسلمانوں کے مسائل اور ان کی سیاسی و سماجی حالت کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز" تاکہ کانفرنس اس مسئلے پر غور کر کے کوئی عملی قدم اٹھا سکے۔ میرا یہ مختصر مضمون اس فرمائش کی تعمیل میں پیش کر رہا ہوں جو حسب ذیل مباحث پر مشتمل ہے۔

۱۔ براعظم افریقہ میں مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن۔
۲۔ اسلام اور مسلمانوں کی مخالف طاقتیں
۳۔ مسلمانوں کی بہبودی میں رکاوٹ ڈالنے والے حالات
۴۔ موجودہ سیاسی مسائل اور ہمارا موقف۔
۵۔ اسلامی عنصر کو تقویت پہونچانے کے لیے ضروری اقدامات۔

۱۔ براعظم افریقہ میں مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن

براعظم افریقہ کی مجموعی آبادی میں مسلمان ایک بڑی اکثریت ہیں۔ اس لیے کہ وہاں کی پوری آبادی (۲۵) کروڑ میں مسلمانوں کی تعداد ۱۵ کروڑ سے بھی متجاوز ہے، مسلمانوں کے اس مجموعہ کی

عہ مؤتمر اسلامی مکہ مکرمہ میں پڑھے گئے مقالات میں سے پہلا مقالہ اکتوبر کے الفرقان میں دیا جا چکا ہے یہ دوسرا ہے ان شاء اللہ اسی طرح الفرقان میں شائع ہوتے رہیں گے۔ مرتب

اہمیت جو دینی اور ثقافتی اعتبار سے متحد ہے اس لیے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ افریقہ کے
غیر مسلم باشندوں کی اکثریت بُت پرست قبائل سے تعلق رکھتی ہے جہاں ابھی تک کسی آسمانی
مذہب کی رسائی نہیں ہو سکی ہے اور اس لیے ان کے اندر اسلامی دعوت کو پیش کرنے کے لیے
ایک بڑا میدان موجود ہے۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس براعظم میں اسلامی دعوت
کے پھلنے پھولنے کے جتنے مواقع ہیں سارے عالم میں شاید کہیں نہ ہوں، لیکن افسوس یہ مواقع
بھی محدود ہوتے جا رہے ہیں، اسلام دشمن طاقتیں ان کو ختم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور
لگا رہی ہیں اور جب تک ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسلامی اور عربی کوششیں وسیع پیمانہ
پر ایک دوسرے کا ہاتھ نہ بٹائیں اس وقت تک ان سے فائدہ اٹھانے کا امکان نہیں ہو بلکہ
بہت ممکن ہے کہ ہمیشہ کے لیے یہ مواقع ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں......اس بنا پر یہ کہنا بالکل
بجا ہے کہ آئندہ بیس سال اس براعظم میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے فیصلہ کن مدت ہوگی اور
اگر مطلوبہ کوششیں وسیع پیمانہ پر وجود میں آجائیں تو یہ امید ذرا بھی خوش فہمی پر مبنی نہیں ہوگی کہ
افریقہ ایک اسلامی براعظم بن جائے۔

اس براعظم میں مسلم اکثریت کی کوششوں کے باوجود (جو بعض علاقوں میں ۹۰ فی صدی سے
بھی اوپر ہے) یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان عام طور پر غیر مسلم اقلیتوں کے زیر حکومت ہیں۔
جن کی سیاسی پالیسیاں اسلامی اخوت سے ٹکراتی ہیں۔ یہ غیر مسلم اقلیتیں مسلمانوں پر ایسے نظام
عائد کرتی ہیں جو نہ صرف اسلامی فکر کے منافی ہیں بلکہ دعوتِ اسلامی کی کامیابی کے مواقع
کو بھی پوری طرح ختم کر دیتے ہیں۔

یہ حالات کئی باتوں کا نتیجہ ہیں:-

۱۔ جدید تعلیم سے مسلمانوں کی بالعموم محرومی اور دوری، جس میں کچھ تو [illegible] عیسائیت
کے قصد و ارادہ کو دخل تھا تاکہ مسلمان حکمرانی کے قابل نہ ہو سکیں۔ دوسرے خود مسلمانوں نے
اپنی اولاد کو بے دینی کے اندیشے سے عیسائی اسکولوں میں داخل ہو کر تعلیم پانے سے باز رکھا۔
جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام کلیدی عہدوں اور زندگی کے اہم شعبوں پر غیر مسلموں کو چھا جانے کا
موقع مل گیا ـــــ مزید برآں یہ کہ نو آبادیاتی تسلط نے جب ان ممالک کو آزادی دینے کا

ارادہ کیا تو اس کی مخصوص طور پر کوشش کی کہ جہاں تک ہو سکے زمام حکومت غیر مسلم لیڈر شپ کے حوالے کی جائے اور پھر مختلف معاہدوں اور اقتصادی امداد کے ذریعہ ان کی پشت پناہی کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ اس کی مثال سنیگال، تشاد، تنجانیکا، یوگنڈا، اور حبابیا ہیں جن میں مسلمانوں کا تناسب ۷۰٪ سے لے کر ۹۸ کے درمیان ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان تمام ملکوں میں حکومت عیسائی اقلیت کے ہاتھوں میں ہے جس کے دل میں اسلام سے بغض و عناد بھرا ہوا ہے اگرچہ انتہائی عیاری کے ساتھ اس کو چھپانے کی کم و بیش کوشش کی جاتی ہے۔

۲۔ اسلامی بنیاد پر اسلامی جماعتوں کے متحد ہونے کا تصور اب تک غیر واضح ہے جس کی وجہ سے مسلمان مختلف سیاسی گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں بلکہ کچھ اس بنیاد پر بھی آپس میں اختلاف کھڑا کرتے ہیں کہ سیاسی سرگرمیوں سے دین کا کوئی تعلق ہی نہیں، حالانکہ یہ اختلاف اس کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ مسلمان بحیثیت اکثریت کے جن حقوق کے حقدار ہیں علاوہ ان سے فائدہ نہ اٹھائیں اور ایک بے اثر اکثریت بن کر رہیں۔ اس اختلاف و انتشار کے افسوسناک نتائج کی مثالیں افریقہ کے ان ممالک میں بکثرت ہیں۔

۳۔ بعض اسلامی جماعتیں اسلام کا ایسا غلط تصور اور اس کی ایسی بگڑی ہوئی تصویر پیش کرتی ہیں جو باطل اور خرافات کا مرقع ہوتی ہے۔ اور جس کی وجہ سے نئی نسلیں اسلامی رشتہ سے ٹوٹ کر عصر حاضر کے نئے فلسفوں اور نئے نظریوں کی طرف دیکھتی ہیں اور اس میں زندگی کے پیچیدہ مسائل کا حل ڈھونڈھتی ہیں، اسلامی اکثریت کی طاقتوں کو یہی چیز قدیم و جدید کے دو مکاتب فکر میں تقسیم کرتی ہے، قدیم مکتب فکر عصر حاضر کی روح اور زندگی کے تقاضوں سے بالکل الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو جدید مکتب فکر قدیم کو ناقابل اعتبار تصور کرتا ہے۔ اور خالص جدید افکار کو اپنی ترقیوں کا ذریعہ اور اسی کو اپنے مسائل کا حل تصور کرتا ہے۔ گو یہ دونوں مکتب فکر ہر جگہ حتی کہ بلاد عربیہ میں بھی موجود ہیں، لیکن افریقہ میں جہاں اسلام کے خلاف زبردست معرکہ آرائی ہے اور جہاں اسلام کا مستقبل ایک مضبوط متحد اسلامی محاذ پر موقوف ہے، یہ تقسیم بیحد خطرناک ہو جاتی ہے۔

۴۔ افریقہ میں بہت سی آزاد مسلم حکومتیں موجود ہیں جن میں اس بات کی پوری صلاحیت

ہو کہ اس براعظم میں اسلامی لہر کو مضبوط کرنے میں ایک مؤثر رول ادا کریں۔ لیکن وہ اپنے داخلی مسائل میں اس طرح پھنسی ہوئی ہیں کہ اس اہم کام کی طرف کوئی توجہ نہیں کر پاتیں۔ یہ مسائل بیرونی دسیسہ کاریوں کا نتیجہ ہوں یا اندرونی اختلافات کا بہرحال ان حکومتوں کی اس میدان میں سرگرمی اور اثراندازی کے لیے سم قاتل ہیں۔ مثال کے طور پر سوڈان کے لیے جنوبی سوڈان کا مسئلہ، زنجبار کا اندرونی جھگڑا اور مراکش و الجزائر کا سرحدی تضیہ۔ اسی طرح مسلم افریقہ میں وہ تمام عیوب و اختلافات موجود ہیں جو عام طور پر عربی اور اسلامی ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور جو اسلامی تربیت کی کمزوری اور سامراج کے پیدا کردہ سیاسی اور اقتصادی احوال کا نتیجہ ہیں، جیسے کہ قومیت و وطنیت اور اشتراکیت وغیرہ کے نعرے بھی افریقہ میں ابھر رہے ہیں اور سب سے زیادہ خطرناک صورت حال یہ ہے کہ ان لیڈروں کے اردگرد اسلامی ذہن رکھنے والے ایسے افراد یا جماعتوں کا بھی فقدان ہے جو انھیں صحیح رہنمائی دیں اور اس غلط بہاؤ کو روکنے یا کم سے کم اس کو سست کر دینے کا راستہ انھیں بتائیں۔ بعض جگہ اگر خوش قسمتی سے ایسے حکمراں پائے جاتے ہیں جو اپنے ملکوں کی سیاست و معیشت کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنا اور اسلامی دنیا سے خود کو مربوط رکھنا چاہتے ہیں تو وہ دیکھتے ہیں کہ سامراج نے ایک طرف ان کو ایسے حالات میں چھوڑا ہے کہ بیرونی امداد کے بغیر ان کا کام کسی طرح نہیں چل سکتا اور دوسری طرف تخریب کاری کے ایسے جال پھیلا دیے گئے ہیں جو وقت ضرورت سامراج کے ادنیٰ اشارے سے اس کے کام آ سکتے ہیں۔

افریقہ کے ایک ایک ملک کے تفصیلی حالات کو نظرانداز کر کے اگر پورے براعظم پر ایک مجموعی نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ افریقہ کے بارے میں بڑی طاقتوں کی پالیسی بھی اس کی وحدت کے تصور ہی پر مبنی ہے اور اس نقطۂ نظر سے وہ افریقہ کی غیرمسلم قیادتوں کو ہر ممکن طریقے پر اس درجہ مضبوط و مؤثر بنانے کے لیے کوشاں ہیں کہ دنیا کی نظر میں یہی قیادتیں افریقہ کی ترجمان اور اس کے بست و کشاد کی مختار بن جائیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان بڑی طاقتوں نے افریقیوں کے اندر اتحاد و یکجہتی کے رجحان کا اندازہ کر کے اس بات کا مکمل منصوبہ بنایا ہے کہ کس طرح اس متحدہ افریقہ کی حکمرانی غیرمسلم عناصر کے

ہاتھ میں آجائے۔ اور اس کا تقاضہ ہے کہ ہم ہر افریقی ملک کے حالات کا جدا جدا جائزہ لینے کے ساتھ عملی پالیسی کا مدار اس کی وحدت کے تصور ہی پر رکھیں، جہاں جہاں اسلامی قیادتیں موجود ہیں اُن سے واقفیت حاصل کریں اور جہاں یہ قیادت مفقود ہے وہاں اسے وجود میں لانے کی کوشش کریں تاکہ افریقہ کے مسلمان پورے براعظم میں اپنا صحیح رول ادا کر سکیں۔

۲۔ اسلام اور مسلمانوں کی مخالف طاقتیں

ا۔ عیسائی مشنریاں۔ آج سے قریباً ڈیڑھ صدی پیشتر جب عیسائی مشنریوں نے افریقہ کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اُن کے سامنے صرف ایک مقصد تھا کہ افریقیوں کو عیسائی بنائیں خواہ وہ مسلمان ہوں یا بُت پرست۔ مسلمانوں کے معاملے میں ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے عقائد بگاڑ دینا اور سیاسی و اجتماعی لحاظ سے ان کو کمزور کر دینا، اسلام کے آغوش سے ان کو نکالنے ورنہ کم سے کم ان پر سے اسلام کی گرفت کو کمزور کر دینے کی طرف ایک مؤثر قدم ہوگا اور اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوگا کہ اپنی اجتماعی زندگی کی اساس کمزور پڑ جانے پر وہ بے وزن اور بے اثر گروہوں کی شکل میں رہ جائیں جن کے ہاتھ میں کوئی طاقت نہ ہو۔

ہم اگر یہ سمجھ لیں کہ عیسائی مشنریوں کا یہ حملہ بالکل ناکام رہا تو یہ بڑی غلطی ہوگی کیونکہ ابھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ عیسائی اقلیتیں کس طرح بعض اُن افریقی ملکوں تک پر قابض ہیں جن کی غالب اکثریت مسلمان ہے۔ مشنریوں کے کچھ خاص طریقے اور بھی ہیں جو افریقیوں کے لیے بڑے مؤثر ہیں اور اُن سے کام لینے میں یہ برابر لگی رہتی ہیں۔ وہ طریقے کیا ہیں۔ اسکول، شفاخانے اور پناہ گزیں کیمپوں جیسے رفاہی کاموں کے ذریعے عوام میں نفوذ۔ اور پھر انھیں اڈوں سے وقت ضرورت اسلامی ممالک میں بغاوت کی آگ بھڑکانے اور اندرونی کشمکش کو ہوا دینے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ لیکن اب جبکہ افریقہ آزادی کی راہ پر گامزن ہو گیا ہے عیسائی مبلغین کو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ ان کے مشن کا گزشتہ سامراج سے تعلق آزاد افریقہ میں ان کے لیے بڑی پریشانیوں اور دشواریوں کا باعث بن گیا ہے اور افریقہ کے عوام مسیحت کو اُن سفید فاموں کے مذہب کی نظر سے دیکھتے ہیں جنھوں نے صدیوں ان کا

خون چوسا ہے۔ اس صورت حال نے ان مشنریوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ جگہ جگہ کانفرنسیں کرکے اپنے اور سفید سامراج کے تعلق کو دبا دینے کی اسکیمیں تیار کریں۔ اور جو افریقی ملک ابھی تک سامراج کے شکنجے میں ہیں اُن کی آزادی کے مطالبات کی تائید کریں، بلکہ مختصر یہ کہ ہر ممکن کوشش سے مسیحیت کو سیاہ فاموں کا مذہب بنا کر پیش کریں۔

اس سلسلہ میں جنوبی افریقہ اور جنوبی رھوڈیشیا کے کلیسا کا رویہ ایک مثال کی حیثیت سے دیکھنے کے قابل ہے جہاں کانفرنسیں منعقد کرکے نسلی امتیاز کی مخالفت کی گئی۔ اس طرح اب یہ بھی مشاہدہ میں آنے لگا کہ کلیسائی عہدے بھی افریقی عیسائیوں کو دیے جانے لگے ہیں۔ یہ تمام باتیں اس وسیع منصوبے کا ایک جزو ہیں جو افریقہ کی آزادی سے پیدا شدہ نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت اونچی سطح پر تیار ہو رہا ہے اور جس کا ایک اشارہ عیسائی دنیا کے موجودہ پوپ کی ایک حالیہ تقریر سے بھی ملتا ہے جس میں موصوف نے افریقہ کو "مسیح کی نئی سرزمین" کے نام سے یاد فرمایا۔

اس بات کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ عیسائیت کی تبلیغ کو سامراج سے الگ کرنے کے اقدامات محض دکھاوا ہیں جس سے ایک زوال پذیر طاقت اپنے آپ کو سنبھالنا چاہتی ہے، اور یہی کیا سامراج اس وقت اپنی پالیسیوں کو ہر پہلو سے بدلنے اور ایسی شکلیں اختیار کرنے میں لگا ہوا ہے جس سے افریقی دھوکے میں آ سکیں۔ جیسے کہ اقتصادی اور ثقافتی تعاون جس کا مقصد ایک نئے انداز سے تسلط برقرار رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ ٹھیک جس طرح استعمار اور سامراج اپنا لباس بدل رہا ہے اس طرح اس کی دست راست عیسائی مشنریاں بھی ایک نیا روپ دھارنا چاہتی ہیں۔ اگرچہ دونوں کا مقصد بدستور ایک ہے اور دونوں ایک دوسرے کے معاون و مددگار!

عیسائیت کا تبلیغی نظام اپنے ان نئے طور طریقوں کے ساتھ ساتھ افریقہ میں اپنی کچھ مددگار طاقتیں بھی رکھتا ہے اور وہ وہاں کی وہ حکومتیں ہیں جن میں عیسائیت کا پورا غلبہ ہے۔ اس چیز نے عیسائیت کو افریقہ میں کامیابی کا پورا موقع فراہم کر دیا ہے۔ اور اسی چیز نے ہم پر یہ لازم کر دیا ہے کہ افریقہ میں دعوت اسلامی کے مضبوط مرکز قائم کریں ورنہ

ہم اگر اس بارے میں کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت کے اس منصوبے کو کامیابی کی پوری آزادی دے رہے ہیں کہ وہ افریقہ میں اسلام کو باہر سے لائے ہوئے مذہب کی شکل میں پیش کرے اور یہ وہ شکل ہوگی جسے آزاد افریقہ کا ذہن قبول کرنا کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ ہمیں اس خطرہ کی پیش بندی کے لیے پوری حکمت سے کام لینا ہے۔ منجملہ اس کے یہ بھی ہے کہ یہاں اسلامی دعوت کا کام اہلِ افریقہ ہی کے ذریعہ سے ہو جن میں خود اسلام کی گہری جڑیں موجود ہیں۔

۲۔ سامراج۔ عیسائی مشن اور سامراج جس طرح ساتھ ہی ساتھ افریقہ میں داخل ہوئے تھے اسی طرح ان کی سرگرمیوں میں بھی حالات کے مطابق کہیں کھلے طور پر اور کہیں چھپے طور پر اتحاد قائم رہا۔ ایک طرف مشن کا کام یہ تھا کہ وہ اہلِ افریقہ کے دین و مذہب اور ثقافت و روایات کی بیخ کنی کرے اور ان کی قومی خودداری کے سوتے خشک کر دے، دوسری طرف سامراج کا کام یہ تھا کہ وہ اس خلاء سے فائدہ اٹھا کر ان قوموں کو غلام بنائے اور یہاں کی دولت سے اپنی قوم کو مالا مال کرے۔ یہ افریقہ کے دورِ غلامی کی بات تھی۔ اور اب جبکہ افریقہ آزاد ہو رہا ہے تو سامراج عیسائی مشنریوں کے کام سے ایک دوسرے انداز میں فائدہ اٹھا رہا ہے۔ افریقہ جب آزادی کے مرحلہ تک پہونچا تو عیسائی مشن کی وسیع جدوجہد کی بدولت قیادت و حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے ان کے رنگ میں رنگا ہوا ایک طبقہ تیار ہو چکا تھا۔ اب سامراجی طاقتیں ہر ممکن طریقے سے اس طبقہ کو اپنی جگہ دلا رہی ہیں اور امداد کی جو صورت بھی ان کے بس میں ہے (حتیٰ کہ بعض وقت فوجی مداخلت بھی) اس کے ذریعہ اس نوخیز طاقت کی پشت پناہی کر رہی ہیں، قریب ہی کے گزشتہ سالوں میں، دیکھئے کہ مشرقی اور مغربی افریقہ کی ریاستوں، کینیا، یوگنڈا، تنجانیکا، جابون، تشاد اور داہومی میں حالات کو جوں کا توں رکھنے کے لیے کس تیزی سے بیرونی فوجیں اتاری گئیں اور اس کے مقابلہ میں زنجبار کی بغاوت کو کس لاپروائی کے ساتھ نظر انداز کیا گیا اسلیے کہ یہاں بغاوت اسلامی قیادت کے خلاف تھی۔

آج سامراجی طاقتیں اپنے اثر کی چھوٹی چھوٹی افریقی ریاستوں کے ذریعے افریقی اتحاد کے نام پر عیسائی قیادت کو مضبوط کرنے اور اسلامی قیادتوں کو ابھرنے سے روکنے میں انتہائی سرگرمی کے ساتھ منہمک ہیں، اور اسلیے اسوقت انتہائی افسوس ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض مسلم حکومتیں بھی ان کے جال میں پھنس گئی ہیں۔

اور سیاسی تعاون کی راہوں سے دانستہ یا نادانستہ اسلامی قیادتوں کیخلاف عیسائی قیادتوں کی مددگار بن رہی ہیں۔

۳۔ اسرائیل۔ تیسری اہم طاقت جو افریقہ میں سرگرم عمل ہو وہ اسرائیل ہو، اور حقیقت یہ ہو کہ اسرائیل سامراج اور عیسائی مشنریوں سے الگ رہ کر کوئی کام نہیں انجام دے رہا ہو بلکہ انھیں کے دوش بدوش ایک ہی اسکیم کے ماتحت عمل پیرا ہے۔ افریقہ میں اسرائیلی سرگرمیوں کا موضوع ایک مستقل بحث چاہتا ہو جسکو ہم مختصراً حسب ذیل نقاط میں بیان کریں گے:

(الف) تاریخی پہلو۔ (ب) دینی پہلو۔ (ج) سیاسی پہلو۔ (د) اقتصادی پہلو۔ (ھ) پیش بینی۔

(الف) اسرائیلی سرگرمیوں کا تاریخی پہلو۔

سامراج نے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلی ہو کہ عرب ہی وہ قوم ہو جس نے اسلام کو براعظم افریقہ تک پہونچایا اور وہ اب بھی اپنے افریقی بھائیوں کی قوت کا سرچشمہ اور ان کیلئے مرکز تقویت ہیں۔ نیز یہ بھی کہ افریقی براعظم کا مستقبل اور سامراج کے علی الرغم اسکی ترقی کے امکانات بڑی حد تک عرب و افریقہ کے ہم آہنگ تعلقات پر موقوف ہیں اسلیے سامراج کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہو کہ وہ افریقیوں کو عربوں سے متنفر کرنے کے تمام وسائل استعمال کرے چنانچہ اُسنے عربوں کو غلاموں کی تجارت اور ان کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیلئے مطعون کیا اور اس سلسلہ میں بعض ایسی انفرادی اور شاذ مثالوں کا پروپگنڈہ کیا گیا جن سے کسی بھی معاشرہ کا دامن پاک نہیں دکھایا جاسکتا۔ یہ پروپیگنڈہ اگرچہ افریقی مسلمانوں میں کامیاب نہیں ہوسکا، لیکن یہاں کے غیرمسلم لیڈروں اور قائدین پر اس نے برا اثر ڈالا اور عربوں کی نسبت مخالفانہ فضا پیدا کرنے کا سبب بن کر رہا۔ یہی وہ فضا تھی جس کو اسرائیل نے اپنے پروپیگنڈے کے لیے استعمال کیا، چنانچہ آج افریقہ میں غلامی کا موضوع اسرائیلی پروپیگنڈے کا ایک اہم باب بن چکا ہے، اسی طرح اسرائیلی پروپیگنڈہ اس "ظلم و ناانصافی" کی تصویر کشی میں بہت حد تک کامیاب رہا جس سے اسرائیل کو اپنا فطری حق واپس لینے اور اپنے "اصلی وطن" واپس جانے میں دوچار ہونا پڑا پھر اسرائیل نے اپنے بارے میں اس نام نہاد "ظلم و ناانصافی" کی تصویر کو اس ظلم و ناانصافی کے ساتھ ملا کر پیش کیا جسمیں خود افریقی ایک عرصہ تک استعمار پسند قوموں کے ہاتھوں مبتلا رہے ہیں اور اسکے بعد یہ نعرہ بلند کیا کہ اسرائیلی اور افریقی دونوں نسلی اور مذہبی امتیاز کے سبب مظلوم قومیں ہیں اسلئے انکو دنیا سے ظلم و ناانصافی کا قلع قمع کرنے کیلئے متحد ہو جانا چاہیے۔

یہ دلائل حد درجہ بیچ اور ناقابل اعتنا ہیں اور تاریخی اعتبار سے ان کا رد کرنا بالکل آسان ہو لیکن عربی اور اسلامی ذرائع نے اس کا اہتمام بالکل نہیں کیا اور اسکو ایک بدیہی اور آپ سے ظاہر چیز سمجھ کر چھوڑ دیا، حالانکہ یہ پروپیگنڈہ تمام افریقی ممالک میں زہر کی طرح سرایت کر رہا ہو اور عرب افریقی تعاون و اتحاد کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوگا۔

(ب) اسرائیلی سرگرمیوں کا دینی رُخ

افریقہ کے اندر اسرائیلی سرگرمیوں میں ایک دینی عنصر بھی شامل ہے اور وہ یہ ہے کہ یہودی وہاں کے عیسائیوں کے مذہبی جذبہ کی تائید حاصل کرنے کے لیے اپنے معاملہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اسرائیلی حکومت کا قیام دراصل ان پیشین گوئیوں کا ظہور ہے جو تمام عیسائی فرقوں کے مقدس صحیفوں "عہد نامہ قدیم" اور "عہد نامہ جدید" میں وارد ہوئی ہیں۔ اور اس بنیاد پر عربوں کے ہاتھوں اس حکومت کا سقوط خود مسیحی عقیدے کے لیے ایک چیلنج اور حکم الٰہی کی شکست ہے۔ اسرائیل کے لیے ایک بڑی پریشانی یہ تھی کہ عیسائیوں کی مقدس کتابوں میں صاف صاف مذکور تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی پر چڑھوانے کے تمامتر ذمہ دار یہودی تھے اور اس لیے یہ کتابیں یہودیوں کی لعنت سے بھری ہوئی بھی ہیں۔ یہ چیز عیسائی اور اسرائیلی اتحاد کی راہ میں، بالخصوص عوامی سطح پر اتحاد و مفاہمت کی راہ میں ایک سخت رکاوٹ تھی اور عرب یا کسی بھی یہود دشمن طاقت کو اسرائیل پر حملہ آور ہونے اور اس کے قلع قمع کر دینے کا بہترین موقع فراہم کرتی تھی۔ لیکن اسرائیل کی یہ مصیبت دنیائے عیسائیت کے مرکزی ادارے کے اس حالیہ فیصلے نے دور کر دی کہ یہودی من حیث القوم حضرت مسیح کے خون سے بری ہیں۔ اور اس لیے اسرائیلی پروپیگنڈا اس فتوے کا اب جتنا بھی سہارا لے وہ کم ہے۔ اس کے ساتھ اسرائیل کو ایک اور چیز سے بھی فائدہ پہنچ رہا ہے اور وہ یہ کہ افریقہ کے عیسائی بالخصوص اور دنیا بھر کے ارباب کلیسا بالعموم افریقہ میں اشاعت اسلام کے اندیشے سے بہت خائف ہیں اور اس لیے کسی ایسے تیسرے فریق کے خواہاں ہیں جو اس میدان میں عرب مسلمانوں کے ایک ازلی دشمن کی حیثیت سے ان کا حلیف بن کر رونما ہو۔

اسرائیل ایک طرف ان بنیادوں پر عیسائیوں کا تعاون حاصل کر رہا ہے اور دوسری طرف اُس کی یہ کوشش بھی ہے کہ فلسطین کے معاملہ میں مسلمانوں کی یکجہتی کو توڑ کر ایک بالواسطہ تائید حاصل کر لے۔ اس سلسلے میں اس کے پروپیگنڈے کا رُخ یہ ہے کہ فلسطین کا مسئلہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں، خالص سیاسی مسئلہ ہے۔ یہ پانی کی تقسیم یا سرحدوں کی تعیین کا معمولی جھگڑا ہے وغیرہ وغیرہ افسوس ہے کہ افریقہ کی بعض اسلامی قیادتیں اپنی کم نظری اور اسلامی شعور کی خامی کی بنا پر اسرائیل کی اس چال سے متاثر بھی ہو رہی ہیں اور اسی کے ساتھ ہم اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ

بعض عرب سیاسی قیادتیں بھی اپنی جہالت یا حماقت سے اس اسرائیلی فریب کو مدد پہنچا رہی ہیں وہ بار بار یہ آواز بلند کرتی ہیں کہ فلسطین کا مسئلہ عرب قومیت کا مسئلہ ہے نہ کوئی اسلامی مسئلہ دینی۔ اور پھر اس پر مستزاد اُن کا طرز عمل ہے کہ ایسے ہی متعدد مسئلوں میں وہ مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں کی ہمنوائی کرتی نظر آتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ افریقہ میں اگر کسی دینی یا سیاسی مسلم لیڈرشپ کو اسرائیل کی تائید پر مطعون کیا جاتا ہے تو وہ فوراً ان عرب ملکوں اور اُن کے قائدین کے بیانات و طرز عمل ہی سے اپنے حق میں دلیل لاتے ہیں اور پھر برملا کہہ دیتے ہیں کہ قوم و وطن کا مفاد ہر چیز پر مقدم ہے۔

(ج) اسرائیلی سرگرمیوں کا سیاسی پہلو

افریقہ میں اسرائیلی سرگرمیوں کے پس پشت در اصل سامراجیوں کی شاطرانہ سیاست بھی کارفرما ہے۔ اس سیاست کا خلاصہ یہ ہے کہ افریقہ میں اسرائیل کے نفوذ کی سرپرستی کر کے اس علاقے میں عرب سیاست کا بہت اچھا توڑ کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس شکل میں جو افریقی ریاستیں اسرائیل سے تعلقات استوار کریں گی ان سے عرب حکومتیں دشمنی مول لے لیتی ہیں تو اس طرح عرب افریقی اتحاد کے امکانات میں وہ زبردست رخنہ پڑ جائے گا جو عین مطلوب ہے اور اگر یہ حکومتیں اس مسئلہ پر سمجھوتے کی روش اختیار کرتی ہیں اور افریقی ریاستوں کو اسرائیل کے وجود کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرنے کی اجازت دیتی ہیں تو اسرائیل کا کام پھر یہ ہوگا کہ عرب افریقی تعلقات میں مستقل زہرچکانی کرے اور سامراج کا آلۂ کار بن کر ان ریاستوں کو سامراجیوں کے حلقۂ اثر میں لائے۔ اور اس سلسلے میں جو طریقے مفید مقصد ہو سکتے ہیں مثلاً اقتصادی اور فنی امداد یا پروپیگنڈہ اور اُس سے بھی آگے رشوت و فریب دہی ان سب میں یہ مانی ہوئی بات ہے کہ یہودی اپنا جواب نہیں رکھتے اور خود بھی انھیں وثوق ہے کہ اس میدان میں فتحیاب وہی ہوں گے۔

اسی طرح خود افریقی سیاست کا ایک پہلو بھی اسرائیل کے لیے مددگار ہو رہا ہے اور وہ ہے افریقی اتحاد کے سلسلے میں افریقہ کی عرب اور غیر عرب قیادتوں میں رقابت کا جذبہ۔ بلکہ خاص افریقی قیادتیں جن کی سامراج دشمنی شک و شبہ سے بالاتر ہے وہ اس خلوص کے باوجود اسرائیل کی پشت پناہ بھی ہیں اور یہ صرف اس لیے کہ وہ بعض طاقتور عرب قیادتوں کے

اثر و رسوخ سے خائف ہیں اور افریقہ میں عربی اور اسلامی اثرات کے نفوذ کے فرضی خطرہ کے مقابلہ کے لیے اسرائیل کو ایک مؤثر رکاوٹ سمجھتی ہیں۔

(د) اسرائیلی سرگرمیوں کا اقتصادی پہلو۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ افریقہ کی اکثر نو آزاد ریاستیں سامراج کی چھوڑی ہوئی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے بیرونی اقتصادی امداد اور فنی تعاون کی بیحد محتاج ہیں۔ ان ریاستوں کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اسرائیل اپنا بھرپور تعاون پیش کرتا ہے اور کچھ خاص اسباب ہیں جن کی بدولت اسرائیل کو اس مہم میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے

(۱) یہ کہ قومی لحاظ سے دنیا کی کوئی قوم اقتصادی فراست اور فنی مہارت میں یہودیوں کا مقابلہ نہیں کرتی اور اسی طرح دنیا بھر میں یہودی سرمایے کا تسلط بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ یہ دوہری طاقت اسرائیل کو پورا موقع فراہم کرتی ہے کہ افریقہ پر حاوی ہو جائے۔

(۲) یہودیوں کی عالمی کمپنیاں غیر یہودی کمپنیوں میں بھی مختلف طریقوں سے دخیل ہیں اور اس طرح بین الاقوامی تجارت و صنعت پر اُن کا پورا اثر ہے

(۳) اقوام متحدہ کے ماتحت بین الاقوامی اداروں مثلاً یونسکو اور یونیسف یا بڑی طاقتوں کے قائم کردہ ایسے اداروں کے اکثر ارکان یہودی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ افریقی ریاستوں میں اپنے فرائض اسرائیلی پالیسی کے ماتحت انجام دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک مزید بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ افریقہ میں اسرائیل کے اقتصادی نفوذ میں ایک بڑی حد تک ان حالات کا بھی دخل ہے جو مسئلہ فلسطین کے سلسلے میں پیدا ہو چکے ہیں، مثلاً خلیج عقبہ اور آبنائے تیران پر۔ اسرائیل کے قبضے نے مشرقی اور وسطی افریقہ میں اسرائیل کے حق میں بڑا نفسیاتی اثر ڈالا ہے۔

(ھ) اسرائیلی سرگرمیوں میں پروپیگنڈے کا عنصر

گزشتہ اوراق میں اسرائیلی سرگرمیوں کے دینی، تاریخی یا اقتصادی پہلوؤں کی جو تفصیل پیش کی گئی ان سب سے مل کر اسرائیلی پروپیگنڈہ مشینری کی تکمیل ہوتی ہے جو بر اعظم افریقہ پر چھائی ہوئی ہے اور مزید برآں ہر شہر میں اسرائیل افریقہ دوستی کی انجمنیں قائم کی

جارہی ہیں جو اسرائیل سے آنے والے مہمانوں کے لیے لیکچروں کا انتظام کرتی ہیں اور یہودی کارندوں اور اہم افریقی شخصیتوں کے درمیان تعارف کے لیے جلسے منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ تحفے تحائف پیش کرنے اور صحافتی نمائندوں، ریڈیو کے نامہ نگاروں اور کالجوں یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کے لیے سفروں کا انتظام کرنے میں گراں قدر رقمیں خرچ کی جاتی ہیں اور اسرائیل کے تعلیمی اور فوجی اداروں میں تعلیم پانے والے افریقی طلباء کی خبریں افریقی اخبارات میں نمایاں طور سے شائع کرا کے یہ تأثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسرائیل ہر علم و فن کا مرکز اور افریقہ کا بہترین دوست ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں یہ بھی کہنا چاہیے کہ اسرائیلی پروپیگنڈے کو ماضی میں جس چیز نے بیحد فائدہ پہنچایا ہے وہ عرب ملکوں کے باہمی اختلافات تھے۔ اسرائیلی ذرائع بڑی پابندی سے اُن الزامات کو نشر کرتے تھے جو ایک عرب فریق دوسرے کے خلاف عائد کرتا تھا۔ ان باتوں کی مدد سے اُس نے افریقیوں کے سامنے عربوں کی یہ تصویر پیش کی کہ وہ ایک منتشر اور باہم متحارب قوم ہیں جن میں کوئی کلمۂ اشتراک یا اتحاد رائے نہیں اور اس لیے ان سے تعاون اور اُن پر تکیہ بالکل فضول ہے۔ اسی کے ساتھ اسرائیلی پروپیگنڈہ عربوں اور یہودیوں کے نزاع کی حقیقت سے ناواقف افریقیوں کو یہ باور کرانے میں بھی کامیاب ہوتا رہا کہ اسرائیل ہر مناسب قیمت پر عربوں سے اپنا جھگڑا طے کرنے اور اُن سے مصالحت کرنے پر راضی ہے مگر عرب اُسے مٹا کر دم لینے کے سوا کسی بات پر راضی نہیں۔

(۴) بین الاقوامی کمیونزم

کمیونزم کا تمام مذاہب کے بارے میں جو نقطۂ نظر ہے اُسکے تحت اسلام کے بارے میں اس کا کوئی اور منصوبہ بجز اس کے نہیں ہو سکتا کہ اس کو نیست و نابود کر دیا جائے اور یہ حقیقت اس بات سے نہیں بدل سکتی کہ بعض جگہ وہ سامراج کے خلاف جنگ میں مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ لینے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ موجودہ حالات میں کمیونزم اسلام کے لیے براہ راست کوئی خطرہ نہیں ہے اسلیے

کہ اس وقت اسے خود اپنے موجودہ دشمنوں سے فرصت نہیں ہے۔ لیکن واقعات وحالات کا طبعی انقلاب کسی سخت ٹکراؤ کا موجب بھی بن سکتا ہے۔ آج کمیونسٹ کوشاں ہیں کہ مزدوروں اور طالب علموں کی تحریکوں اور کسانوں اور مختلف پیشے وروں کی نمائندہ انجمنوں پر قابض ہو جائیں اگر ان کو اس مہم میں کامیابی ہو جاتی ہے تو لازماً یہ طبقے اسلام کے ہاتھ سے نکل جائیں گے جیسا کہ روسی اور چینی درسگاہوں سے تعلیم پاکر آنے والے طلباء کا حال یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ اسلام اور اسلامی روایات کا ادنیٰ احترام تک اپنے دل میں نہیں رکھتے۔

افریقہ میں اسلام کے لیے کیمونزم کا خطرہ اس لیے اور زیادہ قابل فکر ہے کہ وہاں دینی تنظیمیں اور اسلامی شعور کمزور ہے اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ وہاں کی اسلامی جماعتیں بین الاقوامی کیمونزم سے کافی قریب بھی ہیں۔

(۳) مسلمانوں اور عربوں کے لیے موافق حالات

افریقہ میں مسلمانوں اور عربوں کے لیے صرف ناموافق اور مخالف حالات ہی نہیں ہیں بلکہ کچھ موافق اور سازگار حالات بھی پائے جاتے ہیں اور بشرط کوشش ان سے کافی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

مثلاً (الف) جنوبی افریقہ اور رہوڈیشیا میں افریقی عوام اور وہاں کی نسل پرست اقلیتی حکومتوں کے درمیان جو کشمکش برپا ہے اس کی وجہ سے افریقیوں میں ایک بڑی جماعت عرب اور اسلامی حکومتوں کی طرف دیکھتی ہے اور ان کو ہر جگہ ایک طاقتور عنصر تصور کرتی ہے۔ خواہ اقوام متحدہ کا دائرہ ہو یا اس کے باہر یہ صورت حال عربی اور اسلامی مسائل میں افریقہ کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا بہترین موقع فراہم کرتی ہے اور افریقہ میں اسلامی اخوت کو مضبوط کر کے وہاں کے مسائل میں سرگرم کرنے کا بھی!

(ب) عیسائی مذہب افریقہ میں اب تک اس تہمت سے بری نہیں ہو سکا کہ وہ سفید فام سامراج کا دین ہے۔ کلیسا نے اس الزام کی تردید میں ہر طرح کی کوشش کر ڈالی مگر وہ لوگوں کے ذہن سے اس تصور کو ختم کرنے میں ناکام رہا۔ اس لیے ابھی کچھ وقت تک ضرور عیسائی مذہب کے پھیلنے اور مقبول ہونے میں یہ تصور آڑے آتا رہے گا۔ اس زریں موقع سے اگر مسلمانوں نے

فائدہ نہ اُٹھایا تو وہ ہمیشہ اپنی اس غلطی پر کفِ افسوس ملتے رہیں گے۔

(ج) تجربے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بُت پرست آبادیاں افریقہ میں اسلامی دعوت کو قبول کرنے میں سب سے آگے ہیں اور اس سلسلہ میں کوئی بھی منظم کوشش کی جائے تو ان کی بہت بڑی تعداد کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا جا سکتا ہے۔

(د) اسلامی ملکوں کی آزادی کے ساتھ ہی عربوں اور دوسرے مسلمانوں سے بہتر تعلق قائم کرنے کا طبعی رجحان، ان حکومتوں کا تعاون حاصل کرنے اور انکی جغرافیائی پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر کسی بھی وسیع اسلامی منصوبے کو بروئے کار لانے کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔

(ہ) افریقہ میں بھی حسب فطرت اسرائیل سے ایسی حرکتیں سرزد ہونا شروع ہو گئی ہیں جن سے ہمیشہ ہی دوسری قوموں میں نفرت کا جذبہ پھیلا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہ جذبہ اُبھر رہا ہے اور یہودیوں کے دھوکے، فریب اور رشوت کے ذریعہ لوگوں کو ہمنوا بنانے کی مذموم عادتیں جوں جوں ظاہر ہو رہی ہیں۔ افریقہ میں ان سے نفرت پیدا ہوتی جا رہی ہے اور وقت کے ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوگا۔ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔

(۴) ضروری اقدامات

(الف) سیاسی میدان میں:۔

سیاسی پہلو سے عرب اور دیگر اسلامی حکومتوں کے درمیان ایک مشترک لائحہ عمل تیار ہونا چاہیے جس میں تمام حالات اور تقاضوں کو مدنظر رکھا جائے اور اس میں اسرائیل سمیت تمام سامراجی اور نسلی طاقتوں کے خلاف افریقی حکومتوں سے تعاون کے امکانات کا سنجیدہ جائزہ بھی شامل ہو۔ ہم سیاسی لائحہ عمل کو تیار کرنے میں زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ ہمارے سیاسی موقف میں اگر کوئی خامی رہ گئی تو اس کے نتیجہ میں ہمارا بڑے سے بڑا پروپگنڈہ اور مؤثر سے مؤثر اقتصادی تعاون بھی بے کار جا سکتا ہے

(ب) پروپیگنڈے کے میدان میں۔

ایک ایسی پروپگنڈہ تنظیم جس کا تعلق صرف افریقہ سے ہو، ناگزیر ہے، اس کے ذریعہ

ان تمام الزامات کی تردید کی جائے جو سامراج نے عربوں پر لگائے ہیں اور جن کی نشر و اشاعت برابر مشنریوں اور صیہونی مرکزوں کی طرف سے ہوتی رہتی ہے، اسی طرح کچھ ملکوں میں مسلم صحافت (پریس) قائم کرنے کے متعلق غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں نوجوان طبقہ کو صحافت اور نشر و اشاعت کے کاموں میں مہارت حاصل کرنے کے لیے پورا تعاون دیا جائے تاکہ وہ تدریجی طور پر نشر و اشاعت کے ذرائع سے سامراجیوں کی اجارہ داری کو ختم کر سکیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس عداوت کو کم کرنے کی کوشش بھی کی جائے جو عرب اور مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کے دل میں موجود ہے۔

(ج) ثقافتی میدان میں

ثقافت کی راہ سے افریقی حکومتوں کے ساتھ تعلقات کو مضبوط بنانے کے لیے عرب اور دیگر مسلمانوں کے سامنے ایک وسیع میدان ہے۔ یہاں مسلمانوں کی موجودہ تعداد اور اسلامی عربی ثقافت کی طرف ان کا طبعی رجحان اس مہم کو بہت زیادہ سہل بنا دیتا ہے۔ بشرطیکہ منظم اور مسلسل طور پر اس کیلئے کوشش کی جائے۔ ہم اس کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کرتے ہیں۔

(۱) جس علاقے میں بھی مدرسین اور واعظین کی ضرورت ہو برابر اور فوراً فراہم کیے جائیں۔

(۲) عربی اور اسلامی تعلیم کے لیے ایسا نصاب تیار کیا جائے جو افریقی ماحول اور حالات سے میل کھا سکے، نیز اس کے لیے نصاب کی کتابیں طبع کرائی جائیں۔

(۳) عرب اور دیگر اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تعلیم پانے والے افریقی طلباء کے لیے تعلیمی وظائف جاری کیے جائیں اور مذہب و زبان کی تعلیم کے ساتھ دوسرے علوم کی تعلیم کا اہتمام بھی کیا جائے۔

(۴) افریقہ کے تمام موجودہ مدارس اور کالجوں کو ہر ممکن امداد کے ذریعہ مستحکم بنایا جائے اور حسب ضرورت مزید مدارس کھولے جائیں۔

(د) اقتصادی میدان میں۔

گزشتہ سطور میں ہم نے تفصیل کے ساتھ افریقہ کے لیے اقتصادی امداد اور فنی تعاون کی ضرورت کا ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ یہی وہ خلا ہے جس سے سامراج اور صیہونیت کو فائدہ

اٹھانے کا موقع مل رہا ہے، اس لیے عرب اور دیگر مسلم حکومتوں پر لازم ہے کہ وہ اس مقصد کے پیش نظر کوئی خاص پروگرام تیار کریں۔ مثال کے طور پر ہماری یہ تجویز ہے :۔

(۱) قرض دینے کے لیے ایک مالی ادارہ کا قیام، اور افریقی ممالک میں مسلمانوں کے سرمایہ لگانے کی حوصلہ افزائی، اور ان تمام سرکاری اور پرائیوٹ کمپنیوں کا استحکام جن کے مالک مسلمان ہیں۔

(۲) ایک سرمایہ کار کمپنی کا قیام، جس میں افریقی اور غیر افریقی لوگ شریک ہوں۔

(۳) مسلمان اور عرب مدرسوں، انجینیروں اور ڈاکٹروں کے افریقہ جانے کی حوصلہ افزائی، اور ترقی و خوشحالی کے تمام منصوبوں میں افریقیوں کے ساتھ تعاون۔

(۴) ان تمام مسلمان اور عرب حکومتوں کو جو افریقہ کی مسلم نو آزاد حکومتوں کی مالی امداد کر سکیں اسکی ترغیب دی جائے

(۵) افریقہ میں غیر افریقی اسلامی ملکوں کے جو باشندے آباد ہیں اُن کی متعلقہ حکومتوں کو متوجہ کیا جائے کہ وہ ان باشندوں میں تنظیم کی صورت پیدا کریں۔ نیز کوشش کریں کہ یہ لوگ افریقہ کی اسلامی جماعتوں سے قریب ہوں اور اسرائیلی سرگرمیوں پر خصوصی نظر رکھیں۔

دربارِ عالمگیری

(گذشتہ سے پیوستہ)[1]

(جناب ڈاکٹر مصطفیٰ حسن صاحب علوی ایم اے)

عربی اُصول و قواعد کے مطابق قرآنِ پاک کے مطالب اور مفاہیم کے بیان کرنے کا نام علم تفسیر ہے۔ ایسی استعداد اور مشق و مہارت پیدا ہونا جس کے واسطے سے احکام شرعیہ کا باحسنِ وجوہ اور صحیح طریقہ پر استنباط ہو سکے اور معانی قرآن تک رسائی، اس فن کی غرض و غایۃ سمجھی جاتی ہے، کلامِ الٰہی اس کا موضوع ہے جو بلاشبہ سراسر حکمتوں اور اسرار سے مالامال ہے۔

پچھلے اوراق اُلٹئے اس میں گزر چکا ہے کہ عہدِ صحابہ میں تفسیر اور آیاتِ قرآنیہ کے افہام و تفہیم کا خاصا رواج تھا اور وہ اجلۂ علماء اور صحابہ جن کو مفسرین کا شیوخ کہا جائے حضرت علی عبداللہ بن مسعود، عبداللہ ابن عباس، ابی بن کعب اور زید بن ثابت سمجھے گئے اور سمجھے جاتے ہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ کی مرویات کا شمار حضرت علی کی مرویات سے زائد ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ کو ترجمان القرآن، حبر الامۃ اور رئیس المفسرین کے القاب سے یاد رکھا گیا۔ اور یہ ان کا ایک امتیازی وصف گنا گیا۔ ابی بن کعب کو سید القراء کا لقب دیا گیا۔

یہ دور ختم ہوا ہی تھا کہ تابعین کا دور آیا، حضرت عبداللہ بن عباس کے تلامذہ میں حضرت مجاہد بن جبیر، سعید بن جبیر، عکرمہ، طاؤس بن کیسان، حضرت عطاء علماء مکہ میں آتے تھے۔ عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں علماء کوفہ زائد ہیں اور ان میں علقمہ بن قیس اور ابراہیم نخعی

---

[1] سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو الفرقان بابت ماہ صفر ۱۴۰۵ھ۔

ممتاز ہوئے۔ حسن بصری، عطاء بن ابی سلمہ ضحاک بن مزاحم اور قتادہ بن دعامہ بھی فن تفسیر میں پیشوا ہی سمجھے گئے۔ علاوہ ازیں عہد تابعین کے بعد مفسرین کے ایک طبقہ نے صحابہ اور تابعین کے اقوال پر مشتمل تفسیریں لکھیں اور سفیان بن عیینہ، وکیع، شعبہ بن حجاج اور اسحٰق بن راہویہ کا شمار اسی طبقہ میں کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک طبقہ اور پیدا ہوا اور اس نے تفسیری احادیث و اقوال سے اسناد کا حذف کرنا شروع کیا ابو اسحٰق زجاج ابو علی فارسی ابو بکر نقاس اور جعفر بن نحاس اس میں مشہور ہوے اور واقعہ یہ ہے کہ تفسیر میں خارجی اور نا ملائم عناصر کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب اسناد کے حذف کے ساتھ ساتھ مفسروں نے سلف کے ناتمام اور مختصر اقوال بیان کرنا شروع کر دیے۔ اس پر مستزاد آگے چل کے علماء سلف کے اقوال نقریباً ترک ہوئے اور رطب و یابس سے تفسیریں پُر ہوئیں، اپنے اپنے ذوق کے مطابق اگر اقوال نقل ہوئے تو خوش فہمی کے شعور کے ساتھ یہ پچھلوں کی باتیں آنکھیں بند کر کے صحیح سمجھی جانے لگیں اور اسی طرح نقل ہوئیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اب تک جو کچھ بھی تفسیری سلسلہ میں کام ہوا اور تصانیف کی گئیں ان میں نقل کو زائد دخل رہا۔ لیکن چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں جب مختلف علمی تحریکیں پیدا ہوئیں، صرف و نحو بلاغت معانی بیان فقہ منطق فلسفہ کلام تصوف کے موضوعوں نے رواج پایا اور ان میں سے ہر فن کے ماہرین نے تفسیریں لکھیں تو اپنے فن کا پورا مظاہرہ کر دیا۔ کلام پاک کے الفاظ اور آیات کو اپنے فن کے زاویۂ نظر سے دیکھا اور اسی اعتبار سے اس کی توضیح اور تفسیر پر زائد زور دیا۔ زجاج واحدی ابو حیان وغیرہم نے اپنی تفسیروں میں لفظی تناسب اور وجوہ اعراب کی بحثیں کیں۔ ثعلبی نے مورخ کی شان سے قصص و حکایات کا اضافہ کیا اور قرطبی نے فقہی نقطۂ نظر کو بالاتر رکھا۔ امام رازی نے متکلمانہ بحثیں جس شان سے چھیڑیں اور اس طوالت کے ساتھ کہ تفسیر رازی کے مطالعہ کرنے والے یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ تفسیر رازی میں تفسیر کے سوا سب کچھ موجود ہے۔

سلسلۂ کلام یوں ہی دراز ہو گیا اب اگر تمام اقسام و انواع تفسیر کو روشنی میں لایا جائے تو بات کہاں تک پہونچے اس لیے علماء احناف کی تفسیروں ہی کے اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں

امام زمخشری نے تفسیر کشاف لکھی اور اس کے متعلق خود فرمایا

ان التفاسیر فی الدنیا بلا عدد	تفسیروں کا اگرچہ کوئی شمار نہیں ہے لیکن
ولیس فیہا لعمری مثل کشاف	ان میں میرے نزدیک کشاف جیسی کوئی نہیں
ان کنت تبغی الھدیٰ فالزم قرأتہ	اگر تم ہدایت کے جویا ہو تو اس کا مطالعہ
فالجھل کالداء والکشاف کشاف	رکھو، جہالت بیماری ہے اور کشاف

اس کا علاج۔

وہ ممتاز علماء احناف جنھوں نے تفسیریں لکھیں ان کے اسماء گرامی بہ ترتیب سنہ یہ ہیں:۔

(۱) تفسیر وکیع۔ امام وکیع بن جراح کوفی شاگرد امام اعظم المتوفی سنہ ۱۹۷ھ

(۲) تفسیر النسفی۔ قاضی امام حافظ ابراہیم بن معقل المتوفی سنہ ۲۹۵ھ

(۳) تفسیر الماتریدی۔ امام محمد بن محمد بن محمود امام المتکلمین المتوفی سنہ ۳۳۳ھ

(۴) تفسیر ابی اللیث۔ نصر بن محمد فقیہ سمرقندی المتوفی سنہ ۳۸۳ھ

(۵) تفسیر کشاف۔ ۲ جلد۔ علامہ ابو القاسم محمود بن عمر زمخشری المتوفی سنہ ۵۲۸ھ

(۶) تفسیر الخوارزمی۔ ابو الحسن علی بن عمران المتوفی سنہ ۵۳۹ھ

(۷) تفسیر العلائی۔ ۱۰ مجلدات۔ علامہ محمد بن عبد الرحمٰن بخاری زاہد المتوفی سنہ ۵۴۶ھ

(۸) تفسیر العتابی۔ امام ابو نصر احمد صاحب فتاوی عتابیہ المتوفی سنہ ۵۸۶ھ

(۹) تفسیر الکبیر۔ ۲۰ مجلدات۔ شمس الدین ابو المظفر یوسف سبط ابن جوزی المتوفی سنہ ۶۵۴ھ

(۱۰) تفسیر ابو المعالی۔ ۷ مجلدات۔ برہان الدین بن ناصر حسین المتوفی سنہ ۶۸۹ھ

(۱۱) تفسیر الدیری۔ سعید الدین عبد العزیز بن احمد المتوفی سنہ ۶۹۳ھ

(۱۲) تفسیر مدارک التنزیل۔ ۴ مجلدات حافظ الدین نسفی صاحب کنز الدقائق و منار المتوفی سنہ ۷۱۰ھ

(۱۳) تفسیر سراج الدین۔ علامہ ابو حفص عمر بن اسحاق محدث ہندی المتوفی سنہ ۷۷۳ھ

(۱۴) تفسیر البابرتی۔ علامہ اکمل الدین محمد صاحب عنایہ المتوفی سنہ ۷۸۶ھ

(۱۵) کشف التنزیل۔ ۲ جلد ابو بکر بن علی مصری فقیہ المتوفی سنہ [illegible]ھ

(۱۶) تفسیر الزہراوین۔ عـہ علامہ سید شریف الدین علی بن محمد جرجانی المتوفی سنہ ۸۱۶ھ

عـہ۔ زہراوین سے مراد سورۂ بقرہ اور آل عمران ہے۔

(۱۷) تفسیر تبصیر الرحمٰن۔ ۲ جلد۔ علی بن احمد گجراتی المتوفی ۸۳۵ھ۔

(۱۸) تفسیر بحر مواج۔ ملک العلماء قاضی شہاب الدین جون پوری المتوفی ۸۴۹ھ

(۱۹) تفسیر ابن والضیاء۔ علامہ شیخ محمد بن احمد مکی المتوفی ۸۵۴ھ

(۲۰) تفسیر ذخیرۃ الفقر۔ شمس الدین محمد حلبی بن امیر حاج شارح منیہ المتوفی ۸۷۹ھ

(۲۱) تفسیر الجانی۔ فی تفسیر سورۃ العصر نور الدین عبد الرحمٰن المتوفی ۸۹۸ھ

(۲۲) تفسیر سورۃ الفاتحہ۔ مولانا معین الدین صاحب معارج النبوۃ المتوفی ۹۰۷ھ

(۲۳) تفسیر ابن کمال پاشا۔ علامہ شمس الدین احمد بن سلیمان رومی المتوفی ۹۴۰ھ

(۲۴) تفسیر ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم۔ شیخ الاسلام مفتی ابو السعود عمادی۔ المتوفی ۹۸۲ھ

(۲۵) تفسیر سواطع الالہام شیخ فیض اللہ حنفی شاعر دربار اکبری المتوفی ۱۰۰۱ھ

(۲۶) تفسیر القرآن جامی ثانی۔ علامہ یعقوب المتوفی ۱۰۰۳ھ

(۲۷) تفسیر عقد الجواہر، تفسیر سورۂ کوثر۔ شیخ عمر بن نجیم صاحب بحر الرائق المتوفی ۱۰۰۵ھ

(۲۸) تفسیر القاری۔ ملا علی قاری علی بن سلطان محمد مکی المتوفی ۱۰۱۴ھ

(۲۹) تفسیر روح البیان۔ ۶ مجلدات۔ علامہ شیخ اسماعیل آفندی المتوفی ۱۱۳۷ھ

(۳۰) تفسیر ملا جیون، یعنی تفسیر احمدی جس کا پورا نام ہے التفسیرات الاحمدیۃ فی بیان الآیات الشرعیۃ۔

ملا جیون ابھی علوم متداولہ کی تحصیل سے تنہا ہا فارغ نہیں ہوئے، عمر کا صرف سولھواں سال تھا جب اس کو لکھنا شروع کیا اور اکیسویں سال میں پہونچے تھے کہ اس سے فراغت حاصل کرلی اور بقول ملا صاحب یہ زمانہ وہ تھا جب کہ علوم عقلیہ کی طرف لوگوں کی توجہ عام تھی اور منقولات سے ان کو کم کم ہی سروکار تھا۔ زمانہ محی الدین محمد اورنگ زیب کا تھا یعنی شرع اور احکام شرعیہ کا دور دورہ تھا، حدود شرعیہ کا قیام اور رسوم کفریہ کا زوال ہورہا تھا باوجود مصنف کی کم عمری کے پھر بھی یہ کتاب ایک معیاری کتاب تیار ہو کے سامنے آگئی۔

عـــہ۔ یہ امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر کے حاشیہ پر مصر میں طبع ہو گئی ہے۔

اب رہ گئی یہ بات کہ ملا صاحب کی اس طرف باوجود صغر سنی توجہ کیوں ہوئی، باوجودیکہ مال و زر کی تمنا تھی نہ شاہی انعام و اکرام کی آرزو دل میں، اس کا عہد عالمگیری کے ذکر اور عالمگیر کی واجبی مدح و ستائش کے بعد ایک موقع پر اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

ولیس هذا المدح منا طمعا للدنیا	میں نے جو ستائش کی وہ دنیا کی لالچ میں
وطلبا للاثمان والثمین بل	نہیں کی نہ گراں قدر انعام کی تمنا میں
حسبة لله وحرصا لازدیاد	بلکہ خدا واسطے اور دین کی بڑھوتری کی
الدین اذ لم اکن من اهل	لالچ میں اس لیے کہ میں اس طرح کے
هذا الشان ولا من فرسان	لوگوں میں نہیں ہوں اور نہ اس میدان کا
هذا المیدان۔	سوار ہوں۔

اور اس موضوع پر قلم اٹھانے کی توجیہ ملا صاحب نے اپنے قلم سے یہ کی ہے۔

وقد کنت قدیما اسمع من	عرصہ سے میں بڑے لوگوں کی زبانی سنتا
افواه الرجال الکرام ان الامام	آیا تھا کہ امام غزالی نے جو اسلام کے
الغزالی الذی هو من اجلة	بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں انھوں نے
علماء الاسلام قد جمع آیات	اپنی طاقت اور استعداد بھر وہ آیتیں
الاحکام بحسب الطاقة والامکان	ایک جا کرلی تھیں جن سے احکام شرعیہ کا
حتی بلغت خمس مأة بلا زیادة	استنباط ہوتا ہے، ایسی آیات کا شمار
ولا نقصان۔	پانچ سو سے متجاوز نہیں نہ کم ہے۔

اور شاید انھیں اس کتاب تک رسائی نہ ہوئی چنانچہ نفس موضوع کا اشارہ وہاں سے ملتے ہی خود کمر ہمت باندھی اور یہ کام شروع کر دیا۔

فامرت بلسان الالهام.....	لسان غیبی کے حکم پر میں نے اللہ کی مدد اور
ان استنبطها بعون الله تعالیٰ و	توفیق کو سہارا بنا کے احکام کا استنباط
توفیقه..... فاخذت اجمع	کرنا شروع کر دیا۔ میں نے وہ آیات جمع
الآیات التی استنبطت عنها	کرنا شروع کر دیں جن سے میں نے قواعد

الاحکام الفقہیہ والقواعد الاصولیۃ	اصول عقائد اور مسائل فقہیہ کا استنباط
والمسائل الکلامیۃ ..... ثم	کیا پھر میں نے بہترین طریقہ پر ان کی تفسیر
فسرتہا باحسن وجہ من التفسیر	اور شرح لکھی تو مکمل طرز بیان کے ساتھ۔
وشرحتہا باکمل جہۃ من التحریر۔	

تفسیر احمدی لکھتے وقت ملا صاحب کے پیش نظر مختلف فنون و علوم کی کتابیں تھیں مثلاً تفسیروں میں انوار التنزیل اور مدارک التاویل۔ اس کے علاوہ اتقان فی علوم القرآن، شرح وقایہ ہدایہ معہ شرح فتاوی حمادیہ، حسامی، توضیح تلویح، شرح عقائد تفتازانی اور حاشیہ خیالی وغیرہ وغیرہ، اپنی تفسیر میں ملا صاحب نے یہی نہیں کیا کہ جو کچھ ان کتابوں میں لکھا ہے اسی کو نقل کر دیا، بلکہ ان میں اپنی طرف سے اور اضافے بھی کیے۔

وقد الحقت الیہا بعض ما ذکر	بعض مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے اس کے
فی کتب السیر والمحدثین فضلا	علاوہ سیر کی کتابوں اور محدثین کی لکھی
علی ما اوردہ بعض المفسرین	باتوں میں سے بھی میں نے اس میں اضافے
وضممت الیہا من الابحاث	کیے ہیں اور بعض اونچی اونچی بحثیں اور
الشریفۃ والنکت اللطیفۃ	لطیف لطیف نکتے بھی میں نے بڑھا دیے
ما لم اظفر فی کلامہم بالتصریح	ہیں، وہ ایسے ہیں کہ میں نے دوسروں کے
بہا ولم اجد الاشارۃ الیہا۔	بیان میں اس طرح کھل کر لکھے ہوئے نہ
	پائے اور میں نے ان کے اشارے بھی
	نہ دیکھے۔

علوم قرآنیہ اور ما یتعلق بالقرآن پر مقدمہ میں اجمالی بحث کی ہے اور بہت ہی جامع ہے۔ احکام قرآنیہ کے استنباط میں ترتیب قرآنی کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں ان کی نسبت میں مسائل کی تخصیص اور تعیین نہیں ملتی، ہاں اس میں کچھ احکام فقہیہ مسائل کلامیہ اور توحید وغیرہ وغیرہ کی جھلک ملتی ہو۔ اس کے بعد سورۂ بقرہ ہو۔ اس سے یہ مسائل مستنبط ہوتے ہیں کہ تمام اشیاء میں اصل اباحت ہے، نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کا پتہ ملتا ہے عصمت انبیاء

عدم امامت کفار اور اجماع کی حجیت فضائل شہدا، ایمان مفصل، وجوب قصاص یا عفو وغیرہ کے مسائل کا مختلف آیتوں سے استخراج کیا جاتا ہے

ایک آیت ملا صاحب سامنے لاکے اس پر ایک عنوان قائم کرتے ہیں، حالانکہ بظاہر عنوان کا آیت سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا لیکن اپنے انداز بیان اور فکر و غور سے اپنا مدعا ظاہر کر لے جاتے ہیں اور سننے اور سمجھنے والا مطمئن ہو جاتا ہے۔ بیشتر مسائل میں علماء کے اختلافات کی پہلے تصریح کرتے ہیں ان کی آرا نقل کرتے ہیں۔ ان پر عالمانہ بحث کے بعد مرجح بات کو شرح و بسط کے ساتھ مدلل اور مبرہن کر دیتے ہیں۔ کہیں پہلے آیت اور اس کا شان نزول بیان کیا پھر مختصر الفاظ میں اس کی تفسیر کی اور دوسری آیات کو سامنے لاکے اس کے مطلب کی وضاحت کہیں نسخ اور انسا کے معانی کی وضاحت کی، پھر دونوں میں فرق ظاہر کیا، پھر کتاب کے سنت سے منسوخ ہونے یا نہ ہونے کی بحث کی۔ پھر حنفیہ کا مسلک کہ سنت سے کتاب کا نسخ جائز ہے اور شوافع کے نزدیک نہیں اس کی تصریح کی اور آخر میں لکھ دیا۔

ونحن نقول ان النسخ لیس	ہم کہتے ہیں کہ واقعۃً نسخ سے تبدیل
بتبدیل فی الواقع بل ھوا	نہیں ہوتی، بلکہ وہ محض بیان ہوتا ہے
بیان محض فجاز ان یبین اللہ	اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے کلام کی انتہا
مدۃ انتھاء کلام رسولہ او رسولہ	بیان کرے اور اس کا رسول اپنے رب کے کلام
مدۃ انتھاء کلام ربہ	کی انتہا ظاہر کر دے اس میں کونسا حرج ہے۔

نور الانوار اصول فقہ کی کتاب ہے اس میں حنفیت کو جس طرح مستحکم اور مضبوط کیا گیا ہے اسی طرح تفسیر احمدی میں بھی احناف سے قیاس ہی قیاس کی حکمرانی کا اعتراض رفع کر کے قرآن اور سنت رسولؐ کو حنفیت کا منشا اور مولد بنانے کی پوری پوری مساعی جمیلہ شامل ہیں۔

تفسیر احمدی میں کئی مقامات پر ملا جیون علیہ الرحمہ کے کچھ تفردات بھی ہیں۔

تفسیر میں آیات

وقالوا ھذہ انعام وحرث حجر لا یطعمھا الا من نشاء بزعمھم وانعام حرمت ظھورھا وانعام لا یذکرون اسم اللہ علیھا افتراء

علیہ سیجزیھم بما کانوا یفترون"

کی مکمل لفظی تحقیق اور تفسیر کے بعد عام علماء نے جن جن مسائل کا ان سے استخراج کیا ہے اس کو ظاہر کرنے کے بعد خصوصی اوراد و رسائل کا ملّا صاحب استنباط کر کے لکھتے ہیں۔

ولعمری ان ما اخبر الله تعالیٰ بشناعة حال الکفار فی ذلك اصدق دلیل علی بطلان هذه الرسوم التی اشتهرت بین بعض الانام وتفرد بهذا خاطری وهو اعلم بحقیقة الحال۔

بقسم کہتا ہوں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں کفار کی بدحالی اور بدکرداری کا ذکر کیا ہے اُن سے کفار کی ان مروجہ رسوم کا بالکل ٹھیک ابطال ہو جاتا ہے جن کا بعض لوگوں میں چلن اور رواج ہے اور اس بات کے بیان میں صرف میرے ہی ذہن کی رسائی ہوئی ہے اور اللہ حقیقت حال سے زیادہ واقف ہے۔

ملّا عبد السلام

قصبہ دیوہ ضلع بارہ بنکی (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ وہاں ہی پیدا ہوئے لیکن تحصیل علوم متداولہ کی اپنے نانا ملّا عبد الکریم کے پاس قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں رہ کے کی۔ ان کا سلسلۂ نسب امام زین العابدین بن امام حسین بن علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ تک منتہی ہوتا ہے۔ تحصیل علوم کا کچھ زمانہ ملّا عبد السلام لاہوری تلمیذ فتح اللہ شیرازی ملقب بہ عضد الملک کے پاس بھی گذرا ہے۔ عہد شاہجہانی میں مؤخر الذکر مدرسۂ شاہجہانی میں مدرس تھے۔ اپنے استاد کی وفات کے بعد ان کی جگہ انھوں نے لی۔ ملّا عبد الحکیم والد ملّا قطب الدین سہالوی ملّا دانیال چوراسی اور ملّا عبد القادر فاروقی ان کے ارشد تلامذہ میں سے ہوئے ہیں اور شاید مبالغہ نہ ہو کہ اس عہد میں ہندوستان بھر کا سلسلۂ تلمذ انھیں شخصیتوں پر منتہی سمجھا گیا ہے۔ شاہ تراب علی کشف المتواری میں لکھتے ہیں:-

ملا عبد السلام مرحوم کہ شاگرد مخدوم شیخ عبد الکریم و پرورش کردہ آنحضرت

بودند در عہد سلطنت شاہجہاں اولاً مدرس مدرسہ لاہور بعدہٗ مفتی لشکر بادشاہی گشتند از علمائے فحول آں وقت بودند ..... در قصبہ دیوہ حویلی کہ واقع محاجی محلہ است محل سکونت شان بود نیز صبیہ خود را ہبہ کردہ بودند مع قدرے زمین مزروع چک بستہ از موضع ادھیامئو دیہ معانی و زمینداری خود چنانچہ نواسہ او برآں قابض اند۔[۵]

ان کو عہد عالمگیری میں فخر علماء سمجھا گیا۔

در عہد خویش نظیر نہ داشت بادشاہ بسبب استادیش و تبحر علوم بسیار اکرام او میکرد و نزد خود می نشاند سند افتائے اردوئے معلّٰی بنام ملا بود چنانچہ تا عرصہ ممتد خدمت مذکور از دتعلق میداشت۔[۵]

یہ صاحب تصانیف بھی تھے، تہذیب اور منارالاصول کی شرحیں انھوں نے لکھیں اور ایک کتاب فن حکمت و منطق میں بھی انشراحات معالیہ کے نام سے کتب خانۂ انوریہ کاکوری میں قلمی موجود ہے۔ یہ کتاب آپ نے اپنے فرزند شاہ ابوالمعالی کے لیے ان کے زمانۂ درس میں لکھی تھی۔ ان کا مزار قصبہ دیوہ میں ہے۔ راقم السطور کو اس کی زیارت کا موقعہ ملا ہے۔

(باقی)

---

[۱] کشف المتواری صفحہ ۱۳۶۔ [۵] رسالہ باغ و بہار شیخ خیرالزماں صدیقی لکھنوی۔

ایک سانحہ

حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مقیم مدینہ طیبہ کی وفات

آج ہی ۶ر نومبر کو عصر و مغرب کے درمیان اس عظیم سانحہ کی خبر ملی کہ شیخ وقت اور جلیل القدر عالم دین حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (مقیم مدینہ طیبہ) کا وصال ہو گیا ــــ انا للہ وانا الیہ راجعون ــــ اللھم اغفرلہ وارحمہ واکرم نزلہ والحقہ بسلفہ الصالحین من عبادک الذین رضیت عنھم ورضوا عنک۔

اس دنیا میں کسی آدمی کا پیدا ہونا اور اٹھ جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ روزانہ ہزاروں انسان اس دنیا میں آتے ہیں اور اسی طرح ہزاروں موت کے راستے سے چلے جاتے ہیں لیکن وہ بندے جو اپنے احوال و اوصاف اور فیوض و برکات کے لحاظ سے انبیاء علیہم السلام کے وارث ہوتے ہیں اُن میں سے کسی کا اٹھ جانا بلاشبہ انسانی دنیا کے لیے بہت بڑا سانحہ ہوتا ہے جس سے زمین و آسمان بھی متاثر ہوتے ہیں۔

صحیح بخاری شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے۔

یذھب الصالحون الاول فالاول وتبقی حفالۃ کحفالۃ الشعیر والتمر لا یبالیھم اللہ بالۃ۔	اللہ کے نیک بندے ایک ایک کرکے اٹھتے چلے جائیں گے اور ایسے لوگ رہ جائیں گے جو اُن کی نسبت ایسے ہوں گے جیسے جَو کی بھوسی یا سوکھی کھجوروں کے چھلکے جن کی اللہ کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔

یہ گنہگار راقم السطور اپنے شعور کے گزشتہ قریباً چالیس سالوں میں یہ منظر برابر دیکھتا رہا ہے ــ حضرت شیخ الہند لعد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہما کی تو صرف زیارت نصیب ہوئی، ان کے بعد حکیم الامت حضرت تھانوی، حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمد الیاس اور مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری (قدس اللہ اسرارہم) کا کچھ قرب و تعلق بھی اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمایا۔ ان سب کی وفات پر بھی محسوس ہوا کہ دین اور علم و معرفت کا نور دنیا سے اٹھتا جا رہا ہے اور ظلمت اس کی جگہ لے رہی ہے ــــ ہمارے ان اکابر و مشائخ کی کچھ یادگاریں بعض شخصیتیں اب بھی ہیں ان میں ایک بڑی صاحب فیض شخصیت حضرت مولانا محمد یوسفؒ کی بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ نے اسی سال ہم میں سے اٹھا لیا اور وہ ہمارے اس سال کا بہت بڑا دینی سانحہ تھا۔ حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ کی وفات بھی ہماری دینی دنیا کا بڑا عظیم سانحہ ہے۔

مولانا موصوف شیخ وقت بھی تھے اور اس دور کے جلیل القدر عالم دین بھی، عصر حاضر کی خصوصیات اور اسکے تقاضوں کو سمجھنا اور علوم نبوت کی تشریح اس طرح کرنا جس سے اس دور کے پیدا شدہ مسائل بھی حل ہوں ان کا خاص امتیاز تھا۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "ترجمان السنہ" ان کے اس کمال کی آئینہ دار ہے ___ افسوس کہ اسکی صرف ۳ جلدیں مولانا لکھ سکے جو شائع بھی ہوگئی ہیں۔ (چوتھی جلد حال ہی میں پاکستان میں شائع ہوئی ہے)

مولانا مرحوم حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے، پہلے دورۂ حدیث مظاہر العلوم میں پڑھ چکے تھے، اسکے بعد صرف حضرت شاہ صاحب سے علمی استفادہ کی غرض سے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیکر دوبارہ دورۂ حدیث یہاں پڑھا، پھر چند سال تک دارالعلوم میں مدرس بھی رہے۔ بعد میں جب قضا و قدر کے ایک فیصلہ نے حضرت شاہ صاحبؒ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ کو جامعۂ اسلامیہ (ڈابھیل سورت) بھیجدیا تو مولانا بدر عالم صاحب بھی جامعہ کے ایک استاذ کی حیثیت سے ان حضرات کے ساتھ یہاں آگئے اور یہاں کئی سال تک مسلسل حضرت شاہ صاحبؒ کے درس بخاری میں بیٹھ کر حضرتؒ کے درسی افادات قلمبند کرتے رہے جنکو بعد میں عربی میں مرتب کیا اور فیض الباری کے نام سے وہ چار جلدوں میں مصر میں چھپ کر شائع ہوئی۔

۱۹۴۸ء میں مولانا ممدوح ہندوستان سے پاکستان چلے گئے اور ۴ سال کے بعد ۱۹۵۱ء میں وہاں سے حجاز مقدس آگئے اور جنت البقیع میں دفن ہونے کی آرزو کے ساتھ مدینہ طیبہ میں قیام کرلیا۔

کئی سال ہوئے موٹر کے ایک ایکسیڈنٹ میں ایسے مجروح ہوگئے تھے کہ بچنے کی کوئی توقع نہ تھی لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ابھی زندہ رکھنے کا تھا، زندہ رہے لیکن اسکے بعد صرف لیٹے رہ سکتے تھے بیٹھنے کے قابل بھی نہ تھے مگر دینی و علمی افادہ و افاضہ کا سلسلہ الحمدللہ جاری رہا۔ لیٹے لیٹے دینی اور اصلاحی گفتگو ہر وقت فرماتے رہتے تھے۔

عام مسلمانوں کے افکار و خیالات اور اعمال و اخلاق کی اصلاح کیلئے "جواہر الحکم" کے نام سے آسان زبان میں احادیث نبویہ کی شرح کا ایک سلسلہ جاری فرما رکھا تھا، اب سے ۴ مہینے پہلے جب یہ عاجز مدینہ طیبہ حاضر ہوا، تو اس کا دوسرا حصہ عنایت فرمایا تھا۔ آج خبر وفات ملنے پر اسکو اٹھا کر دیکھا تو بسم اللہ اور حمد و صلوٰۃ کے بعد مولانا نے اس میں لکھا تھا۔

"اس وقت عالم کے انقلابات کا ہولناک نقشہ اور علماء و صالحین کا بڑی تیزی سے اٹھتے چلے جانے کا عبرتناک سماں میری آنکھوں کے سامنے ہے اس لیے اس سلسلہ کی چند احادیث اس حصہ میں بے اختیار درج ہوگئی ہیں تاکہ اہل فہم و سعادت اپنی قلیل فرصت کو بے کار ضائع نہ کریں اور جتنی جلد ممکن ہو اعمال خیر میں ہمت سے کام لیں۔"

عجب نہیں کہ مولانا پر اپنی وفات کا قرب منکشف ہوا ہو، اور یہی اُن کے لیے اس سلسلہ کا باعث اور محرک ہوا ہو اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے دینی و علمی فیض کو تا قیامت جاری رکھے اور مسلسل ترقیات اور رفع درجات اس کو ذریعہ بنائے اور اپنی رحمت و رضا سے ان کو نوازے اور پسماندگان و متعلقین کو صبر جمیل اور احتساب کی توفیق دے اور ان کی پوری سرپرستی و نگرانی فرمائے۔ ناظرین کرام سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

مرتبہ
عتیق الرحمن سنبھلی

سالانہ چندہ
ہندستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

(فی کاپی ۶۰ پیسے)

جلد ۳۳	بابتہ ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۵ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۵ء	شمارہ ۸

اگر اس دائرہ میں ⭕ سرخ نشان ہے تو

اسکا مطلب ہے کہ آپکی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۔۔ تک آ جانے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: - براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھدیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت: - الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیا جاتا ہے، اگر ۔۔ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اسکی اطلاع ۔۔ تاریخ تک آجانی چاہیئے ۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

۹ اگست ۶۴ء کو مسلمانانِ ہند کی مختلف جماعتوں اور مختلف حلقوں کے نمائندوں میں ملت کے مشترک مسائل اور مشترک مقاصد کے لئے اشتراکِ عمل کی جو ہلکی سی شکل رونما ہوئی تھی، افسوس ہے کہ اکتوبر ۶۵ء میں اس میں پہلا شگاف بھی نمودار ہو گیا!

اتحاد و اشتراک کی یہ شکل "آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت" کے قیام سے بنی تھی، جس میں ذاتی طور سے ملت کا اعتماد رکھنے والی متعدد نمایاں شخصیتوں کے علاوہ جمعیۃ علماءِ ہند، جماعت اسلامی ہند، اور مسلم لیگ وغیرہ کے اعلیٰ عہدیداران شامل تھے۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ شکل کچھ بہت پائیدار بنیادوں پر قائم نہیں تھی۔ اور ایسے جھول موجود تھے جن سے نہ صرف اسکی معنویت بہت کچھ متاثر ہو سکتی تھی بلکہ اس کا وجود تک خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ مثلاً اس کا بنیادی تخیل تو یہ تھا کہ مختلف جماعتوں اور کارکن حلقوں کا ایک وفاق بنے اور ملک کے مخصوص حالات سے پیدا ہونے والے مشترک ملی مسائل جو مشترک جد و جہد اور متحدہ نمائندگی چاہتے ہیں ان میں سارا کام اسی کے ماتحت یا کم از کم اس سے مربوط ہو کر ہو۔ لیکن مجلس کی تاسیسی قرارداد میں اس تخیل کی بالکل وضاحت نہیں آئی، بلکہ اسکے برعکس مجلس میں بعض جماعتی حضرات کی شرکت اس مفروضے کے ماتحت ہوئی کہ اس سے کسی جماعت کے سر کوئی پابندی نہیں آتی، چنانچہ انھوں نے مجلس کی تاسیس میں اس صراحت ہی کے ساتھ حصہ لیا کہ اُن کی شرکت ذاتی اور انفرادی حیثیت میں ہے، جماعتی حیثیت میں نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ بات مجلس کا قیام بالکل بے معنی کر دیتی تھی اور کم سے کم مدت ہی

میں مجلس کو انتشار کا حادثہ پیش آسکتا تھا، کیونکہ مجلس کسی ایسے کام کے لئے قائم نہیں کی جارہی تھی جو ان جماعتوں کے دائرہ کار سے باہر ہو۔ اس کا تو بنیادی کام وہی مسائل تھے جن میں یہ سب جماعتیں الگ الگ کم و بیش کام کر رہی تھیں۔ مجلس کا کام یہ تھا کہ ان میں مشترک لائحہ عمل اور مشترک جد و جہد وجود میں لائے۔ اور یہ کام جماعتوں کے پابندی قبول کئے بغیر ایک دن بھی کیونکر ہو سکتا تھا؟ ـــــــ اس لئے اس ناقص شکل میں مجلس کا قیام کوئی بہت امید افزا چیز نہیں تھی ـــ مگر جمعیۃ علماء کے حضرات اسی ذہن کے ساتھ آئے تھے کہ وہ ذاتی حیثیت میں شریک ہو رہے ہیں اس لئے جماعتی حیثیت سے کوئی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے، لہٰذا اس ناقص شکل ہی کو غالباً اس اندیشے سے گوارا کیا گیا کہ ۸، ۹ راگست ۱۹۶۴ء کا نمائندہ شاندار اجتماع اگر اتحاد و اشتراک کی کسی ظاہری شکل سے بھی خالی ہاتھ اٹھا تو یہ مضطرب قوم کی امیدوں کے لئے ایسا دھچکا ہوگا جس کی پھر شاید تلافی نہ ہو سکے۔ دوسری طرف شاید یہ امید بھی کارفرما تھی کہ جب مرحلہ اطمینان سے بیٹھ کر عملی تفصیلات طے کرنے کا آئے گا تو ان حضرات پر خود ہی یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مجلس اپنے اصل مقاصد میں کوئی ایک قدم بھی ان لوگوں کی شرکت کے ساتھ اس وقت تک نہیں اٹھا سکتی جب تک یہ جماعتی طور پر مجلس کے قیام کو منظور نہ کرلیں۔ اس لئے جو نقص اور جھول تاسیسی قرارداد میں رہا جا رہا ہے وہ آگے خود ہی دور ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور مجلس کا جو دستور پاس ہوا اس میں بھی تاسیسی قرارداد کا یہ نقص دور نہیں ہو سکا، جس میں مجلس کو ٹوٹ پھوٹ کا حادثہ پیش آجانے یا بے معنی و بے مصرف ہو کر رہ جانے کے امکانات پوشیدہ تھے۔

ہمارے یہ خیالات آج نکات بعد الوقوع کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم نے الفرقان اکتوبر ۱۹۶۴ء کے انہی صفحات میں اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اور پھر دسمبر ۱۹۶۴ء کے اداریہ میں بہت کھول کر یہ بات لکھی تھی کہ اگر مجلس کو باقاعدہ جماعتی وفاق کی حیثیت نہیں دی جاتی تو پھر یہ انتشار کے حادثے سے نہیں بچ سکتی۔ بہرحال یہ مسئلہ دستور سازی کے مرحلے میں بھی صاف نہیں ہو سکا۔ اور اسی اثنا میں مسلم یونیورسٹی کا ہنگامہ خیز مسئلہ آکھڑا ہوا۔ مجلس نے اس پر ایک

اہم قرارداد منظور کی جس میں مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لینے کا اعلان کرتے ہوئے دیگر ضروری اقدامات کے علاوہ قانونی چارہ جوئی کا بھی فیصلہ کیا۔ اور اس کے لئے ایک سب کمیٹی نامزد کر دی۔

منطقی اعتبار سے مجلس کی اس قرارداد کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ جن جماعتوں کے ذمہ دار مجلس میں شریک تھے وہ جماعتیں اس مسئلے میں جداگانہ اقدامات سے پرہیز کرتیں۔ مگر قانونی اعتبار سے ان جماعتوں پر اسکی کوئی ذمہ داری نہیں تھی، کیونکہ ان کے ذمہ داروں نے اپنے جماعتی حقوق مجلس کو تفویض نہیں کئے تھے۔ یہی وہ مبہم اور چھولدار پوزیشن تھی جس میں ایک طرف جمعیتہ علماء نے جائز سمجھا کہ وہ مجلس کو نظر انداز کر کے اپنے طور پر مسلم یونیورسٹی کے لئے قانونی چارہ جوئی کرے۔ اور دوسری طرف مجلس سے تعلق رکھنے والے کچھ دوسرے افراد کو یہ بات سخت قابل اعتراض معلوم ہوئی کہ جمعیتہ کے ذمہ دار مجلس میں بھی شریک ہیں اور اُسے نظر انداز بھی کر رہے ہیں۔

جمعیتہ کا اقدام قابل اعتراض ضرور تھا، مگر صرف منطقی طور پر تھا، دستور مجلس کے اعتبار سے قانونی طور پر اس میں کوئی گرفت کی بات نہیں تھی۔ اس لئے مجلس کے ذمہ داروں کو تو حق تھا کہ وہ معاملے کے منطقی پہلو کو اٹھائیں اور اندرونی طور پر ارباب جمعیتہ سے یہ دریافت کریں کہ اس طرح مجلس کے کیا معنی رہ جائیں گے؟ مگر مجلس کی طرف سے کسی دوسرے فرد کو نہ تو اندرونی طور سے اس پر اعتراض کا حق تھا اور نہ علانیہ، لیکن معاملے کے الجھاؤ نے جس طرح جمعیتہ کو اس غلط اقدام کا موقع دیا اسی طرح کچھ دوسرے افراد سے اس دوسری غلطی کا ارتکاب کرا دیا۔ اور بجائے اسکے کہ مجلس کے یہ شرکاء مجلس کے کسی جلسے میں بیٹھ کر اس مسئلہ پر بات چیت کرتے باہر ہی باہر دست و گریباں ہوگئے۔ اور اس کا انجام ہوا مجلس سے جمعیتہ کا اظہار بیزاری اور جنرل سکریٹری جمعیتہ کا استعفےٰ۔

ہمارے اس نقطۂ نظر سے، اس بدانجامی کی بنیادی طور پر ذمہ دار، مجلس کی وہ تاسیسی قرارداد ہے جس کے ابہام نے اس بات کی اجازت دی کہ جماعتی ارکان اگر چاہیں تو کسی بھی مسئلے پر مجلس کو نظر انداز کر کے اپنی جماعت کے پلیٹ فارم سے آزادانہ کام کریں۔ اور خود مجلس

ہی کو ایک حریف اور رقیب کی جگہ پر رکھ لیں ۔۔ اس شکل میں یہ بات ناگزیر ہی تھی کہ جو لوگ معاملے کے اس الجھاؤ سے فائدہ اٹھانا چاہیں وہ بالآخر ایک دن الگ ہی ہو جائیں کیونکہ یہ دراصل علیحدگی ہی کا راستہ تھا۔ مگر ارباب جمعیۃ نے اس طرز عمل کے ساتھ جس طریقے سے علیحدگی اختیار کی[1] ـــــــــــ وہ بہت ہی حیرت انگیز ہے۔ ہونا یہ چاہئیے تھا کہ مجلس کو ان سے شکایت ہوتی کہ یہ آپ حضرات کیا کر رہے ہیں اور اس طرح مجلس میں آپ کی شرکت کی کیا معنویت رہتی ہے؟ مگر ہوا یہ کہ مجلس نے تو اس طرح کی کوئی شکایت نہ کر کے ان حضرات کو باقاعدہ علیحدگی کا کوئی موقع ہی نہ دیا۔ البتہ ان حضرات نے الٹی کچھ شکایات مجلس ہی پر قائم کر دیں۔ اور پھر مجلس کو صفائی کا کوئی موقع دئے بغیر اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور اس طرح یہ ثابت کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کہ مجلس ان کے لئے ایک نہایت کڑوی گولی تھی جسے پتہ نہیں انھوں نے کس طرح اب تک نگلے رکھا تھا۔

کم از کم راقم سطور کو تو اس ہونے والی بات کا اس طرح انتظار تھا جیسے شام کے بعد صبح کا اور صبح کے بعد شام کا۔ اور اسکی ایک وجہ تو وہ تھی جس کا اظہار دسمبر ۶۳ء کے اس اداریہ میں کیا گیا تھا جس کا ابھی حوالہ گزرا ہے، اس اداریہ میں اس بات سے بحث کرتے ہوئے کہ مجلس مشاورت جس تخیل اتحاد و اشتراک پر قائم کی گئی ہے وہ کس قدر مشکل ہے، یہ چیز سامنے لائی گئی تھی کہ برسہا برس گزر گئے، سب اس تخیل کے مطابق کام کی ضرورت کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور ادھر پوری قوم بےچین ہے کہ یہ چیز ہو، مگر ہو کسی طرح نہیں پاتی۔ اور پھر اسکی وجہ یہ عرض کی گئی تھی کہ :-

"ہمارے نزدیک اس عجیب و غریب صورت حال کا، کہ سب اشتراک و اتحاد چاہتے ہیں، کوئی عذر بھی کسی کی زبان پر نہیں اور پھر بھی یہ بیل منڈھے نہیں چڑھتی، خاص سبب یہ ہے کہ جن مسائل کو آج مشترک مسائل کہا جاتا ہے جن جا عتوں

[1] ہمارے ذہن میں یہ بات موجود ہے کہ جمعیۃ کے صرف ایک صاحب علیحدہ ہوئے ہیں دوسرے (جناب مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی) اس سے متفق نہیں ہیں مگر پھر بھی ہم نے اس مضمون میں اس علیحدگی کو جمعیۃ ہی کی علیحدگی سے تعبیر کیا ہے آخر مضمون میں اسکی وجہ بھی سامنے آجائے گی۔

کا اصل دائرہ کار یہی مسائل ہیں، اور انہی میں اپنی سرگرمیوں کی بنیاد پر وہ مسلمانوں کو تھوڑا یا بہت اپیل کرتی ہیں، یہ جماعتیں اگر انہی مسائل میں اپنی جداگانہ سرگرمیاں ترک کر کے سارا کام مشترک پلیٹ فارم سے کریں تو اپنے انفرادی وجود کے لیے عام مسلمانوں کی دلچسپیاں آخر کس بنیاد پر حاصل کر سکیں گی؟ یہ ہے وہ نفسیاتی گرہ جو آج تک مشترک پلیٹ فارم کے قیام کا راستہ روکے رہی ہے اور جب تک یہ گرہ نہیں کھلے گی صحیح معنی میں کوئی مشترک پلیٹ فارم وجود میں نہیں آسکے گا"

(الفرقان دسمبر ۱۹۶۴ء۔ نگاہ اولیں)

کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ وجہ موجودہ جماعتوں میں سے جمعیۃ علماء پر سب سے زیادہ چسپاں ہوتی تھی۔ اور اسی وجہ سے مجلس کے ساتھ شروع دن سے اس کا طرز عمل دیکھ کر ہمارے لئے یہ بات گویا بالکل یقینی تھی کہ وہ زیادہ دن مجلس کے ساتھ ظاہرداری بھی نہیں نبھا سکے گی۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی۔ اور وہ یہ کہ جمعیۃ علماء مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے ساتھ ہندو مسلم یا مسلمان اور حکومت سے متعلق سوالات میں اشتراک عمل کر کے، اپنا کیریہ خراب کر لے، یہ بہت انہونی بات تھی۔ پتہ نہیں کیسے یہ بات ہوگئی تھی کہ اسکے ذمہ داروں نے ان دو جماعتوں کے ساتھ مجلس میں شرکت منظور کر لی، ورنہ یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی نہیں۔ جون ۱۹۶۱ء کا مسلم کنونشن جو دہلی میں جمعیۃ کے زیر اہتمام ہوا تھا اس میں یہ دونوں جماعتیں اسی لئے شریک نہیں کی جا سکیں، اور پھر مجلس مشاورت میں شرکت منظور کرنے والے ارباب جمعیۃ نے دو ہی تین مہینے بعد جو جمہوری کنونشن منعقد کیا اس میں بھی ان دونوں جماعتوں کو دعوت بہرحال نہیں مل سکی۔ پس یہ بات واقعی بڑی حیرت انگیز تھی کہ ان دو کنونشنوں کے درمیان میں ایک وقت ارباب جمعیۃ کیسے ان دونوں جماعتوں کے ساتھ معاہدہ اشتراک کرنے پر تیار ہو گئے۔ اور اسکے برعکس یہ بات ذرا بھی حیرت انگیز نہیں کہ مجلس سے استعفے میں ان دونوں جماعتوں سے اپنے نظریاتی بُعد کے سوال پر بہت زور دیا گیا۔ واقعہ در اصل یونہی ہے اور ہم اس میں جمعیۃ کو ذرا بھی خطاوار نہیں گردانتے۔ حیرت انگیز بلکہ قابل اعتراض جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ جو کام بعد میں کرنا ہی تھا وہ پہلے ہی کیوں نہ کیا گیا۔ جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے نظریات کے بارے میں چند دن کے لئے کوئی ڈھیل ہو جائے

کا تو سوال تھا نہیں اور نہ ہی ایسا تھا کہ ان کے اندر کسی تبدیلی کا تیقن حاصل کیا گیا ہو، پھر اس بنیاد پر شروع ہی میں مجلس کے اندر آنے سے معذرت کیوں نہ کر دی گئی؟ اس میں کوئی برائی نہ تھی، ایک نظریاتی بات تھی! لیکن اس وقت شرکت کرنے کے بعد آج یہ کہہ کر الگ ہونا کہ جمعیۃ کے اور ان دو جماعتوں کے درمیان سیکولرزم وغیرہ کے مسائل پر ہم آہنگی نہیں ہے، بڑی ستم ظریفی کی بات ہے۔ اسی طرح اگر مسلم یونیورسٹی کی رٹ کے سلسلے میں جماعت اسلامی کے اخبارات سے کچھ مناقشہ ہو گیا تھا تو وہ اسکی شکایت مجلس سے کر سکتے تھے، کوئی ایکشن لئے جانے کا مطالبہ کر سکتے تھے، مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ شکایت ہوئی جماعت اسلامی سے اور استعفیٰ دے دیا گیا مجلس سے ....
.....جماعت اسلامی کا تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا البتہ مجلس کو نقصان پہونچ گیا۔ خود مجلس سے اگر کوئی شکایت کی گئی ہے تو وہ یہ ہے کہ مستقل دستور اور تنظیم اُس وعدے کے خلاف ہو جو صدر مجلس نے اِن حضرات سے کیا تھا! لیکن یہ جاننے کے بعد کہ جو دستور بنا ہے اور اس میں جو تنظیمی اصول منظور کئے گئے ہیں وہ ان حضرات کی رضامندی سے اور ان کی ترمیمات قبول کر کے بنا ہے، کون اس شکایت کو کوئی وزن دے سکتا ہے؟

اس سارے تجزیے کو مختصر کیا جائے اور بات چند لفظوں میں کہی جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ارباب جمعیۃ پتہ نہیں کیسے مجلس میں شامل ہونے کی غلطی کر بیٹھے تھے۔ اور پھر اسکی تلافی کے لئے انھوں نے پہلے ہی دن سے ایسا رویہ اختیار کیا کہ خود مجلس ہی انھیں علیحدگی کا کوئی موقع دیدے۔ لیکن جب مجلس نے انھیں اس طرف سے بالکل ہی مایوس کر دیا تو مجبوراً خود ہی پیش قدمی کرنا پڑی اور جیسے تیسے اس غلطی کی تلافی کر لی — ہمارا یہ تجزیہ یقیناً ان حضرات کو بہت ناگوار گزرے گا۔ مگر ہم ایمانداری کے ساتھ اسکے علاوہ کوئی دوسری رائے قائم نہیں کر سکے — مجلس نے اس استعفے پر اپنے ۱۶، ۱۷ نومبر کے جلسے میں منظوری کی جو قرارداد پاس کی ہے وہ یقیناً اسکے اتباک کے رویے سے بہت مختلف ہے، مگر ہمارا خیال ہے کہ یہ صورت ہرگز پیش نہ آتی، اگر اس استعفے میں غیر ضروری طور پر "حب الوطنی" کی نمائش کے لئے مجلس کی وطن دوستی کو ناپنے کی کوشش نہ کی جاتی۔ یقیناً یہ ایک ناقابل تحمل بات تھی اور اس پر نرمی غلط فہمیوں کا دروازہ

کھول سکتی تھی۔ ہم نے استعفے کے اس جز و پر گذشتہ ماہ بھی لکھا تھا اور آج مزید کہنا چاہتے ہیں کہ وطن دوستی یہ نہیں ہے کہ بغیر سمجھے بوجھے اقتدار کی ہاں میں ہاں ملائی جائے۔ یہ کم سے کم درجے میں کمزوری ہے، جو ضمیر کشی تک لیجاتی ہے۔ کوئی شخص اور کوئی جماعت اگر خود کو اس پر مجبور پاتی ہے تو وہ ایسا کرے، لیکن اس بات کی کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ دوسرں کو اسکے خلاف جانے پر وطن دشمنی کے لئے متہم کیا جائے۔ یہ سراسر نمائشی وطن دوستی کے لئے ملت دشمنی کا ارتکاب ہے، جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ مجلس نے اگر معاملہ کو اس زاویہ نظر سے دیکھا تو اُسے غلط کیسے کہا جا سکتا ہے؟ مجلس قابل مبارکباد ہے کہ اس نے استعفے کے اس جزو کی پیدا کردہ آزمائش میں کوئی کمزوری نہیں دکھائی اور ۱۶، ۱۷، نومبر کے اسی جلسے میں ہند پاک تصادم کے متعلق وہ قرارداد منظور کی جو اسکے اپنے تصور کے مطابق وطن دوستی کا تقاضہ تھی۔

بات بس بات نکلتی چلی آئی۔ اور اس پھیلاؤ سے اندیشہ ہے کہ ہمارے مدعا کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے۔ ہم نے مجلس کی تاسیسی قرارداد کے نقص کو جو اس انتشار کا ذمہ دار قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جمعیتہ کی علحٰدگی کی ذمہ داری بھی اس قرارداد پر ہے، بلکہ اسکے برعکس حقیقت یہ ہے کہ قرارداد میں یہ جھول گوارا ہی صرف اس لئے کیا گیا تھا کہ جمعیتہ شامل رہے لیکن یہ صحیح نہیں ہوا اور اسکے بجائے صحیح یہ ہوتا کہ یا تو جمعیتہ مجلس کے بنیادی تخیل کو واضح طور پر قبول کر کے اس میں شامل ہوتی اور یا پھر اس نیک کام سے کسی دوسرے مناسب وقت تک کے لئے صبر کر لیا جاتا۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا کہ جو صورت اٹھارہ برس سے چل رہی تھی بس وہی قائم رہتی یعنی جماعتوں کا عدم اشتراک و تعاون، لیکن اب اس میں مزید برائی کھلے ہوئے عناد، تلخی اور آویزش کی پیدا ہوگئی ہے جو یقیناً پہلے سے بدتر صورت حال ہے اور ملت کے لئے بیحد خطرناک!

ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ مجلس کے قیام کے وقت کے حالات میں یہ بظاہر ایک اچھی ہی شکل تھی اور آئندہ مزید بہتری ہی کی توقع کی جانی چاہیئے تھی! مگر اب تو انجام سامنے آچکا ہے اس لئے غلطی کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اسی طرح جمعیتہ کے بارے میں ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ اگر شروع میں اپنے اس موقف کا اظہار کرتی کہ مختلف جماعتوں کے درمیان اشتراک عمل کیلئے

معارف الحدیث

نفلی روزے

[معارف الحدیث کے اس سلسلہ میں "کتاب الصوم" کی احادیث کی تشریح ابسے دو سال پہلے الفرقان کی چند اشاعتوں میں کی گئی تھی اس میں وہ حدیثیں درج ہونے سے رہ گئی تھیں جن کو محدثین "صیام التطوع" (نفلی روزے) کے زیر عنوان درج کرتے ہیں اور جن میں مختلف مہینوں اور مختلف دنوں میں نفلی روزے رکھنے کی ترغیب وارد ہوئی ہے یا نفلی روزوں کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی خاص ہدایت مروی ہے۔ آج کی صحبت میں وہی حدیثیں پیش کی جارہی ہیں۔]

نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزوں کا ایک نصاب اور کورس تو اسلام کا رکن اور گویا شرط لازم قرار دی گئی ہے جس کے بغیر کسی مسلمان کی زندگی اسلامی زندگی نہیں بن سکتی۔ اور وہ رمضان کے پورے مہینے کے روزے ہیں۔ اس کے علاوہ شریعت اسلام میں روحانی تربیت اور تزکیہ کے لیے اور اللہ تعالیٰ کا خاص تقرب حاصل کرنے کے لیے دوسری نفلی عبادات کی طرح نفلی روزوں کی بھی تعلیم دی گئی ہے، اور بعض خاص دنوں اور تاریخوں کی خاص فضیلتیں اور برکتیں بیان فرما کے ان کی خصوصی ترغیب دی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زبانی تعلیم و تلقین کے علاوہ اپنے عمل سے بھی امت کو ان نفلی روزوں کی ترغیب دیتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ آپ اس کی بھی پوری

احتیاط فرماتے تھے کہ لوگ نفلی روزوں میں حد اعتدال سے آگے نہ بڑھیں اور ان کا اہتمام اور پابندی فرض روزوں کی طرح نہ کریں بلکہ حدود اللہ کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے فرائض کو فرائض کی طرح ادا کریں اور نوافل کو نوافل کے درجہ میں رکھیں ــــــ اس مختصر تمہید کے بعد اس سلسلہ کی حدیثیں ذیل میں پڑھئے!

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِكُلِّ شَیْءٍ زَكٰوةٌ وَ زَكٰوةُ الْجَسَدِ الصَّوْمُ۔

ــــــ ــــــ رواہ ابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر چیز کی کوئی زکوٰۃ ہے (جس کے نکلنے سے وہ چیز پاک ہو جاتی ہے) اور جسم کی زکوٰۃ روزے ہیں۔ (سنن ابن ماجہ)

ماہ شعبان میں نفلی روزوں کی کثرت:۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَصُوْمُ حَتّٰى نَقُوْلَ لَا یُفْطِرُ وَیُفْطِرُ حَتّٰى نَقُوْلَ لَا یَصُوْمُ وَمَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَكْمَلَ صِیَامَ شَهْرٍ قَطُّ اِلَّا رَمَضَانَ وَمَا رَاَیْتُهٗ فِیْ شَهْرٍ اَكْثَرَ مِنْهُ صِیَامًا فِیْ شَعْبَانَ ــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور (نفلی روزوں کے بارہ میں) یہ تھا کہ آپ کبھی کبھی) مسلسل بلا ناغہ روزے رکھنے شروع کرتے یہاں تک کہ ہمیں خیال ہوتا کہ اب ناغہ ہی نہیں کریں گے، اور (کبھی اس کے برعکس ایسا ہوتا کہ) آپ روزے نہ رکھتے اور مسلسل بغیر روزے کے دن گزارتے یہاں تک کہ ہمیں خیال ہوتا کہ اب آپ بلا روزے کے ہی رہا کریں گے۔ ــــــ اور فرماتی ہیں حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کہ ــــــ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے علاوہ کسی پورے مہینے کے روزے رکھے ہوں، اور میں نے نہیں دیکھا کہ آپ کسی مہینے میں شعبان سے زیادہ نفلی روزے رکھتے ہوں۔ (اسی حدیث کی بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آپ شعبان کے (قریبًا) پورے مہینے ہی کے روزے رکھتے تھے)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کے پہلے جزء کا مطلب تو یہ ہے کہ نفلی روزوں کے بارے میں آپ کا کوئی لگا بندھا دستور و معمول نہیں تھا، بلکہ کبھی آپ مسلسل بلا ناغہ روزے رکھتے تھے اور کبھی مسلسل بغیر روزے کے رہتے تھے، مقصد یہ تھا کہ اُمت کے لیے آپ کی پیروی میں مشکل اور تنگی نہ ہو، بلکہ وسعت کا راستہ کھلا رہے۔ اور ہر شخص اپنے حالات اور اپنی ہمت کے مطابق آپ کے کسی رویہ کی پیروی کر سکے۔ دوسرے جزء کا مطلب یہ ہو کہ آپ پورے اہتمام سے پورے مہینے کے روزے صرف رمضان کے رکھتے تھے (جو اللہ نے فرض کیے ہیں)، ہاں شعبان میں دوسرے مہینوں کی بہ نسبت زیادہ روزے رکھتے تھے ـــــ بلکہ اسی حدیث کی ایک روایت میں ہے کہ قریب قریب پورے مہینے شعبان کے روزے رکھتے تھے اور بہت کم دن ناغہ فرماتے تھے۔

ماہ شعبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ نفلی روزے رکھنے کے کئی سبب اور کئی حکمتیں بیان کی گئی ہیں جن میں سے بعض وہ ہیں جن کی طرف بعض حدیثوں میں بھی اشارہ ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت اسامہ بن زید کی ایک حدیث میں ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارہ میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اسی مہینے میں بارگاہ الٰہی میں بندوں کے اعمال کی پیشی ہوتی ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ جب میرے اعمال کی پیشی ہو تو میں روزے سے ہوں۔

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث مروی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ شعبان میں بہت زیادہ روزے اس لیے رکھتے تھے کہ پورے سال میں مرنے والوں کی فہرست اسی مہینے میں ملک الموت کے حوالہ کی جاتی ہے۔

آپ چاہتے تھے کہ جب آپ کی وفات کے بارہ میں ملک الموت کو احکام دیئے جا رہے ہوں تو اس وقت آپ روزے سے ہوں۔

اس کے علاوہ رمضان کا قرب اور اس کے خاص انوار و برکات سے مزید مناسبت پیدا کرنے کا شوق اور داعیہ بھی غالباً اس کا سبب اور محرک ہوگا۔ اور شعبان کے ان روزوں کو رمضان کے روزوں سے وہی نسبت ہوگی جو فرض نمازوں سے پہلے پڑھے جانے والے نوافل کو فرضوں سے ہوتی ہے، اور اسی طرح رمضان کے بعد شوال میں چھ نفلی روزوں کی تعلیم و ترغیب جو آگے درج ہونے والی حدیث میں آرہی ہے۔ اس کو رمضان کے روزوں سے وہی نسبت ہوگی جو فرض نمازوں کے بعد والی سنتوں اور نفلوں کو فرضوں سے ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے:-

عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَہٗ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ کَانَ کَصِیَامِ الدَّھْرِ ——— رواہ مسلم

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ماہ رمضان کے روزے رکھے اس کے بعد ماہ شوال میں چھ نفلی روزے رکھے تو اس کا یہ عمل ہمیشہ روزہ رکھنے کے برابر ہوگا۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) رمضان کا مہینہ اگر ۲۹ ہی دن کا ہو تب بھی اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ۳۰ روزوں کا ثواب دیتے ہیں اور شوال کے ۶ نفلی روزے شامل کرنے کے بعد روزوں کی تعداد ۳۶ ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے کریمانہ قانون "الحسنۃ بعشر امثالھا" (ایک نیکی کا ثواب دس گنا) کے مطابق ۳۶ کا دس گنا ۳۶۰ ہو جاتا ہے اور پورے سال کے دن ۳۶۰ سے کم ہی ہوتے ہیں ——— بس جس نے پورے رمضان مبارک کے روزے

رکھنے کے بعد شوال میں ۶ نفلی روزے رکھے وہ اس حساب سے ۳۶۰ روزوں کے ثواب کا مستحق ہوگا یعنی اجر و ثواب کے لحاظ سے یہ ایسا ہی ہوا جیسے کوئی بندہ سال کے ۳۶۰ دن برابر روزے رکھے۔

ہر مہینے میں تین نفلی روزے کافی ہیں:-

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ لِي رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَبْدَ اللّٰهِ اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّكَ تَصُوْمُ النَّهَارَ وَتَقُوْمُ اللَّيْلَ فَقُلْتُ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ صُمْ وَاَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَّاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَّاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَّاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا لَا صَامَ مَنْ صَامَ الدَّهْرَ صَوْمُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ صَوْمُ الدَّهْرِ كُلِّهٖ صُمْ كُلَّ شَهْرٍ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ وَاقْرَءِ الْقُرْاٰنَ فِيْ كُلِّ شَهْرٍ قُلْتُ اِنِّيْ اُطِيْقُ اَكْثَرَ مِنْ ذَالِكَ قَالَ صُمْ اَفْضَلَ الصَّوْمِ صَوْمَ دَاوٗدَ صِيَامُ يَوْمٍ وَاِفْطَارُ يَوْمٍ وَاقْرَءْ فِيْ كُلِّ سَبْعِ لَيَالٍ مَرَّةً وَلَا تَزِدْ عَلٰى ذَالِكَ ـــــــــــ رواه البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے یہ معمول بنا رکھا ہے کہ تم ہمیشہ دن کو روزہ رکھتے ہو اور رات بھر نوافل پڑھتے ہو (کیا واقعہ ایسا ہی ہے؟) میں نے عرض کیا کہ ہاں حضرت! میں ایسا ہی کرتا ہوں، آپ نے فرمایا یہ طریقہ چھوڑ دو، روزے بھی رکھا کرو اور ناغہ بھی کیا کرو، اسی طرح رات کو نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو، کیونکہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے (تمہیں اسکی اجازت نہیں ہے کہ جسم پر حد سے زیادہ بوجھ ڈالو اور اس کے ضروری تقاضے بھی پورے نہ کرو) اسی طرح تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے (کہ تم اس کو سونے اور آرام لینے کا موقع دو) اسی طرح تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتیوں مہمانوں کا بھی تم پر

حق ہے، (تم کو جائز نہیں کہ ان کی حق تلفی کر کے اللہ کی عبادت کرو (سنو) جو ہمیشہ بلاناغہ
روزہ رکھے اس نے گویا روزہ رکھا ہی نہیں، ہر مہینے میں تین دن کے نفلی روزے
رکھ لینا ہمیشہ روزہ رکھنے کے حکم میں ہے اس لیے تم ہر مہینے بس تین روزے رکھ لیا کرو
اور مہینے میں ایک قرآن پاک (تہجد میں) ختم کر لیا کرو۔ (عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں) میں نے
عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں (اس لیے مجھے زیادہ کی اجازت
مرحمت فرمائیے۔) آپ نے فرمایا تو پھر تم داؤد علیہ السلام کے روزوں کا طریقہ اختیار کر لو اور
وہ یہ کہ ایک دن روزہ اور ایک دن افطار یعنی روزہ کا ناغہ، اور تہجد میں سات راتوں
میں ایک قرآن ختم کر لیا کرو اور اس سے زیادہ نہ کرو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(**تشریح**) عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا ذوق عبادت بہت بڑھا ہوا تھا، وہ ہمیشہ دن کو روزہ رکھتے اور رات بھر نوافل پڑھتے اور اس میں روزانہ پورا قرآن مجید ختم کر لیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ان کو وہ ہدایت فرمائی جو حدیث میں مذکور ہوئی اور ان کو عبادت میں اعتدال اور میانہ روی کا حکم دیا اور فرمایا کہ تم پر اپنے جسم و جان اور اپنے اہل تعلق کی بھی ذمہ داریاں ہیں اور ان کی بھی رعایت اور ادائیگی ضروری ہے ــــ آپ نے پہلے انھیں مہینے میں تین نفلی روزے رکھنے اور تہجد میں پورے مہینہ میں ایک قرآن پڑھنے کے لیے فرمایا، اور جب انھوں نے عرض کیا کہ میں بآسانی اس سے زیادہ کر سکتا ہوں لہٰذا کچھ زیادہ کی مجھے اجازت دیدی جائے تو آپ نے انکو صوم داؤدی (یعنی ہمیشہ ایک دن روزہ اور ایک دن افطار کی) اور ہفتہ میں ایک قرآن مجید رات کے نوافل میں پورا کر لینے کی اجازت مرحمت فرمادی اور اس سے زیادہ کے لیے منع فرمادیا ــ لیکن اس حدیث ہی سے یہ بات ظاہر ہے کہ آپ کی ممانعت کا منشا یہ نہیں تھا کہ زیادہ عبادت کرنا کوئی بُری بات ہے، بلکہ یہ ممانعت بربنائے شفقت تھی (جس طرح چھوٹے بچوں کو زیادہ بوجھ اٹھانے سے منع کیا جاتا ہے) یہی وجہ ہے کہ ان کے یہ عرض کرنے پر کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں آپ نے ان کو مہینہ میں صرف تین روزوں کے بجائے صوم داؤدی یعنی ۱۵ دن روزہ اور ۱۵ دن افطار کی اور مہینہ میں قرآن ختم کرنے کے بجائے ہفتہ میں قرآن ختم کرنے کی اجازت دیدی، بلکہ ترمذی کی روایت کے مطابق بعد میں صرف پانچ دن میں قرآن پاک ختم کرنے کی بھی اجازت دے دی تھی۔ اور بعض صحابہ کو حضور نے

تین دن میں قرآن ختم کرنے کی بھی اجازت دی ہے۔[۱]

عَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ اَنَّ رَجُلاً اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ کَیْفَ تَصُوْمُ؟ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِہٖ فَلَمَّا رَاٰی عُمَرُ غَضَبَہٗ قَالَ رَضِیْنَا بِاللّٰہِ رَبًّا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَّبِیًّا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ غَضَبِ اللّٰہِ وَغَضَبِ رَسُوْلِہٖ فَجَعَلَ عُمَرُ یُرَدِّدُ ھٰذَا الْکَلَامَ حَتّٰی سَکَنَ غَضَبُہٗ فَقَالَ عُمَرُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ مَنْ یَّصُوْمُ الدَّھْرَ کُلَّہٗ قَالَ لَا صَامَ وَلَا اَفْطَرَ اَوْ قَالَ لَمْ یَصُمْ وَلَمْ یُفْطِرْ قَالَ کَیْفَ مَنْ یَّصُوْمُ یَوْمَیْنِ وَیُفْطِرُ یَوْمًا قَالَ وَیُطِیْقُ ذَالِکَ اَحَدٌ قَالَ کَیْفَ مَنْ یَّصُوْمُ یَوْمًا وَّیُفْطِرُ یَوْمًا قَالَ ذَالِکَ صَوْمُ دَاؤُدَ قَالَ کَیْفَ مَنْ یَّصُوْمُ یَوْمًا وَّیُفْطِرُ یَوْمَیْنِ قَالَ وَدِدْتُّ اَنِّیْ طُوِّقْتُ ذَالِکَ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلٰثٌ مِّنْ کُلِّ شَھْرٍ وَّرَمَضَانُ اِلٰی رَمَضَانَ فَھٰذَا صِیَامُ الدَّھْرِ کُلِّہٖ وَصِیَامُ یَوْمِ عَرَفَۃَ اَحْتَسِبُ عَلَی اللّٰہِ اَنْ یُّکَفِّرَ السَّنَۃَ الَّتِیْ قَبْلَہٗ وَالسَّنَۃَ الَّتِیْ بَعْدَہٗ وَصِیَامُ یَوْمِ عَاشُوْرَاءَ اَحْتَسِبُ عَلَی اللّٰہِ اَنْ یُّکَفِّرَ السَّنَۃَ الَّتِیْ قَبْلَہٗ ـــــــ رواہ مسلم

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور اُس نے حضورؐ سے پوچھا کہ آپ روزے کس طرح رکھتے ہیں؟ (یعنی نفلی روزے رکھنے کے بارے میں آپ کا کیا معمول و دستور ہے؟) اسکے اس سوال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگواری ہوئی (یعنی چہرۂ مبارک پر تکدر اور برہمی کے آثار ظاہر ہوئے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (جو حاضر تھے) جب آپ کی ناگواری کی کیفیت کو محسوس کیا تو کہا۔

رضینا باللّٰہ ربًّا و بالاسلام دینا و بمحمد نبیًّا نعوذ باللّٰہ من غضب اللّٰہ و غضب رسولہ۔

ہم راضی ہیں اللہ کو اپنا رب مان کر اور اسلام کو اپنا دین بنا کر اور محمد علیہ السلام کو نبی مان کر، اللہ کی پناہ اسکی ناراضی سے اور اسکے رسول کی ناراضی سے۔

حضرت عمر بار بار اپنی یہی بات دُہراتے رہے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[۱] مجمع الزوائد میں مسند احمد اور کبیر طبرانی کے حوالے سے سعید بن منذر انصاریؓ کو اس کی اجازت مروی ہے۔
[illegible]

مزاج مبارک میں جو ناگواری پیدا ہو گئی تھی اس کا اثر زائل ہو گیا، تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ شخص کیسا ہے جو ہمیشہ بلا ناغہ روزہ رکھے اور اسکے بارہ میں کیا ارشاد ہے؟ آپؐ نے فرمایا نہ اُسنے روزہ رکھا نہ افطار کیا، پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا اور اس آدمی کے بارہ میں کیا ارشاد ہے جو دو دن روزے رکھے اور ایک دن ناغہ کرے یعنی بغیر روزہ کے رہے؟ آپؐ نے فرمایا کیا کسی میں اسکی طاقت ہے؟ (یعنی یہ بہت مشکل ہے ہمیشہ روزہ رکھنے سے بھی زیادہ مشکل ہے اسلئے اس کا ارادہ نہ کرنا چاہئے) حضرت عمرؓ نے عرض کیا اور اسکے بارہ میں کیا ارشاد ہے جو ہمیشہ ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن ناغہ کرے؟ آپؐ نے فرمایا یہ صوم داؤد ہے یعنی حضرت داؤد علیہ السلام جن کو اللہ نے غیر معمولی جسمانی قوت بخشی تھی اُن کا معمول یہی تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن ناغہ کرتے تھے) حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ اس آدمی کے بارہ میں کیا ارشاد ہے جو ایک دن روزہ رکھے اور دو دن ناغہ کرے؟ (اور اس طرح اوسطاً ہر مہینہ میں دس دن روزہ رکھے) آپؐ نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ مجھے اسکی طاقت عطا فرمائی جائے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر مہینے کے تین نفلی روزے اور رمضان تا رمضان یہ (اجر و ثواب کے لحاظ سے) ہمیشہ روزہ رکھنے کے برابر ہے (لہٰذا جو صوم دہر کا ثواب حاصل کرنا چاہے وہ اس کو اپنا معمول بنا لے) اور یوم عرفہ (۹ ذی الحجہ) کے روزہ کے بارہ میں میں امید کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے کرم سے کہ وہ صفائی کر دے گا اس سے پہلے سال کی اور بعد کے سال کی (یعنی اسکی برکت سے ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہوں کی گندگیاں دھل جائیں گی) اور یوم عاشورا (۱۰ محرم) کے روزے کے بارہ میں میں امید کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے کہ وہ صفائی کر دے گا اس سے پہلے سال کی۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کا اصل مفہوم و مقصد تو ظاہر ہے لیکن چند ضمنی باتیں وضاحت طلب ہیں انہی کے بارہ میں کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

حدیث کے بالکل شروع میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ کس طرح روزے رکھتے ہیں، یعنی نفلی روزوں کے بارہ میں خود آپ کا معمول اور طریقہ کیا ہے؟ آپ کو اس سوال پر ناراضی اور ناگواری ہوئی ـــــ یہ ناراضی اور ناگواری ایسی ہی تھی جیسی شفیق استاذ اور

مربی کو کسی شاگرد اور زیرِ تربیت طالب و مرید کے غلط اور نامناسب سوال سے ہوتی ہے۔ سوال کرنے والے کو اصل بات دریافت کرنی چاہیے تھی یا یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ میرے لیے نفلی روزوں کے بارے میں کیا طرزِ عمل مناسب ہے؟ اُس نے بجائے اس کے حضورؐ کا معمول دریافت کیا تھا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کے بہت سے شعبوں میں اُن بہت سے اسباب کی بنا پر جو آپ کے منصبِ نبوت اور مصالحِ امت سے تعلق رکھتے تھے ایسا طرزِ عمل بھی اختیار فرماتے تھے جس کی تقلید ہر ایک کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اس لیے سائل کو آپ کا معمول دریافت کرنے کے بجائے اصل مسئلہ دریافت کرنا چاہیے تھا، ـــــ استاذ اور مربی کی اس طرح کی ناگواری بھی دراصل تربیت ہی کا ایک جزء ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سوال سے حضورؐ کی ناگواری کو محسوس کر کے کل مسلمانوں کی طرف سے عرض کیا "رَضِينَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَغَضَبِ رَسُوْلِهٖ" ـــــ اس کے بعد آپ سے نفلی روزوں ہی کے بارہ میں صحیح طریقہ پر سوالات کیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جوابات مرحمت فرمائے۔

[illegible] روزہ رکھنے والے کے بارے میں آپ نے جو یہ فرمایا کہ "لَا صَامَ وَلَا أَفْطَرَ" (نہ اس نے روزہ رکھا نہ افطار کیا) اس سے آپ کا مقصد ناپسندیدگی کا اظہار ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ غلط ہے، یہ صوم دہر منع ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوالات کے جوابات کے بعد آپ نے اپنی طرف سے جو فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ کے باب میں عام مسلمانوں کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ وہ رمضان کے فرض روزے رکھا کریں اور اس کے علاوہ ہر مہینے میں تین نفلی روزے رکھ لیا کریں جو "الحسنۃ بعشر امثالہا" کے حساب سے [illegible] تیس روزوں کے برابر ہوں گے اور اس طرح ان کو صوم دہر کا ثواب مل جائے گا۔ [illegible] نفس [illegible] یوم عرفہ اور یوم عاشوراء کے روزے بھی رکھ لیا کریں۔ حضورؐ نے امید ظاہر فرمائی کہ رب کریم کے کرم سے مجھے امید ہے کہ یوم عرفہ کا روزہ ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کی خطا کاریوں کا اور یوم عاشوراء کا روزہ پہلے سال کی غلط کاریوں کا کفارہ بن جائے گا۔

واضح [illegible] کے دن جو در اصل حج کا دن ہے روزہ کی یہ فضیلت اور ترغیب غیر حاجیوں کے لیے ہے، حاجیوں کی اس دن کی خاص الخاص اور مقبول ترین عبادت میدانِ عرفات کا وقوف ہے جس کے لیے ظہر و عصر کی نماز مختصر اور ایک ساتھ پڑھ لینے کا حکم ہے اور ظہر کی سنتیں بھی اس دن چھوڑ دینے کا حکم ہے اگر حاجی لوگ اس دن روزہ رکھیں گے تو اُن کے لیے عرفات میں وقوف اور آفتاب غروب ہوتے ہی مزدلفہ

کو جھیلنا مشکل ہوگا اس لئے حاجیوں کے لئے عرفہ کے دن روزہ رکھنا پسندیدہ نہیں ہے (بلکہ ایک حدیث میں ممانعت بھی وارد ہوئی ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اپنے عمل سے بھی اسی کی تعلیم امت کو دی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے عرفہ کے دن ٹھیک اس وقت جب کہ آپ میدان عرفات میں اپنے اونٹ پر تھے اور وقوف فرما رہے تھے سب کے سامنے دودھ نوش فرمایا تاکہ سب دیکھ لیں کہ آج آپ روزہ سے نہیں ہیں۔

غیر حاجیوں کے لئے یوم عرفہ کا روزہ دراصل اس دن کی ان رحمتوں اور برکتوں میں شریک اور حصہ دار ہونے ہی کے لئے ہے جو عرفات میں حجاج پر نازل ہوتی ہیں اور اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اللہ کے جو صاحب ایمان بندے حج میں شریک نہیں ہیں وہ اس پورے دن روزہ رکھ کر اس دن کی خاص خاص رحمتوں اور برکتوں میں کسی درجہ کا حصہ لے لیں، اسی طرح یوم النحر یعنی بقرعید کے دن غیر حاجیوں کو قربانی کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا راز بھی یہی ہے، واللہ اعلم۔

یوم عاشوراء کا روزہ نفلی روزوں میں اس لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہے کہ رمضان مبارک کے روزوں کی فرضیت سے پہلے وہی فرض تھا، جب رمضان کے روزے فرض کیے گئے تو اس کی فرضیت منسوخ ہوگئی اور صرف نفلی درجہ رہ گیا۔ اس کے بارہ میں احادیث آگے مستقل عنوان کے تحت انشاء اللہ درج ہوں گی۔

مؤتمر اسلامی

مقالہ سوم

اسلام اور اجتماعی انصاف

جناب احمد زکی یمانی
(وزیر پٹرول و معدنیات مملکت سعودی عرب)

آج سے چودہ سو سال پہلے عالم بشریت پر خوفناک اندھیرا چھایا ہوا تھا، جس میں انسان کا نہ کوئی احترام تھا اور نہ اسے آزادی کی نعمت میسر تھی۔ جنگل کے قانون کا دور دورہ تھا اور نفسانی خواہشات اور استبداد کا سکہ چلتا تھا۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی بہتری منظور ہوئی اور اس نے اس خطۂ ارض کو جو سب سے زیادہ تاریک تھا، اس غرض کے لیے منتخب فرمایا کہ وہاں ایک ایسی شمع ہدایت روشن کرے، جس سے ساری دنیا نور حاصل کرے اور اس طرح وہ انسان کو اس کی عزت و آزادی واپس لوٹائے اور عدل و انصاف اور مساوات کی بنیادوں پر ایک اچھا معاشرہ وجود میں لائے۔

غرض ایک معجزہ بروئے کار آیا۔ سرزمین مکہ اور اس کے گرد و پیش کے معاشرہ نے، جہاں نسب پر عزت و شرافت کا مدار تھا اور عیش و عشرت میں غرق آقاؤں کی خدمت میں غلام مشقتیں اٹھاتے تھے، ایک نئے معاشرہ کی شکل اختیار کرلی جس میں انسان کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر تھے۔ اور وہ سب مل کر اس طرح ایک جسم بن گئے کہ اگر اس کے ایک حصے کو کوئی شکایت ہوتی تو سارا جسم تکلیف محسوس کرتا۔

ہماری آج کی دنیا ایک مہلک حیرت و اضطراب اور گھپ اندھیرے میں زندگی گزار رہی ہے، صنعت و حرفت کی تمام روشنیاں ان اندھیروں کو دور کرنے سے عاجز اور اہل دنیا کو اطمینان قلب اور حقیقی آزادی واپس دلانے سے قاصر ہیں۔ کینہ ور شیوعیت (کمیونزم) کی افراط اور

مستبد سرمایہ داری کی تعزیرات کے درمیان انسان اپنا احترام کھو چکا ہے۔ اور اقوام عالم اصلاح احوال کے لیے جو بھی تجربے کرتی ہیں، ان سے حالات اور بھی خراب اور بدتر ہو جاتے ہیں، آج عقلا اور دانش مند اسی نازک صورت حال پر غور کرنے میں مصروف ہیں۔ اور ان کے سامنے معاشرے کے ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے اور متضاد گروہوں کی باہمی طبقاتی کشمکش کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

اجتماعی ظلم کا ہمہ گیر مسئلہ

حج ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے فرض کیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اس ضمن میں لوگ اپنے منافع دیکھیں اور باہم مل کر اپنے مشکلات کے بارے میں صلاح و مشورہ کریں۔ ہم سب اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں کہ اس اجتماعی ظلم کے مسئلے پر غور کریں جس کی جڑوں نے ہر جگہ پھیل کر سرطان کی شکل اختیار کر لی ہے، اور اس کی جو بھی دوا کی جاتی ہے اس سے مرض اور بڑھتا ہے۔

ہم یہاں مکہ میں ہیں جو منبع ہدایت اور مصدر نور ہے۔ اس لیے یہاں ہم سے یہ توقع نہیں ہونی چاہیے کہ ہم دوسروں کی طرح ان تجربوں کی طرف رجوع کریں جو ناکام ہو چکے ہیں۔ یا کم از کم ان کی کامیابی پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچی۔ ہمیں یہ نہیں کرنا چاہیے کہ انہی چیزوں کو باہر سے درآمد کریں اور ان کے اجنبی ہونے اور ان کے نقصانات کے باوجود یہاں انھیں نافذ کرنے لگ جائیں۔ دراں حالیکہ ہمارے پاس ایک کامیاب تجربہ موجود ہے جس کا ہم سے قریب ترین تعلق ہے یعنی ہم اس کے ہیں اور وہ ہمارا ہے "كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ مِنْ لَدُنْ عَزِيزٍ حَكِيمٍ (یہ کتاب ہے جس کی محکم آیات ہیں اور زبردست اور حکمت والے کی طرف سے نازل ہوئی ہے) اور وہ شریعت ہے جس نے ایسا نظام عدل و انصاف قائم کیا جو فرد کے احترام و آزادی کا محافظ ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اسے جماعت کا سرگرم خادم بناتا ہے۔ اس نظام میں نہ فرد جماعت پر مسلط ہوتا ہے اور نہ جماعت میں اس کی ذات فنا ہوتی ہے۔ البتہ جب جماعت کی مصلحتوں سے اس کی ٹکر ہو تو اس وقت بے شک فرد کے حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔

میرے نزدیک آج ہمارے لئے اس مسئلہ سے بڑھ کر جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے کوئی اور مسئلہ نہیں اور کسی دوسرے مسئلے کا حل تلاش کرنا اس سے زیادہ ضروری نہیں۔ لیکن یہ حل ہمارے دین اور ہماری تاریخ سے اخذ ہونا چاہیے۔ ہم نے اگر یہ نہ کیا تو جو امانت ہمیں دی گئی ہے وہ گویا ہم نے ضائع کر دی اور مسلمان اقوام کو طوفان کے حوالے کر دیا کہ وہ انھیں بہا کر لے جائے اور مچھلیاں ان کو نگل جائیں۔

مگر اس سلسلے میں صرف اتنا کافی نہیں کہ ہم لوگوں سے یہ کہہ کر کہ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ اسلام کو عملی جامہ پہنایا جائے اور اس کے اوامر و احکام کی پیروی کی جائے، اپنے ملکوں کو لوٹ جائیں۔ جہاں پریشاں حال انسانوں کی چیخیں اور بھوکوں کی آہیں ہمارے کانوں سے آ آ کر ٹکرائیں اور ہمارے پاس کوئی سوچا سمجھا نقشہ نہ ہو جسے ہم اپنی قوموں کی مشکلات کے حل کے طور پر پیش کر سکیں۔ ان حالات میں ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اسلام سے ایسے احکام کا استنباط کریں جن سے موجودہ مشکلات کا علاج ہو سکے۔ اس کے بعد احکام کی تطبیق کے لئے عملی نقطۂ نظر سے غور و فکر کیا جائے پھر ہم خود کو ان احکام الٰہی پر عملدرآمد کے لئے کمر بستہ کریں۔ اور اس راہ میں نہ ہمیں جانوں کی پروا ہو اور نہ مال کی۔

مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ اسلام نے اجتماعی ظلم دفع کرنے اور عدل کو وجود میں لانے کے لئے، جو وسائل تجویز کئے ہیں میں ان پر اس قدر سیر حاصل بحث کر سکتا ہوں کہ جس سے آپ کے سامنے ان مشکلات کا پورا حل اپنی عملی شکل میں سامنے آسکے۔ یہ چیز میری وسعت سے باہر ہے اور میری حقیر معلومات اس سطح تک پہونچنے سے قاصر ہیں۔ لیکن مجھے جب اس اہم موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی تو یہ بھی پسند نہ ہوا کہ اسے قبول نہ کروں۔ میں شاید اس میں حصہ لے کر اتنا تو کر ہی سکتا ہوں کہ جن حضرات کو مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم اور لوگوں کی مشکلات کا تجربہ ہے ان کے سامنے غور و فکر کا ایک دروازہ کھول دوں۔ تاکہ ان امور پر زیادہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ گفتگو ہو سکے۔ پس میں مسئلہ کو اور صرف اس کے بنیادی پہلوؤں کو پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں اور اس کے بعد حل کی طویل گفتگو آپ کے لئے چھوڑتا ہوں

زیر بحث موضوع اجتماعی ظلم کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک ظلم تو وہ ہے جس کا نشانہ فرد بنتا ہے یہ ظلم فرد کی شخصیت کو ختم اور اس کی آزادی و احترام کی نفی کر دیتا ہے۔ اور یہ سب جماعت کے نام اور مصلحت عامہ کے عنوان سے ہوتا ہے۔ اس ظلم کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فرد کی طاقت

شل ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی صلاحیتیں مردہ اور اس کا جوش پژمردہ ہو جاتا ہے اور وہ جماعت کے لئے کسی کام کا نہیں رہتا۔ اور یہ وہ چیز ہے جو آج انتہا پسند اشتراکی نظاموں کے زیر سایہ پائی جاتی ہے اسی طرح غیر اشتراکی نظاموں میں بھی فرد کو رنگ، مذہب اور قومیت کی بنیاد پر عزت و آزادی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اور جماعت اپنے ایک جزء کو کاٹ کر پھینک دیتی ہے، اس کی صلاحیتوں اور قوتوں سے محروم ہو جاتی ہے اور فرد اس امتیازی سلوک اور محرومی کے مصائب اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے اس کے برعکس یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ جب فرد کی ہوسناکیاں جماعتی مصالح سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہیں تو خود جماعت ہی ظلم کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس نظام میں اجارہ داری کا دور دورہ ہوتا ہے مزدوروں کا خون چوسا جاتا ہے۔ لوگوں سے ان کی روزی چھین لی جاتی۔ اور یوں دولت چند افراد کے ہاتھ میں جمع ہو جاتی ہے۔ غالب اکثریت مصیبتیں اٹھاتی اور اقلیت عیش کرتی ہے۔ معاشرے کا توازن بگڑ جاتا ہے اور آئے دن کی شورشوں اور انقلابوں کے لئے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ یہ وہ نتائج ہیں جو استحصال پسند اور غیر متوازن سرمایہ دارانہ نظاموں میں سامنے آتے ہیں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فرد اور جماعت دونوں ہی بیک وقت اجتماعی ظلم کا نشانہ بن جاتے ہیں جبکہ جماعت پر کوئی ایسا فرد مسلط ہو جاتا ہے جو اپنی ہوا و ہوس پر جماعتی مصلحتوں کو قربان کرے اور اس کی خاطر لوگوں کی عزت و آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اجتماعی ظلم کا مبدا و مصدر مال ہے۔ اور یہ کیفیت اس وقت رونما ہوتی ہے جب فرد اور جماعت حریف ہو کر ترازو کے دو پلڑوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور پلڑا کسی ایک طرف جھک جاتا ہے۔ اس مفروضہ پر جو علاج بھی اس سلسلے میں تجویز کئے جاتے ہیں وہ نہایت تنگ اور خالص مادی نقطۂ نظر پر مبنی ہوتے ہیں۔ اکثر علاج نہیں بلکہ اندھا ردعمل کہنا چاہیے کہ ظلم کا توڑ جوابی ظلم سے اور حرص و طمع کا علاج کینہ پروری سے کیا جاتا ہے۔

اس بارے میں جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس نے بھی بے شک مال و دولت کو خاص اہمیت دی ہے۔ اور اس پہلو سے اپنی خصوصی توجہ اس پر مبذول کی ہے کہ اجتماعی ظلم کا ایک بڑا سبب مال بھی ہے لیکن اسلام نے اس مسئلہ سے مختلف طریقوں سے نمٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے پیش نظر سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ فرد اور جماعت کے یہ جو دو پلڑے ہوتے ہیں، ان کو برابر رکھا جائے۔ اور اگر دونوں میں

کسی ایک کا جھکنا ناگزیر ہو، تو وہ پلڑا جماعت کا ہو۔ اسلام کے نزدیک اجتماعی عدل و انصاف کے معنی صرف یہ نہیں کہ لوگوں کو مساوی اجرتیں ملیں اور اس طرح اقتصادی ناہمواری نہ پیدا ہو سکے، جیسا کہ کمیونزم کا تصور ہے، اور جو اس تصور کی تطبیق میں ناکام ہو چکا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام ایک ایسی انسانی مساوات چاہتا ہے، جو بہت سی قدروں کی جامع ہو۔ اور ظاہر ہے ان قدروں میں سے یقیناً ایک قدر خالص اقتصادی بھی ہوگی جس کے مطابق سب کو ایک سے مواقع حاصل ہوں اور سب افراد اپنی عملی صلاحیتوں کے اظہار میں آزاد ہوں۔

اسلامی عدلِ اجتماعی کے اسی وسیع نقطۂ نظر کی بنا پر صرف جماعت اور افراد کے حقوق کی حفاظت کرنے والے قوانین کا نافذ کر دینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے پہلے اور پھر اس کے ساتھ اس پرجوش اسلامی دعوت کی ضرورت ہے، جس سے معاشرہ کا انداز فکر عادلانہ بنے اور محبت و اخوت کی گرمی جاری و ساری ہو جائے۔ کیوں کہ ہمہ جہت عدل و انصاف صرف اسی طاقت سے وجود میں آسکتا ہے۔

بہرحال میں اس مقالے میں اولاً "حق ملکیت" سے بحث کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ عدل اجتماعی کی بحث میں یہ سب سے پہلا اہم مسئلہ ہے۔ پھر "مساوات" کے بارے میں اسلام کا موقف پیش کروں گا۔ اس کے بعد تیسری بحث "اجتماعی کفالت" کی ہوگی اور پھر "خاتمہ" میں اس بحث کے نتائج آپ کے غور و فکر کے لئے پیش کرنا چاہوں گا۔

۱۔ مال

حق ملکیت اور افراد کے حقوق

دولت کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر بڑا عادلانہ اور دانش مندانہ ہے۔ سب سے پہلے تو وہ انفرادی ملکیت کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اس ملکیت کو اتنا ہی قابل احترام سمجھتا ہے، جتنا انسانی جان کو، اور وہ صاحب مال کو مال کی حفاظت کا ہر طریقہ سے حق دیتا ہے جس میں قتال بھی شامل ہے۔ اگر مال کا مالک اس کی حفاظت کرتا ہوا جان دے دے، تو شہید ہوگا (۱)، اگر اس کے مال پر چور دست درازی کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا (۲)، یا اگر کوئی شخص اس کے مال کو غصب کرے تو وہ

اللہ کے غضب کا مستحق ہو گا (۴)۔

ایک فرد اگر شرعاً جائز طریقوں سے مال حاصل کرتا ہے۔ تو وہ اسے بلا کسی روک ٹوک کے استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے (۵) تاکہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کے آثار ظاہر ہوں (۶) بلکہ اس بارے میں کنجوسی ممنوع ہے اسی قدر جس قدر فضول خرچی (۷)، وہ اس مال کو شرعاً جائز طریقوں سے افزائش مال کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس سے جماعت کے مفادات و مصالح پر زد نہ پڑے جب صاحب مال کا انتقال ہو جائے تو اس کی متروکہ ثروت اس کے عزیزوں اور وارثوں پر تقسیم ہو گی۔ اور دولت کو ایک جگہ جمع نہیں ہونے دیا جائے گا۔ (۸)

اسلام میں ملکیت کا تصور

اسلام کی نگاہ میں "ملکیت" ایک نیابت اور اجتماعی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ اسلام نے انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا اور اسے ہر طرح کی ضمانت دی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس نے مال [illegible] کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اس دینی اساس کو اچھی طرح سے سمجھ لے جس پر کہ اس کی ملکیت قائم ہے اور اس اہم مقصد کو جانے جس کی بنا پر اسے ملکیت میں تصرف کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ صاحب مال کے اندر ایسی نفسیاتی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ طمع و حرص سے بچ کر اس اجتماعی فریضہ کو ادا کر سکے، جو بحیثیت مال کے مالک کے اس پر عائد ہوتا ہے۔

قرآن مجید نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ مال کا اصلاً مالک اس کا دنیاوی مالک نہیں ہے، بلکہ [illegible] تو محض [illegible] اور وکیل کی ہے اصل مالک تو اللہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے لله ما في السماوات وما في الأرض [illegible] (جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے، وہ سب اللہ کا ہے) اللہ نے اپنے بندوں کو اس ملکیت کے استعمال کے لئے مقرر کیا ہے۔ "آمنوا بالله ورسوله وانفقوا مما جعلكم مستخلفين فيه" (۹) (ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جس مال پر اس [illegible]) قرآن مجید میں جہاں غلاموں کی مکاتبت کا ذکر [illegible] آتاكم" (۱۱) (اللہ کے مال میں سے جو اس نے [illegible] دیا ہے [illegible] کہ ان کے پاس مال ہے ....

وہ محض واسطہ ہیں۔ مال تو اللہ کا ہے، اور انھیں اللہ نے اس مال پر اپنا نائب و وکیل بنایا ہے

یہ ہے اسلام کے نزدیک ملکیت کی دینی اساس۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ چیز مالک کے حق تصرف میں عملاً کوئی رکاوٹ بنتی۔ ہاں اس حالت میں یہ چیز ضرور رکاوٹ ہے جبکہ فرد شرائط وکالت کی خلاف ورزی کرنا چاہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ ملکیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ملکیت شئے اور ایک ملکیت منفعت۔ اب مذکورہ بالا اصول پر شئے کا مالک تو حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ ہوگا۔ اور منفعت کی ملکیت مالک کو حاصل ہوگی۔ یعنی وہ مال و دولت میں آزادی کے ساتھ تصرف کرے جیسے کہ وقف کے متولی کو اختیار ہوتا ہے الا یہ کہ وہ واقف کے شرائط کی خلاف ورزی کرنے لگے۔

حق ملکیت کے استعمال پر پابندیاں شریعت اسلامی پہلا قانون ہے جس نے انفرادی حقوق کے استعمال پر ایسی پابندیاں عائد کی ہیں کہ اس سے دوسروں کو نقصان نہ پہونچے اور اس طرح صاحب مال کے اختیار کو محدود کر دیا ہے۔ قرآن مجید نے بہت سے مقامات میں اس سلسلے میں اور دیگر حقوق کے معاملات میں زیادتیوں کے ارتکاب سے روکا ہے۔ خاص طور سے وصیت، طلاق اور دوسروں سے اپنا حق طلب کرنے جیسے معاملات میں زیادتی کرنے کی سخت ممانعت آئی ہے (۱۲)

حنفی اور مالکی مذہب اس سلسلے میں فقہ اسلامی کے دو مذہبوں (حنفی اور مالکی) نے جو احکام و قواعد بیان کئے ہیں ان سے ظلم و زیادتی اور عدل و انصاف کے درمیان ایسی واضح حد بندی ہو جاتی ہے جو دوسرے قانونی نظام میں نہیں پائی جاتی اور نہ ہی دور حاضر کی قانونی فکر کو اس کی باریکی تک رسائی ہوئی ہے۔ ان دونوں مذہبوں میں حسب ذیل تین اصولوں کو بنیاد ٹھہرایا گیا ہے۔

۱۔ نہ خود نقصان اٹھایا جائے نہ دوسرے کو پہونچایا جائے۔
۲۔ دو برائیوں میں ایک برائی اختیار کرنا ناگزیر ہو تو کمتر برائی کو اختیار کیا جائے۔
۳۔ جماعتی مصلحت کو انفرادی مصلحت پر مقدم رکھا جائے۔

ہم دونوں مذہبوں کے احکام کی روشنی میں انفرادی حقوق پر تین پابندیاں ضروری قرار دے سکتے ہیں
۱۔ کسی حق کو صرف اسی غرض کے لئے استعمال کرنے کی اجازت ہے، جس غرض کے لئے وہ حق ملا ہے۔ امام مالک نے اسی اصول کو احوال شخصی کے مسائل پر منطبق کیا ہے۔ خاص کر نابالغ اولاد

کے مال پر باپ کی تولیت کے مسئلے میں (۱۴) اور باپ کے اس حق میں کہ وہ نابالغ لڑکی کا نکاح اسکی اجازت کے بغیر کرسکتا ہے (۱۵) نیز اس حق میں کہ وہ بالغ لڑکی کے نکاح پر معترض ہوسکتا ہے (۱۶) امام مالک کا نظریہ یہ ہے کہ ولی کے ان حقوق سے زیر ولایت افراد کی مصالح کا تحفظ مقصود ہے پس اگر ولی ان کی مصلحت کے خلاف کام کرتا ہے تو وہ قابل رد ہوگا۔

امام ابوحنیفہ اور صاحبین (امام ابویوسف اور امام محمد) نے اسی بنیادی اصول کو نابالغ پر حق ولایت اور نکاح کے لئے کسی وکیل کی ولایت عامہ کو محدود کرنے میں بھی استعمال کیا ہے۔ اگرچہ اس ذیل میں نکاح کے لئے وکالت عامہ کی بعض شکلوں میں امام صاحب اور صاحبین کے درمیان اس اصول کے انطباق میں اختلاف بھی واقع ہوا ہے۔ جیسے امیر کسی شخص کو حکم دے کہ کسی غیر متعین عورت سے اس کا (امیر کا) نکاح کردیا جائے اور وہ شخص اس حکم سے فائدہ اٹھاکر کسی کی باندی کو امیر کے عقد میں دیدے تو امام صاحب کے نزدیک یہ جائز ہوگا لیکن صاحبین کے نزدیک عورت کا کفو ہونا ضروری ہے (۱۷)

۲۔ کسی حق کا استعمال اگر عام عادت کے خلاف دوسروں کے لئے باعث ضرر ثابت ہو تو اُسے غیر قانونی قرار دیا جائے گا۔

امام مالک نے اس اصول کو عمومی حیثیت سے پڑوس کے تعلقات کی تنظیم (۱۸) مکانوں کی کھڑکیاں کھولنے سے پیدا ہونے والے مخصوص تنازعات کی بندش (۱۹) مشترک اموال کی تقسیم (۲۰) اور غیر آباد زمینوں پر قبضہ گیری (۲۱) کے مسائل میں استعمال کرتے ہوئے فیصلہ دیا ہے کہ ان معاملات میں جائز حقوق کے استعمال سے اگر عام عادت کے خلاف کسی کو ضرر پہونچے تو صاحب حق کو اپنے حق کے استعمال سے روکنا واجب ہوگا۔

اسی طرح امام ابوحنیفہ اور ان کے صاحبین نے اسی اصول سے کئی منزلہ مکانات کے مالکوں کے حقوق و فرائض کی تعیین، موکل کی غیر موجودگی میں وکیل کو اس کی وکالت سے دست بردار ہوجانے کی ممانعت اور کسی آجر کے اس حق کو مشروط کردینے میں کام لیا ہے کہ وہ اجیر سے کیا ہوا معاملہ فسخ کرسکتا ہے (۲۲) ان کے نزدیک یہ حق کسی عذر ہی پر مبنی ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی معقول عذر نہیں ہے تو اس حق کا استعمال ظلم قرار دیا جائے گا۔

۴۔ کسی ایسے حق کے استعمال کی اجازت نہیں دی جا سکتی جس کا مقصد خود کوئی فائدہ اٹھانا نہ ہو بلکہ دوسرے کو نقصان پہونچانا ہو۔

امام مالک نے اس اصول کو خاص طور پر پڑوسیوں کو اپنی ملکیت کے کسی ایسے استعمال سے باز رکھنے میں استعمال کیا ہے جس سے محض دوسرے پڑوسی کو ضرر ہو خود کو کوئی نفع نہ ہو (۲۳)، امام ابو حنیفہ نے بھی اس سے ایسے ہی مسائل میں کام لیا ہے۔ امام ابو یوسف کی کتاب الخراج، اس اصول کی تطبیقات و مثالوں سے بھری ہوئی ہے جن میں سب سے اہم چیز یہ ملتی ہے کہ امام ابو یوسف نے غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے کے معاملے میں عام افراد کے علاوہ حکومت کو بھی اس شرط کا پابند کر دیا ہے کہ اس حق کے استعمال سے کسی دوسرے کا نقصان نہ ہو۔ (۲۴)

اوپر جو کچھ مذکور ہوا، اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حقوق اور ان کے استعمال کے متعلق حنفیہ اور مالکیہ کا نقطۂ نظر آپس میں ملتا ہے۔ ان کے نزدیک ہر حق سے ایک غرض اور مقصد وابستہ ہوتا ہے جسے پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر صاحب حق اس مقصد کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اور وہ اپنے اس حق کو دوسروں کی ضرر رسانی کے لئے استعمال کرتا ہے۔ تو اس کا ایسا کرنا ظلم اور زیادتی سمجھا جائے گا اور اس حق کا کوئی قانونی جواز نہیں رہے گا مگر امام شافعی اس نظریہ کے علی الاطلاق حامی نہیں ہیں۔

امام شافعی کا مسلک امام شافعی کے نزدیک صاحب حق اپنے حقوق میں علی الاطلاق مختار ہے وہ جیسے چاہے، اسے استعمال کر سکتا ہے خواہ اس میں اسے کوئی فائدہ نہ ہو، یا دوسروں کو اس سے نقصان پہونچے۔ لیکن بعض قرآنی احکام اور مستقل عادات کے آگے وہ بھی مجبور ہوئے کہ اپنے اس اصول کو مطلق نہ رہنے دیں (۲۵)، اور ان کے بعد ان کے جو شاگرد آئے، انھوں نے امام صاحب کی اس رائے سے بہت زیادہ اختلاف کیا اور اس بارے میں حنفیہ اور مالکیہ کے مسلک پر چلے۔ امام شافعی کی اس رائے کے خلاف شوافع میں سے جن حضرات نے لکھا ہے ان میں اہم ترین شخصیت امام غزالی ہیں۔ انھوں نے نکاح، طلاق، معاہدہ، اور پڑوسی وغیرہ کے حقوق پر ان کے اجتماعی مقاصد کی روشنی ہی میں بحث کی ہے۔ (۲۶) متاخرین میں سے اس نظریہ کے قواعد و ضوابط کے اثبات میں ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ انھوں نے

امام شافعی کی رائے کی مخالفت کی کیونکہ یہ رائے ظلم کی موجب اور عدل و انصاف کے منافی ہے (۲۷) چنانچہ نویں صدی ہجری کے فقہاء کے ہاں تقریباً یہ رائے عام طور پر تسلیم کی جانے لگی کہ حق کے استعمال میں، دوسروں پر ظلم و زیادتی کی اجازت نہیں ہونی چاہیے (۲۸)۔ مجلۃ الاحکام العدلیہ کی اکثر دفعات میں اس نظریہ کی تطبیقات ملتی ہیں (دفعات ۱۱۹۸ — ۱۲۱۲)۔ اسی طرح قدری پاشا مرحوم نے اپنی کتاب الاحوال العینیہ میں اس نظریہ کی بعض تطبیقات بیان کی ہیں (دفعات ۵۷ - ۵۹)۔ ۱۹۴۸ء میں اپنے حق کے استعمال میں ظلم و زیادتی کے ارتکاب کے اس نظریہ کو جیسا کہ وہ شریعت میں ہے، مصر میں داخل کیا گیا ہے

اسلام کا نظریہ ملکیت اور یورپی ماہرین قانون | یورپ کے ماہرین قانون میں سے جو لوگ اسلام کے نظریہ ملکیت، اس کے مقاصد اور انفرادی حقوق کے استعمال پر اس کے عائد کردہ قیود سے متاثر ہوئے، ان میں سے ایک، فرانسیسی پروفیسر دوجی ہیں۔ موصوف ایک عرصہ تک قاہرہ میں لا کالج کے پرنسپل رہے تھے۔ اور ظاہر ہے اس دوران میں ان کا مصر کے علماء و فقہاء سے ملنا جلنا رہا۔ پروفیسر دوجی نے اپنا "تکافل اجتماعی" (اجتماعی کفالت) کا مشہور نظریہ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ ملکیت کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ وہ ایک اجتماعی عمل ہے۔ بعد ازاں انھوں نے اس کی بالکل اسلامی نقطہ نظر کے مطابق تشریح کی ہے، پروفیسر موصوف کا یہ نظریہ مغرب میں خوب مقبول ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں جب روس میں "انقلاب اکتوبر" ہوا، تو ملکیت کے بارے میں بالشویکوں کے اپنے جو نظریے تھے، وہ حقیقت واقعی کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور وہ انھیں روس کے اس وقت کے حالات میں منطبق کرنے میں ناکام رہے۔ انقلاب کے پانچ سال بعد لینن مجبور ہو گیا کہ وہ بعض بورژوائی قوانین ملکیت کو بحال کرے تاکہ ان کو شیوعیت کی منزل تک پہنچنے سے پہلے کے عبوری دور میں نافذ کیا جائے۔ اسے N.E.P. (نیو اکنامک پالیسی) کا نام دیا گیا۔ لینن نے اپنی اس پالیسی کی تشکیل میں پروفیسر دوجی کی تحریروں سے استفادہ کیا۔ اس کا خود بہت سے روسی ماہرین قانون نے اعتراف کیا تھا۔ لیکن بعد میں وہ اپنے ان تحریروں سے مکر گئے ہیں (۲۹)۔ لینن کے اس قانون کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ یہ قانون شہری حقوق کی حفاظت کرتا ہے، سوائے ان حالات کے جب کہ انھیں اجتماعی و اقتصادی اغراض کے خلاف استعمال کیا جائے

لیکن اس سبب سے قطع نظر جس کی بنا پر اسلامی شریعت اور سوویت روس کے قانون کی اس دفعہ میں مشابہت پائی جاتی ہے اس سے جو نتائج نکلے، وہ ایک دوسرے سے مشابہت نہیں رکھتے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ روس کی بالشویک سرزمین اسلامی فکر کے لئے سازگار نہیں ہے جیسے کہ وہ زاویۂ نظر جس سے روس معاملے کو دیکھتا ہے، شریعت اسلامی کے زاویہ نظر سے مختلف ہے مسلمانوں کے ہاں اصل نقطۂ نظر یہ ہے کہ ملکیت کی کامل حفاظت کی جائے جبکہ بالشویک نظریہ بالکل علی العکس ہے۔ وہ سرے سے ملکیت کا ہی انکار کرتے اور اسے اصلاً باطل قرار دیتے ہیں۔ لیکن بعد میں جب انھیں حقائق واقعی مجبور کرتے ہیں، تب وہ ملکیت کو اس شرط کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا استعمال اجتماعی واقتصادی اغراض کے لئے ہو۔

بہرحال یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ۱۹۲۳ء میں پیش کی ہوئی لینن کی عارضی اسکیم اب ایک مستقل حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ لینن کے بعد روسی لیڈروں نے اس میں اور بھی توسع سے کام لیا ہے اور اس طرح ہر نئے سال میں بالشویک نظام کی ناکامیوں سے پردہ جلد اٹھتا جا رہا ہے۔ آج ایک شخص پورے وثوق کے ساتھ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ اس وقت کا عملی روسی نظام مارکس کے بالشوزم سے بے حد جدا ہے۔ اور وہ وقت دور نہیں ہے جب شیوعیت کے خواب کو آخری شکست نصیب ہوگی کسے خبر ہے کہ یہ بعید ترین راہ سے گزرتا ہوا قافلہ ان ناکامیوں کے نتیجے میں اس اسلامی طرز فکر ہی کو نہ اپنا لے جس کا بیج بہرحال اس کے ذہن میں پڑ چکا ہے اگر ایسا ہوا تو یہ اسلام کے معجزوں میں سے کوئی انوکھا معجزہ نہ ہوگا۔ —————— باقی

حوالے

— مضمون میں حاشیوں کے نشانات (ہندسے) حوالوں کیلئے ہیں۔ اس قسط کے حوالے درج ذیل ہیں

۱۔ ایھا الناس ان دماءکم واموالکم علیکم حرام الی ان تلقوا ربکم کحرمۃ یومکم ھذا وکحرمۃ شھرکم ھذا۔
(اے لوگو بے شک تمھارے خون اور تمھارے اموال تم پر قابل حرمت ہیں یہاں تک کہ تم اپنے رب سے ملو ایسے ہی قابل حرمت جیسے یہ دن اور جیسے یہ مہینہ) ۲۔ من قتل دون مالہ فھو شھید (اخرجہ الشیخان) (جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے) ۳۔ والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما جزاء بما کسبا نکالا من اللہ (القرآن: المائدۃ) (چوری کرنے والے مرد اور عورت کا ہاتھ کاٹ دو یہ سزا ہے اللہ کی طرف سے ان کے اس فعل کی جو انھوں نے کیا)
۴۔ من اقتطع مال امرئ مسلم بغیر حق لقی اللہ عز وجل وھو علیہ غضبان۔ (مسند امام احمد) (جس نے

کسی مسلمان کا بغیر حق کے مال لے لیا تو وہ اللہ تعالیٰ کو اس حالت میں ملے گا کہ اللہ اس پر ناراض ہوگا)۔ ۵۔ قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق (القرآن الاعراف)، (اے نبی کہہ دو کس نے اللہ کی تال زینت چیزوں کو جو اس نے بندوں کیلئے پیدا کیں اور روزی کی اچھی چیزوں کو حرام ٹھہرایا) یابنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد (القرآن الاعراف) اے بنی آدم ہر نماز کے وقت زینت اختیار کرو۔ ۶۔ فاذا اتاک اللہ مالا فلیرا اثر نعمۃ اللہ علیک وکرامتہ (ابوداؤد ونسائی) جب اللہ تعالیٰ تمھیں مال دے تو اللہ کی نعمت اور تکریم کا تم پر اثر دیکھا جانا چاہیے۔ ۷۔ ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطھا کل البسط فتقعد ملوما محسورا (القرآن، الاسراء) اور نہ اپنا ہاتھ گردن سے ہی باندھ لینا چاہیے اور نہ بالکل ہی کھول دینا چاہیے ورنہ الزام خوردہ تہی دست ہوکر بیٹھ رہوگے ۸۔ للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون۔ (القرآن : النساء) ماں باپ اور قرابت دار جو کچھ چھوڑ جائیں اس میں سے مردوں کیلئے حصہ ہے اور عورتوں کے لئے بھی حصہ ہے جو ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں ۹۔ للہ ما فی السموات وما فی الارض (القرآن) اللہ ہی کیلئے ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمینوں میں ۱۰۔ القرآن سورۃ الحدید ۷۔ ۱۱۔ القرآن سورۃ النور ۳۳۔ ۱۲۔ . . . .

۱۳۔ وصیت کے بارے میں آیت ہے: ۔من بعد وصیۃ یوصی بھا او دین غیر مضار وصیۃ من اللہ واللہ علیم حلیم۔ (البقرہ) طلاق کے حق کے بارے میں آیت ہے: الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان، اپنا حق طلب کرنے کے بارے میں آیت ہے: ۔ولا تاکلوا اموالکم بالباطل وتدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون ۱۴۔ المدونۃ الکبریٰ الامام مالک (امام عبدالرحمن بن القاسم سے امام سحنون کی روایت، جزء ۱۴ ص ۱۹۹) ۱۵۔ المدونۃ الکبریٰ جزء ۴ ص ۵۔ ۱۶۔ ایضاً ص ۱۴۔ ۱۷۔ کتاب الخراج، امام ابو یوسف وبھامشہ الجامع الصغیر لمحمد حاشیہ ص ۳۳۔ ۱۸۔ المدونۃ الکبریٰ جزء ۱۴ ص ۲۳۵۔ ۱۹۔ ایضاً جزء ۱۵ ص ۱۹۷۔ ۲۰۔ ایضاً جزء ۱۴ ص ۲۲۱ ۲۱۔ ایضاً جزء ۱۵ ص ۱۹۵۔ ۲۲۔ کتاب الخراج حاشیہ ۱۰۲، ۱۰۳۔ ۲۳۔ المدونۃ الکبریٰ جزء ۱۵ ص ۱۹۴، ۱۹۵ ۲۴۔ کتاب الخراج ص ۵۳۔ ۲۵۔ کتاب الام، امام شافعی جزء ۵ ص ۱۸۹، ۲۰۱، ۲۱۱۔ ۲۶۔ احیاء علوم الدین، امام غزالی، جزء ۲ ص ۱۴، ۲۵، ۳۵، ۳۶، ۴۸، ۲۱۳۔ ۲۷۔ اعلام الموقعین، امام ابن القیم جزء ۳ ص ۱۴۳، ۱۴۴۔ ۲۸۔ ابن عابدین۔ رد المحتار علی الدر المختار بر حاشیۃ الزیلعی (تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق)

صرف مسائل کا مشترک ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان مسائل کے لئے جدوجہد کے بارے میں سب کا انداز فکر بھی ہم آہنگ ہونا چاہیئے تو یہ ایک معقول بات ہوتی، اور اس بنا پر جمعیۃ اگر علحدہ کر دیتی تو اس کو ملامت نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن اس نے اس جرأت اور صاف گوئی کے بجائے یا اس لئے کہ رہنمایان جمعیۃ کے ذہن میں یہ نظریاتی بات اس وقت منضبط شکل میں تھی ہی نہیں (اس صاف گوئی کے لئے معاف رکھا جائے) ایک مذموم شکل اختیار کی۔ اس نے دل میں عدم اشتراک کا تہیہ رکھا اور اس پر عمل کیا، لیکن اوپر سے اشتراک پر رضامندی کا لبادہ بھی اوڑھ لیا اور کوشش یہ کی کہ اس لبادے کو اس پر اتارنے کی ذمہ داری دوسروں کے سر رکھ دیں، لیکن جب یہ نہ ہوا تو اپنی غلطی کا اعتراف کرتے یا اسے نباہنے کے بجائے اس انداز سے اپنا دامن چھڑایا کہ نہ تو ملت کے اندرونی مصالح کی کوئی پرواہ کی اور نہ خارجی نزاکتوں کا کوئی لحاظ!

بہرحال جمعیۃ نے مجلس سے علحدگی اختیار کر لی، اور چاہے اسے صرف برسر اقتدار گروہ کی علحدگی کہا جائے لیکن جب تک وہ گروہ برسر اقتدار ہے، جو آج ہے، یہ جمعیۃ ہی کی علحدگی کہلائے گی اور اس صورت میں مجلس کی وہ "کل ملت نمائندہ" حیثیت باقی نہیں رہ جائے گی جو اس کا بنیادی تخیل تھی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ارکان مجلس معاملہ پر از سر نو غور کریں۔ مجلس جو تمام مسلم جماعتوں میں اشتراک عمل کا پلیٹ فارم بننے کے عنوان سے قائم ہوئی تھی، اس کے لئے یہ ہرگز مناسب نہیں ہوگا کہ کوئی جماعت اسے حریف کی نظر سے دیکھے، جیسا کہ جمعیۃ کی طرف سے یہ صورت پیدا ہو چکی ہے اب یا تو مجلس اپنے بنیادی تخیل میں ترمیم کر کے اسے محض اپنی موجودہ محدود حیثیت کے مطابق بنانے پر اکتفا کرے۔ یا بالکل کسی نئے تخیل پر اسکی از سر نو تنظیم کی جائے۔ یہ تخیل کیا ہو؟ یقیناً یہ مسئلہ بہت قابل غور ہے۔ مگر دونوں میں سے ایک بات بہرحال ہونا ضروری ہے۔

حضرت شاہ ابو الرضا محمد فاروقی دہلوی رح

حالات ــــ ملفوظات ــــ مکتوبات

(از ـــــــــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

پچھلے دنوں مجھے مکتوبات شاہ ابوالرضا محمد کا ایک قلمی نسخہ برائے مطالعہ دستیاب ہوا ـــ اس مجموعہ میں ۴۹ مکتوبات ہیں ـــ ان میں سے اکثر مکتوبات نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میرا اولاً ارادہ تو یہ تھا کہ ان مکتوبات پر ہی ایک مقالہ لکھوں، بعدہٗ مناسب یہ معلوم ہوا کہ پہلے حضرت شاہ ابوالرضا محمدؒ کے حالات لکھوں ـــ حالات کے بیان کرنے میں اختصار کا لحاظ رکھنے کے باوجود اتنے صفحات ہو گئے جتنے صفحات میں مکتوبات پر تبصرہ کرنے کا قصد تھا ـــ اچھا ہوا کہ اس بہانے اس عظیم شخصیت کے ذکرِ خیر کی سعادت نصیب ہو گئی جس نے میدانِ تسلیم و رضا میں گامزن ہو کر اور راہ فقر و درویشی اختیار کر کے ایک مثالی نمونہ قائم کیا۔ جس نے اپنے نفسِ گرم سے محفلِ فقر اور بزمِ تصوف کو گرما دیا جس نے اپنی تمام عمر، توکل و استقامت کے ساتھ ساتھ اتباعِ سنت میں گزار دی جس نے دہلی اور اطرافِ دہلی کے تشنگانِ معرفت کو مسجد فیروز آباد کے ایک تنگ و تاریک حجرے میں بیٹھ کر سیراب کیا ـــ سچ پوچھئے تو حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ پر براہ راست اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ پر بالواسطہ اس ذاتِ ستودہ صفات کے فیوض و برکات کا نمایاں اثر پڑا اور ان دونوں شخصیتوں کی تعمیر میں اس درویشِ حق آگاہ کی سیرت کو بھی بہت کچھ دخل ہے ـــ میں نے یہ حالات انفاس العارفین، نزھۃ الخواطر جلد (۱)، حیات ولی اور مزارات اولیاء دہلی سے اخذ کر کے

ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کیے ہیں۔

حضرت شاہ ابوالرضا محمد دہلویؒ، حضرت شیخ وجیہ الدین فاروقی شہیدؒ کے صاحبزادے اور حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ کے برادر کلاں تھے۔ آپ غالباً ۱۰۴۵ھ یا ۱۰۴۶ھ میں پیدا ہوئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ایک مستقل رسالہ شوارق المعرفۃ اپنے عم بزرگوار کے حالات میں لکھا ہے جو باریک قلم سے ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور انفاس العارفین میں شامل ہے ___ اس میں حضرت شاہ ابوالرضا محمدؒ کے حالات، ملفوظات، کرامات، کچھ مکتوبات اور بعض مسودات درج ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے عم محترم کا زمانہ نہیں پایا، اس لیے کہ وہ آپ کی پیدائش سے بارہ سال پہلے اس عالم فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ اسی بنا پر آپ نے عم مکرم کے سوانح و ملفوظات لکھنے سے پہلے تصریح فرما دی ہے کہ مجھے یہ واقعات ایک دو واسطوں سے پہونچے ہیں، چنانچہ شوارق المعرفۃ کو اس عنوان سے شروع فرمایا ہے۔

"قسم ثانی در احوال معارف مآب امام الطریقۃ والحقیقۃ ...... مخدومنا مولٰنا الشیخ ابوالرضا محمدؒ" ___

قسم اول میں اپنے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے وہ احوال و ملفوظات تحریر فرمائے ہیں جن کو اکثر و بیشتر براہ راست اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا ہے۔

تعلیم شوارق المعرفۃ میں شیخ ابوالرضا محمدؒ کی تعلیم کے متعلق کوئی تفصیل نہیں ہے۔ جس سے ان کے تمام اساتذہ اور تمام کتب درسیہ کا پتہ چلتا، بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حافظ بصیر دہلویؒ سے (جو عہد شاہجہانی کے بڑے جید عالم تھے) اور حضرت خواجہ عبیداللہ عرف خواجہ خردؒ ابن حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے تعلیم حاصل کی۔

اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے۔

"فی الحقیقۃ علوم ایشان ہمہ وہبیہ بودند" یعنی درحقیقت ان کے تمام علوم وہبی اور لدنی تھے۔

تجرید و توکل

تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصے اپنے والد ماجد شیخ وجیہ الدین شہیدؒ کے حکم سے ایک امیر کبیر کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ وہاں آتے جاتے رہے۔ آخر کار تجرید تام اور توکل کلی کا غلبہ ہوا اور یہ ملازمت چھوڑ دی۔ بعد ازاں مسجد فیروز آباد کے ایک حجرے میں رہ کر پوری زندگی گزار دی۔

رفیقۂ حیات کی بے نظیر قربانی

حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ مجھے شہرت و تواتر کے ساتھ یہ بات پہونچی ہے کہ عم بزرگوار نے جب راہ فقر کو اختیار کیا تو اپنی اہلیہ محترمہ سے فرمایا کہ "اے رفیقۂ حیات ہم نے جس راستہ کو اختیار کیا ہے وہ ایک دشوار گزار راستہ ہے، یقیناً اس راہ میں جو تکالیف جھیلنی پڑیں گی وہ سخت جگر خراش اور جاں گسل ہوں گی۔ مگر ہم نے تو اب یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس راہ کو مصائب و تکالیف کی وجہ سے نہیں چھوڑیں گے ___ اب تمہارا مسئلہ رہ جاتا ہے، اس کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ ہماری حالت فقر و درویشی کے باوجود، لذیذ غذاؤں اور عمدہ لباسوں سے قطع نظر کر کے اگر ہماری رفاقت منظور کرو تو نبھا، ورنہ تمہیں اختیار ہے"۔ اس نیک بخت دیندار اور وفا شعار بیوی نے یہ سن کر اپنے تمام زیورات اتار دئیے اور معمولی لباس پہن کر اپنے شوہر کی رفاقت کا عہد کیا۔

پیر و مرشد

آپ نے راہ سلوک کو کس کی رہنمائی میں طے کیا؟ اور آپ کے پیر و مرشد کون تھے؟ اس سلسلے میں حضرت شاہ صاحبؒ کے بیان سے جو معلوم ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ اویسی المشرب تھے، براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے فیوض حاصل کیے تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ عم بزرگوار خود یہ بات فرمایا کرتے تھے کہ ایک درویش تھے جو حضرت شیخ تاج الدین سنبھلیؒ کے خلیفہ تھے اور حضرت خواجہ خردؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ ان کے حالات بہت اچھے تھے، ایک دن حضرت خواجہ خردؒ نے اپنی ایک مجلس میں یہ فرمایا تھا کہ جو شخص طالب معرفت ہو اُسے چاہیے کہ اس درویش سے تعلق بیعت پیدا کرے۔ میں بھی اس مجلس میں موجود تھا جب میں نے یہ بات سنی تو میرے دل میں ان بزرگ سے

بیعت ہونے کا تقاضہ پیدا ہوا ـــــ مگر میں نے ان سے بیعت نہیں کی۔

عُسر کے بعد یُسر جیسا کہ لکھا جا چکا مسجد فیروز آباد کے ایک تنگ حجرے میں آپ کی رہائش تھی۔ ابتدا میں اکثر ایسا ہوا کہ دو دو تین تین فاقے متواتر آئے۔ فاقوں کے بعد جَو کی چند روٹیاں میسر آجاتیں تھیں اور کچھ چھاچھ نصیب ہوجاتی وہ روٹیاں محمد جان طحان اور دوسرے غریب معتقدین لے آتے تھے۔ ان روٹیوں کو آپ فقراء اور مستحقین پر مساوی تقسیم فرما دیتے اور بطور سد رمق خود بھی کچھ تناول فرما لیتے تھے۔

کچھ عرصے تک آپ کے گھر میں چولھا، ہنڈیا، چکی وغیرہ کچھ نہ تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا کہ برکت تمام ظاہر فرمائی اور اپنے بندوں کے قلوب کو آپ کی طرف متوجہ کر دیا۔ چنانچہ ایک وسیع حویلی آپ کے اہل و عیال کے واسطے تعمیر کرائی گئی اور منجانب اللہ توسیع رزق کا انتظام بھی ہو گیا۔

استغناء اُمراء و سلاطین سے کنارہ کش رہتے تھے حتیٰ کہ حضرت عالمگیرؒ جیسے دیندار بادشاہ کو بھی باوجود اُن کی درخواست کے اپنی ملاقات کا موقع نہیں دیا۔ غرضکہ امراء و رؤسا کی طرف اُن کو بالکل التفات نہ تھا ان کے ہدایا بھی بڑی مشکل سے قبول فرماتے تھے ـ البتہ مخلص غرباء کے معمولی ہدایا جلد شرف قبولیت حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ کفش دوزی کرنے والے اور آٹا پیسنے کی محنت کرنے والے یا اسی قسم کی محنت مزدوری کرنے والے غریبوں کے چار یا پانچ پیسے بھی بڑی خوشی سے قبول فرما لیتے تھے۔

سیرت و صورت حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریر کے مطابق آپ قوی العلم، فصیح اللسان عظیم الورع، وسیع المعرفۃ اور نرم زبان بزرگ تھے ـــ آپ کا قد لانبا، بدن چھریرا تھا، رنگ میں سرخی و سپیدی کے ساتھ ایک قسم کی ملاحت بھی تھی۔ ڈاڑھی گنجان نہیں تھی۔ رخساروں پر گوشت اس قدر کم تھا کہ چہرے کی تمام رگیں ابھری ہوئی نظر آتی تھیں۔

وعظ و درس آپ ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ وعظ فرمایا کرتے تھے وعظ کا طریقہ یہ تھا کہ شروع میں تین حدیثیں زبانی پڑھتے تھے ـ خوب ٹھہر ٹھہر کر ـــ

اُن احادیث کے پڑھتے وقت مجلس و مجمع کی ہر جانب نگاہ رکھتے تھے، پھر ان حدیثوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کرتے تھے۔ بعدہٗ اس زمانہ کی اردو میں بھی ترجمہ فرماتے تھے اور ان احادیث سے متعلق جو مناسب اور ضروری تشریحات ہوتی تھیں ان کو بھی بیان فرماتے تھے مگر اعتدال کے ساتھ۔ یعنی تشریحات میں نہ زیادہ طوالت ہوتی تھی اور نہ بہت زیادہ اختصار و ایجاز ہوتا تھا۔ (حضرت شاہ صاحبؒ نے اگرچہ تصریح نہیں فرمائی مگر قرینے کی دلالت سے گمان غالب یہ ہے کہ کل تقریر اردو ہی میں ہوتی ہوگی)

شروع شروع میں ہر علم کا درس دیتے تھے اور طالبان علوم جوق در جوق آپ کی اعلیٰ استعداد اور خوبیٔ تقریر کی وجہ سے آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہوتے تھے ___ آخر میں فقط دو کتابوں کا درس دیتے تھے بیضاوی اور مشکوٰۃ المصابیح۔ باقی زیادہ وقت توجہ الی اللہ اور خاص مریدین سے معارف، بیان کرنے میں گزرتا تھا ___ وحدت وجود کے قائل تھے اور اس مضمون میں بقول حضرت شاہ صاحبؒ "تحقیق عظیم" رکھتے تھے ___ اپنی مجالس میں صوفیائے کرام کی باریک باریک باتوں کی تشریح و وضاحت بھی فرمایا کرتے تھے۔

جذبۂ اتباع سنت | غلبۂ عشق اور مسلک توحید وجودی کے ساتھ ساتھ اتباع سنت کا بھی انتہائی خیال رکھتے تھے ___ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ جب آپ مسجد میں داخل ہونے کا ارادہ کرتے مسجد کے باہر کھڑے ہو جاتے پہلے بایاں پاؤں جوتے سے نکالتے اور بائیں جوتے پر بایاں پاؤں رکھ کر پھر دایاں پاؤں مسجد میں رکھتے تھے۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ ان دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے جن سے یہ طریقہ ثابت ہوتا ہے ___ ایک مقام پر حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں "حضرت ایشانؒ چنداں مقید بودند کہ ہیچ ادب وسنت از ایشاں ترک نمی شد الیٰ آخر العمر" یعنی آپ شریعت کے اتنے پابند تھے کہ آخر عمر تک کوئی مستحب عمل اور سنت طریقہ آپ سے ترک نہیں ہوا۔

غلبۂ ورع و احتیاط | حضرت شاہ صاحبؒ، شیخ مظفر رہتکیؒ کی زبانی بیان فرماتے

ہیں کہ اوائل میں جب میں رہتک سے حضرتؒ کی خدمت میں آتا تھا تو مصری کے کچھ کوزے
ہدیے کے طور پر لے آتا تھا۔ حضرتؒ ان کو قبول نہیں فرماتے تھے صرف اس احتیاط کی بنا پر
کہ دیہات وقصبات کے رؤسا کی بیع وشرا قانون شرعی کے مطابق نہیں ہوتی ——— اسکے
بعد میں نے یہ کیا کہ یہ ہدیہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا موقوف کر دیا، البتہ آپ کے بچوں کو مصری
کے کوزے لا کر دے دیتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں نے حسب معمول بچوں کو کوزے دئیے بچے
ان کوزوں کو لے کر آپ کی خدمت میں چلے گئے، آپ نے ان میں سے کچھ تناول فرما لیا، پھر
ایک دن میری طرف مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ ہم نے تمہاری لائی ہوئی مصری کھالی تھی۔
اب ہم نے تورعاتِ زائدہ سے دست کشی کر لی ہے آئندہ جو ظاہر شرع کا حکم ہوگا اسی پر
عمل کریں گے۔

کرامات و روشن ضمیری

حضرت شاہ صاحبؒ نے آپ کی کرامات بڑی تفصیل سے لکھی ہیں اور روشن ضمیری کے بھی کئی واقعے بیان فرمائے ہیں۔ یہاں
ان سب کا احاطہ مقصود نہیں، صرف ایک واقعہ اس سلسلے میں لکھا جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ عنایت اللہ نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک
شخص ——— جو بڑا جید فاضل تھا اور مجادلہ ومناظرہ میں بھی پوری مہارت رکھتا تھا۔
(اور جس کی سکونت غالباً دہلی کے باہر کہیں کی تھی) ——— مجھ سے ایک دن کہنے لگا
کہ میں نے شہر دہلی کے علماء وفضلاء کو آزما لیا، یہاں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس پر میں غالب
نہ آیا ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ کبھی تم مجلس شیخ ابو الرضا محمد میں بھی حاضر ہوئے ہو؟
اُس نے جواب دیا کہ میں نے سنا ہے کہ شیخ ابو الرضا محمد عوام کے سامنے تفسیر حسینی کا وعظ بیان
کیا کرتے ہیں اور اس سے زیادہ ان کا مبلغ علم نہیں ہے۔ میں نے کہا ایسی بات نہ کہو ان
سے ملاقات تو کر لو، چنانچہ وہ جمعہ کے دن مجلس وعظ میں آیا، وعظ کے بعد اس کے دل میں یہ آیا
کہ ان سے مناظرہ کروں، حضرت نے اس وقت اس کی جانب ایک خاص توجہ فرمائی، اس توجہ
کا ہونا تھا کہ اس کا عجیب حال ہو گیا، صرف ونحو کا کوئی قاعدہ تک اس کے حافظے میں نہ رہا، دیگر
علوم کا تو کیا ذکر ہے ——— اس نے جب اپنا یہ حال دیکھا تو ندامت کے ساتھ اظہار نیازمندی

کیا۔ حضرتؒ نے فرمایا بھائی میں عالم نہیں ہوں میں تو صرف تفسیر حسینی کا وعظ عوام کے سامنے بیان کیا کرتا ہوں' اس نے کہا کہ اب میں اپنے قول و اعتقاد سے توبہ کرتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ آپ کے دست حق پرست پر بیعت ہو جاؤں۔ حضرتؒ نے اس کو بیعت نہیں کیا اور یوں فرمایا کہ جن تختیوں پر نقوش قائم ہو جاتے ہیں پھر وہ کام میں نہیں آتی ہیں۔

ملفوظات | آپ کے بہت سے ملفوظات حضرت شاہ صاحبؒ نے نقل فرمائے ہیں جو آپ کی علمی و روحانی بلندی کو ظاہر کرتے ہیں ان میں سے چند ملفوظات یہاں لکھتا ہوں۔

(۱) فرمایا —— سب سے اچھی ریاضت، کھانے پینے میں توسط و اعتدال اختیار کرنا ہے —— دوام توجہ کے ساتھ —— یہاں تک کہ دوام توجہ ملکہ بن جائے۔

(۲) فرمایا —— جب حضوری کی کیفیت جاگزیں ہو جاتی ہے تو پھر وہ گفتگو کرنے یا اسی طرح کے مشاغل سے زائل نہیں ہوتی ہاں اگر علوم دقیقہ کی تعلیم و تعلم میں مشغول ہوگا تو ایک خفیف سا حجاب ضرور واقع ہو جائے گا۔

(۳) فرمایا —— ایک عارف کو یہ بات نہ چاہیے کہ دوسرے عارف کے مرید کو اپنی طرف مائل کرے اور اس کی توجہ اپنے شیخ کی طرف سے پراگندہ کر دے، وہ مرید خوشامد و اصرار کرے تب بھی اسکو اسکے شیخ کے سپرد کر دے۔ لیکن اگر اس کا شیخ وفات پا چکا ہو یا کہیں (دور دراز علاقے میں) چلا گیا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

(۴) فرمایا —— کہ ائمہ اہل بیت کی طرف سے اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی انکار اور رد ثابت نہیں ہے، یہ بات (کہ اہل بیتؓ نے صحابہؓ کا انکار کیا ہے) محض (بدعقیدہ لوگوں کا) افترا ہے۔

(۵) فرمایا —— نجات، تقلید انبیاء علیہم السلام میں مضمر ہے۔ انبیاءؑ کی تقلید عقائد کے اندر بغیر زیادت و نقصان کے ہونی چاہیے —— جیسا کہ قدماء اہل سنت کا مذہب ہے —— ہاں اگر کوئی کسی صاحب کشف سے فیض پائے ہوئے ہو اور وہ ان عقائد کی تفصیل و تحقیق کرکے دوسروں کو آگاہ کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(۶) فرمایا ــــ اگر کسی کو امرِ منکر کا مرتکب دیکھو تو جان لو کہ یہ بھی ارادۂ الٰہی کے بغیر نہیں ہے ــــ لیکن اُس شخص کو نصیحت و تذکیر بھی ضرور کرنی چاہیے۔ فانّ الذکریٰ تنفع المومنین اس لیے کہ نصیحت و تذکیر مومنین کو نفع پہونچاتی ہے۔ اب چاہے سو میں سے ایک کو نفع پہونچے ــــ بالکل ایسا سمجھو کہ کسی کی کنیزک بھاگ جائے اور وہ ہر کوچہ و بازار میں آواز لگائے ــــ اگرچہ کنیزک کسی ایک جگہ موجود ہو اور اس کی خبر بھی ہزاروں سننے والوں میں سے کوئی ایک ہی لائے

(۷) فرمایا ــــ ایک فاضل نے ایک صوفی سے دریافت کیا کہ صوفیاء اتنی ریاضات اور اتنے مجاہدات کیوں کرتے ہیں؟ صوفی نے جواب دیا کہ اگر تجھ سے کہا جائے کہ اتنی محنت کرے گا تو تجھے سلطنت مل جائے گی یا بادشاہ تیرے پاس آئے گا ــــ پھر تو محنت و مجاہدہ کرے گا یا نہیں؟ فاضل نے کہا کہ ایسی صورت میں تو ہر کوئی محنت و مجاہدہ کرے گا۔ صوفی نے کہا کہ بسبب ریاضات و مجاہدات حضرت حق باعظمت اُلوہیت خانۂ قلوب صوفیاء میں جلوہ گر ہو جاتے ہیں، پھر وہ ریاضات و مجاہدات کیوں نہ کریں؟ ــــ

(۸) اِذا تحیّرتم فی الاُمورِ فاستَعِینُوا بِاَصحابِ القُبورِ۔ (یعنی جب تم امورِ دنیا میں متحیر و پریشان ہو جاؤ تو اصحاب قبور سے استعانت کرو) اس مقولے کے بارے میں فرمایا کہ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ احوال موتیٰ کو یاد کرنا اور اُن سے عبرت حاصل کرنا ــــ امورِ دُنیا سے توجہ کو ہٹا دیتا ہے اور فکرِ معاش کو مضمحل کر دیتا ہے (لہٰذا قبر کا دھیان فکرِ دنیا کو کمزور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے) ــــ

(۹) فرمایا ــــ لوگوں کے اولیاء سے انکار کا ایک بڑا سبب شرکتِ مکان ہے کہ ایک محلے میں یا ایک شہر میں سکونت رکھتے ہوں اور شرکتِ زمان بھی ایک سبب ہے کہ ہمعصر و معاصر ہوں ــ اور شرکتِ نسبت بھی ایک سبب ہے کہ وہ ولی عزیزوں میں سے ہو ــــ عوام اکثر اُس شخص کے معتقد ہوتے ہیں جو خدام بہت رکھتا ہو اور عبادت بھی بہت کرتا ہو اگرچہ وہ عبادت ریا و عُجب کے ساتھ ہو۔

(۱۰) فرمایا ــــ علم الیقین ــــ دھواں دیکھ کر آگ کے وجود پر استدلال کرنا ہے۔

عین الیقین براہ راست آگ کو دیکھنا ہے۔ اور حق الیقین اپنے اندر آگ کا علم ہونا ہے۔ مشاہدہ، عین الیقین میں ہوتا ہے اور وصول و شہود، حق الیقین میں ــــ

تالیفات علاوہ مجموعہ مکتوبات کے آپ کا ایک رسالہ ہے جس کا نام اصول الولایۃ لاھل العنایۃ ــ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ احقر کے مطالعہ سے گزرا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے انفاس العارفین میں اس رسالے کے بھی کچھ اقتباسات درج فرمائے ہیں۔

وفات حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ شیخ مظفر رہتکی ذکر کرتے تھے کہ حضرت ایشانؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان ہوگی ــ جب حضرتؒ کی عمر پچاس سال سے متجاوز ہوگئی تو مجھے برابر آپ کی وفات کا اندیشہ لگا رہا۔ جب آپ کی عمر پچپن سال کی ہوگئی تو مجھے ایک تقریب میں شرکت کے لیے رہتک جانا ہوگیا۔ چلتے وقت میں نے ہمت کر کے اپنا اندیشہ ظاہر کیا اور اس سلسلے میں استفسار کیا۔ حضرتؒ نے تبسم فرمایا اور یوں ارشاد فرمایا کہ تم کو وطن جانا چاہیے۔ اس فکر میں مت پڑو ــ میں رہتک چلا گیا، میرے پیچھے حضرت کا انتقال ہوا ــ جب رہتک سے واپس آیا تو شاہ سعداللہ گلشن دہلویؒ نے (جو حضرت شیخ عبدالاحدؒ کے مشہور خلیفہ اور ہندستان کے معروف شاعر ہیں) مجھے حضرتؒ کے اواخر ایام حیات کا ایک واقعہ سنایا جس میں حضرت شیخ عبدالاحدؒ نبیرہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا وفات سے کچھ دن پہلے ملاقات کے لیے تشریف لانا اور دیگر تمام باتیں تفصیل سے بیان کیں[1]

پیر بھائیوں نے اس طرح بیان کیا کہ حضرت چند روز پیشتر کچھ کسل اور کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ دو ایک دن پیشتر سے کھانے کی طرف بالکل رغبت نہیں رہی تھی، نیز چیزوں سے پہلے سے بھی زیادہ بے تعلقی پیدا ہوگئی تھی۔ کسی چیز کی طرف التفات نہیں فرماتے تھے۔ وفات کے دن جب نماز عصر کے لیے مسجد میں جانا چاہتے تھے تو اہل خانہ سے ملنے گئے اور

---

[1] شوارق المعرفۃ (مترجمہ انفاس العارفین) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ابوالرضا محمدؒ کی اہلیہ محترمہ حضرت شیخ عبدالاحدؒ کی قریبی رشتے دار تھیں۔

وہاں سے اس طرح رخصت ہوئے جیسے کہیں سفر پر جانے کی تیاری کر رہے ہوں۔ نماز عصر پڑھنے کے بعد مقامات حضرت خواجہ نقشبند کو مطالعے کے لیے طلب کیا۔ ایک مرید نے اُس وقت حضرت کے سامنے (تھالی میں) پان پیش کئے۔ ایک دو پان اس میں سے لے کر کھائے۔ پھر خنداں و شاداں اپنے تکیے سے ٹیک لگائی بس اتنی ہی دیر میں دیکھتے دیکھتے آپ کی روح مائل پرواز ہو گئی ——

نزع کے عالم میں اپنے بھائی سیدنا حضرت شیخ عبدالرحیمؒ کی طرف اشارہ کیا کہ ان کو بلاؤ۔ کچھ لوگ ان کو بلانے کے لیے کھڑے ہو گئے اور کچھ لوگ یہ گمان کر کے کہ آپ پر غشی طاری ہو گئی آپ کو اٹھا کر گھر تک لائے اس وقت حضرت شیخ عبدالرحیمؒ آ گئے۔ دریافت فرمایا کیا بات ہے؟ جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ رُوح مبارک پرواز کر چکی ہے ——
یہ واقعہ ۱۷؍ محرم الحرام ۱۱۰۱ھ[1] کا ہے۔

مزار مزارات اولیاء دہلی میں ہے کہ آپ کا مزار بی بی فاطمہؒ کے مزار سے آگے جو محلہ کو راستہ جاتا ہے وہاں ہے اور بی بی فاطمہؒ کا مزار قلعہ کہنہ کے سامنے سڑک سے دائیں طرف جو مسجد و مدرسہ سنگ سُرخ سے بنا ہوا ہے اُس کے برابر سے کچے راستے جا کر تھوڑی دور گھنجان درختوں میں ایک چار دیواری کے اندر ہے۔ (مزارات اولیاء دہلی ص ۲۲ و ۲۳)

اولاد ملفوظات کے ضمن میں شیخ مظفر رہتکیؒ کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے کئی صاحبزادے تھے۔ مگر نام صرف ایک صاحبزادے شیخ محمد فخر العالم کا ملتا ہے جو سب سے بڑے تھے اور جنھوں نے اپنے والد ماجد کے مکتوبات کو جمع کیا ہے ——

—————— (باقی)

[1] انفاس العارفین ہی میں ہے کہ بعض مریدوں نے آپ کی تاریخ وفات "آفتاب حقیقت" سے نکالی ہے۔ مگر اس مادے سے ۱۱۱۱ھ برآمد ہوتے ہیں —— واللہ اعلم بالصواب

دربارِ عالمگیری

(از جناب ڈاکٹر سید مصطفےٰ حسن علوی ایم اے (پی ایچ ڈی))

(۵)

ملا عبدالسلام دیوی مذکور الذکر کو تلمذ اپنے والد بزرگوار سے بھی تھا اور دربار عالمگیری سے الحاق کے قبل دربار شاہجہانی سے ان کے تعلقات رہے ہیں، اور وہی زمانہ تھا کہ جب غالباً منار وغیرہ کی شرح کے قبل یا اس کے ہی دوران میں افضل الدین خاقانی شروانی کی کتاب تحفۃ العراقین کی شرح لکھی تھی، اسی میں حمد و نعت اور منقبت کے بعد وجہ تصنیف پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے نام سے پہلے

خوشہ چین خرمن دانائی عبدالسلام و شیخ کبیر

لکھنے کے بعد یوں رقمطراز ہوئے ہیں کہ بعضے

دوستان و یاران ارجمند

کے پیہم اصرار سے

دریں اوان فرخندہ زمان سعید کہ ہزار و پنجاہ و ہفت ہجری است موافق سنہ جلوس بست میمنت مانوس سلطان سلاطین جہان خاقان خواقین قطب سپہر سلطنت آفتاب آسمان خلافت شہنشاہ دیں پناہ شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی شاہجہان بادشاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ در مدت پانزدہ روز از کمین بطون بمعرض ظہور جلوہ داد۔

تھے تو عالم بڑے پائے کے اور ان کی موت "موت العالم موت العالم" کی مصداق بنی ہوگی لیکن تذکرہ نویسوں نے سنہ وفات کہیں لکھا نہیں، مآثر الکرام میں علامہ سید غلام علی بلگرامی نے بس صرف یہ لکھ دیا کہ دیوی ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے، لاہور تشریف لے گئے تو اپنے ہمنام ملا عبدالسلام لاہوری سے علمی استفادے کیے اس کے بعد بہ عہد شاہجہانی

چندے بہ منصب افتا عسکر ناموز گردید

عہد عالمگیری سے اتصال اور مشاغل کا تذکرہ نہیں کیا۔

شیخ عظمت اللہ کاکوروی

ملا عظمت اللہ ان کے والد ملا عزیز اللہ یہ قصبہ کاکوری مضافات لکھنؤ کے رہنے والے تھے، ان کو دربار عالمگیری میں خاص تقرب حاصل رہا، یہ اپنے عہد کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے رہے۔ خداداد ذہانت اور قوت حافظہ میں ان کی نظیر کم ہی تھے، علوم دینیہ اور خاصکر فقہ اور جزئیات فقہ میں ایسے حاوی تھے کہ عالمگیر نے اپنی بیٹی زیب النساء کو فقہ کی تعلیم انھیں سے دلائی۔ کتاب چشمۂ فیض میں منشی فیض بخش ان کے متعلق رقمطراز ہیں:۔

> ملا عظمت اللہ کہ فضیلت برجستہ می داشت نواب زیب النساء بیگم بنت عالمگیر را مسائل فقہی تعلیم می فرمود وایں حویلی موسومہ بہ پرانی حویلی کہ سابق از خشت پختہ بود جانی خاں در عہد آصف الدولہ خشتہائے آں را بردہ بعد ازاں شیخ طفیل علی آنرا خام درست کردند بلا شرکت در تصرف فرزندان شیخ غلام نبی مرحوم ست احداث کردۂ ملا عظمت اللہ بود۔

اس کے علاوہ جواہر الانشا میں شیخ غلام مرتضیٰ کے ان کے متعلق یہ الفاظ ہیں:۔

> " ملا عظمت اللہ توسل از سرکار زیب النساء صبیۂ عالمگیر بادشاہ گرفتہ بود نواب محمد یار خاں پسر بہمن یار کہ از عظماء دربار شاہی بود بس شفقتہا و عطوفت بملا مرحوم می کرد چنانچہ خدمت فوجداری و امانت سرکار خیرآباد و معاملات دیگر بتوجہاتش بنام پسر شان جار اللہ مقرر و مفوض گشت۔"

ملا جار اللہ

ان کی تعلیم و تربیت علاوہ دیگر سرآمد روزگار علماء و فضلا کے اپنے والد بزرگوار ملا عظمت اللہ استاد زیب النساء دختر عالمگیر سے ہوئی اور ان کی نشو و نما شاہان دہلی کی درباری فضاؤں کی منت کش ہے، قسمت کے بڑے یاور تھے سن رشد ہی سے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ انھیں منتظم الملک کا خطاب عالمگیر نے دیا اور شاہی مصالح کی دیکھ بھال کے صلہ میں ہفت ہزاری کے منصب پر فائز رہے، ان کو ترخانی پوزیشن بھی حاصل ہوئی اور اس پوزیشن کی بدولت یہ مختلف ٹیکسوں سے مستثنیٰ تھے اور انھیں خلعت اور طرح طرح کے انعام اور ایک وافر سالانہ رقم برابر خزانۂ شاہی سے ملتی رہی "ترخان" قدیم ترکوں کا ایک اعزازی لقب تھا ترکی کے لفظی معنی امان نامہ یا سند امارت کے تھے[۵] یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ عالمگیر اپنے آباء و اجداد کی روش کے خلاف خطابات دینے میں بہت ہی سخت اور محتاط تھا اور چھان بین کی جائے تو پتہ چل سکتا ہے کہ اس کے زمانے میں سوائے غیر معمولی خدمات والوں کے دوسروں کے لیے یہ عنایتیں خال خال ہی ہوئی ہیں لیکن ملا جار اللہ کی رفعت شان کی یہ ایک دلیل ہے کہ ان کو سب طرح کے خطابات و انعامات سے نوازا گیا، کشف المتواری میں میر شاہ تراب علی لکھتے ہیں :۔

"شیخ جار اللہ منصب دار بادشاہی دو سالہ دار صاحب فیل و سوار شدند۔ و زیادہ تر از پدر خود صاحب اقتدار و نامدار شدند"

انھیں جاگیر میں قصبہ جھونہ ملا تھا اور وہاں ہی جار اللہ نگر نام سے ایک بستی بسائی تھی جب چلتے اور سفر کرتے تھے تو توپوں کی سلامی دی جاتی اور ایک بڑی تعداد خدم و حشم کی ہوتی تھی، چنانچہ "چشمۂ فیض" میں منشی فیض بخش کا بیان ان کے متعلق یہ ہے۔

قصبہ جھونہ کہ متصل باڑی ست در جاگیر او بود ..... حالا ویران ست ..... چہار

---

[۵] تاریخ بخارا و میری

زنجیر فیل و چہار ضرب توپ باخود می داشت و دہ ہزار سوار و پیادہ ملازم رکاب او بودند
...... افاغنہ ملیح آباد...... کہ نواب می گویانیدند و افاغنہ رو سا و رام نگر و عالم نگر
ہمیشہ رفیق و نوکر او بودند۔

اثاث البیت کی وہ فراوانی تھی کہ اپنے گھر پر اس کے رکھنے کی گنجائش نہ پاکے دوسری حویلی تعمیر کرائی۔

چوں در حویلی گنجائش خود و سامان خویش نیافت حویلی دیگر در مقابل آں معہ برج اربعہ و اندرون آں حویلی و دیوان خانہ وسیع و رفیع مشتمل بر امکنۂ متعددہ و دروازۂ بزرگ کہ فیل با عماری در آید و بالائے آں بارہ دری خوبصورت خوش ترکیب و پائین آں طویلہ اسپان و بیرون آں جلوخانہ و بازار بادو کا ہائے پختہ بکمال استحکام بنا نہادہ۔

یہ بڑے صاحب دل مخیر اور فیاض تھے جواہر الانشا میں منشی غلام مرتضیٰ سے ان کی فیاضی پر یہ ریمارک ہیں۔

شیخ فیاضے بود کہ با خویشان و اقارب علی قدر مراتب سلوک و مراعات می نمود اسپان وزر ہا بر قوم و مردم برادری تقسیم می نمود...... و مردم برادر مانش از کوچک و بزرگ محروم نگذاشت...... مردم بفیاضیش منصبہا بر داشتند و خوش زندگانی کردند۔

اس صاحب حشمت شخصیت اور اس ذات پر شکوہ کی یاد چند زبانوں پر ہے یا چند صحیفوں میں، اس کے علاوہ وہ ان کے بنا کردہ قلعہ کے کچھ حصے بارہ دری محل اور ایک مسجد ہے باقی ہے، باقی رہے نام اللہ کا۔ اس کے علاوہ ایک قرولی جس کے دستہ پر جواہرات جڑے ہیں اور میان پر اعلیٰ قسم کی میناکاری موجود ہے۔ ان کی قبر قصبہ کاکوری کے تکیہ بے نواشاہ میں اسپتال کی عمارت کے مضافات میں اب تک ہے اور زبان حال سے اپنی ویرانی کا مرثیہ پڑھ رہی ہے اور گویا گزرنے والوں سے کہہ رہی ہے ؎

فاتحہ پڑھتے چلیں تربت ارماں پہ ذرا ان سے اتنا بھی ہو فرصت کبھی ہو دیکھو کبھی ہو

لیکن باینہمہ لوگ پاس سے گزرتے ہیں اور کسی کو توفیق نہیں ہوتی، یہی شخصیت وہ شخصیت تھی کہ بقول صاحب جواہر الانشا۔

"در عہد عالمگیر بادشاہ ہیچ کار بے ضابطہ از خطاب و سواری فیل و پالکی جھالردار و عطائے سرپیچ مرصع نمی شد واحدے را مجال و یارائے نہ کہ از مرکز اعتدال و مرتبہ خود پا بیروں گذارد و کارے خلاف ضابطہ نماید لیکن شیخ (عبد اللہ) از حضور بادشاہ بہ منصب دو ہزاری سرفرازی می داشت و عطائے پالکی جھالردار و سرپیچ مرصع شدہ مامور بہ سواری فیل بود و ہم ہفت ہزار سوار و پیادہ بدستخط خود نوکر گرفتہ عمل محالات متعلقہ می نمود و سامان کار می داد۔

مولوی حکیم عبد اللہ

عہد عالمگیر کی نامور شخصیتوں میں سے ہوئے ہیں، دربار سے تعلق بھی ان کا رہا انھوں نے عمر سو سال سے بھی زائد پائی اور عالمگیر کے بعد کے دربار بھی انھوں نے دیکھے کہتے ہیں کہ ان کے مزار پر پانی چھڑک کے دعائیں لوگ مانگتے اور باران رحمت کے لیے ہاتھ اٹھاتے تو بارش ہو جاتی۔ ان کا مزار قصبہ کاکوری کے ایک محلہ ولی نگر میں ہے۔ اہل قصبہ ان کے دوران قیام وطن میں آتے اور ان کے ملفوظات سے مستفید ہوتے یہی جواہر الانشا کے مصنف جن کا ذکر صفحات ماقبل میں ہوا ان کے ارشد تلامذہ میں سے ہوئے ہیں۔ فن طب میں کمال رکھتے اور نباضی میں شہرہ آفاق انھیں حاصل ہوا، بڑے بڑے امرا اور نواب زادے مزمن اور مہلک بیماریوں میں ان کا علاج کر کے فائدے اٹھاتے اور انھیں جاگیروں سے نوازتے، یہ اکیس سال محض علم طب کے حصول میں وطن سے باہر رہے اور جب وطن اس مدت مدید کے بعد آئے تو اعزہ و اقربا کو ان کی شناخت کرنے میں دشواری ہوئی، ان کی فراست اور رسائی دماغ کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص ان کے سامنے سے گزرا جو بظاہر اچھا خاصا تھا آپ پاس والوں سے اس کو دیکھ کے کہنے لگے کہ آپ لوگ اس متحرک مردے کو دیکھ لیں اس میں قوت اور سکت نہیں مگر بس پھر رہا ہے، اس کے مرنے کے دن قریب ہی ہیں، چنانچہ ایسا ہوا کہ ایک ہی ہفتہ میں

مرض کا بحران ہوا اور وہ چل بسا، اکثر تشخیص مرض کے لیے نبض اور قارورہ بھی نہ دیکھتے اور صورت دیکھ کے مرض کو تاڑ لیتے۔ ان کا بیشتر وقت یاد الٰہی اور کتب حکمت کے مطالعہ میں گزرتا، آپ نے عجب تپ دق اور اسہال کبدی کے بڑے بڑے پیچیدہ علاج کیے اور مریضوں کو شفا ہوئی، ان کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ خواہ کیسے ہی ذی ثروت لوگ ان کو علاج کے لیے گھر پر بلاتے مگر وہ کہیں نہ جاتے، ان کے تحفہ تحائف قبول کرنے سے بھی احتراز کرتے، بڑے فارغ اور بڑے صابر وضابط تھے۔ شروع شروع شیخ ثناء اللہ لکھنوی کی ہمراہی میں دلی گئے اور بعد چندے منصب دار شاہی ہو گئے۔ زمانہ طفولیت ان کا اپنے والد ماجد کی نگرانی میں گزرا خوش نویسی کی مشق حاصل کی اور وقت کے بڑے بڑے خوش نویسوں پر فوقیت حاصل کر لی۔ فارسی پڑھی تو ایسی کہ اس میں ید طولی انھیں حاصل ہو گیا۔ نیز نثر نویسی اور شعر گوئی میں انھیں پورا پورا امتیاز حاصل تھا ان کے اکثر معاصرین ان کی شاگردی کا دم بھرتے، دست کاری میں بھی امتیاز حاصل تھا۔ لوگ ان کی دست کاری کا لوہا مانتے۔ جب یہ سب کچھ حاصل کر چکے والد ماجد کے حکم سے علوم عربیہ کی تحصیل میں لگ گئے۔ ابھی متوسطات تک پہونچے تھے کہ والد ماجد کا سایہ اٹھ گیا۔ انھیں کے مضافات میں کسی راجہ کے یہاں نوکری کر لی اور ۱۲ برس تک اس راجہ کی مصاحبت میں عیش وعشرت سے گزر اوقات کی۔ اتفاق سے راجہ علم موسیقی کا بڑا شائق تھا اس فن سے خود تو واقف تھا ہی اسکے دربار میں بڑے بڑے موسیقی کے ماہر جمع رہتے ان کی دیکھا دیکھی مولوی حکیم عبداللہ کو بھی شوق دامنگیر ہوا اور ۱۲۰۰ سو روپئے جمع کر کے آلات موسیقی خرید ے، خود نہایت ہی خوش گلو، خوش لحن اور خوش آواز تھے یہ اس کے بعد ہوا کہ ملازمت سے برداشتہ خاطر ہو کے کل سامان عیش اثاثہ اور گھوڑا اسکے بیچ ڈالا اور اس کو بیچ کے فن طب کی کتابیں خرید لیں کبھی کبھی اس عہد کے حکماء سے درس لیتے اور ادھر ادھر کچھ پڑھتے رہتے۔ عطاروں کی دوکانوں پر بیٹھ کے دواؤں کی ناپ تول اور دواؤں کی پہچان حاصل کرتے رہے اور کہتے ہیں کہ حکیم علوی خاں دہلوی سے انھوں نے رجوع کیا اور فن کے کمال نے، جب علم طب سیکھنا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ سے یہ عہد بھی کر لیا کہ فی سبیل اللہ دوا کروں گا۔ علوی خاں نے انھیں بہت سے ذاتی مجربات بتائے۔ مطب میں ان سے نسخے لکھواتے اور کبھی کبھی فن طب کے علاوہ دوسرے فنون کے درس بھی دیتے۔ بعد حصول طب وطن آکے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور خلق اللہ کو طرح طرح کے فائدے پہونچاتے رہے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

ترجمہ

وحید الدین خاں

لبرل اسلام

مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ نئے دور کے تقاضوں کے مطابق اسلام پر جس نظرثانی کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اس کے تعارف کے طور پر الفرقان، اپریل ۱۹۶۵ء میں ایک تحریر "لبرل اسلام" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ یہ دراصل مسٹر آصف فیضی کی کتاب[1] A MODERN APPROACH TO ISLAM کا ایک حصہ تھا، ذیل میں اس کتاب کے چوتھے باب اسلام کی تعبیر نو (THE REINTERPRETATION OF ISLAM) کا ترجمہ دیا جا رہا ہے۔

اسلام کا مطالعہ ایک تاریخی مظہر کی حیثیت سے، پچھلی دو صدیوں میں نہایت احتیاط کے ساتھ کیا گیا ہے، سولہ یا سترہ ملکوں میں اس کا پھیلاؤ اور اس کے پیرووں کی کثرت، مختلف اقتصادی مذہبی اور نسلی قوتوں کا نتیجہ تھا۔ آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چار سو ملین ہے۔ اب یہ عام طور پر مان لیا گیا ہے کہ اسلام نے ایک عظیم تہذیب پیدا کی۔ اور یہ کہ ادب، سائنس، فلسفہ، دینیات، تاریخ اور قانون کو ترقی دینے میں اس کے علماء کا اہم حصہ ہے۔ جمالیات کے میدان میں مسلمان تعمیرات کے اعتبار سے سب سے آگے تھے۔ اس کے آرٹسٹوں نے نقاشی اور موسیقی پر گہرا اثر ڈالا، اور دستکاری مثلاً برتن سازی، پچہ کاری، خطاطی، جلد سازی، زردوزی، لباس سازی اور طباخی کے فنون کو ترقی دی۔ اور اب، تاخیر کے بعد، علماء کے درمیان عام طور پر تسلیم کیا

---

[1] ایشیا پبلنگ ہاؤس، بمبئی، ۱۹۶۲ء، صفحات ۱۲۰۔

گیا ہے کہ اسلام کا پھیلاؤ خون کے پیاسے اور آستین چڑھائے ہوئے عربوں کی تلوار کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ محمد ابن عبداللہ کی تعلیمات اور آپ کی شخصیت کا نتیجہ تھا، جن کو ٹائن بی انسانیت کے عظیم محسنوں میں سے ایک شمار کرتا ہے۔[۵۹]

یہ ایک تازہ ترین خیال ہے۔ ورنہ قدیم یورپ میں محمدؐ کو مرگی زدہ، جعل ساز، تفرقہ انداز اور جھوٹا رسول سمجھا جاتا تھا اور کافرانہ بت پرستی کے موضوع (PAGAN IDOL) سے زیادہ آپ کی حیثیت نہیں تھی۔ رائے کی یہ تبدیلی اسلام اور اس کی زبانوں کے مطالعہ میں اضافہ کی وجہ سے ہے اور صداقت کے اس انکشاف کی وجہ سے ہے جو علمی تحقیق کا طریقہ اختیار کرنے کے بعد حاصل ہوئی ہے! "ایک جھوٹا رسول جو وحشیانہ قوت استعمال کرنے کا عادی تھا"— یہ تاریخ کی اہم ترین تہذیبی قوتوں میں سے ایک (اسلام) کی بالکل سادہ سی توجیہہ بن گئی تھی۔ گاندھی کے ظہور اور ہندوستان کی آزادی کے بعد ثابت ہو گیا کہ انسانی قوت کے مقابلہ میں تلوار ایک کمزور ہتھیار ہے۔ اس طرح علمی دنیا آہستہ آہستہ اسلام کو مطالعہ کا ایک قیمتی موضوع سمجھنے کی طرف آئی اور اب یہ ایک بدیہی مسلمہ قرار پا چکا ہے کہ اسلام اور اس کی قوتوں کا فہم اس کے مذہب اور قانون کے گہرے مطالعہ کے بغیر ناممکن ہے۔ یورپی مستشرقین نے انیسویں صدی کے دوران میں اس اعتبار سے کافی کام کیا ہے۔ مگر ہمارے اوپر سب سے زیادہ احسان ڈچ مستشرق سی۔ اسناوک ہرگرونجی (C. SNOUCK HURGRONJI) کا ہے جو اسلامی فلسفۂ قانون کے مطالعہ کے جدید اسکول کا بانی ہے۔ اس کے بعد گولڈزیہر (GOLDZIHER) ونسنک (WENSINCK) برسٹراسر (BERSTRAESSER) نے اس کی پیروی کی۔ اور اب اس زمرہ میں سین ٹلانا (SANTILLANA) ملیٹ (MILLIOT) شاخت (SCHACHT) اور ٹائن (TYAN) کے نام ہیں۔[۶۰]

اسلام میں قانون (LAW) مذہب (RELIGION) سے الگ نہیں۔ دونوں دھارے ایک ہی نہر میں بہتے ہیں اور ناقابل امتیاز ہیں۔ ان کو شریعت اور فقہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ گویا اسلام کے مذہبی قانون کے دو پہلو ہیں۔ شریعت کا دائرہ زیادہ وسیع ہے وہ اپنے حلقہ میں

---

[۵۹] CIVILIZATION ON TRIAL (LONDON 1953), 146

سارے انسانی اعمال کو لے لیتی ہے۔ فقہ نسبتاً محدود ہے اور اسی شعبے سے بحث کرتی ہے جس کو عام طور پر قانونی اعمال (LEGAL ACTS) کہا جاتا ہے۔ شریعت ہمیشہ ہم کو الہام کی یاد دلاتی ہے یعنی وہ علم جس کو ہم قرآن و حدیث کے سوا کہیں سے حاصل نہیں کر سکتے۔ فقہ میں عقلی قوتوں پر زور ہے اور علم نبوت سے استنباط کیا جاتا ہے۔ شریعت کا راستہ خدا اور اس کے رسول نے مقرر کر دیا ہے، فقہ کی عمارت انسانی کوششوں سے کھڑی ہوتی ہے۔ فقہ میں کوئی عمل قانونی ہوتا ہے یا غیر قانونی، ما یجوز و ما لا یجوز، جائز یا ناجائز۔ اور شریعت میں پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے اعتبار سے عمل کے مختلف درجے ہیں۔ فقہ ایک اصطلاح ہے جو قانون کے لیے فنی مفہوم میں استعمال ہوتی ہے اور شریعت راستبازی کا وہ قانون ہے جو براہ راست خدا نے مقرر کیا ہے۔ تاہم صفائی کے ساتھ یہ اعتراف کیا جا سکتا ہے کہ دونوں کے درمیان امتیازی خط صاف طور پر کھنچا ہوا نہیں ہے اور مسلم علماء خود بھی اکثر اوقات دونوں اصطلاحوں کو مترادف الفاظ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ تمام انسانی اعمال کا معیار (CRITERION) خواہ وہ شریعت کے دائرے کا ہو یا فقہ کے دائرے کا، ایک ہی ہے ——— اور وہ ہے ایک معیاری ضابطہ کی پیروی کر کے خدا کی رضا حاصل کرنا۔ ۸۶

مذہب کا دعویٰ ہے کہ خدا ایک ہے اور ہم سب اس کے بندے ہیں، جمہوریت کا اصرار ہے کہ اسٹیٹ ایک ہے اور اس کے قوانین سب پر یکساں حیثیت سے عائد ہوتے ہیں، قوانین غیر شخصی اور خارجی احکام (OBJECTIVE RULES) ہیں جن کو ریاست اپنے تمام شہریوں پر بلا استثنا نافذ کرتی ہے۔ مگر مذہب کی بنیاد عظیم معلمین کے شخصی تجربات پر ہے۔ اس کی اپیل شخصی، فوری اور وجدانی ہوتی ہے۔ جبکہ اس کے احکام اور اس کے طور طریقے کسی گروہ میں عمومی حیثیت سے نافذ کیے جا سکتے ہیں۔ اس کا اندرونی عقیدہ مخصوص طور پر شخصی ہے، کوئی ریاست مذہبی وفاداری کو اس طرح بالجبر نافذ نہیں کر سکتی جس طرح وہ اس کے قوانین کو نافذ کر سکتی ہے۔ مذہب اسلام ایک خدا اور اس کے پیغمبروں پر عقیدہ رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر اسلام ایسا نہیں کر سکتا اور نہ اسے کرنا چاہئے کہ وہ متعین کرے کہ کس طرح لوگوں کے اوپر اس عقیدے کی اطاعت کو بزور نافذ کیا جائے۔ بزور نافذ کرنے سے مراد (۱) ایک چیز

کے کرنے کا حکم دینا اور (۲) اس کی عدم تعمیل پر سزا دینا ہے، عقیدے کا ایک معاملہ کس طرح خارجی طاقت کے ذریعہ نفاذ کا معاملہ بن سکتا ہے۔ ایک معلم مجھے تعلیم دے سکتا ہے، وہ اپنے نمونہ سے مجھے متاثر کر سکتا ہے، وہ میرے جذبات کو بھڑکا سکتا ہے، مگر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ مجھے اپنے عقیدے پر مجبور کر سکے۔ اس طرح ایک قانونی حکم جو بذریعہ ریاست نافذ کیا جا سکتا ہے اور ایمان وضمیر جو تمام تر ایک شخص کا ذاتی معاملہ ہے، دونوں کے درمیان کھلا ہوا فرق ہے۔ ۸۶

آج اسلام کی سب سے بڑی مشکل یہی ہے۔ شریعت، قانون اور مذہب دونوں پر مشتمل ہے۔ مذہب کی بنیاد روحانی تجربہ (SPIRITUAL EXPERIENCE) پر ہے۔ قانون کی بنیاد اجتماع کی خواہش پر جو اسکی مقننہ کے ذریعہ ظاہر ہوئی ہو یا کسی ایسے حاکم کے ذریعہ ظاہر ہوئی ہو جو قانون سازی کا مجاز ہو۔ مذہب اپنے اندرونی مغز کے اعتبار سے ناقابل تغیر ہے۔ یہ اندرونی مغز ہے خدا کی محبت خدا کے لیے جس کے ترانے تمام دنیا کے عارفوں اور صوفیوں نے گائے ہیں۔ اگر شریعت ان دونوں چیزوں کا نام ہے تو ہر ایک دوسرے کو برابر مخالف سمت میں کھینچتی رہیں گی۔ خدا کی معرفت ایک راز ہے اور انسان ہمیشہ اس کی تلاش میں رہے گا۔ اس تلاش میں ہر عقیدے کے لوگ بلا لحاظ مذہب برابر ہیں۔ مگر قوانین میں ملک ملک اور زمانے زمانے کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے، ان کے لیے ناگزیر ہے کہ سماج کے بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ عربوں کے قوانین اسکیمو پر منطبق نہیں کیے جا سکتے، آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کے قوانین اتر پردیش کے زرخیز علاقے کے لیے غیر موزوں ہیں۔ قوانین وقت اور حالات کی کٹھالی میں دھات کی مانند ہیں۔ وہ پگھلتے ہیں، وہ آہستہ آہستہ مختلف شکلوں میں منجمد ہوتے ہیں۔ وہ دوبارہ پگھلتے ہیں اور مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں۔ ارتقاء کا یہ طریقہ انسانی سماج سے ہم رشتہ ہے۔ کوئی بھی چیز ساکن نہیں ہے سوا اس کے جو مردہ اور خالی از حیات ہو۔ قوانین بھی ساکن نہیں رہ سکتے۔ ہندوستان ہماری آنکھوں کے سامنے بقیہ دنیا کے ساتھ تبدیل ہو رہا ہے۔ یہ تبدیلیاں نتیجہ ہیں فطرت کے اوپر ہمارے کنٹرول کا، زندگی کے بارے میں ہمارے تصورات کا، اور ہماری اس خواہش کا

کہ ہم انسان کے سماجی حالات کو ترقی دیں۔ ہماری مقننہ قوانین کا ایک سیلاب بہا رہی ہے اور قانون سازی کی یہ کوشش سماج کے اندر ہمارے عمل کو متعین کر رہی ہے۔ ۸۷

مگر انسان کا ذہن اور اس کا ضمیر آزاد ہیں۔ اس کو اجازت ہونی چاہیے کہ کائنات کی آخری حقیقتوں کے بارے میں جو عقیدہ چاہے رکھے۔ اس کے عقیدہ اور خیال کو بیڑی نہیں پہنائی جا سکتی۔ اس طرح اسلام میں ایک اندرونی کشمکش جاری ہے۔ اولاً مذہبی قانون کے عمر رفتہ تصورات (AGELESS CONCEPTS) جدید تمدنی قانون سے ٹکرا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر بیمہ یا وہ قرضے جو حکومت جاری کرتی ہے۔ بیمہ اور سود کا لینا یا دینا شریعت کے اعتبار سے ممنوع ہے۔ جبکہ جدید ریاست (MODERN STATE) میں نہ صرف اس کی اجازت ہے بلکہ وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

ثانیاً۔ پرانے قانون کے تشدد کو ختم کرنے کے لیے اسلام کے قدیم قانون پر ایک نئے نظام کا قلم لگایا جا رہا ہے، یا یوں کہنا چاہیے کہ ایک نیا قانونی مجموعہ شریعت کی جگہ لے رہا ہے۔ اول الذکر کی ایک مثال ہندستان کا اسلامی قانون ہبہ (MUHAMMADAN LAW OF GIFTS) ہے جس میں انگلستان کا اصولِ مساوات فقہ (اصل اسلامی قانون) کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ موخر الذکر کی مثال ہندوستان کا قانون شہادت ہے جس نے اسلام کے قانونِ شہادت کو مکمل طور پر بدل دیا ہے۔ تمام اسلامی ملکوں میں یہ دہرا عمل جاری ہے۔ دنیوی قانون (SECULAR-LAW) شریعت کے قانون کو ختم کر رہا ہے اور اس کی جگہ لیتا جا رہا ہے۔ شمالی افریقہ میں فرانسیسی اصول قانون، وسط ایشیا میں روسی قانون، ہندوستان میں انگلش کامن لا، انڈونیشیا میں ڈچ قانون، اور سب سے بڑھ کر بین الاقوامی قانون جو اتنا زیادہ متاثر ہوا ہو کہ نہ صرف قانون کا ظاہری ڈھانچہ بدل گیا ہے، بلکہ اس نے مسلمانوں کے تصور انصاف تک کو بدل دیا ہے۔

یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شریعت قانون اور مذہب دونوں ہے، قانون عین اپنی فطرت کے اعتبار سے تبدیلی کو قبول کرتا ہے۔ اس کے برعکس مذہب کا مغز ناقابل تغیر ہے، یا کم از کم خدا کا عقیدہ غیر متبدل آدرش (UNALTERABLE IDEAL) ہے، ایک دوامی تلاش

(PERENNIAL QUEST) ہے۔[۱] اگر اسی طرح کی دو مخالف قوتیں ایک ساتھ رکھی جائیں تو ان کے درمیان ٹکراؤ ہونا لازمی ہے۔ یہی وہ ٹکراؤ ہے جو اس کتاب کا بنیادی موضوع ہے۔ میرا حل یہ ہے کہ۔

۱۔ مذہب اور قانون کی تشریح بیسویں صدی کی اصطلاحات میں کی جائے

۲۔ اسلام میں مذہب اور قانون کے درمیان فرق کیا جائے۔

۳۔ اس بنیاد پر اسلام کی تعبیر کی جائے اور اسلام کے عقیدے کو ایک نیا مفہوم دیا جائے۔

اگر اس تجزیہ سے بعض ایسے عناصر میں ترمیم واقع ہو جائے جن کو ہم روح اسلام کا جزو سمجھتے رہے ہیں یا انھیں بالکل چھوڑ دینا پڑے تو ہمیں حالات کے اس فیصلے کو قبول کرنا چاہیے۔ اگر اندرونی عقیدہ بچایا جا سکے اور اس کو طاقتور بنایا جا سکے تو اس قسم کا آپریشن اگرچہ وہ کافی تکلیف دہ ہوگا، وہ ایک ایسے جسم کو صحت اور طاقت دے گا جو خون کی کمی کی وجہ سے سوکھ رہا ہے اور جس کی رہنمائی کے لیے کوئی تازہ آئیڈیل موجود نہیں۔ ۸۸

تعبیر نو کی ضرورت

جب ہم مسلمانوں کے عقیدے کا جائزہ لیں تو ہم کو عام طور پر راسخ العقیدہ اور غیر راسخ العقیدہ کے درمیان فرق کرنا چاہیے۔ یہ کوئی علمی تقسیم نہیں ہے اور ہم کو اس مفروضہ پر نہیں چلنا چاہیے کہ ایمان وضمیر کے معاملات کی بالکل دو ٹوک طریقے سے تقسیم ممکن ہے۔ لوگوں کے عقائد میں باریک باریک فرق ہیں۔ کوئی لاادریت کا قائل ہے اور کوئی بے اعتقادی میں مبتلا ہے۔ عقیدہ کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ ریاضیاتی طرز کی تقسیم غلط نتیجہ تک پہونچائے گی۔ اس لیے ہماری عام اور لچک دار تقسیم یہ ہوگی:

۱۔ راسخ العقیدہ مسلمان۔

۲۔ غیر راسخ العقیدہ یا زیادہ بہتر الفاظ میں غیر مقلد (NON-CONFORMIST)

---

[۱] پہلے مذہب کے قانونی احکام دور جدید کے لیے ناموزوں نظر آئے۔ پھر شعائر اور عبادات اور مناسک غیر ضروری روایات قرار دے کر فہرست سے خارج کر دیے گئے۔ اب عقیدہ رہ گیا تھا۔ مگر وہ بھی جدید تصورات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں کسی متعین شکل میں باقی نہیں رہا بلکہ محض ایک مجمل آئیڈیل بن کر رہ گیا جس کی تلاش میں انسان ہمیشہ سرگرداں رہے گا اور شاید کبھی پا نہ سکے گا۔ وحید الدین

راسخ العقیدہ سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو اسلام کے باضابطہ عبادتی رسوم (REGULAR RITUAL) پر اعتقاد رکھتے ہوں، خواہ اس کی پابندی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں اور وہ اب بھی اس پر مطمئن ہوں کہ بحیثیت مجموعی مذہب کا جو ڈھانچہ ائمہ نے مقرر کیا ہے، وہی اصل مذہب ہے اور عبادت کی جو رسوم ہیں وہ آج کے مسلمانوں کے لیے بھی مفید ہیں اور اس میں کسی قسم کی انقلابی تبدیلی خطرناک ہوگی۔ یہ ناممکن ہے اور شاید نامناسب بھی کہ ہم اس گروہ کی مزید تفصیلات میں جائیں۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ سنجیدگی کے ساتھ مخصوص عبادتی رسوم پر عقیدہ رکھتے ہیں اور بڑے پیمانے پر اس کے اوپر عمل کر رہے ہیں جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ۔ اگر وہ بعض احکام شریعت پر عمل نہ بھی کر پاتے ہوں تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کی غفلت ہے اور یہ ان کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ عبادتی رسوم کے قدیم ڈھانچہ کو پوری طرح برقرار رکھیں۔ ان میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو عبادتی رسوم میں بہت معیاری ہیں مگر عقیدہ اور کردار میں کمزور ہیں۔ اور ایسے لوگ بھی ہیں جو کردار میں پختہ ہیں مگر عبادتی رسوم میں پیچھے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو خدا پر اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ پر زبردست اعتقاد رکھتے ہیں، ان میں کچھ ایسے ہیں جو زندگی کے دھارے کے ساتھ بہہ رہے ہیں، قسمت کی طرف سے بے فکر ہیں، ضمیر کی خلش سے آزاد ہیں۔ مگر بچپن کے عقیدے سے ان کا دماغ پر ہے۔ یہ سب اور دوسرے وہ لوگ جو اسلام پر اس کے قدیم ڈھانچہ اور عقیدہ کے مطابق ایمان رکھتے ہیں، وہ ہماری تقسیم کے مطابق "راسخ العقیدہ" مسلمان ہیں، خواہ عقیدہ، کردار اور عمل کے اعتبار سے وہ کتنے ہی مختلف ہوں اور خواہ وہ عقائد کی پوری فہرست کو مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں۔ ۸۹

غیر مقلد (NON-CONFORMISTS)، یا اگر آپ چاہیں تو ان کو غیر راسخ العقیدہ (UNORTHODOX) کہہ لیجئے۔ وہ بنیادی طور پر پہلے گروہ سے مختلف ہیں۔ غیر راسخ العقیدہ کی اصطلاح کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ سچ پوچھئے تو اسلام میں راسخ العقیدہ اور غیر راسخ العقیدہ کی اصطلاح سرے سے نہیں ہے۔ صرف ایک منظم چرچ ہی راسخ العقیدہ، غیر راسخ العقیدہ اور بدعتی کے معیار مقرر کر سکتا ہے۔ اگر چرچ نہ ہو تو کسی شخص کے بارے میں یہ تصور کرنا ہی مشکل ہوگا کہ فلاں شخص بدعتی ہے اور فلاں راسخ العقیدہ ہے۔ مگر مدعا کی وضاحت کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ غیر مقلد وہ ہے جو اسلام کے باضابطہ عبادتی رسوم (نماز وغیرہ) پر عقیدہ نہیں رکھتا

اور ائمہ کی مقرر کی ہوئی بنیاد کو قبول نہیں کرتا۔ ایمان کی معیاری تعریف یہ ہے :-

۱۔ زبان سے اقرار۔

۲۔ عقیدے کی سچائی (SINCERITY OF BELIEF)

۳۔ اصول اسلام کے مطابق عمل (جیسا کہ شارع نے مقرر کیا ہو)

غیر مقلد[1] پہلی چیز کو چھوڑ کر شکل ہی سے کسی اور پر پورے معنی میں عمل کرتا ہے۔ عقیدہ کا مخلصانہ اقرار اسلام کی واحد کسوٹی ہے۔ عقیدہ بعض معاملات میں غلط فہمی پر مبنی ہو سکتا ہے۔ جیسے اسلام کے عبادتی رسوم اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ ناقابل قبول ہیں۔ یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو غیر مقلدیت پیدا کرتا ہے۔ اگر آپ نظریاتی طور پر متفق ہوں مگر عمل نہ کرتے ہوں جب بھی آپ راسخ العقیدہ ہیں۔ البتہ اگر آپ بعض عقائد یا اصول کا انکار کرتے ہوں۔ سوا خدا و رسول کے عقیدہ کے، تب آپ غیر مقلد ہیں۔

ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک اچھا خاصا تناسب اسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو ائمہ کو سند تسلیم نہیں کرتے، کچھ نماز کو ضروری نہیں سمجھتے۔ کچھ ایسے ہیں جن کا اعتقاد ہے کہ عمل ہی عبادت ہے (WORK IS PRAYER) کچھ ایسے بھی ہیں جو خود مذہب کے خلاف بحث کرتے ہیں مگر جانچ کا اصلی معیار پھر بھی باقی رہتا ہے ـــــ کیا آپ اس اسلام کو جسے ائمہ نے مرتب کیا ہے، بحیثیت مجموعی اور عام طور پر ساری انسانیت کے لیے مفید اور صحیح سمجھتے ہیں۔ ـ ۹

میرا عاجزانہ جواب، اسلام کی صداقت کو مانتے ہوئے اور اس کا احترام کرتے ہوئے، نفی میں ہے اور اس لیے میں ایک غیر مقلد ہوں (NON-CONFORMIST) ہوں۔ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ میں مذہب کا منکر (NON-BLIEVER) نہیں ہوں، منکر وہ شخص ہے جو بذات خود مذہبیت کی واقعیت یا اسلام کا انکار کرے یا کم از کم مذہبی عقائد کے بعض بنیادی اصولوں کو چیلنج کرے۔ ایک غیر مقلد مذہب کے بعض اعمال یا

[1] غیر مقلد کا لفظ یہاں اس مفہوم میں نہیں ہے جس مفہوم میں وہ مذہبی حلقوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ مضمون کے اپنے مفہوم میں ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔

تصورات پر معترض ہو سکتا ہے یا اس کا انکار کر سکتا ہے، مگر پھر بھی وہ بنیادی طور پر ایک مذہبی شخص ہوگا۔ وہ مذہب میں اپنی ذاتی بصیرت کے مطابق اعتقاد رکھتا ہے نہ کہ روایتی تصورات کے مطابق۔ تاریخی شہادتیں بتاتی ہیں کہ غیر مقلد اکثر بہت گہرے عقیدے کے لوگ رہے ہیں اور غیر مقلد وہ اسی لیے تھے کہ مذہب میں وہ غیر متزلزل عقیدہ رکھتے تھے، میں یہ ماننے سے انکار کرتا ہوں کہ عقائد کا موجودہ ڈھانچہ ہمارے لیے مفید ہے یا ہمارے آج کے دور میں بھی وہ اپنے اندر صداقت رکھتا ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ اپنے عقیدے کی از سر نو تشریح کروں۔ یہ میرا ارادہ نہیں ہے کہ میں ایک نیا فرقہ بناؤں اور نہ میں کوئی مذہبی معلم ہوں۔ مگر اس تلاش اور اس جہم میں قطعیت کے ساتھ میں یقین رکھتا ہوں کہ اسلام جیسا کہ میں نے اسے سمجھا ہے، وہ بیسویں صدی کے انسان کو بہت کچھ دے سکتا ہے۔ میں اس مروجہ تشریح کو قبول نہیں کر سکتا جو سنی اماموں یا شیعہ مدارس فکر نے پیش کی ہیں۔ پیچیدہ تفصیلات، بے معنی عبادتی رسوم اور بے روح تصورات نے مجھے جمود میں مبتلا کر دیا ہے۔ ذیل میں کوشش کروں گا کہ مختصر طور پر اسلام کی آزادانہ تشریح (LIBERAL INTERPRETATION) کی ایک اسکیم پیش کروں۔

(باقی)

مرتبہ

عتیق الرحمٰن صدیقی ایم۔ اے

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ دس شلنگ

(فی کاپی ۶۰ پیسے)

جلد ۳۳ | بابتہ ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ مطابق جنوری ۱۹۶۶ء | شمارہ ۹

اگر اس دائرہ میں ○ سرخ نشان ہے، تو

اسکا مطلب ہے کہ آپکی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۔۔ جنوری تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر ایڈیٹر پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سکھوں کی قیادت پنجابی صوبے کی جدوجہد کے لیے ایک انتہا پسندانہ پروگرام کا اعلان کر چکی تھی کہ اسی دوران میں کشمیر کے اندر گڑبڑ شروع ہوگئی جو آگے بڑھ کر باقاعدہ جنگ کی شکل اختیار کرنے لگی مگر سکھ قیادت اپنا پروگرام واپس لینے پر تیار نہیں ہوئی حتیٰ کہ اس سلسلے میں عین پنجاب کی سرحد پر شدید جنگ شروع ہو جانے کے بعد بھی، بڑی مشکل سے اس قیادت نے اپنا پروگرام صرف عارضی طور پر ملتوی کیا۔ اور جونہی یہ جنگ بند ہوئی، وہ دوبارہ اپنی صفیں درست کرتے ہوئے نظر آنے لگے ــــــ یہ اسی ہندوستان کی ایک تصویر ہے۔

دوسری ایک تصویر، ٹھیک اس کے بالمقابل یہ ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان کوئی نئی چیز نہیں مانگ رہے تھے، بلکہ سو سال پہلے تنہا اپنے بل بوتے پر جس مسلم یونیورسٹی کی داغ بیل ہم نے ڈالی تھی، اسے ایک مسلمان وزیر ہی کے شوقِ سیکولر نمائی کے صدقے میں کلیتہً حکومت کے قبضے میں جاتے ہوئے دیکھ کر فریاد کر رہے تھے کہ ایسا نہ کیا جائے۔ لیکن جونہی کشمیر میں مذکورہ بالا گڑبڑ کا آغاز ہوا، ہم نے احتجاج و فریاد کی یہ بساط از خود ہی لپیٹ کر رکھ دی اور اس کی جگہ ہماری زبانیں اپنی حکومت سے اظہارِ وفاداری اور پاکستان سے نبرد آزمائی کے نعروں سے ترنم ہانا شروع ہوگئیں۔ حتیٰ کہ اس دوران میں پارلیمنٹ کے اندر اس آرڈیننس کی منظوری کا بل آیا جس کے خلاف ہم احتجاج کر رہے تھے۔ اور اس شان سے پاس ہوا کہ باہر اس کے خلاف کوئی آواز نہیں تھی۔ صرف پارلیمنٹ کے اندر کوئی کوئی آواز اس کے خلاف سنائی دے جاتی تھی جو ناگزیر تھی۔ اس بل کے پاس ہو جانے کے بعد مسلم یونیورسٹی کی ایگزیکیٹو کونسل اور کورٹ دونوں کے

ممبران تمام تر حکومت کے نامزد ہیں اور ان کے ذریعہ سے وزیر تعلیم مسٹر چھاگلا پوری طرح اس پوزیشن میں ہیں کہ اس مسلم یونیورسٹی اور اسکے مسلم طلبار کو جس جس طرح چاہیں سیکولرزم کا بپتسمہ دیں۔ اور ان اقدامات کا آغاز ہو بھی گیا ہے۔ چنانچہ ۲۰، ۲۱ نومبر ۶۵ء کو اس نامزد ایگزیکیٹو نے اپنے جلسے میں یہ سفارش منظور کی کہ یونیورسٹی میں خالص اسلامی دینیات کے بجائے مختلف مذہبوں، کلچروں اور ہندستانی تہذیب کی تعلیم طلبہ کو دیجائے۔ اور یہ اس لیے کیا جائے کہ اس ترمیم سے یونیورسٹی کا سیکولر کردار واضح ہوجائے گا ـــــ پھر اس سیکولر کردار کو مزید وضاحت بخشنے کے لیے یہ رائے بھی قائم کی گئی کہ یونیورسٹی کے نام میں بھی اس طرح کی تبدیلی مناسب ہوگی جس طرح کی تبدیلی ہندو یونیورسٹی کے نام میں راجیہ سبھا نے منظور کی ہے (یعنی مسلم کا لفظ ہٹا دیا جائے) مگر چونکہ راجیہ سبھا کی منظور کردہ یہ ترمیم ہندو عوام کی سخت مخالفت کا نشانہ بن گئی اور اس کے نتیجے میں لوک سبھا اس پر غور کرنے کی ہمت بھی نہ کرسکی اس لیے ایگزیکیٹو کونسل نے اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرنے سے قبل اتنی عنایت فرمائی کہ کورٹ کی رائے بھی اس مسئلہ میں معلوم کرلی جائے، جو اسکے نزدیک مسلمانوں کی عوامی رائے کے قائم مقام ہوگی۔

کورٹ نے ۱۹ دسمبر کو اس سلسلے میں رائے پیش کی ہو کہ "مسلم" کا لفظ تو نہ ہٹایا جائے البتہ اس سے پہلے لفظ "نیشنل" کا اضافہ کردیا جائے یعنی "نیشنل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ"۔ بظاہر تو یہ تجویز بڑی معصوم ہو کہ ایک لفظ بڑھا دینے سے کیا ہوتا ہے جبکہ اصل لفظ برقرار رہ جائے۔ مگر واقعہ یہ ہو کہ یہ پہلا لفظ دوسرے لفظ کو بالکل بے معنی کردیتا ہے۔ یہ مسلم یونیورسٹی کو نیشنلائز کرلینے کی موجودہ کارروائیوں کو جائز کرنے کا ایک ایسا ہی اقدام ہے جیسے لفظ "مسلم" کا ہٹا دیا جانا۔ البتہ اس فرق کے ساتھ کہ اس میں حجابات پنہاں ہے اُس میں وہ عریاں ہوجاتی۔

بہرحال مسلم یونیورسٹی کو سیکولر بنانے کے یہ تمام اقدامات ہو رہے ہیں، مگر جس طرح آرڈیننس کی منظوری کا بل پارلیمنٹ میں پاس کیے جانے پر مسلمانوں کے احتجاج کی لپٹی ہوئی بساط دوبارہ نہ بچھ سکی، اسی طرح یہ سب خبریں بھی آرہی ہیں اور عالم یہ ہے کہ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہو رہی۔ وہ مسلم یونیورسٹی جس پر چار مہینے پیشتر صرف خطرات کا سایہ دیکھ کر کوئی کسی سے پیچھے رہنے کو تیار نہیں نظر آتا تھا، اب ان خطرات کو واقعات کی شکل میں دیکھ کر بھی کوئی کسی سے آگے بڑھنے کو تیار نہیں۔ بلکہ اسکے بجائے اظہار وفاداری سے فرصت پانے کے بعد آپس کے محاذ گرم ہوئے ہیں۔

جمیعۃ علماء میں جو اختلافات کسی حد تک دبے دبے چل رہے تھے، اکتوبر کے مہینے سے ان پر پورے طرح شباب آیا ہوا ہے۔ ساری توتوں کا مصرف اب یہ آپس کی اٹھا پٹخ ہے۔ ابھی نومبر کے آخر میں ناراض گروہ کے زیر اہتمام جمیعۃ کی مجلس منتظمہ (جنرل باڈی) کا ایک جلسہ بھوپال میں منعقد ہوا جس نے برسر اقتدار گروہ کے بہت سے فیصلوں کو کالعدم قرار دیا۔ اور اب اس کے جواب میں مجلس منتظمہ ہی کا دوسرا جلسہ ۱۸، ۱۹ دسمبر کو دہلی میں ہوا ہے جس کے بعد کہنا چاہیئے کہ جمیعۃ کے اندرونی اختلافات کا ایک دور مکمل ہو گیا، دوسری طرف جمیعۃ کے ارباب اقتدار نے مجلس مشاورت سے بھی اپنا تعلق نہ صرف توڑ لیا ہے، بلکہ ۱۸، ۱۹ دسمبر کو دہلی والے اجلاس کا تو سارا زور ہی مجلس کی مذمت پر، اسے فرقہ پرست ٹھہرانے پر اور مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کی تلقین پر صرف ہوا ہے۔

غرض مسلم یونیورسٹی کا کیس جو ایک بار جوش وفاداری یا غلبۂ خوف کے نیچے دبا تو اب آنکھیں ترس رہی ہیں کہ ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

مگر کچھ لوگوں کو تو باہمی پیکار سے فرصت نہیں اور باقی لوگ خدا ہی بہتر جانے کہ کس عذر یا کس مصروفیت میں مبتلا ہیں ـــــــ حد یہ ہے کہ علی گڑھ کے اولڈ بوائز جنھوں نے بجا طور پر سب سے زیادہ اپنے آپ کو حقدار سمجھا تھا کہ اس کیس میں مسلمانوں کی نمائندگی کریں اور لکھنؤ میں جمع ہو کر ایک تجویز کی شکل میں عہد کیا تھا کہ وہ اپنی اس مادر درسگاہ کے مسلم کردار کو بدلنے کے ہر اقدام کی آخری دم تک سخت ترین مزاحمت کریں گے، وہ تو شاید مزاحمت کا کوئی ایک قدم اٹھائے بغیر ہی دم توڑ گئے اور اس عہد و پیمان کے بعد یہ تمام اقدامات جن کا خطرہ تھا وجود میں آتے چلے جا رہے ہیں، مگر ان کی ایک بار بھی کہیں آواز سنائی نہ دے سکی۔

اس طرح کی صورت حال دیکھ کر بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمان آخر ہندوستان میں کس طرح عزت و وقار کی زندگی بسر کریں گے۔ ان کے قائدین اگر کسی معاملے کو لے کر آخر تک چل نہیں سکتے تو پھر بھلا وہ ایسے معاملات پر تیز گفتار ہوتے کیوں ہیں، کیوں نہیں شروع ہی میں اپنا عذر یا وہ

ایسا لہجہ رکھتے کہ عدم شنوائی سے رسوائی تو نہ ہو۔ گزشتہ اٹھارہ برس میں مسلمان شاید کہیں اتنی بڑی ذلت سے دوچار نہیں ہوئے تھے جتنی اس یونیورسٹی کے کیس میں انھیں نصیب ہوئی ہے۔ اور قدرتی طور پر کمتری اور بے بسی کا جو احساس ان چند مہینوں میں ان پر طاری ہوا معمولی رفتار سے شاید مزید اٹھارہ برس میں بھی یہ نوبت نہ آتی ــــــ کیا عام مسلمانوں کی قیادت کرنے والوں اور علی گڑھ اولڈ بوائز کے سربراہوں کو اس کا احساس نہیں ہے؟ پھر آخر یہ سکوت کیا معنی رکھتا ہے جو یونیورسٹی کا کردار بدلنے کے ان تمام اقدامات کے باوجود طاری ہے جن کی خبریں پے بہ پے اخبارات لارہے ہیں؟ گستاخی معاف ہو ہمارا جی چاہتا ہے کہ ان تمام اصحاب میں سے ایک ایک کا گریبان پکڑ کر پوچھیں جنھوں نے کسی پلیٹ فارم اور کسی تنظیم کی نمائندگی کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی آرڈیننس اور مسٹر چھاگلا کے عزائم کو مسلمانوں کے جائز مفادات یا دستور کی رُو سے چیلنج کیا تھا، کہ اب وہ ساکت وصامت کیوں ہیں؟ اور اپنی تنظیم یا اپنے پلیٹ فارم کی استطاعت بھر وہ ان اقدامات کے مزاحم کیوں نہیں ہوتے جنھیں وہ مسلمانوں کے لیے ناقابلِ برداشت سانحہ قرار دیتے تھے؟ ــــــ ہمیں تعجب ہوگا اگر یہ معلوم ہو کہ ان حضرات کے دل میں خود یہ سوال نہیں اُبھر رہا ہے اور خود ان کا احساسِ ذمہ داری ان سے بازپرس نہیں کر رہا ہے!

واقعہ یہ ہے کہ مسٹر چھاگلا اور گورنمنٹ نے مسلمانوں کے ساتھ اتنی برائی نہیں کی جتنی برائی ان لوگوں نے کی جنھوں نے مسلمانوں کے اندر ایک جوش بھر کے انھیں کھڑا کیا اور پھر خود بیٹھ گئے انھیں کامرانی کی اگر کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی تو پسپائی کی کوئی "شاندار" نہ سہی آبرومندانہ راہ تو ڈھونڈھ سکتے تھے۔ مگر جس طرح وہ قوم سے کچھ کہے سُنے بغیر تکلیف میدان سے غائب ہوئے ہیں اُس نے قوم کے جسم پر آبرو کا ایک تار اور دل میں ڈھارس کی ایک رتی بھی نہیں رہنے دی ہے، کیا یہ کوئی معمولی جرم ہے؟ ہماری نظر میں یہ ایک عجیب تماشہ نمائندگان ملت کی سطح پر مسلسل ہو رہا ہے کہ گو اشتراک و تعاون کی تو کوئی قرارداد ان کے درمیان نہیں، مگر بظاہر ایک دوسرے کے سہارے چلا چلتا ہے۔ جہاں اس طرح کا کوئی مسئلہ سامنے آیا جس سے قوم کے جذبات و مفادات متاثر ہوتے ہوں اور نمائندہ حضرات کا فرض ہو جاتا ہو کہ وہ سامنے آئیں تو سب اپنی ذمہ داری سمجھ کر میدان میں آجاتے ہیں۔ مگر پھر اس میدان میں قائم بھی رہنا

تنہا کوئی اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتا۔ جب تک دائیں بائیں میدان بھرا ہوا ہے ہر ایک چاہتا ہے کہ اس کی آواز دوسرے سے نیچی نہ رہے، مگر جہاں دیکھا کہ میدان خالی ہونا شروع ہو گیا ہے یا کچھ لوگ آوازیں روک رہے ہیں تو بس احساسِ ذمہ داری کا سارا جوش ختم ہو جاتا ہے اور آن کی آن میں پورا میدان صاف! ـــــ یہ کیا مذاق ہے؟ ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آتا۔ اس صورت حال کا صرف ایک ہی مطلب ہے کہ مسلمانوں کی کوئی تنظیم اپنے اندر یہ طاقت نہیں پاتی کہ اس طرح کی جدوجہد کا بار تنہا اٹھا سکے۔ اور یقیناً ہر تنظیم پر یہ بات واضح بھی ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ مذاق بار بار ہوتا ہے اور کوئی یہ سوچنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ یہ روز روز کے تماشے مسلمانوں کو کس قدر مفلوج اور کس قدر بے آبرو کرتے جا رہے ہیں!۔

بات ذرا عمومی رُخ پر چلی گئی، ورنہ اس وقت کہنا صرف مسلم یونیورسٹی کے بارے میں ہے کہ کیا مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والے حضرات ان کے اس تاریخی اور نہایت قیمتی ورثے کو مسٹر چھاگلا کے لیے چھوڑ دیں گے کہ وہ نیشنلزم اور سیکولرزم کی داد پانے کے لیے جس طرح چاہیں اسے لٹائیں! یہ ٹھیک ہے کہ معاملہ اب صرف مسٹر چھاگلا کا نہیں رہا ہے بلکہ پوری حکومت اور حکمراں پارٹی کا ہو گیا ہے جس کی توقع نہیں تھی اور اسی لیے کامیابی کا وہ یقین و اعتماد جس کی بنیاد پر لوگوں نے آواز اٹھائی تھی بُری طرح یاس و ناامیدی میں بدل گیا ہے۔ لیکن کیا اس سے اس بات کی اجازت بھی نکلتی ہے کہ ہم اپنے کیس سے دستبردار ہو جائیں۔ اور یہ نوٹ بھی نہ کرائیں کہ جو کچھ فیصلہ ہوا ہے اور جو اس کے نتیجے میں ہو رہا ہے ہم اس پر راضی نہیں ہیں؟ کامیابی کی امید بے شک ہم ان حالات میں نہیں کر سکتے کہ پوری حکومت اور حکمراں پارٹی مسٹر چھاگلا کے کھیل کو کامیاب بنانے کے لیے اس طرح تُل گئی ہے جیسے یہ مدت سے اس کی آرزو ہو۔ لیکن اس پر ناراضگی کے اظہار سے تو ہمیں کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ بالخصوص ہندو یونیورسٹی ترمیمی بل کے سلسلے میں حکومت اور حکمراں پارٹی نے جو بالکل مختلف رویہ دکھایا ہے اور پارلیمنٹ کی بالاتری کے اس فلسفے کو، جس میں مسلمانوں کی چیخ پکار کا اثر لینا کسرِ شان سمجھا گیا تھا، جس طرح ہندو پبلک کے احتجاج کے سامنے تہ کر کے رکھا گیا ہے اس نے بھرپور موقع فراہم کیا ہے کہ ہم اپنے معاملے میں امتیازی رویہ کو اُلم نشرح کریں (باقی صفحہ ۵۶ پر)

معارف الحدیث

نفلی روزے

(بسلسلۂ گزشتہ)

مہینے کے تین روزوں کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول:-

عَنْ حَفْصَةَ قَالَتْ اَرْبَعٌ لَمْ تَكُنْ يَدَعُهُنَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صِيَامُ عَاشُوْرَاءَ وَالْعَشْرِ وَثَلٰثَةِ اَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ وَرَكْعَتَانِ قَبْلَ الْفَجْرِ ——— رواہ النسائی

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ چار چیزیں وہ ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ ایک عاشورہ کا روزہ، دوسرے عشرہ ذی الحجہ (یعنی یکم ذی الحجہ سے یوم العرفہ نویں ذی الحجہ تک) کے روزے، تیسرے ہر مہینے کے تین روزے، اور قبل فجر کی دو رکعتیں۔ (سنن نسائی)

تشریح:- مطلب یہ ہے کہ یہ چاروں چیزیں اگرچہ فرض یا واجب نہیں ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا اتنا اہتمام اور ایسی پابندی فرماتے تھے کہ کبھی یہ چیزیں ترک نہیں ہوتی تھیں۔

عَنْ مُعَاذَةَ الْعَدَوِيَّةِ اَنَّهَا سَاَلَتْ عَائِشَةَ اَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ

ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ قَالَتْ نَعَمْ فَقُلْتُ لَهَا مِنْ اَيِّ اَيَّامِ الشَّهْرِ كَانَ يَصُوْمُ قَالَتْ لَمْ يَكُنْ يُبَالِيْ مِنْ اَيِّ اَيَّامِ الشَّهْرِ يَصُوْمُ۔

رواہ مسلم

معاذہ عدویہ سے روایت ہے کہ میں نے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مہینے تین روزے رکھتے تھے، انھوں نے فرمایا ہاں آپ ہر مہینے تین روزے رکھتے تھے، معاذہ نے پوچھا کہ مہینے کے کس حصے میں (اور کن تاریخوں میں) رکھتے تھے؟ انھوں نے فرمایا کہ اسکی فکر نہیں فرماتے تھے کہ مہینے کے کس حصہ میں رکھیں۔ (صحیح مسلم)

تشریح) بعض روایات میں ہر مہینے کے شروع میں تین روزے رکھنے کا حضورؐ کا معمول ذکر کیا گیا ہے، اور بعض روایات میں مہینہ کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں کا، اور بعض روایات میں ہفتے کے خاص خاص تین دنوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس بیان سے جیسا کہ معلوم ہوا ان میں سے کوئی بھی آپ کا دوامی معمول نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ آپ کو سفر اور اس کے علاوہ بھی دوسری چیزیں بکثرت پیش آتی رہتی تھیں جن کی وجہ سے آپ کے لیے خاص تاریخوں یا دنوں کی پابندی مناسب نہیں تھی۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ آپ کا خاص تاریخوں اور خاص دنوں میں ہمیشہ روزے رکھنا اُمت کے مختلف الحال لوگوں کے لیے باعث زحمت ہوتا اور اس سے یہ غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی کہ یہ روزے واجبات میں سے ہیں۔ الغرض اس طرح کی مصلحتوں کی وجہ سے آپ خود خاص تاریخوں اور دنوں کی پابندی نہیں فرماتے تھے، اور آپ کے حق میں یہی افضل اور اولیٰ تھا، لیکن صحابہ کرام کو آپ مہینے کے تین دن کے روزوں کے سلسلہ میں اکثر ایام بیض (۱۳۔۱۴۔۱۵ تاریخ) کی ترغیب دیتے تھے جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیثوں سے معلوم ہوگا۔

ایامِ بیض کے روزے :-

عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

يَا اَبَا ذَرٍّ اِذَا صُمْتَ مِنَ الشَّهْرِ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ فَصُمْ ثَلٰثَ عَشْرَةَ وَاَرْبَعَ عَشْرَةَ وَخَمْسَ عَشْرَةَ ——— رواہ الترمذی والنسائی

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اے ابوذر جب تم مہینے کے تین روزے رکھو تو تیرھویں، چودھویں، پندرھویں کے روزے رکھا کرو۔ (جامع ترمذی، سنن نسائی)

(قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث سنن نسائی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اس میں ہے کہ آپ نے حضرت ابوہریرہ کو بھی یہی ہدایت فرمائی تھی۔)

عَنْ قَتَادَةَ بْنِ مِلْحَانَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْمُرُنَا اَنْ نَّصُوْمَ الْبِيْضَ ثَلَاثَ عَشْرَةَ وَاَرْبَعَ عَشْرَةَ وَخَمْسَ عَشْرَةَ وَقَالَ هُوَ كَهَيْئَةِ الدَّهْرِ

——— رواہ ابوداؤد والنسائی

حضرت قتادہ بن ملحان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کو حکم فرماتے تھے کہ ہم ایام بیض یعنی مہینہ کی تیرھویں، چودھویں، پندرھویں کو روزہ رکھا کریں۔ اور فرماتے تھے کہ مہینے کے ان تین دنوں کے روزے رکھنا اجر و ثواب کے لحاظ سے ہمیشہ روزہ رکھنے کے برابر ہے۔ (سنن ابی داؤد، سنن نسائی)

(تشریح) یہاں تک جو حدیثیں درج ہوئیں ان سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ ہر مہینے تین نفلی روزے رکھنے والا صاحب ایمان بندہ "الحسنة بعشر امثالها" کے کریمانہ قانون کے حساب سے مہینے کے تیس دن یعنی ہمیشہ روزے رکھنے کے ثواب کا مستحق ہوگا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ یہ روزے تیرھویں، چودھویں، پندرھویں کو رکھے جائیں۔ چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اہم دینی مصالح کی وجہ سے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ان تاریخوں کی پابندی نہیں فرماتے تھے، اور آپ کے حق میں یہی افضل اور اولیٰ تھا۔

یوم عاشوراء کا روزہ اور اس کی تاریخی اہمیت :-

اوپر جو حدیثیں ہر مہینے میں تین دن کے نفلی روزوں کے بارہ میں درج ہوئیں اُن میں سے بھی بعض میں یوم عاشوراء کے روزہ کی فضیلت اور اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی اہتمام و پابندی کا ذکر ضمناً آچکا ہے۔ ذیل میں چند حدیثیں درج کی جارہی ہیں جو خاص اسی سے متعلق ہیں اور جن سے اس دن کی خصوصیت اور تاریخی اہمیت بھی معلوم ہوگی۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ فَوَجَدَ الْيَهُوْدَ صِيَاماً يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا هٰذَا الْيَوْمُ الَّذِىْ تَصُوْمُوْنَهُ فَقَالُوْا هٰذَا يَوْمٌ عَظِيْمٌ اَنْجَى اللّٰهُ فِيْهِ مُوْسٰى وَقَوْمَهُ وَغَرَّقَ فِرْعَوْنَ وَقَوْمَهُ فَصَامَهُ مُوْسٰى شُكْرًا فَنَحْنُ نَصُوْمُهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَحْنُ اَحَقُّ وَاَوْلٰى بِمُوْسٰى مِنْكُمْ فَصَامَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَمَرَ بِصِيَامِهِ ــــ رواه البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو آپ نے یہود کو یوم عاشوراء (۱۰ محرم) کا روزہ رکھتے دیکھا، آپ نے اُن سے دریافت کیا (تمہاری مذہبی روایات میں) یہ کیا خاص دن ہے (اور اس کی کیا خصوصیت اور اہمیت ہے) کہ تم اس کا روزہ رکھتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے ہاں یہ بڑی عظمت والا دن ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور اُن کی قوم بنی اسرائیل کو نجات دی تھی اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرقاب کیا تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے اس انعام کے شکر میں اس دن کا روزہ رکھا تھا اس لیے ہم بھی اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔

اس دن روزہ رکھتے ہیں ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے پیغمبر موسیٰ سے ہمارا تعلق تم سے زیادہ ہے اور ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی عاشوراء کا روزہ رکھا اور امت کو بھی اس دن کے روزہ کا حکم دیا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(**تشریح**) اس حدیث کے ظاہری الفاظ سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ پہونچ کر ہی عاشوراء کے دن روزہ رکھنا شروع فرمایا، حالاں کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم ہی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی صریح روایت موجود ہے کہ "قریش مکہ میں قبل از اسلام بھی یوم عاشوراء کے روزے کا رواج تھا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں یہ روزہ رکھا کرتے تھے، پھر جب آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی تو یہاں آکر آپ نے خود بھی یہ روزہ رکھا اور مسلمانوں کو اس دن روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا۔"

اصل واقعہ یہ ہے کہ یوم عاشوراء زمانۂ جاہلیت میں قریش مکہ کے نزدیک بھی بڑا محترم دن تھا اسی دن خانۂ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا اور قریش اس دن روزہ رکھتے تھے، قیاس یہ ہے کہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل کی کچھ روایات اس دن کے بارہ میں اُن تک پہونچی ہوں گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ قریش ملت ابراہیمی کی نسبت سے جو اچھے کام کرتے تھے اُن میں آپ اُن سے اتفاق اور اشتراک فرماتے تھے۔ اسی بنا پر حج میں بھی شرکت فرماتے تھے، پس اپنے اس اصول کی بنا پر آپ قریش کے ساتھ عاشوراء کا روزہ بھی رکھتے تھے، لیکن دوسروں کو اس کا حکم نہیں دیتے تھے ـــــ پھر جب آپ مدینہ طیبہ تشریف لائے اور یہاں کے یہود کو بھی آپ نے عاشوراء کا روزہ رکھتے دیکھا اور اُن سے آپ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ وہ مبارک تاریخی دن ہے جس میں حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کو اللہ نے نجات عطا فرمائی تھی اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کیا تھا (اور مسند احمد وغیرہ کی روایت کے مطابق اسی یوم عاشوراء کو حضرت نوح کی کشتی جودی پہاڑ پر لگی تھی) تو آپ نے اس دن کے روزہ کا زیادہ اہتمام فرمایا اور

مسلمانوں کو عمومی حکم دیا کہ وہ بھی اس دن روزہ رکھا کریں، بعض احادیث میں ہے کہ آپ نے اس کا ایسا تاکیدی حکم دیا جیسا حکم فرائض اور واجبات کے لیے دیا جاتا ہے، چنانچہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں رُبَیِّع بنت مُعَوِّذ بن عفراءؓ اور سلمہ بن الاکوعؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم عاشوراء کی صبح مدینہ کے آس پاس کی اُن بستیوں میں جن میں انصار رہتے تھے یہ اطلاع بھجوائی کہ جن لوگوں نے ابھی کچھ کھایا پیا نہ ہو وہ آج کے دن روزہ رکھیں اور جنھوں نے کچھ کھا پی لیا ہو وہ بھی دن کے باقی حصہ میں کچھ نہ کھائیں پیئیں بلکہ روزہ داروں کی طرح رہیں ـــــ ان حدیثوں کی بنا پر بہت سے ائمہ نے یہ سمجھا ہے کہ شروع میں عاشوراء کا روزہ واجب تھا، بعد میں جب رمضان مبارک کے روزے فرض ہوئے تو عاشوراء کے روزے کی فرضیت منسوخ ہوگئی اور اس کی حیثیت ایک نفلی روزے کی رہ گئی جس کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اس کی برکت سے پہلے ایک سال کے گناہوں کی صفائی ہوجائے گی" ـــــ اور صوم یوم عاشوراء کی فرضیت منسوخ ہوجانے کے بعد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی رہا کہ آپ رمضان مبارک کے فرض روزوں کے علاوہ سب سے زیادہ اہتمام نفلی روزوں میں اسی کا کرتے تھے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَحَرَّى صِيَامَ يَوْمٍ فَضَّلَهُ عَلَى غَيْرِهِ إِلَّا هٰذَا الْيَوْمَ يَوْمَ عَاشُورَاءَ وَهٰذَا الشَّهْرَ يَعْنِي شَهْرَ رَمَضَانَ۔

ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نہیں دیکھا کہ آپ کسی فضیلت والے دن کے روزے کا بہت زیادہ اہتمام اور فکر کرتے ہوں سوائے اس دن یوم عاشوراء کے اور سوائے اس ماہ مبارک رمضان کے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کے طرز عمل سے حضرت ابن عباسؓ نے یہی سمجھا کہ

نفلی روزوں میں جس قدر اہتمام آپ یوم عاشوراء کے روزے کا کرتے تھے اتنا کسی دوسرے نفلی روزے کا نہیں کرتے تھے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ حِيْنَ صَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ وَاَمَرَ بِصِيَامِهٖ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّهٗ يَوْمٌ يُعَظِّمُهُ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِذَا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ صُمْنَا الْيَوْمَ التَّاسِعَ قَالَ فَلَمْ يَأْتِ الْعَامُ الْمُقْبِلُ حَتّٰى تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ —— رواہ مسلم

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم عاشوراء میں روزہ رکھنے کو اپنا اصول و معمول بنالیا اور مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا تو بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس دن کو تو یہود و نصاریٰ بڑے دن کی حیثیت سے مناتے ہیں (اور یہ گویا ان کا قومی و مذہبی شعار ہے، اور خاص اس دن ہمارے روزہ رکھنے سے ان کے ساتھ اشتراک اور تشابہ ہوتا ہے، تو کیا اس میں کوئی ایسی تبدیلی ہو سکتی ہے جس کے بعد یہ اشتراک اور تشابہ والی بات باقی نہ رہے) تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ انشاءاللہ جب اگلا سال آئے گا تو ہم نویں کو روزہ رکھیں گے ____ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں لیکن اگلے سال کا ماہ محرم آنے سے پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات واقع ہو گئی۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) ظاہر ہے کہ صحابہ کرام کے اشکال عرض کرنے پر یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات شریف سے کچھ ہی پہلے فرمائی، اتنی پہلے کہ اس کے بعد محرم کا مہینہ آیا ہی نہیں اور اس لیے اس نئے فیصلے پر عمل درآمد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں نہیں ہو سکا، لیکن امت کو رہنمائی مل گئی کہ اس طرح کے اشتراک اور تشابہ سے بچنا چاہیے ____ چنانچہ اسی مقصد سے آپ نے یہ طے فرمایا کہ انشاءاللہ آئندہ سال سے ہم نویں کا روزہ رکھیں گے۔

نویں کو روزہ رکھنے کا آپ نے جو فیصلہ فرمایا اُس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور علماء نے
دونوں بیان کیے ہیں، ایک یہ کہ آئندہ سے ہم بجائے دسویں محرم کے یہ روزہ نویں محرم ہی کو رکھا
کریں گے ــــــ اور دوسرا یہ کہ آئندہ سے ہم دسویں محرم کے ساتھ نویں کا بھی روزہ رکھا
کریں گے اور اس طرح سے ہمارے اور یہود و نصاریٰ کے طرزِ عمل میں فرق ہو جائے گا
اکثر علماء نے اسی دوسرے مطلب کو ترجیح دی ہے اور یہ کہا ہے کہ یوم عاشوراء کے ساتھ
اس سے پہلے نویں کا روزہ بھی رکھا جائے اور اگر نویں کو کسی وجہ سے نہ رکھا جاسکے تو اسکے
بعد کے دن گیارھویں کا رکھ لیا جائے۔

یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ ہمارے زمانہ میں چونکہ یہود و نصاریٰ وغیرہ یوم عاشوراء
(دسویں محرم) کو روزہ نہیں رکھتے، بلکہ ان کا کوئی کام بھی قمری مہینوں کے حساب سے نہیں ہوتا
اس لیے اب کسی اشتراک اور تشابہ کا سوال ہی نہیں رہا، لہٰذا فی زماننا رفع تشابہ کے لیے
نویں یا گیارھویں کا روزہ رکھنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے۔ واللہ اعلم۔

مؤتمر اسلامی
مقالہ سوم

اسلام اور اجتماعی انصاف

(از استاذ محمد زکی یمانی، وزیر پٹرول و معدنیات سعودی عرب)

(۲)

انفرادی ملکیت کے بارے میں اسلام کا عمومی نقطۂ نظر

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اسلام نے کس طرح انفرادی ملکیت کی اجازت دی ہے اور اس حق کی ہر ممکن طریقے سے حفاظت کی ہے اس کے بعد اس حق کے تصرفات کو اجتماعی قیود کا پابند کر دیا ہے تاکہ ان سے جماعت کو نقصان نہ پہونچے، اور انفرادی ملکیت جماعت کی سعادت کا سبب بنے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے انفرادی حرص و طمع کے امکانات کو قابو میں رکھنے کے لیے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس نے چند ہاتھوں میں زیادہ سے زیادہ دولت جمع ہونے کا بھی سد باب کیا ہے۔ قرآن نے اغنیا کے بجائے خاص طور پر صرف فقراء کو مال فیئ (وہ مال غنیمت جو بغیر لڑائی کے ہاتھ آئے) دیئے جانے کا جو سبب بتایا ہے، وہ یہ ہے "کئی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم" (تاکہ مال ادل بدل کر تمہارے مالداروں ہی کے ہاتھوں میں نہ رہے)۔ اس کے علاوہ اسلام نے نفع پر نہیں بلکہ اصل سرمائے پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ہر سال ایک مقرر مقدار میں ضرورتمندوں کے حق کے طور پر وصول کی جاتی ہے۔ اسی ضمن میں اسلام کا قانون وراثت آتا ہے جس کے تحت متوفی کی ثروت متعدد رشتہ داروں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ پھر شریعت جو متوفی کو وصیت کا حق دیتی ہے اس میں بھی پابندی ہے کہ کسی شرعی وارث کے حق میں نہ ہو جس سے وہ ترکہ کے ایک بڑے حصے کا تنہا مالک بن جائے اور اس سب کے بعد اسلام ناجائز ذرائع سے افزائش دولت کو

حرام قرار دے کر اس امر کی مزید پیش بندی کرتا ہے کہ دولت فرد اور جماعت دونوں کی مشترک طور پر خدمت کا ذریعہ بنے۔ کسی حریص فرد کے ہاتھ میں جمع ہو کر لوگوں کی مجموعی مصلحت کے خلاف استعمال نہ ہو۔

وسائل ملکیت اور افزائش دولت کے طریقے

جن وسائل سے ایک فرد صاحب ملکیت بنتا ہے اسلام نے ان کا تعین کر دیا ہے۔ اور ان وسائل کے بغیر کوئی ملکیت پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچ سکتی، فقہائے مسلمین کے نزدیک ملکیت کا حق خود اشیاء کی طبیعت سے صادر نہیں ہوتا، بلکہ اس حق کا اثبات شریعت کی اجازت اور کسی چیز کو اس کا سبب ٹھہرا دینے سے ہوتا ہے۔ (۳۰)

وسائل ملکیت میں سے سب سے اہم وسیلہ آبادکاری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "عام زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ اس کے بعد تمہاری ہے، جو غیر آباد زمین کوئی آباد کرے وہ اس کی ہے۔ اور اگر اس طرح کی کوئی زمین ایک شخص تین سال تک بغیر کام میں لائے روکے رکھے تو پھر اس زمین پر اس کا حق نہیں رہتا۔ (۳۱)۔ بہت سے فقہاء کے نزدیک غیر آباد زمین کو آباد کرنے کا حق امام (حکومت) کی اجازت کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔ یعنی اتنی ہی زمین پر حق قائم ہوگا جس کی منظوری حکومت دے دے

بہرحال شریعت کے مذکورہ اصول سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ملکیت کو جماعت کی خدمت کا وسیلہ دیکھنا چاہتی ہے۔ غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے کی ہمت افزائی میں یہی نقطۂ نظر کارفرما ہے۔ کیونکہ ایسی زمینوں کی آبادکاری سے قومی دولت اور عمومی خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے اور اسی بناء پر شریعت اس حق کو ایسی صورت میں ساقط کر دیتی ہے جبکہ زمین پر صرف قبضہ کر کے رکھ لیا جائے اور ایک معقول مدت (تین سال) کے اندر اسے کام میں نہ لایا جائے۔

اس کے علاوہ ملکیت کے کچھ اور بھی ذرائع ہیں جیسے شکار کرنا، زمین سے کوئی معدنی دولت برآمد کر لینا، یا بطور جاگیر یا وراثت کے ذریعہ سے کچھ ملنا۔ لیکن سب سے اہم ذریعہ عمل ہے جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا ہے اور اس کی ہمیں ترغیب دلائی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے۔ وقل

اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمؤمنون" (۳۲) (ان سے کہو کہ عمل کرو۔ اور جو تمہارا عمل ہوگا اسے اللہ، اس کا رسول اور مومنین دیکھیں گے)۔[عہ] دوسری جگہ ارشاد ہے" فامشوا فی مناکبھا وکلوا من رزقہ" (۳۳) (تم اس (زمین) کے رستوں میں چلو (معاشی جد وجہد کرو) اور خدا کا دیا ہوا کھاؤ) رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عامل (کام کرنے والے) کی بڑی تکریم فرمائی ہے اور کام کرنے پر زور دیا ہے۔ آپ نے فرمایا" ان اللہ یحب العبد المؤمن المحترف" (۳۴) (اللہ تعالیٰ روزگار کرنے والے مومن کو محبوب رکھتا ہے)۔ آپ کا ایک اور ارشاد ہے" ما اکل احدکم طعاما قط خیرا من عمل یدہ" (۳۵) (تم میں سے کسی نے کبھی اس کھانے سے بہتر کھانا نہیں کھایا جو کہ انہیں اپنے ہاتھ کے عمل سے حاصل ہو) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بکریاں چرایا کرتے تھے۔ اور آپ کو حضرت خدیجہ نے اپنے تجارتی کاروبار کے لیے رکھا تھا۔ آپ کے خلفاء اور صحابہ بھی مختلف کام دھندے کرتے تھے۔

اسلام نے ملکیت کے جو وسائل و ذرائع بتلائے ہیں اگر ان کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وراثت اور اقطاع (حکومت کے عطیات) کو مستثنیٰ کر کے ان سب میں قدر مشترک عمل ہے (اور یہ جو دو ذریعے مستثنیٰ نوعیت کے ہیں ان کا بھی اپنی جگہ پر پورا جواز موجود ہے) اور یہ اس لیے ضروری ہے کہ اکیلا مال افزائش مال کا سبب نہیں ہوتا، جب تک کہ اس کے ساتھ عمل محنت نہ شامل ہو۔ اب ایک طرف اسلام اور دوسری طرف اشتراکیت و سرمایہ داری کے نظاموں میں جو فرق ہے وہ یہاں اچھی طرح سے واضح ہو جاتا ہے، جہاں تک سرمایہ داری کا تعلق ہے وہ عمل کو بے شک ذریعۂ ملک قرار دیتی ہے۔ لیکن اس نے افزائش مال کے معاملے میں صرف سرمائے کو حق مطلق دیا ہے اور یہ اصول مانا ہے کہ مال سے مال پیدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف شیوعیت نہ تو ملکیت میں اور نہ افزائش مال میں سرمائے کا کسی طرح کا دخل مانتی ہی نہیں چاہے سرمایہ دار کا عمل بھی اس میں شامل ہو۔ وہ سارا حق عمل و محنت کا مانتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا موقف ان دونوں کے درمیان ہے۔ وہ

عہ اس آیت سے اس طرح کا استشہاد بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ مگر بظاہر آیت کا معاشی عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسا کہ سیاق آیت دیکھنے سے پتہ چلتا ہے۔ بلکہ خود آیت کے الفاظ میں بھی اس کا قرینہ موجود ہے۔　　(الفرقان)

عمل و محنت کی اسی طرح تکریم کرتا ہے جیسے اشتراکیت کے اصول و مبادی اس کی تکریم کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ افزائش مال میں تنہا سرمایہ کا حق تسلیم نہیں کرتا اور اسی لیے سود کو (جس میں عمل کا دخل نہیں ہوتا) وہ بڑی سختی سے حرام قرار دیتا ہے۔ لیکن وہ اس وقت شیوعیت (کمیونزم) سے پورا اختلاف کرتا ہے جب وہ افزائش مال کے عمل کا ایک عنصر سرمائے کو بھی تسلیم کرتا ہے اور ایسے اصول مقرر کرتا ہے جن میں دونوں میں سے کسی عنصر کی حق تلفی نہ ہونے پائے۔ بہرحال اسلام پیداوار میں سرمایہ اور محنت دونوں کا حق تسلیم کرتا ہے اور اشیاء کی قیمتوں میں ہر ایک کا حصہ مقرر کرنے کے لیے منصفانہ پیمانوں سے کام لیتا ہے۔

۲- مساوات

جب بھی انسانیت کی پشت پر ظلم و طغیان کے کوڑے برسے، اس نے ہمیشہ مساوات کے خواب دیکھے۔ دنیا کی قومیں گزرے زمانوں سے مساوات کی تلاش میں سرگرداں رہی ہیں، مگر انھیں یہ مساوات سوائے فلسفیوں کی تصنیفات کے اور کہیں نظر نہ آئی گویا مساوات ایک سراب تھی۔ جب بھی کوئی اس کے پاس پہونچا وہ نظروں سے روپوش ہوگئی۔ اس دوران میں رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوتے ہیں۔ آپ اس خواب کو ایک حقیقت بنا دیتے ہیں۔ ایسی حقیقت جس نے تاریخ کا دھارا بدل دیا اور پہلی دفعہ دنیا میں ایک معاشرہ وجود میں آیا جو مساوات کے بارے میں باتیں کرنے کے بجائے اس پر عامل تھا۔ بعد میں اگر اسلامی افق سے یہ درخشاں نور چھپ گیا اور صرف کبھی کبھی اس کی آتی جاتی شعاعیں نظر آتی رہیں تو یہ قصور اسلام کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا ہے جنھوں نے اپنے اسلام کو ضائع کر دیا اور اپنے مجد و شرف کا سرا کھو دیا۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ ایک زندۂ جاوید دین ہے، وہ ایک ایسا چشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔ ہم اگر اس کی طرف لوٹیں گے تو اس کو اسی حالت میں پائیں گے جس میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے تھے وہ ہماری روحوں کے لیے غذا ہے۔ ہماری قوت کا سرچشمہ ہے اور عدل و انصاف کی ایک ایسی اساس ہے جس میں ظلم بار نہیں پا سکتا۔ وہ ایسی مساوات ہے جس میں عربی اور عجمی کی کوئی تفریق نہیں اور تقوے کے سوا فضیلت کی کوئی بنیاد نہیں۔

وسیع تر مساوات جیسا کہ گزر چکا ہے، اسلام میں مساوات کا تصور کسی تنگ دائرے کے اندر محدود نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کی روح کو مساوات میں ڈبو تا ہے۔

اسلام میں مساوات کا نقطۂ آغاز ایک خدا پر ایمان ہے جو تنہا جِلاتا اور مارتا ہے۔ وہی تنہا رزق دیتا ہے اور روکتا ہے، ہر چیز پر اسی کا اختیار ہے اور ہمارے اس کے درمیان نہ کوئی واسطہ ہے اور نہ سفارش کرنے والا۔ سب اس کی بارگاہ میں بندگی کے رشتے سے برابر ہیں خواہ کوئی کتنا ہی بلند مرتبہ ہو اور کوئی کتنا ہی نادار۔

جب مسلمان اسلام کے اس عقیدے کے اساسی معانی پر ایمان لاتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک اپنے کمزور اور فانی وجود کو خدائے قادر و رحیم کی طاقت سے براہ راست مربوط محسوس کرتا ہے اور اس سے اس کے اندر خود اعتمادی اور خودداری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اسے یہ شعور بخشتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں معاشرے کے ہر ہر فرد کے مساوی ہے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کے دلوں میں یہ عقیدہ گھر کر جاتا ہے اور فقر کا خوف سوائے خدائے رازق کے آگے جھکنے کے کسی اور کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت نہیں دیتا، اللہ کو مالک الملک مان کر وہ کسی عہدہ و منصب کی پرستش کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اور موت و زندگی خدا کے ہاتھ میں مان لینے کے بعد موت کا خوف اسے دبانے کے قابل نہیں رہتا تو پھر اسلامی معاشرہ اس مرحلہ میں داخل ہوتا ہے جو حقیقی مساوات کا مرحلہ ہے۔ اس کے بعد ہی قوانین اسلامی اپنا اثر دکھلاتے ہیں، اور یہ اسلامی معاشرہ وہ اُمّت بنتا ہے جسے قرآن مجید نے "خیرامۃٍ اخرجت للنّاس" کہا ہے۔

مساوات اسلام کا ایک امتیازی نشان ہے۔ اور انصاف پسند غیر مسلم مصنفین تک نے اسلام پر اگر کچھ لکھا ہے تو اس کی اس خصوصیت کا ضرور اعتراف کیا ہے۔ اس ضمن میں یہاں مشہور برطانوی مفکر تھامس کارلائل نے جو کچھ لکھا ہے یہاں صرف اسی کا حوالہ کافی ہے۔ کارلائل نے لکھا ہے کہ "اسلام کی سب سے بلند تر خصوصیت میری نظر میں اس کی مساوات ہے۔"

قرآن مجید نے بار بار مساوات پر زور دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ "یاایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا۔ ان اکرمکم عنداللہ اتقٰکم" (۳۹) (اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو مختلف قومیں اور

مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں زیادہ شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے)

"وما اموالکم ولا اولادکم بالتی تقربکم عندنا زلفی الا من امن وعمل صالحا، فاولٰئک لھم جزاء الضعف بما عملوا وھم فی الغرفات امنون (۳۷)

(اور تمہارے اموال اور تمہاری اولاد ایسی چیز نہیں جو درجے میں تم کو ہمارا مقرب بنادے، مگر ہاں جو ایمان لائے اور اچھے کام کرے۔ سو ایسے لوگوں کے لیے ان کے عمل کا دگنا صلہ ہے۔ اور وہ بالاخانوں میں چین سے ہوں گے۔)

اسلام کی یہ دعوت ایک نعرۂ انقلاب تھی جس نے اس معاشرے میں ایک زلزلہ ڈال دیا جو غلاموں اور آقاؤں کے طبقات پر قائم تھا۔ ابوجہل نے یہ درس مساوات سنا تو بگڑ کر پیغمبر اسلام سے مخاطب ہوا کہ "محمد! تم اس لیے آئے کہ سُمیّہ کے ذلیل بیٹے اور اس کے آقا ولید کو برابر کردو؟" آپ نے فرمایا ہاں وہ دونوں آدم ہی کے تو بیٹے ہیں اور آدم کی بنا مٹی تھی! ابوجہل کہتا کہ تم انھیں ہمارے برابر بنائے دے رہے ہو جبکہ وہ ہمارے غلام ہیں؟ حضرت محمد بڑے اطمینان سے فرماتے کہ نہیں ہم تو انھیں تمہارا سردار بھی بنائیں گے! اور یہ آپ نے اس وقت کرکے دکھا دیا جب مہاجرین و انصار پر مشتمل دو لشکروں پر ایک دفعہ حضرت زیدؓ اور اُن کے بعد اُن کے صاحبزادے اُسامہ بن زید کو سربراہ بنایا ــــ اور یہ بات آپ پر ختم نہیں ہوگئی۔ آپ کے بعد خلیفۂ ثانی عمر بن الخطابؓ نے تو یہاں تک کیا کہ اپنے بعد منصب خلافت کے لیے تمنا کرتے تھے کہ کاش ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالم زندہ ہوتے۔ اسلام کی تاریخ میں مساوات کے یہ نمونے اس کثرت سے ہیں کہ اس تنگ وقت میں ان کا بہترین حصہ بھی پورا نہیں سامنے لایا جاسکتا۔

غرض یہ اسلام تھا جس نے مسلمانوں کو بھائی بھائی بنایا، ان کے دلوں کو متحد کیا۔ انھیں قانون کے سامنے اور معاشرے کے اندر مساوات دی۔ اور اس امر کی وضاحت کی کہ انسان کا اپنا عمل ہی سب کچھ ہے "لیس للانسان الا ما سعی" اور "لا تزر وازرۃ وزر اخری" (انسان کے لیے وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی۔ کسی کا بوجھ [illegible] دوسرے کے ذمہ نہیں)

ایک اعتراض | بعض لوگ اسلام پر [illegible] کہتے ہیں کہ اس نے غلامی کو برقرار رکھا۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے غلامی کو روا نہیں رکھا۔ بلکہ جب وہ آیا تو اس نے دیکھا کہ غلامی جزیرۂ عرب کے معاشرے کی اساس ہے۔ چنانچہ اس نے ایسے قواعد وضع کیے، جن سے اس کا قلع قمع ہو سکے۔ اسلام غلامی کا دروازہ بالکل تو نہ بند کر سکا، لیکن اس نے نئے غلام بنانے کا دروازہ کافی تنگ کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے غلاموں کا درجہ بلند کیا، اور انھیں اللہ کی نظر میں اور بہت سے اجتماعی حقوق میں آقاؤں کے برابر کر دیا۔ اسلام نے مال کے عوض غلاموں کو آزاد کرنے (مکاتبت) کا حکم دیا۔ اور بیت المال میں سے ایک رقم غلاموں کو آزاد کرانے (فک الرقاب) کے لیے خرچ کرنا فرض ٹھہرایا۔ اس طرح اسلام نے بہت سی غلطیوں اور گناہوں کا کفارہ غلاموں کو آزاد کرنا قرار دیا۔ اگر اسلامی معاشرہ اس راہ پر چلنے سے انحراف نہ کرتا، جو شریعت اسلامی نے غلاموں کے بارے میں تجویز کی تھی تو غلامی کبھی کی مٹ گئی ہوتی۔

مرد وعورت میں مساوات اسلام سے پہلے کسی نظام نے مرد اور عورت کا درجہ مساوی قرار نہیں دیا۔ اسلام نے سب سے پہلے تو ان دونوں کو اللہ کی نظر میں برابر قرار دیتے ہوئے اعلان کیا "ومن یعمل من الصّالحات من ذکر او انثیٰ وھو مومن فاولٰئک یدخلون الجنّۃ ولا یظلمون نقیرا" (۳۸)

(اور جو کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ مومن ہو، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔)

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"من عمل صالحا من ذکر او انثیٰ وھو مومن فلنحیینہ حیاۃ طیبۃ ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون" (۳۹)۔

(جو کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو، تو ہم اس کو ایک خوشگوار زندگی عطا کریں گے اور ان کے اچھے کاموں کا بہترین بدلہ دیا جائے گا)

ارشاد الٰہی ہے:۔

"فاستجاب لھم ربھم انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثیٰ بعضکم من بعض" (۴۰)

(سو منظور کر لیا ان کی درخواست کو اُن کے رب نے کہ میں کسی شخص کے کام کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت اکارت نہیں کروں گا)

اس کے بعد اسلام نے عورت اور مرد کو حق تصرف اور حق ملکیت میں بھی برابر قرار دیا جس سے اکثر نظام اب تک خالی ہیں، بالخصوص شادی شدہ عورت ابھی تک وہاں ان حقوق سے محروم ہے۔ قرآن مجید میں ہے :-

"للرجال نصیب مما اکتسبو وللنساء نصیب مما اکتسبن (۴؍۴)

(مرد جو کمائیں وہ ان کا حصہ اور عورتیں جو کمائیں وہ ان کا)

اسلام نے مردوں کو عورتوں پر برتری بعض مخصوص حالات میں دی ہے اور اسکی وجہ بھی ہر دو کی الگ الگ فطری استعداد اور ذمہ داریاں ہیں۔ چنانچہ جس معاملے میں مرد اور عورت اپنی اپنی فطری استعدادوں اور ذمہ داریوں میں برابر ہوں، تو ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوگا، اور ان کے درمیان مساوات لازم ہوگی۔ پس اسلام نے اگر لڑکی کے مقابلے میں لڑکے کو وراثت میں دُگنا حصہ دیا ہے تو اس کے ساتھ مرد پر عورت کے نان ونفقہ کی ذمہ داری بھی ڈال دی ہے جس میں عورت شریک نہیں ہے۔

اسلام نے عورت کو چودہ سو سال پہلے جو حقوق دیئے تھے دوسری جنگ عظیم کے بعد جاکر کہیں برطانیہ اور فرانس جیسے ملکوں نے وہ حقوق عورتوں کو دیئے ہیں۔ البتہ اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اسلام نے مساوات کسی دباؤ کے ماتحت نہیں دی ہے، یہ خالص اسکے اس عقیدہ کا نتیجہ ہے جو عورت کے لیے مساوی عزت واحترام کا تقاضہ کرتا ہے۔ اور اسی لیے اس مساوات کو وہ ایسی آزادی میں تبدیل ہونے کی اجازت نہیں دیتا جس سے عورت مردوں کی خواہشات کا کھلونا اور بازار کی جنس بن جائے۔

اجتماعی ذمہ داریاں

اسلام بنی نوع انسان کو حریت اور مساوات کی جو دولت بخشتا ہے اس کے مقابلے میں کچھ ذمے داریاں بھی اسلامی معاشرے کے ہر فرد پر اپنی حیثیت کے مطابق دوسرے افراد کے سلسلے میں عائد ہوتی ہیں اور ان ذمہ داریوں کی ادائیگی ہی کی تصویر ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات میں ملتی ہے ——

آپ نے فرمایا۔

مثل المؤمنین فی توادھم وتراحمھم وتعاطفھم کمثل الجسد اذا اشتکیٰ منہ عضو تداعیٰ لہ سائر الجسد بالسھر والحمّیٰ (۴۲)

(مسلمانوں کی مثال باہمی محبت و اخوت اور ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسم، کہ اسکے کسی عضو کو تکلیف ہو تو باقی سارا جسم بھی تکلیف سے بے چین ہوتا ہے)

المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً (۴۳)

(مسلمان ایک دیوار کی مانند ہیں جس کی ہر اینٹ دوسری کی مضبوطی کا باعث ہوتی ہے)

ہر فرد کی اپنی ذات کے بارے میں ذمہ داریوں کے بعد اُس کی ذمہ داریاں درجہ بدرجہ وسیع ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک ایک مسلمان کا فرض ہے (وبالوالدین احسانا) اس کے بعد دوسرے قریبی عزیزوں کی خبر گیری (والوالارحام بعضھم اولیٰ ببعض فی کتاب اللہ) پھر یہ دائرہ اہلِ قرابت سے بھی آگے پھیلتا ہے اور اس حد تک وسیع ہو جاتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ایما اھل عرصۃ اصبحت فیھم امرؤ جائعاً فقد برئت منھم ذمۃ اللہ تبارک وتعالیٰ۔ (۴۴)

(جس بستی میں میں کوئی آدمی صبح کو بھوکا اُٹھے اس بستی کے بارے میں اللہ کی کوئی ذمہ داری نہیں)

یہ صرف پیغمبرانہ احساس ذمہ داری نہیں، بلکہ اسلام نے اس کو قانون کی شکل دی ہے اور حضرت عمرؓ کے ایک قانونی فیصلہ کے مطابق اس پوری بستی سے ایسے شخص کی دیت وصول کی جائے گی جو اس بستی میں بھوک سے مرجائے۔ یہ شرف صرف اسلام کو حاصل ہے ورنہ دنیا کا کوئی نظام اس حد تک نہیں جاتا۔

فرض کفایہ ہر سوسائٹی ایک کل کی حیثیت سے مختلف خدمتوں کی حاجتمند ہوتی ہے، مثلاً اس کو ضرورت ہوتی ہے طبیبوں کی، انجینیروں کی، قانون دانوں کی، ماہرینِ اقتصادیات کی وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے یہ تمام علوم فرضِ کفایہ کا درجہ رکھتے ہیں کہ اگر

بقدرِ ضرورت لوگ انھیں حاصل کرلیں تو باقی سب سے فرض ساقط ورنہ سب کے سب گنہگار۔ اسکی مثال بالکل ایسی ہے جیسے جہاد کے نازک مواقع پر بھی ایک جماعت کو تفقہ فی الدین اور دوسروں کی تعلیم کے کام میں لگا رہنا چاہیے۔ ورنہ اس کا گناہ سب پر عائد ہوگا۔

۳۔ اجتماعی کفالت

اجتماعی کفالت کا تصور، جو اس بیسویں صدی میں ہر مہذب حکومت کا واقعی یا نمائشی شعار بن گیا ہے، خالص اسلام کا عطیہ ہے جس سے اس نے انسانیت کو اس وقت بہرہ مند کیا جب اس دنیا کا شعار یہ تھا کہ زندگی صرف طاقتور کے لیے ہے اور غریبوں کی حاجتمندانہ آہ وفغاں یا نظر انداز کر دی جاتی تھی اور یا گلا گھونٹ کر فراموش کر دی جاتی تھی۔ اس خود پرستی کے عالم میں اسلام نے اجتماعی کفالت کا انقلابی نعرہ بلند کیا، اسے حکومت کی قانونی ذمہ داری ٹھہرایا اور اس کا مالی بار بھی حکومت کے خزانے پر ڈالا۔

کفالت اجتماعی کا اصول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے عہدِ مبارک میں بروئے کار آچکا تھا جس کی شہادت یہ روایت دیتی ہے کہ حضرت جعفر بن ابی طالب کی بیوہ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آئیں تاکہ آپ سے اپنے یتیم بچوں کے لیے کچھ کہیں۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ تم ان بچوں کے معاملے میں فقر و احتیاج سے خائف ہو۔ میں اس دنیا میں اور آخرت میں ان کا ولی اور ذمہ دار ہوں۔ آپ نے حضرت جعفر کی بیوی سے یہ بات اس بنا پر نہیں کہی کہ حضرت آپ کے قریبی عزیز تھے۔ بلکہ آپ کا یہ ارشاد امام اور سیاسی حاکم کی حیثیت میں تھا۔

آپ کے بعد خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن الخطابؓ نے اس اصول کو نہایت واضح بنیادوں پر استوار کیا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ اور پھر عمر ثانی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں یہ اصول اپنی معراج کمال کو جا پہونچا جس کی برکت سے یہ حال ہو گیا کہ زکوٰۃ دینے والوں کو کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ ملتا تھا۔

کفالتِ اجتماعی کا اسلامی نظریہ کفالت اجتماعی کے نظام کی ضرورت معاشرے کے افراد کو پیش آنے والی تین قسم کی آفات کی

بنا پر پیدا ہوتی ہے (۱) جسمانی آفتیں جو افراد کو لاحق ہوتی ہیں اور انھیں کام کرنے کے قابل نہیں رہنے دیتیں۔ جیسے کہ بیماریاں، جسمانی معذوری اور بڑھاپا۔ (۲) پیشہ ورانہ آفات۔ وہ آفتیں جو کام کرنے والوں کو اپنے کام کے سبب پیش آتی ہیں اور ان کی وجہ سے وہ جزوی یا کلی طور پر کام کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ (۳) غربت و افلاس کی آفت جس سے اس شخص کو واسطہ پڑتا ہے جو کثیر العیال ہو اور آمدنی کم ہو۔

ان آفتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسلام کیا تجویز کرتا ہے، اس کے لیے ہمیں غور و توجہ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وہ خط پڑھنا چاہیئے جو انھوں نے اپنے عہد خلافت میں مصر کے گورنر کو لکھا تھا۔ (۴۵) حضرت علیؓ لکھتے ہیں:۔

"گرے ہوئے طبقوں کے بارے میں جن کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں اور مسکینوں، محتاجوں، مصیبت زدوں نیز جسمانی معذوروں کے بارے میں اپنی ذمہ داری کے لیے اللہ سے ڈرتے رہو، ان طبقوں میں سے بعض تو منہ سے سوال کر لیتے ہیں اور بعض صورت سوال بن کر۔ ان کے معاملے میں اللہ نے اپنے جس حق کا تمھیں ذمہ دار بنایا ہے اس کی نگہداشت کرو۔ ان کیلئے ایک تو اپنے بیت المال میں سے حصہ مقرر کردو اور دوسرے ہر شہر کی سرکاری آمدنی کی پیداوار میں سے، خواہ وہ رہنے والے پاس کے ہوں یا دور کے، یاد رکھو کہ تمھیں ان سب کے حقوق کا نگراں بنایا گیا ہے۔ پس خوش عیشی ان سے تمھیں غافل نہ کر دے۔ اس بارے میں تمھاری ذرا سی کوتاہی بھی قابل معافی نہیں ہوگی۔ اور نہ دوسرے اہم کاموں میں انہماک کی معذرت قابل قبول ہوگی۔ نہ تم ان سے نظر پھیرو اور نہ تکبر سے گردن موڑو۔ ان میں سے جو شخص تم تک نہیں پہونچ سکتا اور جسے لوگ حقیر جانتے ہیں اس کا خود پتہ چلانے کی کوشش کرو اور اس کام کے لیے اپنے معتمد خدا ترس اور تواضع پسند لوگوں کو مقرر کرو ..... یتیم کنبوں اور عمر رسیدہ کمزور، جن کے پاس نہ وسائل ہیں اور نہ وہ خود سوال کرنا پسند کرتے ہیں، ان کی پوری طرح دیکھ بھال کرو۔ بے شک حاکموں کی یہ ذمہ داریاں بڑی گراں ہیں، لیکن ذمہ داریاں ہوتی ہی گراں ہیں۔"

حضرت علیؓ کا اپنے والی مصر کے نام یہ خط محض باتیں نہیں جو صفحۂ قرطاس پر لکھ دی گئیں۔

بلکہ وہ نافذ ہونے والا قانون ہے جو ایک صاحب اقتدار حاکم اپنے ایک والی کے نام بطور حکم کے جاری کرتا ہے تاکہ اسے بروئے کار لایا جائے اور اس کی مدد سے کفالت اجتماعی کے ایک بہترین نظام کی طرح پڑے۔

اسلام میں اجتماعی کفالت کے مکمل عملی نظام کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس پہلو سے تاریخ اسلام کا جائزہ لینا ہوگا جس سے ان مصائب و آفات کا تعین ہو سکے گا جن کی پریشانیوں سے لوگوں کو نجات دلانے کے لیے اسلام نے اس اصول سے کام لیا۔

(ا) فقر و احتیاج اس بارے میں حضرت عمر کے عہد خلافت کے دو واقعات کا ذکر کرنا کافی ہوگا۔

ایک رات حضرت عمر نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ زبردستی اپنے بچے کا دودھ چھڑا رہی ہے اور بچہ ہے کہ بری طرح چلا رہا ہے۔ حضرت عمر نے اس عورت سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ اس نے جواب دیا (اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ حضرت عمر سے مخاطب ہے) کہ عمر دودھ پیتے بچے کو تو وظیفہ نہیں دیتے۔ میں اس لیے بچے کا دودھ چھڑا رہی ہوں کہ مجھے اس بچے کا وظیفہ ملے اور اس سے میں اپنی احتیاج پوری کروں، یہ سن کر حضرت عمر اپنے گھر لوٹے، انھوں نے نماز فجر ادا کی، اور سلام پھیرنے کے کہنے لگے۔ اے عمر! تیرے لیے خرابی ہو، معلوم نہیں مسلمانوں کے کتنے بچے تو نے مار ڈالے۔ پھر انھوں نے یہ منادی کرائی کہ اے لوگو! اپنے بچوں کا جلد دودھ نہ چھڑاؤ، ہم نے ہر بچے کے لیے اس کے پیدا ہونے کے بعد سے ہی وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔

دوسرا واقعہ بھی ایک عورت ہی کا ہے جو اپنے بھوکے بچوں کو چولھے پر ہنڈیا رکھے جس میں کہ خالی پانی اور صرف کنکریاں تھیں، بہلا رہی تھی کہ حضرت عمر ادھر سے گزرے، یہ دیکھتے ہی فوراً واپس گئے اور خود بیت المال سے غلہ لے کر آئے۔ خود بچوں کے لیے کھانا پکایا۔ اور جب تک وہ کھا کر سیر نہیں ہوئے وہاں رہے۔

(ب) بڑھاپا اور بیماری حضرت علی نے والی مصر کے نام جو ہدایات بھیجی تھیں، ان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہاں ہم حضرت عمر کی زندگی کی بعض مثالیں اور پیش کرتے ہیں۔ حضرت عمر نے ایک اندھے کو دیکھا کہ وہ راہ چلنے والوں سے

بھیک مانگ رہا ہے۔ انھیں معلوم ہوا کہ وہ یہودی ہے۔ حضرت عمر نے اس سے پوچھا کہ کس چیز نے اسے بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا ہے، اس نے کہا جزیہ، احتیاج اور بڑھاپے نے۔ حضرت عمر اسے اپنے گھر لے گئے اور اس کی ضرورت پوری کی۔ اس کے بعد حضرت عمر نے بیت المال کے خازن کو بلوایا اور اس سے کہا "یہ کتنی بری بات ہے۔ خدا کی قسم ہم نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہم نے اس کی جوانی سے تو فائدہ اٹھایا اور بڑھاپے میں اسے ذلیل کر رہے ہیں۔ بے شک صدقات فقراء اور مساکین کے لیے ہیں۔" انما الصدقات للفقراء والمساکین"۔ اور یہ شخص مساکین اہل کتاب میں سے ہے۔ حضرت عمر نے اسی وقت سے بوڑھوں، بیماروں اور معذوروں سے جزیہ معاف کر دیا اور ان کے گزارے کے لیے بیت المال سے وظیفے مقرر کیے جانے کا حکم دیا۔ اس طرح اسلام میں عدل اجتماعی کا دائرہ صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس میں مملکت کے تمام غیر مسلم باشندے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

اس کی ایک اور مثال حضرت عمر کا وہ واقعہ ہے جب آپ شام جاتے ہوئے ایسے لوگوں کے پاس سے گزرے جنھیں کوڑھ تھا، یہ لوگ عیسائی تھے، حضرت عمر نے انھیں صدقات دینے کا حکم دیا اور ان کا گزارہ مقرر کر دیا۔

ایک دفعہ حضرت طلحہ نے حضرت عمر کو رات کے اندھیرے میں اپنے گھر سے باہر نکلتے دیکھا۔ وہ چپکے سے ان کے پیچھے ہو لیے۔ حضرت عمر ایک مکان میں داخل ہوئے اور پھر وہاں سے نکلے۔ جب صبح ہوئی تو حضرت طلحہ اس مکان میں گئے اور وہاں ایک اندھی معذور بڑھیا دیکھی۔ حضرت طلحہ نے ان سے پوچھا کہ یہ کون شخص تمھارے پاس آتا ہے۔ اس بڑھیا نے کہا کہ یہ ایک عرصہ سے میری دیکھ بھال کر رہا ہے۔ جس چیز کی مجھے ضرورت ہوتی ہے وہ لا کر دیتا ہے اور میری جو تکلیف ہوتی ہے وہ دور کرتا ہے۔

(ج) زچگی حضرت عمر اپنی عادت کے مطابق ایک رات گھر سے نکلے۔ پھرتے پھرتے وہ ایک جگہ پہونچے تو وہاں ایک عورت کو درد زہ میں کراہتے سنا۔ واپس گھر گئے اور اپنی بیوی ام کلثوم کو اس عورت کے پاس لے گئے انھوں نے اس عورت کو ولادت میں ضروری مدد دی اس دوران میں حضرت عمر خود کھانا تیار کرنے میں لگ گئے الخ واقعہ پوری تفصیل کے

ساتھ مشہور ہے، یہاں جس جزء کے ذکر کی اہمیت ہے وہ یہ ہے کہ اس ہنگامی مدد سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے اس عورت کے شوہر سے فرمایا کہ وہ صبح کو آ کر ملے۔ چنانچہ وہ حاضر ہوا تو آپ نے اس کی ضرورت کا باقاعدہ بندوبست فرمایا۔

یہ اور اس طرح کی دوسری اعلیٰ مثالیں جو ہماری تاریخ میں پائی جاتی ہیں، ان سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلام نے اجتماعی مصائب کے سدباب پر کس درجہ توجہ دی ہے۔ اگر مسلمان اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں ان اصولوں پر عامل رہتے تو آج ہماری بالکل دوسری حالت ہوتی لیکن ہم اس میں ناکام رہے، جس کا نتیجہ ہمارا مسلسل زوال اور انحطاط ہے، ہم پھر سے اپنی عزت بحال کر سکتے ہیں اگر ہم اللہ کے حکم کی طرف لوٹیں اور اسے اپنے اندر پوری طرح قائم کریں۔

کفالتِ اجتماعی کے مالی ذرائع

اجتماعی کفالت کی ضمانت دینے والے دوسرے تمام نظاموں کے برخلاف (جو اس کفالت کا استحقاق انھیں افراد کو دیتے ہیں جو اپنے مال سے ان نظاموں میں حصہ دار بنتے رہیں یعنی کفالتی اسکیم کے لیے سرمایہ مہیا کریں) اسلام کوئی مالی ذمہ داری فرد پر عائد نہیں کرتا۔ بلکہ سرکاری خزانے سے کفالت کی جاتی ہے اور اس کا سرمایہ حسبِ ذیل ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔

۱۔ زکوٰۃ۔ زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر صاحب نصاب مسلمان پر فرض ہے اور یہ اسلام کے ارکان میں سے تیسرا رکن ہے۔ زکوٰۃ کہاں کہاں خرچ ہو، قرآن مجید نے ان مصارف کی یوں وضاحت کی ہے۔

انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیھا والمؤلفۃ قلوبھم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل فریضۃ من اللہ" (۴۶)

(صدقات (زکوٰۃ) صرف حق ہے غریبوں اور محتاجوں کا اور ان کارکنوں کا جو اس کی تحصیل پر مقرر ہیں اور جن (نومسلموں) کی دلجوئی کرنا ہے۔ علیٰ ہذا غلاموں کے آزادی حاصل کرنے، قرضداروں کے قرضے ادا کرنے اور جہاد اور مسافروں پر خرچ کی جائے گی)

یہ ایک امر مسلم ہے کہ زکوٰۃ کے بعض مصارف اب ختم ہو گئے ہیں۔ جہاں تک "مؤلفۃ القلوب" کا تعلق ہے، حضرت عمرؓ کے عہد خلافت سے انھیں زکوٰۃ میں حصہ نہیں دیا جاتا۔ "فی الرقاب"

یعنی غلاموں کا قصہ اب پرانا ہو گیا ہے اس کی حیثیت محض تاریخی رہ گئی ہے۔ اور غلام سرے سے ہے ہی نہیں۔ ۵ ہے " العاملین علیھا " یعنی زکوٰۃ کی تحصیل کا کام کرنے والے۔ تو وہ اب حکومت کے ملازم ہوتے ہیں اور سرکاری خزانہ سے ان کو تنخواہ ملتی ہے اس لیے ان پر زکوٰۃ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ظاہر ہے اب زکوٰۃ کی ساری رقم بیت المال میں جائے گی تاکہ اس سے کفالت اجتماعی کی ضرورتیں پوری ہوں۔ اور مملکت سعودیہ نے اسی بنا پر حال میں یہ قانون بنا دیا ہے کہ زکوٰۃ کی تمام آمدنی ادارہ کفالت اجتماعی کے حساب میں جمع کی جائے گی عام سرکاری خزانے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

۲۔ عطیات وصدقات۔ اس نظام کے لیے سرمایہ کی دوسری مد زکوٰۃ کے ماسوا عطیات و صدقات ہیں، حضرت عثمان کے زمانۂ خلافت میں اس مد پر کافی اختلاف رائے بھی ہو چکا ہے، حضرت عثمان نے ایک مجلس میں جہاں حضرت ابوذر غفاری بھی موجود تھے۔ کعب الاحبارؓ سے سوال کیا کہ اگر مال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو کیا اس کے بعد اس مال میں کوئی اور حق باقی رہتا ہے؟ حضرت کعب نے جواب دیا کہ نہیں! اس پر حضرت ابوذر نے کعب کو ڈانٹا۔ اپنا عصا ان کے سینے پر مارا اور کہا کہ تم غلط کہتے ہو، اور دلیل میں یہ آیت پڑھی۔

" لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من آمن باللہ والیوم الآخر والملائکۃ والنبیین واتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتمی والمساکین وابن السبیل وفی الرقاب واقام الصلوٰۃ واتی الزکوٰۃ " (۴، ۲)

(یہ نیکی نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کر لو یا مغرب کو۔ بلکہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتب سماویہ پر۔ اور پیغمبروں پر۔ اور دیتا ہو مال اس کی محبت کے باوجود، رشتہ داروں کو اور یتیموں کو، محتاجوں کو اور مسافروں کو، اور گردنیں چھڑانے کے لیے (غلاموں کو)، اور نماز کی پابندی رکھتا اور زکوٰۃ ادا کرتا ہو)

اس کے بعد حضرت ابوذر نے کہا کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زکوٰۃ کی ادائیگی اور ذوی القربی اور یتامیٰ پر خرچ کرنے میں تفریق کی ہے (یعنی ان کو دو الگ باتیں ٹھہرایا ہے) اور یہ دلیل حضرت ابوذرؓ کی ٹھیک ہی ہے کیونکہ عطف کے پیرایہ میں دو چیزوں کا بیان ان کی غیریت پر دلالت

کرتا ہے اور اس سے قطع نظر بھی قرآن مجید اور احادیث نبوی میں انفاق پر برابر زور دیا گیا ہے کسی جگہ حکم ہے اور کسی جگہ ترغیب دلائی گئی ہے۔ یہاں تک کہ غریب بیوہ عورت اور مسکین کی مدد کرنے والے کا وہی درجہ بتایا گیا ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کا ہے۔ اسی طرح جو شخص ایک یتیم کو اکل و شرب میں اس وقت تک اپنے ساتھ رکھے جب تک وہ اس سے بے نیاز نہ ہو جائے، اس کے لیے جنت کی بشارت آئی ہے۔

۳۔ ٹیکس۔ ضرورت ہو تو اس مقصد کے لیے ٹیکس بھی عائد کیا جا سکتا ہے۔ جیسے کہ مصالح مرسلہ کی بنیاد پر فقہ مالکی میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ چنانچہ جب بیت المال خالی ہو یا فوج کی ضرورتیں بڑھ جائیں اور وہ بیت المال سے پوری نہ کی جا سکتی ہوں تو اس صورت میں فقہ مالکی کے مطابق امام اغنیا پر اس وقت تک کہ جب تک بیت المال میں روپیہ نہ آ جائے اتنا ٹیکس لگا سکتا ہے جس سے ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ یہ ٹیکس فصلوں کی کٹائی یا پھلوں کو توڑنے کے وقت لگایا جانا زیادہ مناسب ہے۔

اس بارے میں یہ رائے صحیح نہیں کہ امام ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قرض لے، بلکہ جیسا کہ امام شاطبی نے فرمایا ہے غیر معمولی حالات میں صرف اس صورت میں قرض لیا جا سکتا ہے کہ بیت المال میں کہیں سے آمدنی کی توقع ہو اور اس کا انتظار کیا جا رہا ہو۔ لیکن اگر کسی آمدنی کا انتظار نہیں اور بیت المال کے ذرائع آمدنی اتنے کم ہیں کہ وہ ضرورت کے لیے کافی نہیں، تو امام کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ لوگوں پر ٹیکس لگائے۔

غرض امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مصالح مرسلہ کی بنیاد پر، جس پر کہ مالکی فقہا کا عمل ہے، کفالت اجتماعی کے لیے ضروری وسائل فراہم کرنے کی خاطر بیت المال کی آمدنی کی اس تیسری مد سے کام لے۔ جبکہ اس کی دو سابق الذکر مدوں یعنی زکوٰۃ اور عطیات و صدقات سے معاشرے کی ضرورتیں پوری نہ ہوں۔

اختتامیہ

وقت کی تنگی اور اپنی معلومات کی کمی کے باوجود میں نے جو کچھ اوپر لکھا ہے، اس سے ہم

بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اجتماعی ظلم کے سدباب کی اسلام کو کس قدر فکر ہے اور وہ حق اور عدل کی سادی بنیادوں پر ایک متوازن معاشرے کے قیام کے لیے کس قدر باریک بینی سے کام لیتا ہے۔
اب میں اپنی اس بحث کے جسکے نقائص کا مجھے اعتراف ہو بعض بنیادی اصول اخذ کرکے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اس امید پر کہ ان پر مزید غور وخوض ہوگا اور ان کے بارے میں آپس میں گفت وشنید ہوگی۔ اور اس طرح ان میں سے جن باتوں پر آپ اتفاق کریں گے انھیں قبول کر لیا جائے گا۔ پھر ان بنیادی اصولوں کو زیادہ تفصیل سے قلم بند کرکے ایسی شکل دے دی جائے گی کہ آج اس جدید دور میں ہمارے لیے جو سب سے اہم مشکل ہے اُسے حل کرنے کے لیے اللہ کا جو حکم ہے وہ واضح ہو جائے۔

یہ بنیادی اصول حسب ذیل ہیں :

(۱) شریعت اسلامی کے مقررہ حدود کے اندر ملکیت اور انفرادی حقوق قابل حفاظت بھی ہیں اور قابل احترام بھی۔

فی الحقیقت تمام اموال اللہ کی ملکیت کے حکم میں آتے ہیں اور اللہ نے اپنے بندوں کو ان اموال پر اپنا نائب مقرر کیا ہے تاکہ وہ انھیں اس طرح خرچ کریں اور اپنے مفادات ومصالح کے مطابق ان میں یوں تصرف کریں کہ اس سے جماعت کے مفادات ومصالح پر زد نہ پڑے۔ کیونکہ دراصل یہ جماعت ہی کے مفادات ومصالح ہیں، جن کے لیے اللہ نے اموال پیدا کیے۔

ملکیت ایک اجتماعی ذمہ داری ہے جس کے لیے اسلام نے غصب، چوری اور ضبطی کے خلاف پوری ضمانت دی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اسلام نے صاحب ملکیت پر فرض کیا ہے کہ وہ اپنی ملکیت کے استعمال میں ظلم وزیادتی کا ارتکاب نہ کرے، اور اس مقصد سے منحرف نہ ہو جس کے لیے ملکیت اُسے سپرد کی گئی ہے۔

(۲) اسلام فرد کے وجود کا احترام کرتا ہے۔ اور ان حدود کے اندر جن میں جماعت کے مفادات پر زد نہ پڑے اور اس شکل میں جس سے کہ وہ جماعت کے لیے مفید ثابت ہو، فرد کی آزادی اور اسکے احترام کی حفاظت پر شدت سے زور دیتا ہے۔

معاشرہ کے افراد میں مساوات کا قیام اسلام کے احکام میں سے ایک حکم ہے جو یہ لازم کرتا ہے کہ تمام اہل وطن کو مساوی مواقع حاصل ہوں اور ریاست کی نظر میں سب برابر ہوں۔

اسلام نسلی تفریق کو اس کی ہر شکل میں ناپسند کرتا ہے۔ وہ ہر فرد کو حق دیتا ہے کہ اسے کام لے۔ اور واجب قرار دیتا ہے کہ ہر فرد کام کرے۔

(۲) اسلامی معاشرے کے ہر فرد کا یہ ثابت شدہ حق ہے کہ بے کاری۔ مرض۔ معذوری۔ بیوگی اور بڑھاپے میں (یعنی ہر ایسی حالت میں جب کہ وہ وسائل معاش سے کسی ایسے سبب کی وجہ سے محروم ہو جائے جس میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہ ہو۔) اس کی اجتماعی طور پر کفالت کی جائے۔

ان گزارشات کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اور آپ سب حضرات کو اپنے دین کی خدمت اور اپنے احکام کی سربلندی کی توفیق دے اور ہمارے ارباب حکومت میں سے مومنوں کی اپنی شریعت کے قیام کے لیے دستگیری فرمائے۔ بے شک اللہ ہی ہے توفیق دینے والا اور سیدھے راستے پر چلانے والا۔

حوالے

۳۰۔ الملکیۃ ونظریۃ العقد فی الشریعۃ الاسلامیہ ــ شیخ ابوزہرہ۔

۳۱۔ کتاب الخراج امام ابو یوسف۔

۳۲۔ التوبۃ۔ ۱۰۵

۳۳۔ سورۃ الملک۔ ۱۵

۳۴۔ القرطبی فی تفسیرہ۔

۳۵۔ البخاری

۳۶۔ الحجرات۔ ۱۳

۳۷۔ سورۃ السبا۔ ۳۶۔ ۳۷

۳۸۔ سورۃ النساء۔ ۱۲۴

۳۹۔ سورۃ النحل۔ ۹۷

۴۰۔ سورۃ آل عمران۔

۴۱۔ النساء۔ ۳۲

۴۲۔ متفق علیہ

۴۳۔ ایضاً

۴۴۔ مسند امام احمد

۴۵۔ نہج البلاغۃ ج ۲ ص ۱۰۰

۴۶۔ التوبۃ۔ ۵۹

۴۷۔ البقرۃ۔ ۱۷۷

حضرت شاہ ابو الرضا محمد فاروقی دہلویؒ

(۲)

(از ـــــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوبات

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ حضرت شاہ ابو الرضا محمد دہلویؒ کے مکتوبات کی تعداد ۴۵ ہے۔ جن کو صاحبزادۂ گرامی قدر شیخ محمد فخر العالم نے جمع کیا ہے۔ مجموعۂ مکتوبات کے شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں لکھا ہے کہ "یہ میرے والد ماجد کے مکتوبات ہیں جن کو انھوں نے بعض کبرائے وقت مشائخ زمان نیز احباب و مسترشدین کے نام تحریر فرمایا ہے"

یہ مکتوبات حسب ذیل حضرات کے نام لکھے گئے ہیں۔

(۱) شیخ عبد الاحدؒ ابن شیخ محمد سعیدؒ ابن حضرت مجدد الف ثانیؒ۔

(۲) خواجہ شیخ محمد نقشبندؒ ابن خواجہ محمد معصومؒ ابن حضرت مجدد الف ثانیؒ

(۳) مرزا محمد سرہندیؒ

(۴) شیخ عبد الحفیظ تھانیسریؒ

(۵) شیخ محمد مراد کشمیریؒ

(۶) خواجہ عبد الرحیم کشمیریؒ

(۷) شاہ محمد [illegible]۔

(۸) فضیلت مآب مُلّا عصمت اللہ فاروقیؒ قاضی مراد آباد۔
(۹) شہاب الدین قلی ملقب بہ غازی الدین خاں صدیقیؒ سمرقندی۔
(۱۰) سید علی اکبرؒ
(۱۱) شیخ محمودؒ
(۱۲) حاجی عبداللہ سلطان پوریؒ
(۱۳) عنایت خاںؒ۔
(۱۴) میر عزت اللہؒ
(۱۵) میر عبدالحکیمؒ
(۱۶) خواجہ عبدالکریمؒ۔
(۱۷) حقائق آگاہ شیخ بایزید قدس سرہٗ
(۱۸) شیخ محمد یحییٰؒ۔
(۱۹) ایک دوست جن کا نام درج نہیں۔

سب سے زیادہ مکتوبات حضرت شیخ عبدالاحدؒ نبیرۂ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نام ہیں ـــ جو تعداد میں تیرہ ۱۳ ہیں۔ ان میں سے ایک مکتوب حضرت شیخ عبدالاحدؒ کی والدۂ ماجدہ کی تعزیت میں اور ایک ان کے بھائی کی تعزیت میں ہے۔ باقی گیارہ خطوط مضامین عالیہ پر مشتمل ہیں۔ ان میں چار پانچ مکتوب وہ ہیں جو راہِ سلوک کی ایک دقیق بحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے انفاس العارفین میں حضرت شیخ عبدالاحدؒ کے مکتوبات اور ان کے جواب میں اپنے عم بزرگوار کے مکتوبات ـــ درج کر دیے ہیں، اور ان مکتوبات کی بعض عبارات کی تشریح بھی اپنے قلم سے فرمائی ہے۔ ان مکتوبات کے علاوہ شیخ عبدالحفیظ اور محمد مرزا سرہندیؒ کے نام جو مکتوبات ہیں ان میں سے بھی کچھ کو شامل کتاب کیا ہے۔ علاوہ شیخ عبدالاحدؒ کے کچھ حضرات کے نام چھ چھ کچھ کے نام تین تین اور دو دو مکتوب ہیں۔ زیادہ تر ایک ایک گرامی نامہ ہے۔ ان میں سے کچھ سفارش پر مشتمل ہیں۔ اور سب سے آخر میں جو مکتوب ہے وہ ایک دوست کے نام ہے۔ جن کا نام جامع کو معلوم نہ ہو سکا ہوگا۔ خواجہ شیخ

محمد نقشبندؒ کے نام جو دو گرامی نامے ہیں ان میں سے ایک اس موقع پر لکھا گیا ہے جبکہ خواجہ محمد نقشبندؒ نے قصد حج بیت اللہ کیا ہے، دوسرا اُن کے کسی عزیز کی تعزیت میں ہے ـــ شاہ محمد مظفر روہتکیؒ کے نام دو مکتوب ہیں۔ ان میں سے پہلے کے آخر میں تحریر فرمایا ہے۔ "ایں نامہ بکسے ننمائند۔ (یہ خط کسی کو نہ دکھانا) یہ مکتوب اسرار و معارف توحید پر مشتمل ہے، عوام اور ناواقفین کے فہم سے بالاتر ہونے کی بنا پر خود ہی اس مکتوب کی اشاعت کو منع فرمادیا۔ شیخ روہتکیؒ کے نام کا دوسرا خط مع ترجمہ کے آگے آرہا ہے۔

میں نے جن مکتوبات کا انتخاب کیا ہے وہ سوائے ایک کے (جو بنام شیخ عبدالحفیظ تھانیسریؒ) ہے انفاس العارفین میں بھی نہیں ہیں ـــ مجھے مسرت ہے کہ میں ان نادر مکتوبات کو ناظرین الفرقان کے مطالعہ کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ بنظر اختصار خیال تو یہ تھا کہ ان مکتوبات منتخبہ کے صرف اُردو ترجمہ ہی پر اکتفا کیا جائے۔ لیکن اول تو یہ مکتوبات نادرالوجود ہیں، دوسرے ان کی فصاحت و بلاغت دل آویزی اور تاثیر نیز جامعیت و معنویت نے تقاضہ کیا کہ اصل عبارت کو برقرار رکھ کر ترجمہ بھی کردیا جائے ـــ البتہ اپنے ذوق کے مطابق افادیت ناظرین کو پیش نظر رکھ کر بعض مکتوبات کے اقتباس پر اکتفا کی گئی ہے۔ ان مکتوبات میں سے اکثر کی زبان فارسی ہے چند عربی زبان میں بھی ہیں ـــ

شیخ عبدالحفیظ تھانیسریؒ کے نام (۱) ـ

برادر ارجمند، دل پیوند، عبدالحفیظ از التفات	برادر ارجمند عبدالحفیظ ماسوائے خدا کی طرف،
بماسوائے او سبحانہ وتعالیٰ محفوظ باشند۔ مکتوب	التفات سے محفوظ رہیں ـــ تمہارا مکتوب
برادر رسید، نوشتہ بودند کہ بفضلِ الٰہی وقتِ	پہونچا اُس میں لکھا تھا کہ بفضلِ الٰہی وقت
جمعیت بے کلفت میسر می آید وحالے شگرف	جمعیت بے کلفت میسر آتا ہے اور عجیب کیفیت

ع۵ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے انفاس العارفین میں آپ کے متعلق صرف اتنا تحریر فرمایا ہے "از خواص اصحاب ایشاں بود" یعنی شیخ عبدالحفیظ حضرت شیخ ابوالرضاؒ کے خاص اصحاب میں سے تھے۔

روئے می نماید۔ الحمد للہ۔ حق تعالیٰ زیادہ ازیں جمعیت کرامت فرماید و باستقامتِ ظاہر و باطن مشرف دارد۔ چوں تعہدِ عیال و اطفال بامرِ شریف حضرت رب العزت است داخلِ دائرۂ طاعت و عبادت است از تحملِ مشاقِ آں چارہ نیست صابر باشد سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا ...... بقیہ النصیحۃ ملازمت العبودیۃ علی السنۃ و دوامِ المراقبۃ...... والسلام

نمودار ہوتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ حق تعالیٰ اس سے زیادہ جمعیتِ قلب نصیب فرمائے اور استقامتِ ظاہر و باطن سے مشرف رکھے۔ چونکہ اہل و عیال کی دیکھ بھال بھی حضرت ربّ العزت کا حکم ہے اسلئے یہ بھی دائرۂ طاعت و عبادت میں داخل ہے۔ اہل و عیال کے لیے محنت و مشقت برداشت کرنا بھی ضروری ہے۔ صابر رہیں۔ عنقریب اللہ تعالیٰ تنگدستی کے بعد خوشحالی کا سامان مہیا فرمائے گا۔ .... باقی نصیحت یہ ہے کہ سنت کے مطابق عبادت کو لازم پکڑیں اور دوام مراقبہ کا التزام کریں۔ ...... والسلام۔

شیخ عبد الحفیظ تھانیسری کے نام (۲)

...... ولایت بر سہ قسم است، ولایتِ ایمانی و ولایتِ عرفانی و ولایتِ احسانی۔ ولی بولایتِ ایمانی و عرفانی محفوظ نباشد از صدورِ کبیرہ متعمداً چہ جائے صغیرہ۔ اما ولی بولایتِ احسانی محفوظ است از صدورِ کبیرہ مطلقاً و از صدورِ صغیرہ متعمداً والسلام۔

...... ولایت تین قسم کی ہے، ولایتِ ایمانی، ولایتِ عرفانی، ولایتِ احسانی۔ ولایتِ ایمانی و عرفانی والا ولی، قصداً کبیرہ گناہ صادر ہونے سے بھی محفوظ نہیں ہوتا چہ جائیکہ صغیرہ سے محفوظ ہو۔ لیکن ولایتِ احسانی والا ولی مطلقاً صدورِ کبیرہ سے اور متعمداً صدورِ صغیرہ سے محفوظ ہوتا ہے۔ والسلام۔

خواجہ محمد مراد کشمیری کے نام (۱)

عــہ شیخ محمد مراد کشمیری ابن مفتی محمد طاہر کشمیری، کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں اپنے والد ماجد سے تحصیلِ علوم کی (باقی [illegible])

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ السلام علیکم و
رحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ برادرِ ارجمند خواجہ محمد مراد از
حقیقتِ مریدی و مرادی خجستہ فرجام بودہ از
شربِ بندگی و آزادی سیراب کام باشد ۔
مکتوب مع یادگار کمربند پشمینہ رسید، خاطر مسرور
گردید ۔ از استغنارِ محبوب چہ نگارم ۔ اما از
عنایتِ بے غایت شمہ می نویسم ۔ بگوش ہوش
استماع نمائند ۔ کہ ہیچ چیز را جز حق تعالیٰ
بحقیقت ہستی نیست ۔ و ہستی ہمہ چیزہا پرتو
نورِ وجود اوست و بقائے وجود ہمہ اشیار ببقاءِ
فیضِ حضرت اوست کہ اگر یک لمحہ فیض او نرسد
ہمہ عالم درہماں لمحہ در کتمِ عدم رود ۔ پس
ہمہ موجودات در عین زمانِ وجود از دعویٔ
وجود مبرّی اند بزبانِ قال و حال اقرار
می نمایند کہ ما بیگانگانِ خرابۂ عدم ہر چند بخلعتِ
وجود از درگاہِ واجب الوجود وجودہا داریم ولیکن
نظر بحقیقت ہم چناں بیگانہ ایم کہ پیش از تشریفِ
وجود بودیم ۔ کریمہ ۔ کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ

بعد تسمیہ وسلام ۔ برادرِ ارجمند خواجہ محمد مراد
حقیقت مریدی و مرادی سے کامیاب ہو کر مشرب
بندگی و آزادی سے سیراب ہوں ۔ تمہارا مکتوب
مع ایک ادنیٰ کمربند کے پہونچا دل خوش ہوا ۔
استغنارِ محبوبِ حقیقی کے بارے میں کیا لکھوں،
البتہ اُنکی عنایتِ بے غایت کے متعلق لکھتا ہوں
غور سے سنو ۔ کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی چیز کو
درحقیقت، ہستی حاصل نہیں ہے ۔ تمام چیزوں
کی ہستی اُسی کے نورِ وجود کا پرتو ہے اور تمام
اشیار کے وجود کی بقار، بقائے فیضِ خداوندی
کے ساتھ وابستہ ہے ۔ اگر ایک لمحہ بھی اس کا فیض
نہ پہونچے تو تمام عالم اسی لمحہ معدوم ہو جائے۔
پس تمام موجودات اپنے وجود کے زمانے میں بھی
وجود سے دست بردار ہیں اور زبانِ قال و حال سے
اقرار کرتے ہیں کہ اگرچہ ہم بیگانگانِ خرابۂ عدم بھی
واجب کی جانب سے خلعتِ وجود مل جانے کی
وجہ سے (بظاہر) وجود رکھتے ہیں لیکن حقیقت
میں اسی طرح وجود سے برہنہ ہیں جس طرح وجود

(بقیہ صفحہ گذشتہ)
حضرت شیخ عبدالاحد نبیرۂ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلیفہ تھے۔ ان کے ہمراہ سرہند گئے وہاں بہت عرصے رہ کر
کشمیر گئے جہاں بعد وہاں سے [illegible] آکر ایک سال کامل اپنے شیخ کی خدمت میں رہے اور ان سے استفادہ کیا پھر کشمیر گئے اور
وہیں ایک مسجد میں [illegible] ۔ [illegible] مکتوبات نے آپ کا احوال
[illegible] ابوالرضا محمد میں [illegible] ظاہر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے شاگرد [illegible] یا ان سے بیعت ہوئے ہوں۔

برا ثبات ایں دعویٰ گواہ است و حدیث اَلاَ کُلُّ شَیءٍ ماخلا اللهَ باطِلٌ ___ مبینۂ رفع ایں اشتباہ ___ برادرا چوں ایں شہود بدوام پیوندد، مرید را ارادہ رخت از میانہ بربندد.. ...... آفتاب مراد از افق حقیقت طالع گردد، بساط ظلمت غیر و غیریت در نوردد .... فقدان بوجدان مبدل گردد قلق و اضطراب تسکین پزیرد. عطش و تشنگی رو بزوال آرد و بآب زلال وصال سیراب گردد. سعادت سرمدی بحصول انجامد۔

آں سرے کہ از گوش شنیدیم ز خلقے
از علم بعین آمد و از گوش بآغوش

بقیۃ النصیحۃ ـ لازمۃ العبودیۃ علی السنۃ ودوام المراقبۃ.........

ملنے سے پہلے تھے ___ قرآن مجید کی پیش کردہ آیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پسند فرمایا ہوا ایک عرب شاعر کا مصرعۂ مذکورہ اس دعوے کے گواہ ہیں ___ برادرم! جب یہ شہود راسخ ہوجاتا ہے تو پھر آفتاب مراد، افق حقیقت سے طلوع ہوتا ہے اور ظلمت غیر و غیریت کی بساط کو لپیٹ کر رکھ دیتا ہے۔ فقدان وجدان سے بدل جاتا ہے، قلق و اضطراب کو تسکین ہوجاتی ہے۔ تشنگی دور ہوکر وصال کے آب زلال سے سیرابی حاصل ہوتی ہے۔ نیز سعادت سرمدی کی دولت ہاتھ لگتی ہے ___

(ترجمہ شعر) وہ بھید جس کو لوگوں کی زبان سے اپنے کانوں سے سنا تھا اب وہ علم الیقین سے عین الیقین کی حد تک پہونچ گیا اور گوش سے آغوش میں آگیا ___

باقی نصیحت یہ ہے کہ مطابق سنت عبادت و طاعت کو لازم قرار دیں اور دوام مراقبہ اختیار کریں ___

خواجہ محمد مراد کشمیری کے نام۔ (۲)

سوختۂ آتش محبت ابدی و مست بادۂ مودّت سرمدی برادرم خواجہ محمد مراد بعد از حمد و صلوٰۃ وسلام از دعاگوئے خود، ابوالرضا محمد مطالعہ نمایند۔ محب آنست کہ ہرچہ گوید با دوست

...... برادرم خواجہ محمد مراد بعد از حمد و صلوٰۃ وسلام ___ اپنے دعاگو ابوالرضا محمد کی طرف سے مطالعہ کریں۔ محب وہ ہے کہ جو کچھ گفتگو کرے دوست کے ساتھ گفتگو کرے، جو کچھ سنے

گوید و ہر چہ شنود از دوست شنود باہر کہ نشیند با دوست نشیند و ہر چہ بیند از دوست بیند ۔۔۔ نصیحت جامعہ آنست کہ قدم در متابعت حضرت سید المرسلین صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین ۔ استوار داشتہ خدائے عزوجل را بہ بیان حسن وجمال جہاں آرائے او بر بندگان او محبوب گردانند و خود را بہ ہیچ کس فضل ننہند۔

زیادہ چہ نویسم کہ قصہ چنین است،
فرصت اندک، موت در کمین است

دوست سے سنے ۔ جس کسی کے ساتھ بیٹھے دوست کے ساتھ بیٹھے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور جو کچھ دیکھے دوست سے دیکھے ۔۔۔ ایک جامع نصیحت یہ ہے کہ اتباع حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں ثابت قدم رہ کر اللہ تعالیٰ کی محبت کو اس کے جہاں آرا حسن جمال کو بیان کر کے اس کے بندوں کے دلوں میں قائم کریں۔

زیادہ کیا لکھوں ۔۔۔ بات یوں ہے کہ فرصت کم ہے اور موت گھات لگائے کھڑی ہے۔

خواجہ محمد مراد کشمیریؒ کے نام (۳)

برادر سعادت آثار خواجہ محمد مراد، بدریائے نیستی و نامرادی فرو رفتہ دُرِّ یتیم ہستی حقیقی را علی الدوام در کف مراد داشتہ اوقات عزیزہ را بوظائف طاعات و عبادات و تلاوت قرآن و رعایت احسان، موظف دارند و عبارات غریبہ واشارات عجیبہ محجوبان و مہجوران را

برادرم خواجہ محمد مراد۔ دریائے نیستی و نامرادی میں غوطہ زن ہو کر ہستی حقیقی کے دُرِّ یگانہ کو ہمیشہ کف مراد میں رکھتے ہوئے اپنے اوقات عزیزہ کو طاعات، عبادات، تلاوت قرآن اور رعایت حسن سلوک میں صرف کریں ۔ نیز اچھی عبارات غریبہ اشارات کے ذریعے مہجوروں کو [illegible]

ع۵۔ مطالعہ مکتوبات کے وقت خاکسار [illegible] ایک عجیب کیفیت پیدا ہوئی [illegible] شعر یاد آ گیا ۔ [illegible] ہوش باش کہ عالم [illegible] ہے ۔۔۔ [illegible]
[illegible] نہیں [illegible] ہے ۔ [illegible]
[illegible]

مشتاقانِ لقاءِ آں بادشاہ حسن و جمال گردانند و مراہم خدمت و عبادت او سبحانہٗ و تعالیٰ بر طالبانِ راہ مقرر سازند۔۔۔ سیّد الطائفہ جنید بغدادی قدس سرہٗ را کسے بخواب دید از حالِ خیر مآل او پرسید جواب گفت۔ "طاحت العبارات وفنیت الاشارات وما نفعنا الّا رکیعاتٌ رکعنا ہا فی جوف اللیل" حق تعالیٰ آں برادر را از شہوتِ شہرت و لذتِ قبولِ خلق محفوظ و مصئون داراد بحرمۃ النبی و آلہ الامجاد۔۔۔

قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ بحسب امرءٍ من الشرّ ان یشار الیہ بالاصابعِ فی دینٍ او دنیا الّا من عصمہٗ اللہ۔

والسلام علیٰ من اتبع الھُدیٰ۔

حسن و جمال (اللہ تعالیٰ) کی ملاقات کا مشتاق بنا دیں۔۔۔ اور اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت کی راہ و رسم طالبانِ راہ کے لیے مقرر کریں۔۔۔ سیّد الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا اور اُن کے حال کو دریافت کیا۔ جواب میں فرمایا کہ (ہماری) سب عبارتیں ختم ہوگئیں اور تمام اشارات ختم ہوگئے۔ بس ہم کو تو اُن دو معمولی رکعتوں نے فائدہ دیا جو رات کے اندر ہم نے پڑھی تھیں۔ اللہ تعالیٰ آنعزیز کو شہرت کی خواہش اور قبولِ خلق کی لذت سے محفوظ رکھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں۔۔۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ انسان کی بُرائی کے لیے یہی کافی ہے کہ اُس کی طرف لوگ انگلیوں سے (اُس کے مشہور ہونے کے باعث) اشارہ کریں دین یا دنیا کے بارے میں۔۔۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کی حفاظت فرمائے (کہ وہ شہرت کے باوجود اس کی بُری تاثیر سے محفوظ رہے)۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔۔۔

”دربارِ عالمگیری“

(از جناب ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی)

—— (۶) ——

ابوالخیر

ملک ابوالخیر، یہ ملک ابوالمکارم عالم دین حافظ قرآن صوفی منش قاری کے بیٹے تھے، ابوالخیر اپنے پدر بزرگوار سے زیادہ ظاہری ثروت سے مالا مال ہوئے۔ خدا کی راہ میں خرچ کرتے اور جو کچھ ہوتا اس پر ہی قناعت کرتے۔ نہ کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلے، نہ کسی کی ملازمت کی، نہ خدمت گزاری میں اوقات صرف کئے علوم عربیہ سے پورے واقف۔ باپ دولت مند تھے انھیں کی دولت کے سہارے خوب خوب عیش کیا بڑھاپا آیا تو باہنر و قابل اولاد کی خدمت گزاری نے آرام سے گزار دی۔ تاہم مزید مدد معاش کے لئے ہنر و علم پرور شہنشاہ عالمگیر نے سو بیگہ زمین بھی معافی میں دے دی۔

> دریں وقت میمنت عنوان فرمان والاشان صادر شد کہ یک صد بیگہ زمین
> افتادہ لائق زراعت خارج جمع از پرگنہ ملیح آباد تابع سرکار لکھنؤ مضاف لصوبۂ
> اودھ در وجہ مدد معاش شیخ ابوالخیر ولد شیخ ابوالمکارم حسب الضمن مقرر باشد کہ
> حاصل آں را صرف معیشت نمودہ بدعائے بقائے دولت روز افزوں اشتغال
> نماید۔ باید کہ حکام و عمال و جاگیرداران و کروریان حال و استقبال زمین مزبورہ پیمودہ
> و چک بستہ بتصرف او باز گزارند و اصلا و مطلقا تغیر و تبدل با جان راہ نہ دہند و
> بعلت مال و جہالت و اخراجات مثل پیشکش و جریانہ و ضابطانہ و محصلانہ و ہراشہ
> و علفانہ و بیگار و شکار و مقدمی و قانون گوئی و ضبط ہر سالہ بعد تشخیص چک دیگر

زراعت وکل مطالبات سلطانی وتکالیف دیوانی مزاحم نشوند ومیں باب ہر سال سند جدید
نہ طلبند واگر در محصل دیگر چیزے دانستہ باشد آں را اعتبار نہ کنند۔ فرمان بست وپنجم جمادی الاولیٰ
سنہ ۳۴ جلوس مطابق سنہ ۱۱۰۲ ہجری۔

ملا عبد الرقیب

ملا عبد الرقیب کا سلسلہ نسب ملا عبد البکر جامی سے ملتا ہے۔ شہنشاہ عالمگیر انھیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا صاحب نسبت درویش صفت ذی علم اور ماہر مدرس تھے اور باوجود دولت وثروت مال ومتاع، اوراد واشغال کے بڑے پابند تھے۔ انوار معرفت سے خوش دل رہتے زہد وتقویٰ ان کا شعار رہا اور تدین اور پاک دامنی سے آراستہ وپیراستہ رہے۔ طلاقت لسانی اور عذب البیانی ان کا طرۂ امتیاز تھا عزم کی پختگی حوصلہ کی وسعت فکر کی متانت اور ظاہری وجاہت بذل واحسان اور حسن اعمال وکردار میں مشہور تھے متوسطات تک کتب درسیہ میں ملا سعید فرنگی محلی سے تلمذ حاصل تھا۔ احادیث کی سند ملا غلام نقش بندی لکھنوی سے لی۔ اپنے استاد کی معیت میں دہلی میں قیام کیا اور بحکم شاہ عالمگیر وزیر الممالک اسد خاں ونواب عابد خاں صدر الصدور ایک فرمان کے ذریعہ اٹھائیس بیگہ آراضی مضافات لکھنؤ پرگنہ کاکوری میں حاصل کی اور اس کے محاصل سے گزر بسر کرتے رہے۔ پہلے پہلے وظیفہ نقد ملتا رہا پھر آراضیات معافی میں تبدیل ہوگیا۔ نواب اسد خاں کو بھی ان پر اعتماد تھا اور اس حد تک کہ ان کے بہت سے پیچیدہ معاملات کا سلجھانا بھی ان سے متعلق رہا۔ شاہی عدالت میں قضایا اور مہمات میں پیروی کرتے بادشاہ ان کی دیانت اور ایمان داری کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے اپنے چند ذاتی معاملات بھی ان کے سپرد کر دیے۔ بعد چندے گو کہ باضابطہ ان کا تعلق حکومت سے منقطع ہوگیا لیکن درباری امرا سے ان کا میل جول برابر رہا جب شاہ عالمگیر حسن ابدال کی زیارت کے لئے کابل گئے تو لشکر عالمگیری کے ساتھ یہ بھی تھے۔ عہد عالمگیری میں تمام ہندستانی صوبہ جات سے جزیہ کی وصول یابی انھیں کی نگرانی اور سرکردگی میں ہوتی۔ وطن کے قیام اور مستقل رہائش کے فیصلہ کے بعد صوبہ اودھ کے جزیہ کا حصول اور حساب کتاب ان سے متعلق رہ گیا۔ اور ان کی حسن کارگزاری اور وسیع تجربہ کی بدولت جزیہ کی مقدار میں معتدبہ اضافہ ہوا خیرآباد میں ملک محمد عوض، شیخ عبد الحبیب سندیلہ میں اور چھوٹے بھائی ان کے شیخ عبد الحفیظ لکھنؤ ومضافات لکھنؤ میں نیابۃً ان کی طرف سے کام کرتے رہے۔ خود بھی دورہ کے سلسلے میں [illegible] کی ملاقات

ابدالله سے استفادہ کے لئے یہ روزانہ لکھنؤ آتے۔ ملا غلام کے واسطے سے دہلی سے آیا ہوا ان کے نام ایک خط ملا جس میں صوبہ اودھ کی تاریخ لکھنے کے کام کی انھیں پیشکش ہوئی تھی! اور یہ کام بھی بخوبی انجام پایا۔ جب عالمگیر کی خدمت میں ان کا مرتبہ مسودہ تاریخ پہونچا تو عالمگیر بہت خوش ہوا اور اسے دیکھ کے اس نے یہ نوٹ لکھا کہ صوبجات ہند کے دوسرے سوانح نگاروں سے ملا عبدالرقیب کا مسودہ واضح ہے۔ اور مختصر بھی۔ ملا عبدالرقیب نے اپنی نیابت میں ہر ہر ضلع میں ایک وقائع نگار کا تقرر کر دیا تھا جہاں سے روزانہ کے حالات قلم بند کر کے ان کے پاس آتے اور ان کی نظر ثانی کے بعد عالمگیر تک پہونچ جاتے۔ لوگ اس صوبہ کے انھیں بھی اپنا ماویٰ و ملجا سمجھتے اور مشکلات میں انھیں کی طرف رجوع کرتے۔ اجگین ضلع اناؤ (اودھ) ان کی جاگیر میں تھا۔ انھوں نے وہاں سرا اور مسافرخانہ اور کنواں بھی بنوا دیا تھا، بیواؤں کی تنخواہیں، یتیموں کے وظیفے اور لاچاروں کی خفیہ اور علانیہ مدد کرتے رہتے۔ واما السائل فلا تنهر پر پورے پورے عامل رہے۔ کسی شاعر نے حالات اور واقعات دیکھ کر یہ شعر بھی ان کی شان میں کہا تھا ؎

شیخ عبدالرقیب کز فیضش
ہمہ کس را نصیب پنہانی ست

ذی علم اور ذی فضل شخصیتیں جیسے مولوی کرم اللہ کھیولی اور ملا محمد اصغر بانسوی اوقات فرصت میں ان کی صحبت میں بیٹھتے اور علمی بات چیت میں اوقات گزاری کرتے۔ کبھی حدیثی نکات بیان ہوتے اور کبھی قرآنی نکتہ رانیاں ہوتیں۔ ان کا روحانی سلسلہ شیخ عبدالقادر جیلانی تک منتہی ہوتا ہے۔ شاہ پیر لاہوری سے بیعت تھے اور اپنے مرشد کے دل میں ان کی خاصی قدر و قیمت تھی۔ کبھی یہ ان کی خدمت میں پہونچتے تو مرشد ان کی پیشانی کا بوسہ دے کے بہت خوش ہوتے۔ شیخ محمد قلندر لاہرپوری، شاہ عبدالرزاق بانسوی شاہ عبداللطیف بھگانوی، شاہ دوست عرف شاہ دوسی لکھنوی کا سے ان کے بڑے مراسم اور بڑے تعلقات تھے۔ کتب بینی کا شوق تھا اس لیے کتابوں کا ذخیرہ بھی اچھا جمع کر لیا تھا۔ دل بیار و دست بکار ریاضیات شاقہ اور مجاہدات میں بھی سرگرم رہتے۔ دعائے سیفی ان کے ورد میں رہتی۔ صائم النہار اور قائم اللیل تو تھے ہی مگر باوجود شرعیت اور کمال ورع ان چیزوں پر قانع تھے ان کا مقولہ تھا کہ نفس کو قوت نہ پہونچانا چاہیے اس لئے کہ نفس ہی تو ہے جو اغوائے شیطانی میں جلد آجاتا ہے۔ باتوں میں [illegible] تک بہت جلد پہونچتے، ان کی ذکاوت طبع اور سرعت فہم کی داد ملتی۔ ایک بار علما کی مجلس میں حافظ علی المتو

صلواۃ الوسطیٰ میں صلوٰۃ وسطیٰ کے تعیین کی بحث چھڑی تو انھوں نے کہا کہ حافظوا علی الصلوات
اشارہ حرکات بدنی اور ارکان کی طرف ہے اور صلوٰۃ وسطیٰ میں صلوٰۃ قلبی بر دوام شہود کی طرف ۔

شیخ فصیح اللہ بانسوی نے ان کے ملفوظات محافل خمسہ کے نام سے محفوظ کئے تھے۔ عدل پسند اور عدل
ست حد درجہ کے تھے اور مقدمات اور پبلک کے معاملات میں خواہ اجانب ہوں یا اقارب شمہ برابر
رعایت مدنظر نہ رکھتے ما آتاکم الرسول فخذوہ پر پورے پورے عامل تھے قصبہ دیوہ ضلع بارہ بنکی کا ایک
ملہ ان کے سامنے پیش آیا۔ انھوں نے جو حق سمجھا اس پر فیصلہ صادر کر دیا ایک فریق نے ان پر عزیزداری کی
یت کا غلط الزام لگا کے بادشاہ کی خدمت میں درخواست دی۔ عالمگیر نے شاہزادہ کام بخش کے
مقامات سپرد کی کہ اگر واقعی ایسا ہے تو معزول کر دیئے جائیں۔ یہ خبر مرزا یار علی بیگ کو جو شاہی مقربین میں
پہونچی تو انھیں بہت انقباض خاطر ہوا۔ اور تین روز تک دربار میں نہیں گئے۔ بادشاہ نے طلب کیا تو جواب
میں بہت ضعیف ہو گیا ہوں مجھے درباداری سے معاف کر دیا جائے۔ علاوہ بریں مجھے زیارت حرمین
لگی ہے۔ عالمگیر نے پھر اصرار کیا یہ حاضر ہوئے تو استعفا لئے ہوئے اور عذر یہ تھا کہ آپ کو اب تک مجھ پر
اعتماد تھا وہ اب نہیں رہا۔ اس لئے مستعفی ہوتا ہوں۔ عالمگیر نے سوال کیا کہ یہ کیسے؟ انھوں نے جواب دیا
یہ ایسے کہ آج تک آپ کو مجھ پر اعتماد تھا اور مجھے ملا عبد الرقیب پر اور یہ وہ ہی شخصیت ہیں کہ ان کی دیانت
ری کا حال سن کے آپ نے سجدہ شکر ادا کیا تھا۔ آج آپ نے مخالفوں کی بات پر اعتماد کر کے ان کو
زول کر دیا تو مجھے بھی معزول سمجھئے۔ بادشاہ نے جب سنا تو فوراً ملا کی بحالی کے احکام جاری کر دیئے۔

انھیں تصنیف اور تالیف کا بھی شوق تھا اور ایک کتاب اسی داعیہ سے تفسیر میں لکھی تھی اور ان میں
ص طور پر وہ آیات لی تھیں جن کا تعلق واردات قلبی سے ہوتا ہے۔ ان کے ملفوظات "محافل خمسہ" کے نام
مجموعہ میں یہ رسالہ بھی شامل ہے۔ یہ صاحب کرامات بھی تھے۔ صاحب "محافل خمسہ" لکھتے ہیں کہ
نے ایک روز ان سے رخصت چاہی کہ اپنے وطن بانسہ چلا جاؤں۔ فرمایا کہ آج نہ جاؤ راہ میں بھیگ
جاؤگے۔ میں نے عرض کی برسات کا موسم تو ہے نہیں اور مجھے ضرورت بھی شدید ہے فرمایا اچھا جاؤ میں
اور ابھی ۲-۳ میل ہی چلا ہوں گا کہ ملا وہم و گمان بادل گرجے برسے اور برس کے نکل گئے میں تر ابور
ہو گیا۔ آگے جانے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ وہاں ہی بادل حزیں ہو گئیں مجھے قیام کرنا پڑا۔
ان کی یہ بھی ایک خاص آن تھی کہ باوجود کمالات باطنیہ اور قوائے تصرف کسی کو مرید کرنے میں

مشاغل ہی رہے۔ ہاں اگر مرید کیا تو اپنے بیٹے شیخ محمد کو اور انھیں بعد کو خلیفہ مجاز بھی بنا دیا۔ باقی روحانی اور باطنی استفادہ کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت تھی جو مستفید ہوتی رہتی۔ ان میں صاحب محافل خمسہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شہنشاہ عالمگیر کا انتقال ہو چکا تھا اس کے دو ہی سال بعد ان کا ہوا۔ جب تخت نشین بدلتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا تاج ور آتے آتے آتا ہے تو فضا میں تبدیلی پیدا ہوتی، ماحول میں تغیر رونما ہوتا ہے اور انقلابی شورشیں کہیں سر اٹھاتی ہیں۔ اودھ کے صوبہ میں بیسواڑہ کے راجاؤں نے فسادات اور فتنوں کے علم اٹھائے اور ان کے وطن کو قبضہ میں لانے کا تہیہ کیا تو انھوں نے اس آتش فتنہ کی لپٹوں سے محفوظ رہنے کے لئے بطور حفظ ماتقدم اپنے بیٹے محمد منتجب کو سواروں اور پیادوں کی جمعیت کے ساتھ حراست کے لئے اور ان شعلوں سے بچاؤ کی خاطر روانہ کر دیا۔ عالمگیر کے بعد شاہ عالم تخت آرائے حکومت ہوا تو انکی بحالی اور حسب سابق اپنی پوزیشن پر برقرار رہنے کی انھیں سند دی گئی۔ لیکن دنیا اور مافیہا سے نفور و بیزار تو تھا ہی رہا۔ بالآخر علائق دنیوی سے قطع تعلق کرکے ہمہ وقت اور ہمہ تن یاد حق میں مشغول رہنے لگے علالت شروع ہوئی ضعف و نقاہت میں زیادتی ہوئی۔ دوا علاج کا کوئی نام زبان پر لاتا تو فرماتے یہاں کی سختیاں آخرت کے سکون اور آرام کی باعث ہوں گی اب تو لو وہاں کی لگی ہوئی ہے۔ دوا علاج بے سود ہی سے ہوں گے۔ ذکر خفی کی زیادتی تھی۔ بڑی بڑی مقدس ہستیاں قاضی مینا قلندر مہونوی اور بانسہ کے شاہ عبد الرزاق عیادت کو آگئے۔ وقت آخر تھا صاحبزادے کو بلا کے کہا دشمن مخالفت پر کمربستہ ہوں تو پریشان نہ ہونا اور برائی کا بدلہ ہمیشہ بھلائی ہی کی صورت میں دینا۔ حدیث میں ہے کہ الانسان عبید الاحسان۔ صاحب جواہر الانشا لکھتے ہیں کہ انھیں یہ روایت محمد یعقوب فرنگی سے پہونچی اور انھوں نے ملا نظام الدین فرنگی محلی سے سنا کہ ایک دفعہ ملا عبد الرزاق بانسوی نے مراقبہ سے سر اٹھایا تو فرمایا کہ ابھی میں نے جنت کی سیر کی جنت کے باغات میں سے ایک باغ میں دیکھا کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اور ملا عبد الرقیب دونوں بڑی شان و شوکت سے بیٹھے ہیں یہ منظر جب میرے سامنے آیا تو مجھے انتہائی خوشی ہوئی اس لئے کہ یہ دونوں میرے دوست تھے جن کو یہ رتبہ اور شرف ملا تھا انکا مزار قصبہ کاکوری کے محلہ چودھری تالاب میں ہے اور ایک محلہ جزیہ گڑھی انھیں کے نام سے مشہور ہے۔ دو حویلیاں اور دیوان خانہ تھا جن کے ٹوٹے ہوئے آثار تو ہیں لیکن دیدۂ عبرت کا نم نہیں ہے۔ ایک مسجد ہے جس کا سن تعمیر کتبے سے [illegible] پڑھا جاتا ہے موجود ہے۔ ملا عبد الرقیب نے ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی۔ وفات سے قبل ذکر انفاس زور زور سے جاری تھا [illegible]۔ رحمہ اللہ

ترجمہ

از:۔ وحید الدین خاں

لبرل اسلام (۲)

[مسٹر آصف فیضی کی کتاب "اے ماڈرن اپروچ ٹو اسلام" کے چوتھے باب کا ترجمہ۔
اسلام کے بارے میں جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے طرز فکر کے ایک مطالعہ کے طور پر]

تعمیرِ نو کے عام اصول

تاریخی طریقہ HISTORICAL APPROACH

اسلام کا پیغام چودہ سو سال پہلے کی دنیا میں آیا تھا۔ کیا اب اسکی نئی تشریح کی ضرورت ہے۔ کیا وہ تمام دنیا اور ہر زمانے کے لئے نہیں۔ دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں ہے۔ خواہ ایک پیغام سچا ہو اور خواہ وہ ایک مفہوم میں دائمی بھی ہو، پھر بھی اسی مقدمہ کے تحت ضروری ہے کہ اسکو جدید دنیا کی سائنس، فلسفہ، نفسیات مابعد الطبیعیات اور دینیات کے تحت سمجھا جائے۔ ورنہ دنیا کا فکر اور اسکی روشنی اسے ختم کر دے گی۔ ۹۱

انسان کی تاریخ میں یہ تقریباً صرف دس ہزار برس پہلے کی بات ہے کہ اسکے ذہن میں خداؤں کا تصور آیا۔ جو اسکی قسمت پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ آسمان کے ستارے، جنگل کے درخت ہوا کی چڑیاں، خشکی پر رینگنے والے جانور، اور سمندر کی مچھلیاں مافوق الفطرت ہستیاں تصور کی گئیں جو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتی ہیں اور ساری دنیا میں انسان نے ان خداؤں کو پوجنا شروع کر دیا۔ اور قربانی، بھجن، مذہبی اعمال و رسوم اور رقص کے ذریعہ اس نے کوشش کی کہ ان کی آفتوں سے بچ سکے۔ اسکے تقریباً پانچ ہزار برس بعد ــــ یعنی اب سے صرف پانچ ہزار برس پہلے میسو پوٹامیا یا اسکے آس پاس اور نیز ہندوستان میں معلوم

تاریخ میں پہلی بار انسان اس عقیدے تک پہنچا کہ خدا ہزاروں نہیں بلکہ صرف ایک برتر ہستی ہے ـــــــ برہم، وجود مطلق (ABSOLUTE) خالق، رام، یا رحیم، جس نام سے بھی تم اسے پکارو، وہی ایک عبادت کا مستحق ہے۔ ایک لمبی دکھ بھری تلاش کے بعد انسان اس عظیم دریافت تک پہنچا۔ بلاشبہ انسانی تاریخ کی عظیم ترین واحد دریافت! یہ زیرو، آگ، لوہا، نظریہ اضافیت یا کسی اور دریافت سے کہیں زیادہ عظیم ہے۔ یہ تصور بذات خود ایک نادر چیز ہے، وہ ایک پُراسرار اور محرک طاقت ہے، وہ مایوس روحوں کو زندگی دیتا ہے، وہ زندگی کو بامعنی بناتا ہے، وہ آدمی کو وہ کچھ دیکھنے کے قابل بناتا ہے جو وہ نہیں دیکھ سکتا، آدمی کو وہ کچھ سننے کے قابل بناتا ہے جو وہ نہیں سن سکتا، آدمی کو وہ کچھ جاننے کے قابل بناتا ہو جس وہ جان نہیں سکتا ـــــ وہ انسانی علم اور اسکی تبدیلیوں پر منحصر نہیں ہے۔ یہ ایک دوامی تصور ہے جو بدلتا نہیں۔ جس کے لئے نہ زوال ہے اور نہ نقص۔ یہ پیغام اکثر کسی حساس انسان کی مرتعش روح کی معرفت آیا ہے۔ انھیں منتخب لوگوں میں سے ایک پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں۔ ان کی تلاش کی تاریخ، ان کا ذہنی کرب اور بالآخر روشنی کا حصول قرآن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ کتاب سچائی کے اس اندرونی ادراک سے بھری ہوئی ہے جو خدا کے متعلق انسان کی معرفت کی تدریجی تاریخ کو بتاتی ہے۔ یہاں اس کی ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔

سورۂ تکویر کا ترجمہ

خدا کے وجود کا عقیدہ قلبی واردات سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ نہ ثابت کیا جا سکتا نہ ہی غلط ٹھہرایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وقت کے امتحانات میں برقرار رہ سکا۔ انسانی عقل یا معلومات یا سائنس کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ ہمارے مفروضے، نظریات اور حقائق سبھی اپنی فطرت کے اعتبار سے قابل تغیر ہیں۔ مگر خدا کا عقیدہ ناقابل تغیر اور وجدانی ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں، ان کے لئے یہ انسان کی عظیم ترین واحد دریافت ہے۔

مگر اس کامل صداقت کا انتقال صرف ایک ناقص ذریعہ سے ہوتا ہے، یعنی زبان کے ذریعہ سے۔ زبان ایک انسانی چیز ہے، وہ تغیر پذیر ہے، وہ بدلتی رہتی ہے، کوئی زبان پانچ یا دس ہزار برس سے زیادہ بڑھی اور گھٹی نہیں جا سکتی، ہماری زمین پر ایسی بہت سی انسانی تحریریں موجود ہیں جن کا مطلب لامعلوم ہے۔ عبر کی قدیم زبان میں پچھلے دو ہزار برس کے اندر کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں اور لسانیات کے مطالعہ نے قطعی طور پر واضح کر دیا ہے کہ الفاظ کے معنی اور ملتے جلتے الفاظ کے باہمی فروق ارتقائی تبدیلی کے تابع ہیں۔ کوئی زبان ٹھہری ہوئی نہیں رہتی۔ الفاظ اور محاوروں کی تاثیری قوت گھٹتی بڑھتی رہتی ہو یہ کوئی مستقل چیز نہیں ہے بلکہ ان معلوم چیزوں میں سے ہے جو تغیر پذیر ہیں، جس طرح سے یہ واضح ہے کہ الفاظ، محاورے، استعارے اور تشبیہات جو پیغمبر کے زمانے میں عرب استعمال کرتے تھے، اس میں بہت کچھ تبدیلیاں ہو چکی ہیں، ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ یہاں تک کہ وقت گزرنے کے بعد ان کا سمجھنا اتنا ہی مشکل ہو سکتا ہے جتنا کہ موہن جوداڑو کی زبان کا سمجھنا۔ مگر ہم مسلمان یقین رکھتے ہیں کہ اس کا مرکزی پیغام اس کی زبان سے زیادہ مدت تک باقی رہے گا۔ اور وہ ہے خدا کا عقیدہ ——————

"آسمان اور زمین ٹل جائیں گے مگر میری باتیں (WORDS) ہرگز نہ ٹلیں گی۔ (متی ۲۴ آیت ۳۵) اس لئے میرے نزدیک یہ بالکل واضح ہے کہ ہم پیچھے قرآن کی طرف واپس نہیں جا سکتے۔ البتہ قرآن کو لے کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ میں قرآن کو سمجھنا چاہتا ہوں اس مفہوم میں جیسے کہ پیغمبر کے زمانہ کے عربوں نے سمجھا تھا، مگر صرف اس کی تعبیر نو کے لئے اور اس کو اپنی زندگی کے حالات پر منطبق کرنے اور اس پر اس حد تک عقیدہ رکھنے کے لئے جس حد تک وہ بیسویں صدی کے انسان کی حیثیت سے مجھے اپیل کرتا ہے۔ مجھ سے صحرا میں رہنے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ میں اونٹ پر سواری کروں اور کپڑے گھوڑے کھاؤں۔ قبائلی لڑائیوں میں شریک ہوں، داڑھی رکھوں اور جبہ پہنوں اور ایک دقیانوسی عرب کی ذہنیت اپنے اندر پیدا کروں۔ مجھے فرق کرنا چاہئے شاعرانہ حقیقت (POETIC TRUTH) اور حقیقی صداقت

(FACTUAL TRUTH) میں۔ میں فرق کروں گا مذہب کے مغز اور اس کے چھلکے میں۔ قانون میں اور مذہبی افسانہ (LEGEND) میں۔ مجھے اسلام کے پیغام کو ایک جدید انسان (MODERNMAN) کے طور پر سمجھنا اور قبول کرنا ہے نہ کہ ایسے شخص کی طرح جو صدیوں پہلے رہتا تھا۔ میں سند (AUTHORITY) کا احترام کرتا ہوں مگر ذہن وضمیر کے معاملات میں بلا کیف (WITH OUT HOW) کسی بات کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے اور قرآن کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تشریح اس کے تاریخی ماحول کے اندر اور واقعہ نگاری کے اصولوں کے مطابق کی جائے۔ سب سے پہلے ہم ما قبل اسلام عیسائیت اور یہودیت کا مطالعہ کریں گے۔ یہ مطالعہ سامی مذاہب کے درمیان ہمدردانہ مفاہمت کے ذہن کے تحت ہونا چاہیئے۔ یہودیت اور عیسائیت کو ان کے تاریخی ماحول میں پوری طرح سمجھنے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ پیغمبر اسلام کا پیغام اور اس کی معنویت ہمارے اوپر واضح ہو سکے۔

ہندستان ایک مذہبی ملک ہے۔ ہم ہندستان میں بالخصوص زیادہ بہتر طور پر اس پوزیشن میں ہیں کہ مذہب کی تعبیر کر سکیں۔ یہاں ہندو، بدھسٹ، جینی، سکھ، عیسائی، زرتشت کے پیرو یہودی اور مسلمان ایک سیکولر دستور کے سایہ میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں جو قانونی طور پر ہر عقیدہ کی یکساں ضمانت دیتا ہے۔ یہ دستور ہماری طویل رواداری روایت کے مطابق ہر شہری کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنا عقیدہ رکھے۔ اس پر عمل کرے اور اسکی تبلیغ کرے۔ رواداری کی اس روایت کا لحاظ، چند بدنام استثنا کو چھوڑ کر، ہندو، مسلم اور برطانی حکمراں سب کرتے رہے ہیں۔ اس طرح کے جغرافیہ میں رہنے کی وجہ سے ہندستانی مسلمان کو یہ موقع ہے کہ وہ ہر روز اپنے عقیدے اور عمل کو اپنے ہم وطنوں کے ساتھ جانچے اور مقابلہ کرے۔ ہندو بزرگوں کا احترام مسلمانوں کی طرف سے اور مسلم بزرگوں کا احترام ہندوؤں کی طرف سے اس ملک کی عام خصوصیت رہی ہے۔ اس طرح اسلام کی ہندستانی تعبیر (INDINN INTERPRETATION OF ISLAM) کو ایک مشترک مذہبی زندگی اور مشترک عارفانہ تجربات سے [illegible] حاصل کرنے کا موقع ہے جو کہ تعصب اور مذہبی دیوانگی کے خلاف کش مکش میں مصروف ہے اور انتخابیت (ECLECTICISM) اور رواداری کو جنم دے رہا ہے۔ یہ بہت

بڑا موقع ہے جو اسلام جیسے عالمی مذہب کو یہاں حاصل ہے۔

تعبیرِ نو کے بنیادی اصول

چھ اصول جو اسلام کی جدید تعبیر کے لئے پیش کئے جا سکتے ہیں، یہ ہیں :-

۱۔ مذاہب کی تاریخ کا مطالعہ۔
۲۔ سامی نسلوں کے مذہب کا تقابلی مطالعہ
۳۔ سامی زبانوں اور لسانیات کا مطالعہ
۴۔ قانون اور مذہب کی علیحدگی
۵۔ شریعت اور علم کلام کی دوبارہ جانچ
۶۔ علم کائنات (COSMOLOGY) اور سائنسی حقائق کی نئی تعبیر

۱۔ مذاہب کی تاریخ تاریخ مذاہب کا علم اب اکثر یونیورسٹیوں میں نصاب کا اہم جزو بن چکا ہے۔ شکاگو کے پروفیسر جوزف کٹاگوا (JOSEPH M. KITAGAWA) نے اپنی ایک حالیہ تحریر میں "تاریخ مذاہب کے کام کی نوعیت اور اس کا پروگرام" بتایا ہے وہ کہتے ہیں کہ مذاہب کی تاریخ کو پہلے تقابلی مذہب کا نام دیا جاتا تھا۔ شکاگو یونیورسٹی میں تقابلی مذہب کا شعبہ الٰہیات کے شعبہ کے ساتھ ساتھ کام کرتا ہے۔ ہیسکل لکچرول —— (HASKELL LECTURESHIP) کے انتظام نے اس اسکول کو بہت تقویت دی ہے اور نمایاں ترین اشخاص نے اپنے لکچروں سے اس کی پشت پر شاندار علمی روایت قائم کی ہے مثلاً ہارٹ فورڈ سیمنری کے میکڈانلڈ (D.B. MAC DONALD) کولمبیا یونیورسٹی کے ولیم جیکسن (A.V. WILLIAM JACKSON) جان ہاپکنس کے موریس بلوم فیلڈ (MAURICE BLOOMFIELD) ہیڈل برگ کے کارل بزولڈ (KARL BEZOLD) کلکتہ کے رادھا کرشنن (S. RADHAKRISHNAN) آکسفورڈ کے ایچ، اے، آر، گب (H.A.R. GIBB) اور پیرس کے لوئیس مسگنان (LOUIS MASSIGNON)۔

کتاگوا اس شعبے کی نوعیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" یہ ظاہر ہے کہ تاریخ مذاہب کا مطالعہ پورے مذہب کا مطالعہ نہیں ہے، معیاری شعبے (NORMATIVE DISCIPLINES) جیسے دینیات اور فلسفہ، اور بیانیہ شعبے (DESCRIPTIVE DISCIPLINES) جیسے سماجیات علم الانسان وغیرہ مختلف پہلوؤں سے مذہب اور مذہبی مظاہر سے وابستہ ہیں۔ اسی کے ساتھ خود تاریخ مذاہب محض اسکا نام نہیں ہے کہ اسلام، عیسائیت، بدھ ازم، ہندو ازم قدیم مذاہب کی تاریخ یا مختلف مذاہب کے اصول، رسم و رواج اور کلیائی اداروں کے تقابلی مطالعہ کے متعلق کتابیں اکٹھا کرلی جائیں۔ مختصر یہ کہ تاریخ مذاہب نہ تو محض معیاری شعبہ ہے اور نہ بیانی شعبہ، اگرچہ وہ ان دونوں سے تعلق رکھتا ہے"

دوسرا اہم ٹکڑا اس کے بعد ہمیں ملتا ہے :-

" (یونیورسٹی میں) تقابلی مذہب کا شعبہ جن امور سے بحث کرتا ہے وہ یہ ہیں۔ مذہب کا آغاز، کسی نسل کی ترقی میں مذہب کا حصہ، شخصی مذاہب کا ارتقاء بڑے مذاہب کے عناصر ترکیبی کا موازنہ اور حقیقی عمل کی حیثیت سے مذہب کی قدر و قیمت۔ تاریخ افکار کے اوپر بھی وقت دیا جاتا ہے تاکہ خود مذہبی علم کی ارتقائی صورتوں کے متعلق معلومات حاصل ہو سکیں"

مطالعہ اور تربیت کا یہی طریقہ ہے جو اسلام کے حق میں سچی قدردانی کا پس منظر پیدا کرے گا یہ ہمارے دینیات کے طلبہ کے لئے بہترین آغاز ہوگا۔ الازہر اور دیوبند کی پیداوار اس قسم کے مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

سامی مذہب اس بنیادی مطالعہ سے آغاز کرتے ہوئے ہم موسیٰ کے ظہور سے پہلے کے سامی مذاہب کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کریں گے۔ اور اس طرح کے مطالعہ کے لئے رابرٹسن اسمتھ (ROBERTSON SMITH) کی کتاب سامی نسلوں کا مذہب (RELIGION OF THE SEMITES) نقطۂ آغاز کا کام دے سکتی ہے۔ اس کے بعد یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا ایک تاریخی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہوگی۔

ان تین مذاہب کے درمیان مماثلت اتنی زیادہ اور اتنی بنیادی ہے کہ اس کے مطالعہ کے لئے ایک مستقل شعبہ " سامی مذہب کا تقابلی علم " کے نام سے کھولا جا سکتا ہے۔ اس طرح کا ایک مربوط اور تقابلی مطالعہ وقت کی بہت بڑی ضرورت بن چکی ہے، ہمارے درمیان عیسائیت کے ایسے علماء موجود ہیں جو اسلام کی بخوبی معلومات رکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں اسلام کے ایسے علماء موجود ہیں جو عیسائیت یا یہودیت سے واقف ہیں اور ہم میں یہودیت کے ایسے علماء ہیں جنھوں نے اسلام یا عیسائیت پر مہارت حاصل کی ہے اور انھوں نے بعض متعلقہ زبانیں بھی سیکھی ہیں۔ مگر ہمارے درمیان ایسے علماء نہیں، اور اگر ہوں گے تو بہت کم، جو اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے اصول، تاریخ اور مابعد ترقیات کے بارے میں یکساں واقفیت رکھتے ہوں۔ اس مطالعہ کا ایک خصوصی پہلو مذہبی تصورات کے درمیان پیوند کاری (HYBRIDIZATION) ہوگا۔ اسماعیلی خوجے اسلام اور ہندوازم کا مخلوطہ (HYBRIDS) ہیں۔ نُصَیری نے عیسائیت کا تثلیث کا عقیدہ لیا اور اس کو اسلام کی ایک شکل کے ساتھ ملا دیا۔ اسی طرح اور بھی مسلم یا یہودی فرقے ہو سکتے ہیں جو ایک دوسرے سے متاثر ہوئے ہوں۔ قرآن اور پیغمبر کی زندگی بہت واضح ہو جائے گی اگر اس طرح کا مطالعہ خالص علمی اور معروضی انداز میں کیا جائے۔

۳ سامی زبانوں کی تقابلی لسانیات

اب ہم زبان اور اس کے صحیح فہم پر آتے ہیں۔ عربی زبان کا مطالعہ اس کی خاندان کی دوسری زبانوں کے اندر کیا جانا چاہیے۔ یہ بات واضح طور پر ذہن میں رہنی چاہیے کہ عربی، عبرانی، آرامی، سریانی اور حبشی زبان وغیرہ ایک لسانی طبقے سے تعلق رکھتی ہیں جنکو سامی زبانیں کہا جاتا ہے۔ عربی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے آدمی اس طبقہ کی دوسری زبانوں سے کچھ نہ کچھ آشنا ہو جاتا ہے اور سامی زبانوں کی تقابلی گرامر سے بھی اسکو کافی واقفیت ہو جاتی ہے۔ اس موضوع پر جرمن مستشرقین نولدیکی (NOELDEKE) اور بروکل مین (BROCKELMANN) وغیرہ کا مطالعہ توجہ کے ساتھ کرنا چاہیئے تاکہ ہم ان لغزشوں اور غلط مفروضوں سے بچ سکیں جو قرون وسطیٰ کے عرب لغویین کے کام میں پائی جاتی ہیں۔ فرانکل (S. FRAENKEL)

کی کتاب جو سنہ ۱۸۸[illegible]ء میں لیڈن سے شائع ہوئی اور جیفرے (A. JEFFERY) کی کتاب (FOREIGN VOCABULARY OF THE QURAN) جو سنہ ۱۹۳۸ء میں بڑودہ سے شائع ہوئی۔ ان میں ان تریقات کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے جو اس سلسلے میں یورپی ماہرین لغات نے حاصل کی ہیں۔ مثال کے طور پر اب ہم کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ "فاروق" کا لفظ فرق (فرق کرنا) کے مادہ سے نکلا ہے۔ بلکہ یہ ایک سریانی لفظ "پاروقہ" سے آیا ہے جس کے معنی ہیں نجات دہندہ (DELIVERER) عمرؓ کا نام فاروق اس اعتبار سے پڑا کہ وہ عیسائیوں کو مسلمانوں کے ظلم سے نجات دلانے والے تھے۔ یہ لقب انھیں عیسائیوں کی طرف سے دیا گیا جو ایک خاص زمانے تک سریانی زبان استعمال کرتے تھے۔ اس طرح کی مثالیں اور بھی کثرت سے ملیں گی۔

قانون کی مذہب سے علیحدگی

معاشرتی قانون کی اخلاقی یا مذہبی قانون سے علیحدگی اب اسلام میں بلا تاخیر ہو جانی چاہیئے۔ سب سے پہلے ہمیں عالمی اخلاقی اصول جیسے سچائی، ازدواجی عصمت، دیانت داری وغیرہ، اور مخصوص اخلاقی قوانین جیسے سود اور شراب کی حرمت کے درمیان فرق کرنا ہوگا۔ اول الذکر کا حکم تمام مذاہب میں دیا گیا ہے۔ موخر الذکر کا حکم سب کے یہاں نہیں ہے۔ اس سے یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ اس طرح کے معاملات میں زیادہ زور نہیں دینا چاہیئے۔

اس کے بعد ہمیں قانون کو لینا ہے۔ پہلا کام یہ ہے کہ مذہبی عقائد اور اصولوں کو منطقی طور پر قانونی احکام و ضوابط سے الگ کر دیا جائے۔ انسان کا بنیادی عقیدہ قانون کی خارجی پیروی سے کچھ مختلف چیز ہے، اخلاقی نوعیت کے احکام ضمیر سے تعلق رکھتے ہیں، مگر قانونی احکام کو اسٹیٹ ہی کے ذریعہ نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اخلاقی معیار داخلی (SUBJECTIVE) ہیں اور قانونی احکام معروضی (OBJECTIVE) تقدس کے باطنی تصور کو ایک حد تک سماج کے خارجی طرز عمل سے الگ کر دینا چاہیئے۔ یہ علیحدگی آسان نہیں ہے۔ اس کو غیر اسلامی بھی سمجھا جائے گا۔ مگر شریعت پر دوبارہ غور و فکر کرنے کی کوشش اسی اصول کو ماننے کے بعد ہی شروع ہو سکتی ہے۔

اس لئے اعمال کی قانونی حیثیت کے بارے میں نئے درجات مقرر کرنا ہوں گے۔ شریعت میں احکام کے پانچ درجے بتائے گئے ہیں ـــــ فرض، مندوب، مباح، مکروہ، حرام، اس میں ایسے معاملات بھی داخل کرنے ہوں گے جو شریعت کے دائرے سے باہر ہیں، مگر خاص حالات میں سول عدالتوں کے قانون کے مطابق عین جائز ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ترکی میں معاشرتی قانون کا نفاذ، سول میرج اور طلاق، کمپنی لا، انشورنس، فضائی قانون، ہائر پرچیز اگریمنٹ، بین الاقوامی مالیاتی لین دین جس پر سود لگتا ہے، سرکاری قرضے وغیرہ۔ عدالتوں میں زیر بحث آنے والے قوانین کا تقدس مسلمان کی نظر میں کچھ مختلف ہونا چاہئے جیسے انکم ٹیکس، ریونیو، صنعتی جھگڑے، ایسے معاملات میں اصولی طور پر سیکولر قانون کو تسلیم کر لینا چاہئے۔ یہودیوں کے یہاں ایسا ہو چکا ہے۔ ربی اگنازمیبام (RABBI IGNAZ MAYBAUM) کہتا ہے ـــــ "ہم تورات کو چھوڑ نہیں سکتے، مگر تورات، جہاں تک اس کے دیوانی اور فوجداری قوانین کا تعلق ہے، اس نے اپنا عمل ہماری زندگی میں اسی وقت ختم کر دیا جب کہ ہم مغربی تہذیب کے ملکوں کے شہری ہو گئے"[۱]

اس طرح کی ایک آزاد تعبیر (LIBERAL INTERPRETATION) کسی اسلامی ملک کے دستور کو متاثر کرنے والی ثابت ہوگی۔ اسلام کے مطابق خدا ہر چیز کا مالک ہے، وہی کسی ریاست کا حقیقی حکمراں ہے اس طرح کا ایک نظریہ جدید دنیا میں ناقابل عمل ہے اور واحد قابل عمل نظریہ صرف وہ ہے جو بے شمار جدید جمہوری دستوروں میں دیا گیا ہے یعنی یہ کہ کسی ملک کے جو شہری ہیں وہی اس علاقہ کے حکمراں ہیں۔ اگر مذہب بتدریج تمدنی قانون کی زنجیروں سے آزاد ہو جائے اور قانون کو آزادانہ بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع ملے تو مسلم سوسائٹی بلاشبہ بہت تیزی سے ترقی کرے گی۔

مذہب کو چاہئے کہ وہ خدا کی پرستش، روحانی صفائی زندگی کی باقاعدگی پر زور دے اور کرو اور نہ کرو (DO'S AND DONTS) کی جزئیات میں الجھے، تمام

---

[۱] THE JEWISH MISSION (LONDON 1949) P. 94

چیزوں سے قطع نظر کرکے اسلامی بھلائیاں، مثلاً فیاضی، تواضع، اخوت، بلند ہمتی اور انسانیت کی تعلیم، مسلم تاریخ کی مثالوں کی روشنی میں دینا چاہیئے، مزید یہ کہ اسلام کی اخلاقیات کو جدید دنیا کے فلسفی اور علمائے اخلاقیات کی تعلیمات سے مضبوط کرنا چاہیئے، ہم کو اپنا دل اور اپنا دماغ بارتھ (BARTH) ٹلک (TILLICH) کیرک گارڈ (KIERKEGAARDE) اور رادھا کرشنن کے افکار کے لئے کھلا رکھنا چاہیئے۔ ہمیں قرآن کو ایک ایسی کتاب نہیں بنا دینا چاہیئے جس نے خدا کے کلام کو بس ایک کتاب میں بند کر دیا ہو۔ اور سنت کو ایک معصوم ماخذ کی حیثیت دیدی ہو۔ اگنا زیہام نے لکھا ہے کہ یہودی ربی " اپنی ضمیر کی آواز پر کان نہیں لگاتے، وہ قانون کی کتابیں الٹتے رہتے ہیں " (P. 97) یہی حال ہمارے مسلم علماء کا ہے۔

۵ شریعت اور علم کلام کا از سرنو جائزہ اسلام کے علم دینیات کو ہر پہلو سے دوبارہ جانچنا چاہیئے اور جدید فلسفہ مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، نفسیات اور منطق کو اسلام کے بنیادی عقائد کی نئی تشریح میں استعمال کرنا چاہیئے، اسلام کا فن دینیات (علم کلام) اپنے مختلف پہلوؤں سے امام غزالی کے بعد کوئی ترقی نہیں کر سکا ہے، مغربی خیالات کا جدید سیلاب، لوتھر اور اس کے بعد کے پروٹسٹنٹ مفکرین کی عظیم ترقیاں اسینٹ ٹامس اکوئیناس (ST. THOMAS AQUINAS) اور سوریز (SUAREZ) سے لے کر مارٹین (MARITAIN) اور برڈیا (BERDYAEV) تک کی علمی کوششیں اور جدید دنیا کے یہودی اور دوسرے مفکرین کے خیالات کو، اپنا مخصوص امتیاز باقی رکھتے ہوئے اسلام کے کلامی اصولوں کے استحکام اور دوبارہ تشکیل RE-SHAPE کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔

۶۔ سائنسی حقائق اور علم کائنات کی نئی تعبیر قدیم مذہبی کتاب یا حدیث میں جہاں کہیں مظاہر فطرت یا سائنسی حقائق پر کلام کیا گیا ہو، اس کو مقدس نہ قرار دینا چاہیئے بلکہ علمی تنقید کے لیے کھلا رہنا چاہیئے۔ اور پھر جدید سائنس کی روشنی میں یا تو انھیں قبول کیا جائے یا ان کی اصلاح کی جائے یا انھیں رد کر دیا جائے۔ اس میں علم الانسان، حیاتیات، طبیعیات، ریاضیات، کیمیا اور علم الادویہ سب شامل ہیں۔ عالم کا تصور، اور وقت اور کائنات کا تصور جو کوپرنیکس کے

زمانے میں تھا، وہ اب انقلابی طور پر بدل گیا ہے، اسلام کو ان تبدیلیوں کا لحاظ کرنا ہوگا اور مذہب کے نقشے سے سائنسی عدم مطابقت ختم کر دینی پڑے گی۔ ۱۰۱

مثال کے طور پر مسیح کی بے باپ کی پیدائش پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں۔ یہی معاملہ قرآن میں جنت دوزخ کی تشریحات کا ہے۔ ان چیزوں کی لفظی صداقت (LITERAL TRUTH) پر اصرار نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کی شاعرانہ صداقت (POETIC TRUTH) زیادہ حقیقی اور اہم ہے۔ روزہ کے فائدے اور روحانی برکتیں اس کے تنگ اور سخت مسائل پر اصرار کیے بغیر بتانا چاہیئے۔ مشرقی عرب کے پورے علاقے میں یہ حال ہے کہ رمضان کے مہینے کی راتوں کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ جشن، ملاقات، موسیقی اور رقص کے پروگراموں میں شرکت، وقت اور پیسے کے ضیاع کے لیے خاص ہے۔ بلاشبہ مذہبی اعمال میں لچک کا طریقہ اختیار کرنا اسلام کی روح کے زیادہ مطابق ہوگا۔ (باقی)

نگاہ اولیں، بقیہ صفحہ ۶

اور بتائیں کہ ہمارے احساسات اس معاملے میں کیا ہیں۔

جب سے مسلم یونیورسٹی کا یہ تازہ قضیہ پیدا ہوا ہے ہمارا برابر یہ احساس رہا ہے کہ ہندوستانی جمہوریت میں مسلمانوں کو حکومت سے اپنی شکایات کے طویل سلسلے میں اتنا مضبوط اور بے غبار کیس کوئی دوسرا نہیں ملا ہے۔ یہ مسلّمہ طور پر مسلمانوں کی ایک تاریخی ملکیت کا، جس پر موجودہ حکومت کے ایک انکوائری کمیشن کی مہر تصدیق بھی لگ چکی ہے، غصب ہے۔ اور غصب کنندہ براہ راست حکومت!— اس کیس میں اگر مسلمانوں کو اقلیت ہونے کی وجہ سے ہار ماننی پڑے تو یہ صرف ہندوستانی جمہوریت کا ننگ ہو۔ لیکن مسلمان اس ہار پر خاموش ہو کر بیٹھ جائیں اور باندازِ عمل اس ظلم سے سمجھوتہ کرنے لگیں، تو اس کا الزام کسی اور کو نہیں دیا جا سکتا۔ اور یہ پست ہمتی کی وہ حد ہے کہ اس کے بعد اگر عزت و آبرو کی باتیں کرنا چھوڑ ہی دی جائیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

Lucknow.

الفرقان
لکھنؤ
مرتبہ
عتیق الرحمن سنبھلی
فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے
مسئول
ظور نعمانی

قرآن آپ سے ـــ کیا کہتا ہے؟
تالیف ـــ مولانا محمد منظور نعمانی
بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آب حیات ہے،
لیکن ہماری دنیا اس سے ناآشنا ہے یہانتک کہ اسکو "کلام الٰہی" ماننے والی
اُمت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے
(یہ کتاب)
اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے.
یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے.
جسمیں ۳۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے.
یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ
قرآن کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے.
نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، ۳۰۰ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳/-
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندستان سے -/٦
پاکستان سے -/٨
ششماہی
ہندستان سے ٣/٥٠
پاکستان سے -/٤

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

(فی کاپی ٦٠ پیسے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
١٢ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
١½ پونڈ

جلد ٣٣ | بابتہ ماہ شوال ١٣٨٥ھ مطابق فروری سنہ ١٩٦٦ع | شمارہ ١٠

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اولیں

از ——— محمد منظور نعمانی

جدید تمدن اور زمانے کے نئے حالات نے زندگی کے مختلف شعبوں میں بہت سے ایسے مسائل پیدا کر دیے ہیں جن کا واضح حکم ہماری فقہ میں موجود نہیں ہے اور روزمرہ کی زندگی میں مسلمانوں کا بھی ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے بارہ میں شریعت کا حکم معلوم ہو ——— اس کی بہتر اور زیادہ اعتماد و اطمینان کے قابل صورت یہ ہو سکتی تھی کہ مختلف مکاتب فکر کے صاحب بصیرت علماء کی کوئی مجلس ان مسائل پر اجتماعی طور پر غور کرے ——— الفرقان کے ناظرین کو یاد ہو گا کہ اب سے قریباً ڈھائی سال پہلے ستمبر ۶۲ء میں اسی مقصد کے لیے "مجلس تحقیقات شرعیہ" کے نام سے علماء کی ایک مجلس قائم ہوئی تھی۔ اس نے غور و فکر اور تحقیقات کے لیے مسائل کی جو ابتدائی فہرست تیار کی تھی اس میں بیمہ (انشورنس) کا مسئلہ سر فہرست تھا جس کے بارہ میں مجلس نے اپنا تحقیقی کام ختم کر کے حال ہی میں اپنے فیصلہ کا اعلان بھی کر دیا ہے جو متعدد اخبارات میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

مجلس نے اپنے اس تحقیقی کام کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا اور جو مواد جس طرح فراہم کیا اور ارکان مجلس کے علاوہ اس دور کے دیگر اکابر علماء و اہلِ فتویٰ کی تحقیقات و آراء سے بھی جس طرح استفادہ کیا اس کا تذکرہ ان شاء اللہ موجب بصیرت ہو گا۔

سب سے پہلے مجلس کی طرف سے ایک سوالنامہ[1] تیار کیا گیا جس میں بیمہ کی حقیقت اور اس کی مختلف اقسام کے بارہ میں مستند معلومات کی روشنی میں ضروری توضیحات کی گئیں، نیز بیمہ کے مصالح اور مفاسد تفصیل سے لکھے گئے۔ اس کے بعد بیمہ کی مختلف اقسام کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے بارہ سوالات

---

[1] یہ سوالنامہ جناب مولانا محمد اسحٰق صاحب ندوی سندیلوی نے مرتب کیا تھا جو مجلس تحقیقات شرعیہ کے کام کے گویا اصل ذمہ دار ہیں۔

قائم کیے گئے۔

یہ سوالنامہ جو بجائے خود ایک تحقیقی اور تفتیشی کام تھا ارکانِ مجلس کے علاوہ ہندوستان و پاکستان کے مختلف مکاتبِ فکر کے قریب قریب تمام مشاہیر علماء اور اہلِ فتویٰ کو بھی بھیجا گیا اور ان میں سے اکثر حضرات نے پوری توجہ اور اہتمام کے ساتھ مفصل اور مدلل جوابات لکھے۔ توقع کے مطابق بعض حضرات نے بیمہ کی تمام شکلوں کو ہر حال میں ناجائز اور قطعی حرام قرار دیا اور لکھا کہ بیمہ اپنی اصل حقیقت کے لحاظ سے چونکہ ربوٰا بھی ہے اور قمار بھی اور شرعی نقطۂ نظر سے اس میں اور بھی مفاسد ہیں اس لیے کسی شکل اور کسی حال میں اس کے جواز کی گنجائش نہیں ہے۔ اس جواب کے لکھنے والوں میں جناب مولانا عبید اللہ صاحب مبارکپوری رحمانی سلفی اور جناب مولانا مفتی محمود صاحب گنگوہی حنفی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں بزرگوں نے اپنے الگ الگ انداز میں پورے استدلال کے ساتھ اپنا یہ نقطۂ نظر تفصیل کے ساتھ لکھا اور بلاشبہ احتیاط اور تقویٰ کا تقاضا یہی ہے کہ بیمہ جیسے معاملات سے بچا ہی جائے۔ دوسرے اکثر حضرات نے بھی اسکو تو تسلیم کیا کہ بیمہ ربوٰا اور قمار کی شکل سے خالی نہیں ہے اسلئے اصلاً ناجائز ہی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ان حضرات نے یہ بھی لکھا کہ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد بن حسن کی تحقیق یہ ہے کہ ربوٰا و قمار جیسے عقودِ فاسدہ کی حرمت کا حکم دار الاسلام میں ہے، جو علاقے دار الاسلام نہ ہوں ان میں ایک مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ اس طرح کے معاملات اگر کرے تو وہ اگرچہ صورت میں ربوٰا یا قمار ہو لیکن حقیقت میں ربوٰا یا قمار نہیں ہے اس بنا پر ان علاقوں میں اس طرح کے معاملات ان دونوں اماموں کی تحقیق کی بنا پر ناجائز نہیں ہیں، اسلئے ایسے علاقوں کے جو لوگ اپنی املاک وغیرہ کے تحفظ کیلئے اپنے مخصوص حالات میں بیمہ کو ناگزیر سمجھیں ان کے لیے اس مسلک کی بنا پر گنجائش ہے۔

مجلس کے سوالنامہ کے جواب میں اکثر اہلِ علم و اصحابِ فتویٰ نے تفصیلات کے فرق کے ساتھ یہی جواب دیا۔ ان میں خاص طور سے قابلِ ذکر حضرات یہ ہیں:-

حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب (صدر مفتی دار العلوم دیوبند) مولانا مظفر حسین مظاہری (مفتی مظاہر علوم سہارنپور) مولانا محمد یحییٰ قاسمی (مفتی امارتِ شرعیہ بہار و اڑیسہ) مولانا ولی حسن صاحب (مفتی مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی)

مولانا ولی حسن صاحب کا جواب ایک مبسوط تحقیقاتی مقالہ ہے جو فل اسکیپ کے قریباً پچاس صفحات کے بقدر ہے اس پر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کی تصدیق بھی ہے۔ یہ پورا مقالہ رسالہ "بینات کراچی" میں شائع ہو [illegible] سے بیان [illegible] وقت علم میں آئی کہ "ربوٰا بین المسلم والحربی" کے بارہ میں امام ابو حنیفہ

اور امام محمدؒ کا جو مسلک ہو بعض شرائط کے ساتھ وہی مسلک امام دارالہجرت مالک بن انسؒ کا بھی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (سابق مفتی دارالعلوم دیوبند مقیم حال کراچی) کا جواب بھی حسب توقع مفصل مدلل اور فقیہانہ ہو اور اسکا حاصل بھی قریب قریب یہی ہو۔ اور غالباً وہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

مفتی امارت شرعیہ بہار مولانا محمد یحییٰ قاسمی نے اپنے جواب میں ربوٰا وغیرہ عقود فاسدہ سے متعلق دارالاسلام اور دارالحرب کی تفریق کے بارہ میں امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے مذکورہ بالا مسلک کو منقح اور مدلل طور پر پیش کرنے کی بڑی فاضلانہ اور فقیہانہ کوشش کی ہے۔

۲۰ دسمبر ۱۹۶۵ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مجلس تحقیقات شرعیہ کا اجلاس ہوا۔ ارکان مجلس نے سوالنامہ کے موصولہ جوابات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے غور و فکر اور باہمی مشاورت سے بنیادی طور پر اسی دوسرے مسلک پر اتفاق کیا جس کا حاصل یہی ہو کہ بیمہ جیسے عقود فاسدہ جن کی تہہ میں ربوٰا اور قمار کی ہو شریعت اسلامی میں ان کو حرام قرار دیا گیا ہو۔ اسلئے عام حالات میں ان سے احتراز ہی کرنا چاہیے۔ مگر چونکہ متعدد ائمہ (امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ اور ایک حد تک امام مالکؒ) بھی دارالاسلام سے باہر یعنی دارالحرب میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ان عقود فاسدہ کو ربوٰا اور قمار ہی نہیں سمجھتے اور اس کی اجازت دیتے ہیں۔ اسلئے جن حالات میں بیمہ کے بغیر عظیم نقصانات کا اندیشہ ہو تو دفع ضرر کے لیے ان ائمہ کے مسلک پر عمل کیا جا سکتا ہے فان الضرر مدفوع، والضرورات تبیح المحذورات۔

مسئلہ پر غور و فکر کے اثنا میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ ربوٰا (سود) اور میسر (قمار) کی حرمت کا اعلان قرآن مجید میں بھی صراحت اور جس شد و مد کے ساتھ کیا گیا ہو اسکے باوجود امام ابوحنیفہؒ و امام محمدؒ اور امام مالکؒ نے اس حکم کو دارالاسلام کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہوئے دارالحرب میں ان عقود فاسدہ کے جواز کا جو حکم دیا ظاہر ہے کہ یہ رائے ان ائمہ کرام نے جب ہی قائم کی ہوگی جب ان کے سامنے اس کی کوئی روشن اور قوی دلیل سامنے آئی ہوگی۔ کیونکہ صرف قیاس اور اجتہاد سے کسی امام کے نزدیک بھی قرآن مجید کے ایسے قطعی، صریح اور مطلق احکام میں تخصیص و استثنا نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہو یہ وہی دلائل ہوں جو مبسوط سرخسی وغیرہ میں امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے مسلک کی تائید میں ذکر کیے گئے ہیں یا ان کے علاوہ اور دلائل ہوں ــــ بہرحال ان ائمہ کبار کا یہ فتویٰ بجائے خود اس کی دلیل ہے کہ انھوں نے کسی محکم دلیل کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی ہے ــــ علاوہ ازیں قرآن مجید میں سورۂ نساء میں جہاں خطاءً قتل مومن کے کفارہ اور دیت کا حکم بیان کیا گیا ہے وہاں دارالاسلام کے مقتول مسلم باشندہ اور دارالحرب کے مقتول مسلم باشندہ کے حکم میں یہ فرق بتایا گیا ہے کہ پہلے کے قتل کی صورت میں کفارہ بھی واجب ہوگا اور مقتول کے ورثا کو دیت بھی ادا کرنی ہوگی اور دوسرے کے قتل کی صورت میں صرف کفارہ دینا ہوگا دیت ادا نہیں کی جائے گی۔ بہرحال جان کی دیت میں یہ تفریق خود قرآن مجید نے کی ہے اور ظاہر ہے کہ مال کا مسئلہ جان کے مقابلہ میں بہرحال اھون ہے۔

معارف الحدیث

نفلی روزے

(مسلسل)

عشرہ ذی الحجہ اور یوم العرفہ کا روزہ :-

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ اَيَّامٍ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ اَنْ يُّتَعَبَّدَ فِيْهَا مِنْ عَشْرِ ذِي الْحِجَّةِ يَعْدِلُ صِيَامُ كُلِّ يَوْمٍ بِصِيَامِ سَنَةٍ وَقِيَامُ كُلِّ لَيْلَةٍ مِنْهَا بِقِيَامِ لَيْلَةِ الْقَدْرِ۔

(رواہ الترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنوں میں سے کسی دن میں بھی بندہ کا عبادت کرنا اللہ تعالیٰ کو اتنا محبوب نہیں جتنا کہ عشرۂ ذی الحجہ میں محبوب ہے (یعنی ان دنوں کی عبادت اللہ تعالیٰ کو دوسرے تمام دنوں سے زیادہ محبوب ہے) اس عشرہ کے ہر دن کا روزہ سال بھر کے روزوں کے برابر ہے اور اس کی ہر رات کے نوافل شب قدر کے نوافل کے برابر ہیں۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) اس سے پہلے بھی ایک حدیث میں ضمنی طور پر عشرۂ ذی الحجہ کے نفلی روزوں کا ذکر آچکا ہے اور وہاں یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ اس سے مراد یکم ذی الحجہ سے نویں ذی الحجہ تک کے ۹ دن ہیں۔ کیونکہ عید کے دن تو روزہ رکھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صِيَامُ يَوْمِ عَرَفَةَ اِنِّیْ اَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِیْ بَعْدَهٗ وَالسَّنَةَ الَّتِیْ قَبْلَهٗ

(رواہ الترمذی)

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ عرفہ کے دن کا روزہ اس کے بعد والے سال اور پہلے

والے سال کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) حضرت ابو قتادہ کی ایک طویل حدیث صحیح مسلم کے حوالے زیر عنوان "ہر مہینے کے تین نفل روزے" پہلے گزر چکی ہو اس میں یہ مضمون بھی قریب قریب انہی الفاظ میں آچکا ہو اور وہاں دوسری احادیث کی روشنی میں یہ وضاحت بھی کی جا چکی ہو کہ یوم عرفہ کے روزہ کی یہ فضیلت اور ترغیب ان حجاج کے لیے نہیں ہو جو ادائے حج کے لیے عرفہ کے دن میدان عرفات میں حاضر ہوں ان کے لیے وہاں روزہ نہ رکھنا افضل ہے ــــ اور وہیں اس کی حکمت بھی بیان کی جا چکی ہے۔

(فائدہ) بعض لوگ ایسی حدیثوں میں شک کرنے لگتے ہیں جن میں کسی عمل کا ثواب اور ثمرہ ان کے خیال کے لحاظ سے بہت زیادہ اور غیر معمولی بیان کیا گیا ہو جس طرح کہ اس حدیث میں عرفہ کے روزہ کے بارہ میں فرمایا گیا ہو کہ اس کی برکت سے ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہوں کے معاف ہو جانے کی امید ہے" ــــ اس شک کی بنیاد ارحم الراحمین کی رحمت و کرم کی وسعت سے ناآشنائی ہے۔ اللہ تعالیٰ انتہائی کریم اور مختار مطلق ہے جس دن کے جس عمل کی اپنے کرم سے جتنی بڑی چاہے قیمت مقرر فرمائے۔ سال کی ایک رات "لیلۃ القدر" کو اس نے "خیر من الف شھر" ہزار مہینوں یعنی قریباً تیس ہزار دنوں اور راتوں سے بہتر قرار دیا ہے۔ یہ اس کی کریمی ہے ــــ الغرض جب حدیث صحیح ہو تو اس طرح کے وساوس مومن کو نہ ہونے چاہئیں۔

پندرھویں شعبان کا روزہ :-

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا كَانَتْ لَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَقُوْمُوْا لَيْلَهَا وَصُوْمُوْا نَهَارَهَا فَإِنَّ اللّٰهَ يَنْزِلُ فِيْهَا لِغُرُوْبِ الشَّمْسِ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَقُوْلُ أَلَا مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَ لَهُ أَلَا مُسْتَرْزِقٌ فَأَرْزُقَهُ أَلَا مُبْتَلًى فَأُعَافِيَهُ أَلَا كَذَا أَلَا كَذَا حَتّٰى يَطْلُعَ الْفَجْرُ ــــــــ (رواہ ابن ماجہ)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب شعبان کی پندرھویں رات آئے تو اس رات میں اللہ کے حضور میں [illegible] اور اس دن کو روزہ رکھو کیونکہ اس رات میں آفتاب غروب ہوتے ہی اللہ تعالیٰ [illegible] آسمان پر اتر آتی ہے اور وہ ارشاد فرماتا ہے کہ کوئی بندہ ہے جو [illegible] بخشش طلب کرے اور میں اس کی مغفرت کا فیصلہ کر دوں کوئی [illegible]

روزی دینے کا فیصلہ کروں، کوئی مبتلائے مصیبت بندہ ہو جو مجھ سے صحت و عافیت کا سوال کرے اور میں اسکو عافیت عطا کروں، اسی طرح مختلف قسم کے حاجتمندوں کو اللہ پکارتا ہو کہ وہ اس وقت مجھ سے اپنی حاجتیں مانگیں اور میں عطا کروں ۔ غروب آفتاب سے لیکر صبح صادق تک اللہ تعالیٰ کی رحمت اسی طرح اپنے بندوں کو اس رات میں پکارتی رہتی ہو۔ (سنن ابن ماجہ)

(تشریح) اسی حدیث کی بنا پر اکثر بلاد اسلامیہ کے دیندار حلقوں میں پندرھویں شعبان کے نفلی روزے کا رواج ہو لیکن محدثین کا اس پر اتفاق ہو کہ یہ حدیث سند کے لحاظ سے نہایت ضعیف قسم کی ہو اسکے ایک راوی ابوبکر بن عبداللہ کے متعلق ائمہ جرح و تعدیل نے یہاں تک کہا ہو کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔

پندرھویں شعبان کے روزہ کے متعلق تو صرف یہی ایک حدیث روایت کی گئی ہو۔ البتہ شعبان کی پندرھویں شب میں عبادت اور دعا و استغفار کے متعلق بعض کتب حدیث میں اور بھی متعدد حدیثیں مروی ہیں لیکن ان میں کوئی بھی ایسی نہیں ہو جسکی سند محدثین کے اصول و معیار کے مطابق قابل اعتبار ہو۔ مگر چونکہ یہ متعدد حدیثیں ہیں اور مختلف صحابہ کرام سے مختلف سندوں سے روایت کی گئی ہیں اسلئے ابن الصلاح وغیرہ بعض اکابر محدثین نے لکھا ہے کہ غالباً اس کی کوئی بنیاد ہے۔ واللہ اعلم۔

خاص دنوں میں نفلی روزے:۔

جس طرح اب تک کی درج ہونے والی حدیثوں میں سال کے بعض متعین مہینوں اور مہینوں کی بعض مخصوص تاریخوں میں نفلی روزے رکھنے کی خاص ترغیب دی گئی ہے اسی طرح ہفتہ کے بعض مخصوص دنوں کے لیے بھی یہ ترغیب دی گئی ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی اس بارہ میں رہنمائی ملتی ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تُعْرَضُ الْاَعْمَالُ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَالْخَمِیْسِ فَاُحِبُّ اَنْ یُّعْرَضَ عَمَلِیْ وَاَنَا صَائِمٌ ــــــــــــ رواہ الترمذی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پیر کو اور جمعرات کو اعمال کی ایک پیشی ہوتی ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ جب میرے عمل کی پیشی ہو تو میں اس دن روزہ سے ہوں۔ (جامع ترمذی)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَالْخَمِيْسِ ـــــ رواہ الترمذی والنسائی

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیر اور جمعرات کے دن روزہ رکھا کرتے تھے۔ (جامع ترمذی، سنن نسائی)

عَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْ يَوْمِ الْاِثْنَيْنِ فَقَالَ فِيْهِ وُلِدْتُ وَفِيْهِ اُنْزِلَ عَلَيَّ ـــــ رواہ مسلم

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیر کے دن روزہ رکھنے کے بارے میں سوال کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں پیر ہی کے دن پیدا ہوا اور پیر ہی کے دن سے مجھ پر قرآن کا نزول شروع ہوا۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ پیر کا دن بڑی برکت اور رحمت والا دن ہے۔ اسی دن میں تمہارے نبی کی پیدائش ہوئی اور اسی دن کتاب اللہ کا نزول شروع ہوا، پھر اس دن کے روزے کا کیا پوچھنا! ـــ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو پیر کے دن (کبھی کبھی یا اکثر) روزہ رکھتے تھے تو اس کا ایک محرک تو وہ تھا جس کا اوپر کی حدیث میں ذکر آیا، یعنی یہ کہ "اس دن اعمال کی ایک پیشی ہوتی ہے اور آپ چاہتے تھے کہ اس پیشی کے دن آپ روزہ کی حالت میں ہوں"۔ اور دوسرا محرک اللہ تعالیٰ کی ان دو عظیم نعمتوں (ولادت اور وحی و نبوت) کے شکر کا جذبہ بھی تھا جو آپ کو پیر ہی کے دن عطا ہوئیں اور جو ساری دنیا کے لیے بھی نعمت اور رحمت ہیں ـــ وما ارسلناك الا رحمة للعالمين ٥

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ .... قَلَّمَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُفْطِرُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ـــــ رواہ الترمذی والنسائی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کم ایسا ہوتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن روزہ نہ رکھتے۔ (جامع ترمذی، سنن نسائی)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے دن اکثر و بیشتر آپ کا روزہ ہوتا تھا لیکن دوسری حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس سے منع فرماتے تھے کہ جمعہ کی فضیلت اور خصوصیت کی وجہ سے لوگ ایسا کرنے لگیں کہ نفلی روزے جمعہ ہی کو رکھیں اور شب بیداری اور عبادت کے لیے شب جمعہ ہی کو مخصوص کریں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَخْتَصُّوْا لَیْلَةَ الْجُمُعَةِ بِصِیَامٍ مِنْ بَیْنِ اللَّیَالِیْ وَلَا تَخْتَصُّوْا یَوْمَ الْجُمُعَةِ بِصِیَامٍ مِنْ بَیْنِ الْاَیَّامِ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ فِیْ صَوْمٍ یَصُوْمُهٗ اَحَدُکُمْ ——— رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ راتوں میں سے جمعہ کی رات کو نماز اور عبادت کے لیے مخصوص نہ کرو اور اسی طرح دنوں میں سے جمعہ کے دن کو روزہ کے لیے مخصوص نہ کرو۔ الّا یہ کہ جمعہ کسی ایسی تاریخ کو پڑ جائے جس کو تم میں سے کوئی روزہ رکھتا ہو (اس صورت میں اس جمعہ کے نفلی روزے میں کوئی مضائقہ نہیں) (صحیح مسلم)

(تشریح) جمعہ کے دن اور اس کی رات کی خاص فضیلت کی وجہ سے چونکہ اس کا امکان زیادہ تھا کہ فضیلت پسند لوگ اس دن نفلی روزہ رکھنے کا اور اس کی رات میں شب بیداری اور عبادت کا بہت زیادہ اہتمام کرنے لگیں اور جس چیز کو اللہ و رسول نے فرض و واجب نہیں بنایا اس کے ساتھ فرض و واجب کا سا معاملہ ہونے لگے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ممانعت فرمائی ——— اس کے علاوہ اس ممانعت کے علماء کرام نے اور بھی بعض مصالح لکھے ہیں، بہرحال یہ ممانعت انتظامی ہے اور منشا یہ ہے کہ جمعہ کا روزہ اور شب جمعہ کی شب بیداری ایک زائد رسم نہ بن جائے۔ واللہ اعلم۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَصُوْمُ مِنَ الشَّهْرِ السَّبْتَ وَالْاَحَدَ وَالْاِثْنَیْنِ وَمِنَ الشَّهْرِ الْاٰخَرِ الثُّلَاثَاءَ وَالْاَرْبِعَاءَ وَالْخَمِیْسَ ——— رواہ الترمذی

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایسا بھی کرتے تھے کہ) ایک مہینہ میں سنیچر، اتوار اور پیر کا روزہ رکھتے اور دوسرے مہینے میں منگل، بدھ اور جمعرات کا۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہی کی روایت سے پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ مہینے کے تین روزوں کے بارہ میں حضورؐ کا کوئی لگا بندھا معمول نہیں تھا اس لیے آپ کی اس روایت کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ ایسا بھی کرتے تھے کہ ایک مہینے میں آپ نے کسی ہفتہ کے پہلے تین دنوں سنیچر، اتوار، پیر کا روزہ رکھ لیا اور دوسرے مہینے میں بعد والے تین دنوں منگل بدھ اور جمعرات کا ـــــ (اور جمعہ کے بارہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان گزر ہی چکا کہ آپ جمعہ کے دن اکثر و بیشتر روزہ رکھتے تھے) ـــــ گویا علاوہ اُن مخصوص تاریخوں اور دنوں کے جن کے روزہ کی خاص فضیلت ہے آپ اس کا بھی اہتمام فرماتے تھے کہ آپ کا نفلی روزہ ہفتہ کے ہر دن میں پڑ جائے تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کے بنائے ہوئے ساتوں دن عبادت کے دن ہیں۔

وہ دن جن میں نفلی روزہ رکھنا منع ہے :-

سال میں بعض مخصوص دن وہ بھی ہیں جن میں روزہ رکھنے کی ممانعت ہے۔ اور اللہ تعالےٰ حاکم مطلق ہے، اس نے نماز کو عظیم عبادت بھی قرار دیا اور بعض خاص اوقات میں (مثلاً طلوع و غروب اور استوار کے وقت) نماز کی ممانعت بھی فرمادی، اسی طرح اس نے روزہ کو محبوب ترین عبادت اور روحانی ترقی کا خاص وسیلہ بھی قرار دیا اور بعض خاص دنوں میں روزہ رکھنا حرام بھی کر دیا، یہ بات حاکم مطلق کی شانِ حاکمیت کے عین مطابق ہے اور ہم بندوں کا کام بس حکم کی تعمیل اور فرمانبرداری۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ نَہٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ صَوْمِ یَوْمَ الْفِطْرِ وَالنَّحْرِ ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے منع فرمایا ہے یوم الفطر کے روزے سے اور قربانی کے دن کے روزہ رکھنے سے۔
(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ صِيَامِ يَوْمَيْنِ يَوْمِ الْاَضْحٰى وَيَوْمِ الْفِطْرِ ـــــــ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا یوم الاضحیٰ اور یوم الفطر میں روزہ رکھنے سے۔ (صحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ عُبَيْدٍ مَوْلٰى ابْنِ اَزْهَرَ قَالَ شَهِدْتُ الْعِيْدَ مَعَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَجَاءَ فَصَلّٰى ثُمَّ انْصَرَفَ فَخَطَبَ النَّاسَ فَقَالَ اِنَّ هٰذَانِ يَوْمَانِ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صِيَامِهِمَا يَوْمُ فِطْرِكُمْ مِنْ صِيَامِكُمْ وَالْاٰخَرُ يَوْمٌ تَاْكُلُوْنَ فِيْهِ مِنْ نُسُكِكُمْ ـــــــ رواہ مسلم

ابو عبید مولیٰ ابن ازہر تابعی سے روایت ہے کہ میں نے عید کی نماز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں پڑھی، انھوں نے نماز پڑھائی، نماز سے فارغ ہو کر خطبہ دیا اس میں فرمایا کہ عید کے یہ دونوں دن وہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے، ان میں سے ایک دن تو (پورے مہینے رمضان کے روزوں کے بعد) تمہارے فطر کا دن ہے اور دوسرا اپنی قربانیوں کا گوشت کھانے کا دن ہے۔ (صحیح مسلم)

عَنْ نُبَيْشَةَ الْهُذَلِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيَّامُ التَّشْرِيْقِ اَيَّامُ اَكْلٍ وَشُرْبٍ وَذِكْرِ اللّٰهِ۔
ـــــــ رواہ مسلم

نبیشہ ہذلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایام تشریق (۱۱-۱۲-۱۳ ذی الحجہ) کھانے پینے کے اور اللہ کی یاد کے دن ہیں۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت ابو سعید خدری، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہم کی مندرجہ بالا حدیثوں میں یوم الفطر اور یوم النحر کے دنوں میں روزہ رکھنے کی صریح ممانعت فرمائی گئی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یوم الفطر کا روزہ تو اس لیے منع ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے رمضان کے بعد "فطر کا دن" یعنی روزہ نہ رکھنے اور کھانے پینے کا دن قرار دیا ہے اس لیے اس دن روزہ رکھنے میں منشاء الٰہی کی مخالفت ہے اور یوم النحر کا روزہ اس لیے منع ہے کہ وہ قربانی کا گوشت کھانے کا دن ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ اس دن جو قربانیاں اللہ تعالیٰ کے لیے کی جائیں اس کے بندے ان قربانیوں کا گوشت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کی ضیافت سمجھ کر اور اس کے در کے فقیر بن کر شکر کے ساتھ کھائیں، اور وہ بندہ بلاشبہ بڑا متکبر اور کافر نعمت ہے جو اللہ کی عام ضیافت کے دن دانستہ روزہ رکھ لے اور چونکہ ذی الحجہ کی گیارھویں اور بارھویں بھی قربانی کے دن ہیں اس لیے ان کا حکم بھی یہی ہوگا ـــــ اور نبیشہ ہذلی کی آخری حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے ایام تشریق کو کھانے پینے کے یعنی اللہ تعالیٰ کی ضیافت کے دن فرمایا ہے جس میں ۱۳ ذی الحجہ بھی شامل ہے، اس لیے ۱۰ ذی الحجہ سے ۱۳ ذی الحجہ تک پانچوں دن روزہ رکھنا ممنوع قرار دیا گیا ہے، اب ان دنوں میں روزہ رکھنا عبادت نہیں بلکہ معصیت ہوگا ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں　　خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

نفلی روزہ توڑا بھی جاسکتا ہے :-

رمضان کا روزہ اگر بغیر عذر شرعی توڑ دیا جائے تو اس کا بہت بھاری کفارہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے جس کا تفصیلی بیان اپنے موقع پر گزر چکا ہے۔ لیکن نفلی روزہ رکھنے والا اگر چاہے تو توڑ بھی سکتا ہے، اس پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہوگا اور وہ گنہگار بھی نہیں ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی خود بھی ایسا کیا ہے اور دوسروں کو بھی یہ مسئلہ بتلایا ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْئٌ فَقُلْنَا لَا قَالَ فَإِنِّي إِذًا صَائِمٌ ثُمَّ أَتَانَا يَوْمًا آخَرَ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أُهْدِيَ لَنَا حَيْسٌ فَقَالَ أَرِيْنِيْهِ فَلَقَدْ أَصْبَحْتُ صَائِمًا فَأَكَلَ ـــــــ رواہ مسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کیا تمہارے ہاں کھانے کے لیے اس وقت کچھ ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ اس وقت تو کچھ بھی نہیں ہے، آپ نے فرمایا تو اب ہم روزہ رکھتے ہیں ـــــ پھر ایک اور دن آپ تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا کہ آج ہمارے ہاں حَیس (خرما اور مکھن کا ملیدہ) ہدیہ میں آیا ہے اس کو نوش فرمالیں، آپ نے فرمایا دکھاؤ ہم نے آج روزہ کی نیت کرلی تھی، پھر آپ نے اس میں سے نوش فرمایا اور روزہ نہیں رکھا۔ (صحیح مسلم)

تشریح) اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ نفلی روزے کی نیت دن میں بھی کی جاسکتی ہے، اور دوسری یہ کہ نفلی روزے کی نیت کرلینے کے بعد اگر رائے بدل جائے تو اس کو توڑا بھی جاسکتا ہے۔ اگلی حدیثوں سے یہ بات اور زیادہ صراحت کے ساتھ معلوم ہوگی۔

عَنْ أُمِّ هَانِئٍ قَالَتْ لَمَّا كَانَ يَوْمُ الْفَتْحِ فَتْحِ مَكَّةَ جَاءَتْ فَاطِمَةُ فَجَلَسَتْ عَلَى يَسَارِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأُمُّ هَانِئٍ عَنْ يَمِيْنِهِ فَجَاءَتِ الْوَلِيْدَةُ بِإِنَاءٍ فِيْهِ شَرَابٌ فَنَاوَلَتْهُ فَشَرِبَ مِنْهُ ثُمَّ نَاوَلَهُ أُمَّ هَانِئٍ فَشَرِبَتْ مِنْهُ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَقَدْ أَفْطَرْتُ وَكُنْتُ صَائِمَةً فَقَالَ لَهَا أَكُنْتِ تَقْضِيْنَ شَيْئًا قَالَتْ لَا قَالَ فَلَا يَضُرُّكِ إِنْ كَانَ تَطَوُّعًا۔

ـــــــ رواہ ابوداؤد والترمذی والدارمی

امّ ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے دن جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تشریف فرما تھے، فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا

آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں جانب بیٹھ گئیں اور اُمّ ہانی آپ کے داہنی جانب تھیں کہ ایک بچی آپ کے پینے کے لیے کوئی مشروب لے کر آئی اور آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے اس میں سے کچھ پی لیا اور پھر اُمّ ہانی کی طرف بڑھا دیا۔ انھوں نے بھی اس میں سے پی لیا اور پھر حضور سے عرض کیا یا رسول اللہ میں روزہ سے تھی اور میں نے یہ پی کے روزہ توڑ دیا، آپ نے فرمایا کیا تم اس روزہ کے ذریعہ کسی فرض یا واجب کو ادا کرنا چاہتی تھیں؟ انھوں نے عرض کیا نہیں (بلکہ صرف نفلی روزہ تھا) تو آپ نے فرمایا اگر نفلی تھا تو پھر کچھ مضائقہ نہیں۔

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن دارمی)

(تشریح) اس حدیث میں تصریح ہے کہ نفلی روزہ توڑ دینے سے کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ اسی حدیث کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں ـــــ "اَلصَّائِمُ الْمُتَطَوِّعُ اَمِیْرُ نَفْسِہٖ اِنْ شَاءَ صَامَ وَاِنْ شَاءَ اَفْطَرَ" (یعنی نفلی روزہ رکھنے والے کو اختیار ہے کہ چاہے تو روزہ پورا کرے اور کسی وجہ سے توڑنا چاہے تو توڑ دے) مندرجہ بالا دونوں حدیثوں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ نفلی روزہ توڑ دینے کی صورت میں اس کی جگہ دوسرا روزہ رکھنا پڑے گا یا نہیں، آگے درج ہونے والی حدیث میں اس کی قضا رکھنے کا بھی حکم ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَنَا وَحَفْصَةُ صَائِمَتَيْنِ فَعُرِضَ لَنَا طَعَامٌ اشْتَهَيْنَاهُ فَاَكَلْنَا مِنْهُ فَقَالَتْ حَفْصَةُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا كُنَّا صَائِمَتَيْنِ فَعُرِضَ لَنَا طَعَامٌ اشْتَهَيْنَاهُ فَاَكَلْنَا مِنْهُ قَالَ اِقْضِيَا يَوْمًا آخَرَ مَكَانَهُ ـــــــــ رواہ الترمذی

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں اور حفصہ (رضی اللہ عنہا) دونوں نفلی روزہ سے تھے، ہمارے سامنے کھانا پیش کیا گیا جس کو کھانے کے لیے ہمارا جی چاہا ہم نے اس کو کھا لیا، پھر حفصہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم دونوں روزہ سے تھے ہمارے سامنے کھانا آیا جس کو

(باقی ص ۲۰)

حضرت شاہ ابو الرضا محمد فاروقی دہلوی

(از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

(۳)

مکتوبات

خواجہ عبد الرحیم[عـــہ] کشمیری کے نام

بعد از حمد و صلوٰۃ و سلام۔ برادرم خواجہ
عبد الرحیم از دعا گوئے خویش ابو الرضا محمد
مطالعہ نمائند۔ کہ چوں بادشاہِ عالم حسن و خوبی
خیر بندہ خواہد اورا بخود آشنا کند و بر تقرب
خویش بنا گرداند تا پیوستہ از قرب باندیشد و ہموارہ خود را با او
و اورا با خود بیند۔ لاجرم حرمت و تعظیم حق صفت
او شود و محافظت بر ادب صحبت عادتِ او
گردد و ہر دم راحت و انس افزاید و دولتِ نو
بنو حاصل آید۔ چہ شقاوت و حرمان"

بعد از حمد و صلوٰۃ و سلام۔ برادرم خواجہ
عبد الرحیم اپنے دعا گو ابو الرضا محمد کی طرف سے
مطالعہ کریں۔ کہ جب بادشاہِ عالم حسن و خوبی
(اللہ تعالیٰ) اپنے بندے کے حق میں خیر
چاہتا ہے تو اس کو اپنا آشنا بنا دیتا ہے۔
اور اپنے تقرب پر بنا کر دیتا ہے تاکہ وہ
ہمیشہ اس کے قرب کا لحاظ رکھے اور ہمیشہ
خود کو اس کے ساتھ اور اس کو اپنے ساتھ
سمجھے۔ پھر تو لازمی طور پر تعظیم حق کرنا اس

عـــہ۔ آپ کشمیر کے اکابر علماء میں سے تھے۔ ہندوستان پہونچ کر تحصیل علم کی تھی۔ تمام عمر درس و افادہ میں بسر کی۔
۱۱۰۰ھ میں وفات پائی۔ [illegible]

مردوداں ازاں راہ یافت کہ خود را بوہم باطل وخیالِ فاسد از حضرت قدس او دور شمردند و بعجب وغفلت از نواخت حضرتِ او محجوب گشتند واو سبحانہ وتعالیٰ بجمیع کمالاتِ ذاتیہ وافعالیۂ خود از ذات وصفات وافعالِ ما بما نزدیک تراست زیرا کہ قرب صفتِ اوست تقدس وتعالیٰ وصفاتِ تبارک وتعالیٰ جز حقیقی نباشد وقرب حقیقی آں باشد کہ بہ ہیچ وجہ قابلِ بُعد نباشد نہ بظاہر نہ بباطن ونہ بوہم ونہ بخیال وفہم ؎

فراقِ دوست اگر اندک است اندک نیست
میانِ دیدہ اگر نیم موست بسیار است

زیادہ چہ نویسم کہ قصہ چنین است، فرصت اندک وموت درکمین است

بندے کی صفت ہوجاتی ہے اور ادب صحبت کی محافظت اس کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے ہر وقت اس کے راحت واُنس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور دولتِ نو بنو اس کو حاصل ہوتی رہتی ہو۔

مردودانِ بارگاہِ الٰہی کی شقاوت وحسرمان کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے خود کو اپنے وہم باطل کے باعث حضرتِ قدس سے دور سمجھا اور غفلت کی بنا پر حضرتِ حق کی نوازشوں سے محروم ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے جمیع کمالات ذاتیہ وافعالیہ کے ساتھ ہمارے ذات وصفات وافعال کے مقابلے میں ہم سے زیادہ قریب ہے اس لیے کہ قرب اس کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کی جو صفت بھی ہے وہ حقیقی ہے۔ اور قرب حقیقی وہ ہوتا ہے کہ کسی طرح قابلِ دوری نہ ہو۔ نہ ظاہر میں نہ باطن میں نہ وہم میں نہ خیال میں نہ فہم میں۔

(ترجمہ شعر، دوست کی جدائی اگر تھوڑی سی بھی ہو تو تھوڑی نہیں ہے (دراصل بہت ہو) دیکھو اگر آنکھ میں ذرا سا بال بھی پڑجاتا ہے تو بہت ہوتا ہو" زیادہ کیا لکھوں۔ بات یوں ہو کہ فرصت کم ہو اور موت گھات لگائے کھڑی ہے۔

شاہ محمد مظفر رمتکی رح کے نام

برادرم محمد مظفر بجود آگاہ باشد وبداند کہ

برادرم محمد مظفر خود آگاہ ہوکر جان لیں کہ ان کا

کمال ایشان در متابعت حضرت سید المرسلین است کارے نکنند کہ مردم در ہلاکت افتند۔ باید کہ از دوستانِ خدائے تعالیٰ مردم راہِ سنت گیرند و اسرار پیش عوام نگویند کہ مردم ملحد شوند..... والسلام۔

کمال، حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں مضمر ہے۔ ایسا کوئی کام نہ کریں جس سے لوگ (دینی حیثیت سے) تباہی میں مبتلا ہو جائیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ اللہ کے دوستوں سے لوگ راہِ سنت حاصل کریں۔ عوام کے سامنے (خواہ مخواہ) "اسرار" نہ بیان کیے جائیں ایسا نہ ہو کہ لوگ (نا سمجھی کی بنا پر) ملحد ہو جائیں..... والسلام

مولانا عصمت اللہ[۵] فاروقی قاضی مراد آباد کے نام

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ وصل المکتوب الشریف الی العبد الضعیف مع

بعد حمد و صلوٰۃ ــ آپ کا مکتوب گرامی اس عبد ضعیف کے پاس مصری کے تحفے کے ساتھ پہونچا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مکرم کرے جس طرح

ع۵ مولانا قاضی عصمت اللہ فاروقی، قاضی عبد القادر فاروقی لکھنوی کے دبو کہ حضرت شیخ پیر محمد سلونی ثم لکھنوی کے استاذ تھے بڑے صاحبزادے تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ اپنے والد ماجد اور مفتی وجیہ الدین گوپاموی سے تعلیم حاصل کی اخذ (بیعت) حضرت شیخ پیر محمد سلونی سے کیا۔ حضرت عالمگیر کے دربار میں آپ کو تقرب حاصل تھا۔ انکی طرف سے مراد آباد کے قاضی و حاکم مقرر ہوئے۔ وہاں مدتوں رہے۔ اسکے بعد دوسرے شہروں کے قاضی و حاکم ہوئے۔ سخاوت اور ایثار و کرم میں ممتاز تھے۔ عالمگیر نے کچھ جاگیریں عطا فرمائیں۔ روزانہ دوسو طالبعلموں کو کھانا کھلاتے تھے۔ رمضان شریف میں روزانہ ایک ہزار آدمی آپکے مطبخ سے کھانا کھاتے تھے۔ فتاویٰ عالمگیریہ کے مرتب کرنے والوں میں آپکا نام بھی شامل ہے۔ ۱۲ رجب المرجب ۱۱۱۲ھ کو ۷۰ سال کی عمر میں ساحل نربدا کے ایک مقام پہ دکن سے لوٹتے ہوئے وفات پائی۔ موضع بھداوہ متصل لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۶ ، و تذکرہ علمائے ہند)

حضرت حاجی رفیع الدین فاروقی مراد آبادی کا نسب آپ تک اس طرح متصل ہوتا ہے۔ حاجی رفیع الدین ابن قطب فرید الدین ابن نواب عظمت اللہ حاکم مراد آباد ابن مولانا قاضی عصمت اللہ فاروقی مراد آبادی۔

تحفۃ النبات اللطیف، اکرمکم اللہ تعالیٰ کما اکرمتمونا و اذاقکم حلاوۃ الایمان کما اذقتمونا.... فعلیکم باکرام الفقراء و اھتمام الضعفاء واعانۃ المظلوم و اقامۃ المرسوم فی الخیر۔ الخلق کلھم عیال اللہ و احبّ عباد اللہ الی اللہ من احسن الیٰ عیالہ۔ ثم الدعاء فی حاجتکم التوفیق التقویٰ وعبادۃ اللہ تعالیٰ بالاخلاص فھی الغایۃ القصوٰی ۔ قال اللہ تعالیٰ انّ اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔
والسّلام اوّلاً و آخراً

آپ نے ہمارا اکرام کیا اور اللہ تعالیٰ آپ کو حلاوتِ ایمان نصیب فرمائے جس طرح آپ نے ہم کو حلاوت کا ذائقہ چکھایا..... آپ پر لازم ہو کہ فقراء کا اکرام، ضعفاء کی خبرگیری، مظلوم کی اعانت و مدد اور خیر کے کاموں کا سلسلہ قائم کریں۔ اللہ کی مخلوق تمام کی تمام اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے بندوں میں اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ کے بندوں کے حق میں اچھا سلوک کرے۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تقویٰ کی اور اخلاص کے ساتھ اپنی عبادت کی توفیق عنایت فرمائے۔ اس لیے کہ یہی انتہائی مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم میں سب سے زیادہ مکرم اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔ والسلام اوّلاً و آخراً۔

مولانا قاضی عصمت اللہ مرادآبادیؒ کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ثم السلام علیکم و علیٰ من لدیکم۔
وصل المکتوب الشریف الی العبد الضعیف افقر الفقراء محمد الرضاء مع خمسۃ انناس جزاکم اللہ خیر الجزاء ان کان

بعد حمد و صلوٰۃ اور بعد سلام مسنون (واضح ہو کہ) آپ کا مکتوبِ گرامی پانچ عدد اناس کے ساتھ اس عاجز کے پاس آیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بہترین جزا دے اگر یہ اناس حلال طریقے سے حاصل کیے گئے ہوں اور اگر ان کا حصول کسی اور طریقے سے ہوا ہو تو اپنے لیے اور آپ کے لیے

حلالاً و استغفر اللہ لی ولکم ان کان غیر ذلک ثم انّ احسن وعظٍ یؤثر فی القلوب کلام علامِ الغیوب۔ یا ایہا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ ولتنظر نفس ما قدمت لغد واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون۔ ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانسٰہم انفسہم اولئک ہم الفاسقون۔ ثم بقیۃ مراسم المحبۃ والوداد علیکم بامرار لا الٰہ الا اللہ علی اللطیفۃ القلبیۃ بالمحبۃ والتعظیم بعد صلوٰۃ الصبح الی ارتفاع الشمس قدر رمح او رمحین وینبغی ان یکون کل مرۃ ملاحظۃ المعنی وہو انہ لا مقصود غیر اللہ ۔۔ ثم بعد کل عشرۃ محمد رسول اللہ ۔۔ ثم بالرکعتین شکراً لنعمائہ تعالیٰ۔

والسلام اولاً و آخراً۔

اللہ تعالیٰ سے معافی و مغفرت طلب کرتا ہوں۔ اس کے بعد مطالعہ کریں کہ بہترین وعظ جس کا اثر براہ راست قلوب پر ہوتا ہے وہ کلام اللہ ہے (مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو دیکھو) "اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور ہر شخص اس بات پر غور کرے کہ اس نے کل (قیامت) کے لیے کیا چیز آگے کو روانہ کی ہے ۔ اللہ سے ڈرو۔ اللہ تمہارے تمام افعال و اعمال سے اچھی طرح خبردار ہے اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا، پھر اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا۔ (نظر انداز کر دیا) یہ لوگ فاسق ہیں۔" باقی مراسم محبت کے سلسلے میں یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ لا الٰہ الا اللہ کا تکرار لطیفۂ قلبیہ پر بعد صلوٰۃ صبح سے لے کر سورج کے ایک نیزہ یا دو نیزہ بلند ہونے تک محبت و تعظیم کے ساتھ کیا کریں اور ہر دفعہ معنیٰ کا بھی دھیان رکھیں اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی مقصود نہیں۔ دس مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کہنے کے بعد محمد رسول اللہ کہیں، پھر دو رکعت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکریے میں پڑھیں۔

والسلام اولاً و آخراً۔

مولانا عصمت اللہ فاروقی مرادآبادی کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سلام اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ...... اخی فی اللہ

علی اخ فی اللہ عصمۃ اللہ۔ اُمِرتُم بالزاد وَنُودِیَ فیکم بالرحیل فیہیہات الی الآن اشتغلتم بالقال والقیل ۔

حاصل کن از جہانِ فانی ہنرے
غافل منشیں ز خویش چوں بے خبرے

عصمت اللہ پر اللہ کی رحمت ہو۔ (بعد سلام واضح ہو کہ) تم کو زادِ راہ مہیا کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے اور کوچ کی آواز لگادی گئی ہو۔ پھر بھی افسوس ہے کہ ابھی تک تم قیل وقال میں مشغول ہو۔

(ترجمہ شعر) اس جہانِ فانی میں کوئی کمال حاصل کرلے اور بے فکر آدمی کی طرح غافل ہو کر مت بیٹھ۔"

چوں بنشیند غبار روشن گردد
کاسپ است بزیر رانت یا لاشہ خرے

نصیحت دل خفتہ را بیدار کند و دلِ مردہ را بیزار۔ حاسِبوا قبل ان تحاسَبوا

عشاق بعشق دست بردند و شدند
دل را بغم عشق سپردند و شدند

"جب غبار چھٹ جائے گا تب پتہ چلے گا کہ تیری سواری میں درحقیقت گھوڑا تھا یا گدھا"۔ نصیحت دل خفتہ کو تو بیدار کر دیتی ہے مگر دل مردہ کو ناراض و بیزار کرتی ہے۔ دیکھو محاسبۂ اُخروی سے پہلے پہلے ہی اپنا محاسبہ دنیا ہی میں خود کرلو۔

(ترجمہ شعر) عشاق نے عشق پر دسترس حاصل کی اور دُنیا سے چلے گئے۔ انھوں نے اپنے دل کو غم عشق کے حوالے کر دیا اور رخصت ہو گئے"۔

حق تعالیٰ جمعیت صوری ومعنوی ارزانی کناد بحرمۃ النبی وآلہ الامجاد۔ دراعانت ضعیفان ومظلومان بقدر وُسع وامکان بذل جہدی نمودہ باشند۔

اللہ تعالیٰ تم کو جمعیت صوری ومعنوی عنایت فرمائے۔ بحرمۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ ضعیفوں اور مظلوموں کی امداد واعانت میں حتی الامکان اور حتی الوسع کوشش کرتے رہیں۔

مولانا عصمت اللہ فاروقی مرادآبادی کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ و		بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بعد حمد وصلوٰۃ۔

وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ـ بئس العبد عبدٌ تجبر واعتدیٰ ونسی الجبار الاعلیٰ ـ بئس العبد عبدٌ سہیٰ ولہیٰ ونسی المقابر والبلیٰ بئس العبد عبدٌ عتیٰ وطغیٰ ونسی المبتدیٰ والمنتہیٰ ـ قال فخر الدین الرازی ـ

بُرا ہے وہ بندہ جس نے جبر وظلم کا شیوہ اختیار کیا اور جبار اعلیٰ (خدا) کو بھول گیا ـ بُرا ہے وہ بندہ جس نے نسیان اور لہو ولعب کو اپنا شعار بنایا اور مقابر کو اور اپنے جسم کے (قبر میں) بوسیدہ ہونے کو بھول گیا ـ بُرا ہے وہ بندہ جس نے سرکشی اور طغیان کو پسند کیا اور اپنے آغاز اور انجام کو بھول گیا ـ امام فخر الدین رازیؒ نے فرمایا ہے ـ

۵ نہایۃ اقدام العقول عقالُ
واکثر سعی العالمین ضلالُ

... ...

وارواحنا فی وحشۃ من جسومنا
وحاصل دنیانا اذیً ووبالُ

(ترجمہ اشعار) عقلوں کے قدموں کی انتہا پاؤں کی بندش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور اہل دُنیا کی اکثر کوششیں گمراہی ہیں ـ
ہماری روحیں ہمارے جسموں میں گھبرا رہی ہیں ہمیں جو چیز دُنیا سے حاصل ہوئی ہے وہ تکلیف اور وبال ہے ـ

---

۵ بقیاسات عقل یونانی
نتواں یافت راہ ایمانی
عقل خود کیست تا بمنطق ورائے
رہ برد تا جناب پاک خدائے
گر بمنطق کسے ولی بودے
شیخ سینا ابو علی بودے
چشم عقل از حقائق ایماں
ہست چوں چشم اکمہ نا داں

قیاسات عقل یونانی سے راہ ایمانی نہیں مل سکتی ـ عقل بیچاری کی کیا مجال ہے کہ وہ منطق ورائے کی مدد سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک رسائی حاصل کرے ـ
اگر منطق کے ذریعے کوئی ولی ہوا ہوتا تو شیخ بو علی سینا اس بات کے زیادہ مستحق تھے کہ وہ ولی ہوتے ـ
حقائق ایمان چشم عقل میں اسی طرح نہیں آسکتے جس طرح ایک مادر زاد نابینا کی آنکھ

ما کتبت الیکم فمن جمیل الود اولاً من

سبیل الهوی والعناد ۔

میں دنیا کے رنگ نہیں آسکتے" ۔ میں نے تم کو جو کچھ لکھا ہے اس کا محرک، حسن محبت ہے۔ میں نے خواہش نفسانی اور دشمنی کی بنا پر نہیں لکھا ہے۔

شہاب الدین قلی ملقب بغازی الدین خاں کے نام

بسم الله الرحمن الرحیم. برادر سعادت آثار محبت اطوار از کمترین فقراء محمد الرضا بعد دعائے جمعیت صوری و معنوی مطالعه نمایند که مکتوب شریف

بسم اللہ الرحمن الرحیم. برادر سعادت آثار شہاب الدین قلی کمترین فقراء سے بعد دعائے جمعیت صوری و معنوی مطالعہ کریں۔ کہ

ع۵۔ امیر کبیر شہاب الدین ابن عابد ابن عالم صدیقی السمرقندی۔ آپ کا لقب غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ خانخاناں سپہ سالار تھا۔ آپ دربار عالمگیری کے مشہور امراء میں سے تھے۔ سمرقند میں پیدا ہوئے وہیں نشو ونما ہوئی اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ سبحان قلی کے یہاں تقرب حاصل کیا وہاں کچھ عرصے رہے۔ بعدہ ۱۰۷۹ھ میں ہندوستان آئے اور شاہ عالمگیرؒ کے دربار میں قرب نصیب ہوا۔ عالمگیرؒ نے ان کو عہدہ دیا اور ۱۰۹۴ھ میں غازی الدین خاں بہادر لقب دیا۔ پھر ۱۰۹۰ھ میں فیروز جنگ لقب ملا۔ عالمگیرؒ برابر ان کے مراتب کو بڑھاتے رہے۔ ۱۰۹۹ھ میں اگرچہ ان کی آنکھیں جاتی رہی تھیں مگر اس کے باوجود عظیم معرکے انھیں کی رائے اور مشورے سے سرہوئے تھے۔ اسی بنا پر عالمگیرؒ نے ۱۰۱۵ھ میں ان کو سپہ سالار کا لقب دیا تھا۔ جب عالمگیرؒ کا انتقال ہو گیا تو عالمگیر کے لڑکے شاہ عالم نے آپ کو گجرات کا حاکم بنایا۔ وہیں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ اپنے زمانے کے بڑے امراء میں سے تھے۔ آپ کے مقابلے کا عقل و شجاعت اور کرم و سخاوت میں کوئی دوسرا امیر نہ تھا۔ اپنی تدبیر سے بلاد کثیرہ اور متعدد قلعے فتح کئے۔ عالمگیرؒ آپ سے بہت محبت رکھتے تھے اور ولد رشید کہہ کر مخاطب فرماتے تھے۔ ۱۱۲۲ھ میں احمد آباد میں انتقال ہوا وہاں سے دہلی لا کر دفن کیا گیا۔ اجمیری گیٹ پر آپ کا مقبرہ ہے۔ آپ کے پوتے نے وہاں ایک بڑا مدرسہ تعمیر کیا جو آج دہلی کالج کی شکل میں ہے۔ آپ نظام دکن کے مورث اعلیٰ تھے۔ (نزہۃ الخواطر جلد (۶) و غرائب نگار)

مع یادگارے یک لوئی و دو مہر طلا رسید فاتحہ بسلامتی خواندہ شد۔ جزاکم اللہ خیراً۔ کما تزرع تحصد وکما تدین تدان۔

؎ از مکافات عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جو ز جو
اینچنیں گفتہ است پیر معنوی
کائے برادر ہرچہ کاری بدروی

مکتوب گرامی مع ایک لوئی اور دو اشرفیوں کے پہونچا۔ دعائے خیر کی گئی۔ جزاکم اللہ خیراً۔ جیسا بوؤگے کاٹوگے۔ اور جیسا عمل کروگے ویسا صلہ ملے گا۔

(ترجمہ اشعار) مکافات عمل سے غافل مت ہو حقیقت یہ ہے کہ گیہوں گیہوں سے اور جو جو سے اُگتا ہے۔

پیر معنوی (حضرت مولانا رومؒ) نے یوں فرمایا ہے کہ اے بھائی تو جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔

تواضع فقرا نمودہ بودند بحکم حدیث من تواضع للہ رفعہ اللہ الیہ (او کما قال) امیدوار رفعت دینی و دنیوی باشند کہ منہاج مدارج سعادت ابدیہ و معراج کرامات سرمدیہ محبت فقرا است وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔ نصیحت آنکہ کتاب منہاج العابدین در مطالعہ داشتہ باشند و در ہر قلیل و کثیر از جادۂ شریعت بیرون نروند و در ادائے حقوق اللہ خصوصاً حقوق عباد اللہ سعی بلیغ نمایند و بشغلے کہ از بزرگان طریقت اخذ نمودہ اند مشتغل باشند۔ فالوقت سیفٌ قاطعٌ۔ وقت از دست رفتہ رجوع نہ نماید و تیر از کمان جستہ باز نیاید۔ زیادہ چہ نویسد

تم نے فقراء کے ساتھ تواضع کا معاملہ کیا۔ اس حدیث کی رُو سے کہ "جس نے اللہ کے لیے تواضع کی اللہ نے اس کو بلند کر دیا" تم کو دینی و دنیوی ترقیات کا امیدوار رہنا چاہیئے۔ اسلئے کہ مدارج سعادت ابدیہ کا راستہ اور کرامات سرمدیہ کی سیڑھی محبت فقراء ہے" اور یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ اللہ بڑے فضل و کرم والا ہے"۔ نصیحت یہ ہے کہ کتاب منہاج العابدین اپنے مطالعہ میں رکھیں اور ہر چھوٹے بڑے معاملے میں جادۂ شریعت سے باہر قدم نہ رکھیں اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی خصوصاً اللہ کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں پوری پوری کوشش

کریں۔ اور جو ذکر و شغل بزرگان طریقت سے حاصل کیا ہے اس میں مشغول رہیں۔ وقت سیف قاطع کی طرح ہے جو گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ اور کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں لوٹا کرتا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

شہاب الدین قلی کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

برادر سعادت آثار محمد شہاب الدین قلی بجمعیت صوری و معنوی کامیاب بودہ جواہر انفاس نفیسہ را بطراز ذکر الٰہی جل شانہٗ مجلّٰی و مزین گردانیدہ اوقات عزیزہ را غنیمت بپندارند

صوفی ابن الوقت باشد اے رفیق
نیست فردا گفتن از شرط طریق

ودر ادائے حقوق اللہ خصوصاً حقوق عباد اللہ سعیٔ بلیغ بکار دارند کہ نجاتِ اُخروی منوط و مربوط بادائے ایں دو حق است۔ والسّلام۔

بسم اللہ الرّحمٰن الرحیم۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

برادر سعادت آثار محمد شہاب الدین قلی جمعیت صوری و معنوی سے کامیاب ہو کر اپنے جواہر انفاس نفیسہ کو ذکر الٰہی سے مجلّٰی و مزین کر کے اوقات عزیزہ کو غنیمت شمار کریں۔

(ترجمہ شعر) اے عزیز، صوفی پابند وقت رہا کرتا ہے۔ طریقۂ صوفی یہ نہیں ہے کہ کام کو کل پر ٹال دے۔

ادائے حقوق اللہ خصوصاً ادائے حقوق عباد اللہ میں سعیٔ بلیغ کریں کیونکہ نجاتِ اُخروی انھیں دونوں حقوق کی ادائیگی سے وابستہ ہے۔ والسّلام

سیّد علی اکبرؒ کے نام

...... ہوش دار پنبہ از گوش برآر ہیہات

...... ہوش میں آؤ۔ روئی کی ڈاٹ کان سے

بیہات کہ مرگ درکمیں است و خواجہ در خواب
نوشیں است۔ برخیز کہ وقت رحیل است
توشہ برگیر کہ فرصت قلیل است۔ اکنوں
اگر آگاہ نباشی میدانم کہ تباہ باشی۔ دریں مہلت
یسیر بذکر کثیر باید پرداخت۔ خود را و ہمہ را
مردہ باید انگاشت ــــ اِنَّكَ مَيِّتٌ
وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ــــ

۵ بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت
کہ باکہ باختۂ عشق در شب دیجور

نکال لو۔ افسوس موت تو گھات لگائے
بیٹھی ہے اور جناب والا ہیں کہ خواب نوشیں
میں مبتلا ہیں۔ اٹھو کہ کوچ کا وقت آگیا۔
توشہ مہیا کرو اب وقت کم رہ گیا۔ اب ہم،
اگر آگاہ نہ ہوگے تو میں سمجھتا ہوں کہ تباہ
ہو جاؤگے۔ اس مہلت قلیل میں ذکر کثیر
کے ساتھ مشغول رہنا چاہیے۔ اپنے آپ کو
اور سب کو مردہ سمجھو۔ چنانچہ قرآن مجید میں
ارشاد ہے۔ انك ميت وانهم ميتون۔
(ترجمۂ شعر) صبح کے وقت دن کی طرح یہ بات
روشن ہو جائے گی کہ تونے اندھیری رات
میں کس سے عشق کیا تھا۔

شیخ محمودؒ کے نام

...... اگرچہ دل از ہمہ آزاد است امّا
برادر در دعا یاد است بگوش ہوش بنیوش
کہ کوس رحلت نواختہ اند و کار آخرت
نساختہ اند۔ باختلال احوال باید گریست
کہ ناقد بصیر است و در عمل تقصیر است، اگر
بقیہ انفاس و آنات بذکر نفی و اثبات
معمور گردد سعادت ابدیت و کرامت
سرمدیست۔ و اگر نہ غرامت در پیش است
و ندامت بیش از بیش۔

...... اگرچہ میرا دل سب سے آزاد ہے مگر تم
دعا میں یاد ہو۔ گوش ہوش سے سنو کہ کوچ کا
نقارہ بجا دیا گیا مگر تم نے ابھی تک کار آخرت
انجام نہیں دیا۔ احوال ناقص ہونے پر رونا
چاہیے۔ کمال اعمال پر نظر نہ رکھنی چاہیے۔
اسلئے کہ پرکھنے والا (خدا) بصیر ہے اور عمل
میں تقصیر ہے۔ اگر باقی سانس اور باقی
اوقات ذکر نفی و اثبات سے معمور ہو جائیں
تو سعادت ابدی اور کرامت سرمدی ہے ورنہ

۵ دل گفت مرا علم لدنی ہوس است
تعلیم کن اگر ترا دسترس است
گفتم کہ الف گفت دگر گفتم ہیچ
در خانہ اگر کس است یک حرف بس است

(ترجمہ اشعار) مجھ سے دل نے کہا کہ مجھے علم لدنی حاصل کرنے کا شوق ہے اگر تجھے اس علم پر قدرت ہے تو مجھے سکھا دے۔ میں نے اس کو الف پڑھایا۔ اس نے کہا کچھ اور میں نے کہا بس اور کچھ نہیں۔ اگر کوئی سمجھ دار انسان گھر میں موجود ہے تو اسکو بس ایک ہی حرف کافی ہے۔ خارہ سامنے ہے اور ندامت پیش از پیش ہے۔

عنایت خاںؒ کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اخوی عبد العلیم، بذکر تفقدات کریمانہ و تلطفات رحیمانہ خاطر اینجانب را شاد گردانید۔ آرے قدر درویشاں ہم ایشاں دانند۔ چوں در خزینۂ فقرا بہتر از دعا جوہرے دیگر نیست کہ بداں مکافات کنند ناچار درویشاں غائبانہ بشکرانہ دست بدعا برداشتند و فاتحۂ سلامتیٔ ذاتِ آں خانِ عالی درجات برخواندند کہ الدعاء بظہر الغیب اقرب الی الاجابۃ

ع ..... درویش صفت باش وکلاہ تتری دار

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بعد حمد وصلوٰۃ واضح ہو کہ برادرم عبد العلیم نے تمہارے الطاف کریمانہ اور نوازشہائے رحیمانہ کا تذکرہ کر کے ہمارے دل کو شاد کیا۔ بیشک تم درویشوں کی قدر جانتے ہو۔ چونکہ فقراء کے خزانے میں دعا سے بہتر کوئی موتی نہیں ہے جس کے ذریعے تمہارے احسانات کا بدلہ دیں ناچار درویشوں نے غائبانہ شکریے کے طور پر ہاتھ اٹھا کر تمہارے لیے دعائے خیر کی۔ حدیث شریف میں ہے کہ پیٹھ پیچھے جو دعا کی جاتی ہے وہ قبولیت سے بہت قریب ہوتی ہے۔

درویش صفت رہو چاہے سر پر ٹوپی ایلچیانہ وضع کی رکھو۔

میر عزت اللہ کے نام

برادر ارجمند میر عزت اللہ۔ بجمعیت صوری ومعنوی بہرہ مند باشند۔ مکتوبات برادر رسید شکایت قساوت قلبی معلوم انجامید۔ دلِ برادر بواسطۂ تعلقِ اُمورِ متعددہ در تفرقہ ہست تا خاطرِ متفرقہ از ساحتِ سینہ خیمہ بیروں نزند ذکر تاثیر نکند و نور ظہورِ حق سبحانہٗ بر باطنِ طالب پرتو نیندازد۔

> ے در دل تو ہزار مشکل زہمہ
> مشکل شود آسودہ ترا دل زہمہ
> چوں تفرقۂ دلست حاصل زہمہ
> دل را بکیے سپار و بگسل زہمہ

برادر ارجمند میر عزت اللہ جمعیت صوری و معنوی سے بہرہ مند رہیں۔ تمھارے مکتوبات پہونچے۔ قساوت و سختی قلب کی شکایت معلوم ہوئی۔ تمھارا دل اُمورِ متعددہ سے تعلق کے باعث تفرقہ میں ہے۔ جب تک دل سارا متفرقہ صحنِ سینہ سے باہر ہو کر خیمہ زن نہیں ہوتے ذکر تاثیر نہیں کرتا اور طالب کے باطن پر نورِ ظہورِ حق پر تو انداز نہیں ہوتا۔

(ترجمہ اشعار) اے وہ شخص کہ تیرے دل میں بہت سی اشیاء کے تعلق کی وجہ سے خلفشار ہے۔ یہ امر بہت ہی مشکل ہے کہ تیرا دل سب چیزوں سے یکسو ہو سکے۔ جب کہ تمام اشیاء سے تفرقۂ دل حاصل ہو رہا ہے تو پھر دل کو ایک ہی ذات کے سپرد کر دے اور سب سے تعلق توڑ لے۔

علاج آنست کہ بگوشہ بنشینی و اسمِ ذات پے در پے بمحبت و تعظیم در سویدائے قلب بگذرانی و تصور نمائی کہ ہمہ ذرات وجود از سر تا قدم بدیں اسم بزرگ ذاکر اند بحضورِ مذکور بحدے کہ ترا شعور بخود ہست نماند

> ذکر و ذاکر محو گردد بالتمام
> جلّٰی مذکور ماند والسّلام

> چیزے کہ ز دوستے در لقا باشی ازو
> آخر بحدِ تیسر بلا باشی ازو

علاج یہ ہے کہ ایک گوشے میں بیٹھ کر اسم ذات پے در پے محبت و تعظیم کے ساتھ اندرونِ قلب میں داخل کرو اور یہ تصور کرو کہ تمام ذرات وجود سر سے پاؤں تک اس اسم بزرگ کا ذکر کر رہے ہیں حتیٰ کہ تم کو خود اپنا شعور و ہوش باقی نہ رہے۔

از ہر چہ بمردگی جدا خواہی شد
آں بہ کہ بزندگی جدا باشی ازاں
از مرگ میر عنایت اللہ عبرت گیرند و
شکیبائی ورزند۔
زیادہ چہ نویسد۔

(ترجمۂ شعر) ذکر اور ذکر کرنے والا محو ہو جائے اور بس
وہی ذات سامنے رہے جس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔"
جس چیز سے لقا کی حجاب رہنمائی ہو آخر کار
تو اسی چیز کی وجہ سے تیر بلا کا نشانہ بن جائے گا؛
ہر وہ چیز کہ مرنے پر تو اس سے جدا ہو جائے گا بہتر یہی
ہے کہ زندگی ہی میں تو اس سے جدا ہو جائے۔
میر عنایت اللہ کی موت سے عبرت اور صبر
اختیار کرو۔ زیادہ کیا لکھوں۔

شیخ بایزیدؒ کے نام (ایک درویش کی سفارش میں)

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔
ہزاراں ہزار ثنا بے نیازے را کہ نیاز
منداں را از عالم و عالمیاں بے نیاز
گردانید۔ الہٰی فقر و تنگ دستی و
وعیال مندئ سید نور محمد چہ نویسم کہ تو نیک
میدانی۔ اگر بندۂ از بندگان خود را خدمت
معاونت فرمائی تو کریمی و او شکور و اگر
نہ فرمائی تو حکیمی و او معذور
والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ہزاروں ہزار تعریفیں
اس بے نیاز ذات کے لیے واجب ہیں جس نے
اپنے نیاز مندوں کو دنیا اور اہل دنیا سے
بے نیاز کر دیا۔ اے اللہ! میں سید نور محمد
کی تنگ دستی و عیال مندی کے بارے میں
کیا لکھوں تو خود ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر اپنے
بندوں میں سے کسی بندے کو سید نور محمد کی
معاونت کا حکم فرمائے تو تو کریم ہے اور وہ
بندہ شکور ہوگا۔ اور اگر کسی کو اس کی معاونت کا
حکم نہ فرمائے تو تو حکمت والا ہے اور بندہ
معذور ہے۔
والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔

حضرت مولانا محمد یوسفؒ کے دو اہم مکتوب

[[illegible] میں میاں جی محمد عیسیٰ اور اُن کے ساتھیوں کی ایک جماعت حجاز مقدس میں تبلیغی کام کر رہی تھی۔ مندرجۂ ذیل دونوں مکتوب اسی جماعت کو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے لکھے تھے۔ یہ دونوں مکتوب میاں جی محمد عیسیٰ صاحب کی اسی بیاض سے لیے گئے ہیں جس کا ذکر "حضرت مولانا محمد یوسف نمبر" میں کیا جا چکا ہے۔]

(۱)

مکرمین و محترمین بندہ! وفقنا اللہ و ایاکم لما یحب و یرضیٰ من القول والفعل والنیۃ والهدیٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

حق تعالیٰ شانہ نے محض اپنے فضل سے ایسے وقت میں جبکہ عام انسانیت اپنی ذاتی رذائل اور گندگیوں کی بنا پر سخت زلزلوں اور مصائب و بلایا میں مبتلا ہے اور ہر طرف پریشانیوں کے عمومی دروازے کھلے ہوئے ہیں، آپ حضرات کو انبیاء کرام کی اس عالی امانت کی طرف متوجہ فرمایا جس ہمیشہ انبیاء کرام کی مساعی و ریاضت و مجاہدے اور ان کے ذات باری تعالیٰ پر یقین و اعتماد اور تضرع و زاری اور توجہ الی اللہ پر گندگیوں کی جڑیں کٹ کر عام انسانوں میں بھلائیوں کی جڑیں پیدا ہو کر حق تعالیٰ شانہ کی رحمت و نصرت و انعامات کے دروازے کھلے اور وہی محنت کا طریقہ اور محنت و ہمت کے وہی جذبے ہم امت محمدیہ مرحومہ کو مرحمت فرما کر اور ان کی ذات عالی پر اسی یقین و اعتماد کا مطالبہ کر کے اور اسی تضرع و زاری و توجہ الی اللہ پر اپنی تمام رحمت و نصرت و انعامات کے دروازوں کے کھول دینے کا وعدہ فرمایا جن کا انبیاء کرام سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ میرے عزیز دوستو! جس دین کے سیکھنے کے لیے آپ نے اپنے گھروں کو چھوڑا وہ یہی دین ہے جو خاص انبیاء کرام

کی میراث ہے۔ اور جس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں بہ ہیئت اجتماعیہ اجتماعی اصولوں کے اتباع کے ساتھ چھوڑ کر گئے ۔ انسان بالطبع مخلوق سے متاثر، اس کے بارہ میں کچھ غلط یقین، کچھ غلط بے بنیاد علم اور ان کے مطابق غلط عمل پر پڑا ہوا ہے۔ جس کے اتباع پر اپنی ذات میں سوائے گندگیوں کے پیدا ہوجانے کے اور کچھ حاصل نہیں، اور اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے دوزخ کا منظر ابد کے لیے کھلا ہوا ہے۔ مخلوق کے بارہ میں جو بھی یقین وعلم اپنے کو حاصل ہے اس کو اپنے میں سے نکالنے کے لیے اور اس سفلی وفانی یقین کے بدلے اپنے میں صرف ذات باری تعالیٰ کا یقین وعلم پیدا کرنے کے لیے جدوجہد محنت کا کلمہ ہم کو مرحمت فرمایا گیا تاکہ اس کی محنت کے ذریعہ حق تعالیٰ شانہٗ کے اوامر کے اتباع کا جذبہ ہم میں پیدا ہو کر ان کی صفات و کمالات کا مظہر بن کر ان کی ذات والے رحمت و انعامات کے عمومی دروازوں کے کھل جانے کا ہم ذریعہ بن جاویں اور اس کا انعام ذات باری تعالیٰ کی رضا ومعیت ہم کو ابد کے لیے حاصل ہو۔ اصل دین حق تعالیٰ کی مخلوق میں ان کی ذات کا یقین پیدا کرنے کے لیے یقین کے ساتھ ایسے جان کھپانے اور ٹھوکریں کھانے کے طریقہ کو سیکھنا ہے جس پر نہ کسی مخلوق کا تاثر اثر انداز ہوسکے نہ بھوک و پیاس نہ بیماری وکمزوری، وگرمی وسردی وعیش وعشرت وخوف دہراس والی مخلوقات اُسے متزلزل کر سکے۔ مخلوقات سے صادر ہونے والی چیزوں کی موافقت کی طرف پلٹنے کی اصل صورت یہ ہے کہ ان کے تاثر کو اپنے میں سے نکال کر حق تعالیٰ شانہ کے اُس امر کی تعمیل کی طرف متوجہ ہو جو ان کی ذات عالی سے صادر ہو رہا ہے۔ اُسی امر کی تعمیل میں تمام مخلوقات کے سرنگوں ہو جانے کا حق تعالیٰ شانہٗ نے فیصلہ فرما رکھا ہے۔ امر کے ذریعہ وجود کا وہ رابطہ تحریک میں آجاتا ہے جو بندہ اور مولیٰ کے درمیان قائم فرما کر تمام مخلوقات کے موجودات کو اپنی ذات سے وابستہ فرما رکھا ہے۔ امر کی تعمیل سے اس رب العزت کی معیت حاصل ہو جاتی ہے جس سے ساری مخلوقات کا سلسلہ چل رہا ہے۔ بس اسی کا یقین اور اس کے موافق انہماک و ٹھوکریں کھانا، پوری مخلوقات کے لیے رحمت کے دروازوں کو کھلوا دیتا ہے ـــــ ایسے وقت میں جبکہ عام مخلوقات پریشانیوں میں پوری طرح مبتلا ہے اور غلامی کی اس راہ کے سوا کوئی صورت نہیں، اپنے احباب کی ذمہ داری حد سے زیادہ ہے۔ جہاں تک ہو سکے اپنی ذات والے ہر طرح کے جذبات کو کچلتے ہوئے اس جدوجہد و حرکت و نقل کے

تعدیہ اور فروغ کی شکلوں کو پوری طرح بڑھاتے ہوئے، راتوں کی تنہائیوں میں پوری طرح بلبلا کر عام مخلوق کے لیے عموماً اور اُمتِ محمدیہ مرحومہ کے لیے خصوصاً پورے یقین و اعتماد کے ساتھ دعاؤں کا اہتمام فرمادیں۔ تمام مخلوق حق تعالیٰ شانہٗ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، اس کا پورا یقین کرتے ہوئے ہدایت کی طرف پلٹنے کی پوری طرح دعائیں فرمادیں۔ جتنا کھانے پینے کے معاملے میں ایثار و ہمدردی و سادگی کی آپ عادت ڈالیں گے اور مرغوبات و مالوفات کو اس راہ کی مکارہ و ناگواریوں کی محبت کی طرف پلٹنے کی مشق کرتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مبارک صحابہ وانبیاء و تابعین کی تکلیف اٹھانے کی جگہوں پر ان کی والی روحانیت و نور کے اکتساب کے حصول کے لیے ٹھوکریں کھانے کی مقدار کو بڑھائیں گے اتنا ہی اجابت کی عمومی شکلیں ان شاء اللہ العزیز پیدا ہوں گی۔ ایک دوسرے کے حقوق پوری طرح پہچان کر اپنی ذات سے ما علیہ کی ادائیگی کی فکر قلوب میں رائٔت کے بیج بو کر اس امانت کے فروغ و تقویت کا باعث ہوگا۔ حق تعالیٰ شانہٗ ہم سب کے لیے اپنی خصوصی رحمتِ انعامات اور تقرب کے دروازوں کو کشادہ فرمادیں۔

بندہ محمد یوسف عفرلہٗ

۳ر جمادی الاولیٰ ۱۳۶۹ھ ، دوشنبہ

۷۸۶

مکرم و محترم بندہ! جناب میانجی عیسیٰ صاحب احبابہ۔ وفقنا اللہ ایاکم لما یحب ویرضیٰ من القول والعمل۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ــــ حق تعالیٰ شانہٗ کے فضل سے یہاں ہر طرح خیریت ہے۔ دینِ محمدی کی سرسبزی کے لیے قریب و بعید میں جدید و جدید حرکت و نفر کی شکلیں بدستور فروغ پذیر ہیں۔ آپ حضرات کے بعد کے مبارک سفر کی سرگزشت سے اور اس راہ میں سادہ زندگی گزار کر ٹھوکریں کھانے کے مبارک مناظر سے بہت ہی مسرت ہوئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی جدید و جدید نقل و حرکت کی جس اعلیٰ صورت پر ہمیں چھوڑا اور بھوک و پیاس و شدائد کے تحمل کی جن فضاؤں میں الفت و مؤدت کے جن عالی اصولوں کا ہم کو عادی بنایا وہ بالذات محبوب ہو۔ اور اس کا حسن لذاتہٖ ہے۔ آپ حضرات نے اس راہ کی جتنی لذت حاصل کی حق تعالیٰ شانہٗ اس کو بھی آپ کے اور اپنے سب احباب کے

اور عام اُمتِ محمدیہ کے اس راہ کی ترقیات و لذائذ پر پڑنے کا ذریعہ فرمادیں۔

میرے بزرگ و دوستو! ایسے وقت میں جبکہ مادّہ و مخلوق کے تأثر و انہماک کی فضاؤں میں اس راہ کی رغبتیں مردہ ہو کر حق تعالیٰ شانہٗ کے اوامر کی تعمیل کے جذبات مردہ ہو کر بلایا کے عمومی دروازے اہلِ عالم کے لیے کھل چکے اور اوصاف انسانیہ اور وہ کمالات خداوندیہ جن کا مظہر انسان کو بنایا گیا تھا ضائع و پامال ہو کر، مادی رذائل انسان میں ابھر کر اشیاءِ فانیہ کی فراہمی کے جذبات کے ساتھ ساری ہی گندگیوں کا مظہر بن کر مورد بلایا و مصائب بن چکا۔ اس صحیح نورانی و روحانی حرکت کے تعدیہ و فروغ کی اہمیت حد سے زیادہ بڑھ چکی ہے۔ اپنی ذاتوں سے بکھرنے پر اگرچہ اہلِ عالم پر سے بلایا دور ہوتی ہیں مگر عمومی جد و جہد کی فضاؤں کے قیام پر جن رحمتوں اور مددوں کے دروازے کھلتے ہیں اور جن کی آج امت پوری طرح ہر جگہ محتاج ہے وہ تو جب ہی کھلیں گے جب ہر جگہ سے نہایت فکر و درد کے ساتھ ایمان کی جد و جہد کے لیے اور اس جد و جہد کے اوامر کی تعمیل کے ذریعہ نصرت و نعمتہائے خداوندیہ کے متوجہ ہو جانے کا اپنے میں یقین پیدا کرنے کے لیے نقد نکالنے کی پوری طرح کوششیں کی جائیں۔ کسی مخلوق پر جانیں کھپانے سے اسکے ذریعہ حق تعالیٰ شانہٗ منفعت دنیویہ حقیرہ کو وجود مرحمت فرماکر ہمیشہ کی نعمتوں سے محروم فرمادیتے ہیں، اور اگر اس اپنی توجہ کو بلند کرکے اس امر کی طرف متوجہ ہوا جائے جو حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے صادر ہوا ہو تو اس مخلوق والے مفاد کی اگرچہ حقیر سی قربانی ہو مگر حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ وابستگی و معیت خداوندیہ نصیب ہو کر ان کی ذات و اوصاف کیلئے بے نہایت خزانوں کے دروازے کھل کر اس عالم علوی و فوقانی والے حقیر منافع بھی پیروں میں آکر پڑ جاتے ہیں۔ سارے ہی انبیاء کرام اس راہ کا یقین پیدا کرکے اس راہ کے اعمال کے لیے جانیں کھپانے کو رواج دے کر حق تعالیٰ شانہٗ کے عمومی ابدی رحمت و انعامات کے دروازے کھلوانے کے لیے تشریف لائے اور اسی پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو امتِ محمدیہ کو اٹھایا۔ یہی وہ مبارک مایہ ہے جسکی اصل تبلیغ ہے، جزوی اعمال کا پھیلانا مقصود نہیں بلکہ مخلوق پر طاقتوں کے مسلسل خرچ ہونے کی بنا پر جس یقین انسانیہ پر مخلوقات والا گرد و غبار پڑ کر ذاتِ باری تعالیٰ سے استفادۂ کمالات و اوصاف واحیاء مسدود ہو گیا اس یقین کے ذاتِ باری تعالیٰ سے وابستہ کرنے کے لیے یقین و ایمان کے لیے جانیں کھپانے کے اوامر کی تعمیل کے لیے گھروں سے نکل کر اس راہ کی

ٹھوکریں کھاتے ہوئے اور دوسروں کو ان اوامر کی تعمیل کے لیے ذات باری تعالیٰ سے استفادہ پر آمادہ کر کے اس راہ کی ٹھوکریں کھانے کے لیے نکلتے ہوئے جائیں کھپانے والوں کے اپنی جانیں کھپانے میں حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ وہ یقین و اعتماد، دعوات و تضرع وزاری مقصود ہے جس سے وہ قلوب کو پلٹ کر عمومی احوال کو درست فرما کر انسانیت کی اپنے اوصاف و کمالات والی ترقی کے دروازوں کو سارے اہل عالم کے لیے کشادہ فرمادیں۔ میرے بزرگو! نہایت فکر و کوشش کے ساتھ مخلوقات فانیہ، منافع و رذائلہ کے مناظر سے نکال کر حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف رہبری کرنے والی متحرک فضاؤں میں ان کو لیتے ہوئے دُنیا کے غلط جد و محنت کے میدانوں کو صحیح جد و جہد کے میدانوں کے قیام کے لیے دنوں میں تو پوری محنت کرو اور راتوں کو پوری طرح مجاہدت و خوشامد کے ساتھ حق تعالیٰ شانہٗ کی بارگاہ میں دعوات کی مقداروں کو پوری طرح بڑھاؤ۔ جن اسباب ظاہریہ کی وابستگی کو خود ہماری اپنی طبیعتوں نے کام قرار دے رکھا ہے اور ان سے کھینچنے میں ہم ضعیف ہو رہے ہیں یہی اہل عالم پر بلایا کے نزول کے اسباب ہیں۔ ایسے وقت میں جبکہ تمام اہل عالم پریشانیوں میں مبتلا ہوں اور خصوصاً امت محمدیہ مرحومہ۔ اور خلاص کی اسکے سوا کوئی صورت نہ ہو کہ حق تعالیٰ شانہٗ ہی فضل فرمادیں اور ان کا فضل اسباب فضل سے وابستہ ہو اور ان کو حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ پر منکشف بھی فرمادیا ہو تو پھر اپنی پوری قوت و ہمت تو اسی پر صرف ہو کہ جہاں بھی آپ حضرات نکل جائیں اسباب کے بارہ میں ذہنیتیں بدل جائیں۔ اسباب ظاہریہ پر یقین کے بجائے اور اس پر عمل کے بجائے اسباب ایمانیہ پر یقین اور اس کا طریقہ سیکھ کر اس پر عملی انہماک کی فضائیں قائم ہوتی چلی جائیں۔ تمہاری اپنی مساعی تو نقد نکالنے کے لیے بہت ہی فکر و درد کے ساتھ وجود میں آئیں۔ جتنا اپنے میں اس کے لیے فکر و بے قراری و محنت کی مقدار بڑھے گی خود بخود قلوب کو حق تعالیٰ شانہٗ اس کی طرف مائل فرما کر اقدام کی شکلیں پیدا فرمادیں گے۔

حق تعالیٰ شانہٗ اپنے سب ہی احباب کے لیے انبیاء کرام کے عالی طرز کے جد و جہد میں سے حصہ نصیب فرماتے ہوئے ان کی والی عالی نصرتوں کے دروازوں کو کشادہ فرمادیں۔ آپ حضرات بھی اس عاجز اور سب احباب کے لیے پوری طرح دعوات کا اہتمام فرمادیں۔

فقط بندہ محمد یوسف غفرلہٗ

۱۲ر جمادی الثانی ۱۳۶۹ھ چہارشنبہ

شیخ بدر الدین الحسنی

شام کے عہد قریب کی ایک یادگار شخصیت

(از استاذ علی طنطاوی)
ترجمہ:- مولانا محبوب الرحمٰن ازہری

میں نے جب سے آنکھ کھولی، دمشق میں ہر شخص کو، چاہے عالم ہو یا جاہل، یہی کہتے سنا کہ "وہ ملک شام کے شیخ اور ہر معاملے میں مرجع انام ہیں۔" اگر وہ کہدیں تو ان کی بات پر علماء کا اتفاق ہو جاتا ہے اور جو حکم دیدیں کوئی اس کی مخالفت نہیں کر سکتا ہے۔ ان کی عظمت اور ان کے احترام پر سب متفق ہیں اور ان کی اطاعت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا یقین رکھتے ہیں کیونکہ وہ صرف احکام الٰہی بیان کرتے ہیں اور لوگوں کو شریعت الٰہی کی تعلیم دیتے ہیں، اگر شیخ طاہر الجزائری شیخ طریقت تھے تو یہ خزانۂ علم۔

شیخ کی پوری اسّی سالہ زندگی علم ہی علم ہے۔ علم کے سوا کوئی بات انتہائی ضرورت کے بغیر زبان پر نہ آتی تھی۔ اور وہ بھی انتہائی مختصر بلکہ ممکن ہوتا تو اشارہ کی زبان میں ہوتی۔ اور پھر فوراً درس اکتاب کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ کبھی ایکدن بھی درس کا ناغہ نہیں کیا یہاں تک کہ وفات کے دن صرف نزع کے وقت یہ مشغلہ منقطع ہو سکا۔ مرض موت کے سوا ساری عمر بستر یا زمین پر کمر لگانے سے ناآشنا رہے۔ وہ عام لوگوں کی طرح کبھی نہیں سوئے بلکہ رات کو بھی پڑھنے کے لئے بیٹھے رہتے تھے۔ جب نیند کا غلبہ ہوتا تو تکیوں پر سر ٹیک لیتے جو اسی کام کے لئے تھے اور دو یا تین گھنٹے مختلف دفعات میں رات کو اور ایک گھنٹہ اسی طرح دن کو آرام کرتے تھے۔ رات میں کتب بینی کے سوا کوئی اور شغل تھا تو وہ اللہ کی یاد اور اس کا دھیان۔

وہ دراصل عہد سلف کے علماء میں سے تھے جو تنہا بعد میں آنے کے لئے اپنے قافلے سے اس طرح بچھڑ گئے تھے جیسے زہرہ دوسرے ستاروں سے بچھڑ کر آخر شب میں اس لئے چمکتا ہے کہ رات کے بھٹکنے والوں کا صبح کے قریب تنہا [illegible] یا اس گلاب کے پھول کی طرح جو چمن میں اس لئے تاخیر سے رونما ہوتا ہے کہ

بادشاہوں کا تحفہ بن سکے۔

شیخ حسنی اپنے علم، وسعت نظر، قوت حافظہ اور ذہانت و ذکاوت ہر لحاظ سے ایک عجیب و غریب ہستی تھے۔ ہر فن کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے مضامین کی ایک زندہ فہرست تھے۔ جب بھی کسی مسئلہ کے بارے میں سوال کیا جاتا تو خود سائل سے فرماتے کہ فلاں کتاب لاؤ اور کھولو سائل خود کھولتا اور آپ فرماتے "اور آگے" "یا پیچھے" یہاں تک کہ جب قریب پہونچ جاتا تو وہ ایک ورق الٹ کر سامنے رکھدیتے اور معلوم ہوتا کہ سوال کا جواب اپنے قلم سے تحریر فرماکر رکھدیا ہے۔ آپ کی یہ ایک عام حالت تھی کوئی ایک آدھ واقعہ نہیں جس کی نادر سمجھا جائے یا اتفاق کہہ کر نظر انداز کیا جا سکے۔

آپ کے دور میں دمشق میں بہت سے علماء تھے اور ائمہ فنون کی بھی بہتات تھی لیکن مرجع آپ ہی تھے لغت ہو صرف، نحو ہو یا بلاغت، مذاہب اربعہ کی فقہ ہو یا دوسرے مذاہب جو غیر مدون ہیں، حدیث کی روایۃ و درایۃ ہو یا معرفۃ و رجال و معرفۃ اسانید کلام ہو یا فلسفہ یا تاریخ غرض تمام علوم میں علما کے لئے مرجع آپ ہی تھے۔ آپ کو دنیا میں صرف دو چیزوں سے محبت تھی کتاب اور چینی کے برتن آپ جس کتاب کے بارے میں سنتے خرید فرما لیتے چاہے دنیا کے کسی علاقہ میں طبع ہوئی ہو اور مخطوطات کو تو ان کے ہموزن سونا دے کر خریدنے کو بھی تیار رہتے تھے کسی کتاب کو پڑھے بغیر، نہ چھوڑتے اگر سرسری نظر ڈالتے تو اس میں بھی تمام مضامین ان کے ذہن میں نقش ہو جاتے تھے۔

جامع اموی میں آپ کا درس عجائبات زمانہ میں تھا جس نے بھی دیکھا یا سُنا پھر اس کو کہیں اور یہ اعجوبہ دیکھنا نصیب نہوا یہاں علمائے سابقین کی مجالس املا کی یاد تازہ ہوتی تھی جن سے ہماری علمی تاریخ کی عظیم عمارت وجود میں آئی ہے۔ اگر سیوطی نے اپنے بارے میں کہا ہے کہ وہ آخری شخص ہیں جنھوں نے حدیث و لغت میں املا کرایا تو وہ صرف اس لئے کہ انھوں نے شیخ بدر الدین کا زمانہ نہیں پایا۔

میں ایسے اشخاص سے واقف ہوں جنھوں نے آپ کے درس سے دسیوں جلدیں لکھ ڈالیں جن سے شیخ کے وسعت علم کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی یادداشت پوری صدی میں کہیں ایک شخص کو ہی نصیب ہوتی ہے آپ جب بھی کوئی حدیث بیان کرتے تو اس کے تمام طرق بیان کرتے اور تمام راویوں کا تعارف کراتے پھر لغت کے اعتبار سے اس کی تشریح کرتے اور نحو و بلاغت کے نکات ظاہر کرتے

جیسے کہ امام فن اس کو بیان کر رہا ہو یعنی ہر کلمہ کے شاہد اور شاہد کی توضیح و تفسیر پھر محدثین کے اقوال مع اسانید اور ہر اسناد کے مقصد، پھر فقہاء نے اس حدیث سے جو مسائل اخذ کئے ہیں اور فقہاء کا اختلاف اور ان میں سے ہر ایک کی دلیل اور اقوال میں موازنہ اور ترجیح یہ سب ظہر کی نماز کے بعد سے اذان عصر تک جاری رہتا۔ اور اس دوران میں نہ کہیں رکتے اور نہ کہیں زبان میں لڑکھڑاہٹ ہوتی، نہ کسی کلمہ کا اعادہ کرتے اور نہ کسی جملہ کو ناتمام چھوڑتے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی کھلی ہوئی کتاب سامنے ہے اور آپ اسے پڑھ رہے ہیں۔

آپ کا علم تو حیرتناک تھا ہی آپ کی سیرت اور اخلاق اس سے زیادہ حیرت ناک تھے۔ آپ اسی سال زندہ رہے لیکن حقیقت میں آپ صرف ایک دن زندہ رہے جو تیس ہزار مرتبہ بار بار اپنی شکل میں دہرایا جاتا رہا۔ آپ اپنے معمولات میں ثابت قدم اور ایسے مضبوط تھے کہ اس کی مثال نہیں۔ رات کو نیند سے آدھی رات کے بعد بیدار ہوتے جس کو نیند کہنا بھی صحیح نہیں بلکہ ایک ایسے طالب علم کی طرح رات بھر پڑھتے جس کو امتحان کی تیاری میں رات بھر جاگ کر مطالعہ کرنا ہوتا ہے جب نیند کا غلبہ ہوتا تو تکیہ پر سر جھکا لیتے اور آنکھ جھپکا لیتے پھر جب آنکھ کھلتی، چراغ جل رہا ہوتا اور سامنے دسترخوان پر چھوٹی طشتریوں میں فیرینی، شیرینی اور پھل ہوتے ان میں سے کچھ نوش فرماتے پھر تالاب پر وضو فرماتے جو آپ کے بڑے مکان میں تھا اور یہ مکان آج تک خالی پڑا ہوا ہے۔ اپنی جوانی میں ہاتھ سے برف توڑتے اور سردی میں اسی سے وضو فرماتے جب بوڑھے ہو گئے تو آتشدان پر لوٹے میں پانی گرم کیا جانے لگا تاکہ ضرورت کے وقت آسانی سے گرم پانی مل سکے۔

پھر آپ نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے اور اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنی رکعتیں ادا کرتے تھے جب صبح ہوتی تو نکلتے تھے اور مریدین اور تلامذہ کی جماعت دروازہ کے سامنے والے دالان میں صف بستہ انتظار میں ہوتے جن کو سردی یا بارش بھی نہیں روک سکتی تھی جب آپ نکلتے تو وہ سب آپ کے ساتھ جامع اموی جاتے اور وہاں جماعت سے نماز ادا فرماتے پھر دارالحدیث کی طرف تشریف لے جاتے جہاں ایک کمرہ آپ کے لئے مخصوص تھا جس میں دریاں بچھی ہوئی تھیں اور اس میں صرف معمولی تکیے جن میں خشک گھاس بھری ہوتی اور اسی گھاس کے معمولی گدے تھے۔ اسی کمرہ میں بڑے بڑے آدمی حاضر ہوئے اور بیٹھے وہاں کے حاضرین میں مشائخ ادیان اور علمائے اعلام، حکام اور امراء بڑے بڑے زعماء جن کے قدموں تک

نیچے زمین بھی لرزتی تھی اور ان کے خوف سے دل دہلتے تھے جب اس کمرہ میں داخل ہوتے تو جوتے اتارتے ہوئے دوزانو بیٹھ جاتے اور خشوع سے ان کے گردنیں جھک جاتیں اور خاموش بیٹھے رہتے۔ جمال پاشا کی ایسی عظیم شخصیت اور ان سے پہلے کے حکام دوسرے ملکوں کے نمائندے بھی اسی طرح حاضر ہوتے معلوم ہوتا تھا کہ اس کمرہ کی شان و شوکت بڑے بڑے جبابرہ کو بچہ، عالم علامہ کو طالب علم بنا دیتی تھی، علم، تقویٰ اور دین کی ہیبت، خود پسندوں کو لوگوں کی نظر میں چھوٹا کر دیتے تھے۔

اسی کمرہ میں آپ نماز، درس اور ذکر میں غروب آفتاب تک مصروف رہتے اور پھر اپنے گھر تشریف لیجاتے تاکہ روزہ افطار کریں کیونکہ آپ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے جو آپکی کسی نذر کے مطابق ہمیشہ معمول رہا۔ آپ کو کسی نے سوائے گھر مدرسہ اور جامع اموی کے اور کہیں نہیں دیکھا سوائے اسکے کہ شاذونادر کہیں تفریح کیلئے گیا۔

حضرت شیخ موہوب من اللہ تھے آپکے استاد کتابیں تھیں آپنے کسی درسگاہ میں تعلیم حاصل نہیں کی صرف یہی معلوم ہو سکا ہے کہ آپ نے شیخ ابو الخیر الخطیب سے ابتدائی علوم حاصل کئے پھر خود ہی مطالعہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور عمر بھر میں کوئی گھڑی خالی نہیں گئی جس میں کتابوں کا مطالعہ نہ کرتے ہوں اسی طرح درس دینا بھی کبھی نہ چھوڑا یہاں تک کہ وفات سے دو گھنٹے قبل آپ کے درس دینے کا وقت تھا جب طالبعلموں نے معذرت دیکھا تو لوٹنے لگے آپ نے ان کو اشارہ سے بلایا اور فرمایا کہ تم پڑھو میں سن لوں گا۔

آپ کے ویسے حالات۔ عبادت اور تعلق باللہ کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب حجازی ریلوے لائن بچھائی گئی (اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ جاری فرمادیں) اور پہلی ریل گاڑی چلی تو اس گاڑی میں آپ بھی سوار تھے گاڑی راستہ میں جنگل میں بغیر اسٹیشن کے انجن کی کسی خرابی کی وجہ سے رک گئی تو لوگ اتر کر مغرب کی نماز پڑھنے لگے۔ ابھی لوگ نماز میں تھے کہ گاڑی چل پڑی۔ لوگوں نے نماز توڑ دی اور بھاگ بھاگ کر لٹکنے لگے گاڑی کے نکل جانے کے بعد تلاش کیا گیا تو لوگوں نے آپکو ریل میں نہ پایا۔ گاڑی کو دوبارہ لوٹایا گیا تو آپ وہیں جنگل میں اپنی جانماز پر تھے جہاں نہ پانی نہ آبادی تھا نہ کوئی جن اور نہ کوئی انسان اور آپ کو محسوس بھی نہ ہو سکا کہ گاڑی نکل گئی آپنے کبھی کسی کی غیبت نہیں کی بلکہ آپکی مجلس میں کسی کی غیبت نہیں ہوئی جس شخص نے تجربہ نہیں کیا وہ اسکو بہت آسان بات سمجھے گا لیکن ذرا تجربہ کر کے دیکھئے کہ صرف ایک دن کیلئے غیبت کرنا یا غیبت کا سننا چھوڑنے کی کوشش کیجئے پھر آپ خود ہی کہیں گے کہ شیخ رحمہ اللہ کی زندگی یہ جو اپنے عمل اور اپنے اخلاق میں سلف صالحین کے نقیب اور اپنے زمانہ میں یکتا شخصیت تھے جنکی مثال دیکھنے کیلئے طویل مدت کی ضرورت ہے نہ صرف شام میں بلکہ اسلامی دنیا میں بھی صدیوں میں اس قسم کے نمونے نمودار ہوتے ہیں۔

دربارِ عالمگیری

از ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی

(۷)

ملّا وجیہ الدین

یہ دربارِ عالمگیر میں ایک بڑے منصب پر فائز رہے۔ دوسرے درباریوں کی نظروں میں انکی وقیر اور بڑی قدر تھی۔ انھیں افضل المعالی کے لقب سے یاد کیا جاتا۔ ان کے والد مفتی شیخ عیسیٰ ابن مفتی شیخ آدم دانشمند ہیں۔ شیخ آدم پہلے ملتان میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھے۔ زمانہ کی گردش نے انھیں ملتان چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور یہ قصبۂ گوپامئو ضلع ہردوئی میں آ بسے۔ اور اسی کو وطن بنا لیا۔ ملّا وجیہ رحمۃ اللہ کا سلسلۂ نسب گیارھویں پشت پر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی[۱] بن محمد قدس اللہ سرہ سے ملتا ہے۔ حضرت مخدوم بندگی نظام الدین[۲] امیٹھی ضلع لکھنؤ کے شہرۂ آفاق بزرگ ان کے حقیقی پرنانا تھے۔ اور یہ قصبہ امیٹھی "بندگی میاں" کے نام ہی سے ممتاز ہوتا ہے۔ نسباً ملّا وجیہ صدیقی ہیں۔ آپ کی پیدائش ۱۰۸۰ھ میں گوپامئو میں ہوئی۔ تعلیم و تربیت کے ابتدائی مراحل آپ نے اپنے حقیقی بھائی عبید اللہ کے عاطفت اور مہر کے سایہ میں

---

[۱] تاریخ خاندان مفتیان مطبوعہ جون پور۔

[۲] شیخ معروف را بادشاہ دہلی تکلیف قضاء قصبہ امیٹھی و دیگر مزوارستر کہ دادہ آمدہ دراینجا متوطن شدند الی یومنا ھذا اولاد احجاد شیخ مسطور در امیٹھی سکونت دارند۔ (اخلاق جعفری ملک عبد السلام العلوی مخطوطہ)

لے گیے۔ یہ انھیں بڑے پیار اور محبت کی نگاہوں سے دیکھتے۔ علاوہ ازیں انھوں نے اپنے نانا حضرت بندگی جعفر بن حضرت مخدوم بندگی نظام الدین سے بہت کچھ فیوض حاصل کیے اور بعد فراغت درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری رکھا عرصہ دراز تک فرداً فرداً آپ کے اسلاف کو افتاء کی خدمات تفویض رہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ گوپامئو کا یہ گھرانہ مفتیوں ہی کے لقب سے آج تک مشہور چلا آتا ہے۔

ملاّ کی جودت علم کا آوازہ اور شہرہ شہنشاہ زمانہ شاہجہاں کے کانوں تک پہونچا تو ازراہ قدردانی دربار سے طلبی کا پروانہ جاری ہوا اور شاہی نقد و تبصرہ کے بعد فی الحال شاہی کتب خانہ کے نگراں اور سپرداشرزہ مقرر فرما دیئے گئے۔ قلمدان اور توزک شاہی کی مہر ان کی امانت میں دونوں چیزیں دے دی گئیں۔ اس پر مستزاد شہزادہ داراشکوہ کی تربیت و تعلیم اور اتالیقی کے فرائض کی انجام دہی بھی انھیں کو تفویض رہی۔ رفتار زمانہ آگے بڑھی اور لیل و نہار نے گردش کی تو منجانب شاہزادہ داراشکوہ ۱۰۶۰ھ میں صوبہ الہ آباد اور بہار کی صدارت کا منصب جالی بھی انھیں کے سپرد کر دیا گیا۔

ایک وہ زمانہ بھی آیا کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر تخت ہندوستان پر جلوہ افگن ہوئے تو ان کے کچھ مصالح کا اقتضا یہی ہوا کہ ان مناصب سے مستعفی ہو کے رہیں۔ چنانچہ استعفا دیا اپنے وطن گوپامئو واپس آگئے۔ اور اپنا وہی دلچسپ درس و تدریس کا شغل اختیار کر لیا لیکن تا بہ کے ان کی ہنرمندی اور علمی کمالات کا اقتضا یہی تھا کہ اہل نظر کی نظریں ان پر پڑیں چنانچہ نظریں پڑیں اور جلوس ۹ سنہ میں عالمگیر نے ازراہ قدر افزائی اپنے دربار سے ان کو منسلک کر ہی لیا[1] اور ان کے شایان شان ایک منصب جالی ان کو عطا ہوا۔ علم معانی اور علم بیان کے ماہرین میں ان کا شمار کیا جاتا تھا، اور اپنے زمانہ میں ان دونوں علوم میں اپنی آپ ہی نظیر تھے۔ ذہن روشن اور وقاد اور ضمیر صاف و شفاف پایا تھا۔ علم فقہ میں پوری دستگاہ تھی اور جزئیات فقہیہ پر پوری نظر حدیثی معلومات میں بھی وسعت نگاہ تھی۔ ذہانت اور ذکاوت بھی بلا کی پائی تھی۔ چنانچہ صاحب تکرہ علما ان کے متعلق یوں رقم طراز ہیں :-

"علامہ شیخ وجیہ الدین گوپامئوی عالم تحریرات و بہ تقریر دلپذیر و امارت ذہن و

---

[1] نزہۃ الخواطر صـ۳۸۲

صفائے ضمیر انتصاب دارد و یک چند در زمرۂ ملازمان و مقربان دار شکوہ منتظم بودہ۔

چوں اورنگ سلطنت جہاں بانی بجلوس حضرت خاقانی فر آسمانی یافت او در وطن خود منزوی بودہ اوقات خود را بسر می برد و در سن نہم جلوس والا بعنوی بخت بیدار بدرگاہ کیوان جاہ رسیدہ بمنصب سرفراز گردید و ترتیب و تالیف ربع از فتاوی عالمگیری[1] شاہی مامور شدہ وہ کس دیگر از فضلا بمدد اعانت او مقرر شدند۔

ربع فتاوی عالمگیری کی تبیض اور تسوید جیسی کچھ وسعت معلومات اور دقت نظر کی مقتضی تھی اور وہ بالکلیہ ان کے سپرد ہوئی۔ اس کے علاوہ آپ کی اور بھی اہم تصانیف کا اس عہد کے مؤرخین تذکرہ کرتے ہیں۔ لیکن سوائے بعض کے اور تقریباً ناپید ہی ہیں۔ جو تصانیف ان سے منسوب ہیں ان کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ نفائس وجیہہ

۲۔ حاشیہ بر حاشیہ خیالی مطول

۳۔ رسالہ انساب

۴۔ شرح حصن حصین

۵۔ رسالہ تحقیق چہاردہ علوم

۶۔ الکلام الکافی والعروض والقوافی

آپ اپنے والد بزرگوار حضرت مفتی شیخ عیسیٰ سے مریدی[2] کا شرف رکھتے تھے۔ لیکن مصنف خاندان مفتیان گوپامئو کا بیان یہ ہے کہ انھیں شیخ معروف جون پوری سے خلافت حاصل ہوئی لیکن جمع بین القولین یوں ممکن ہے کہ مرید تو اپنے والد ماجد کے ہوئے ہوں اور پھر مریدی اور خلافت شیخ معروف سے حاصل کی ہو اور انھوں نے ہی خلیفہ مجاز فی الصحبۃ والبیعۃ بنا دیا ہو۔ واللہ اعلم۔

آپ کے تلامذہ کی تعداد کا شمار اور احصا نہ ہوسکا لیکن آپ کے ارشد تلامذہ اور معنوی گل کے

---

[1] اس کا مفصل بیان صفحات آئندہ میں آئے گی۔

[2] آثار علما گوپامئو۔

حقیقت کے اعتبار سے۔

۱۔ ملا عصمت اللہ بن ملا عبد القادر بدایونی

۲۔ ملک بہاء الدین بلگرامی۔

۳۔ ملا شیخ محمد محسن صدر و محتسب خیرآباد

۴۔ مولوی شاہ محمد آفاق خلیفہ و جانشین حضرت شاہ پیر محمد لکھنوی کے اسماء گرامی تذکروں میں لیے جاتے ہیں۔[۱]

۵ رجادی الثانیہ ۱۰۳۰ھ آپ کی تاریخ وفات ہے۔ یہ حادثہ دہلی میں ہوا، وقت انتقال آپ کی عمر ۹۰ سال تھی۔ میت کو کچھ دن دہلی میں محفوظ رکھنے کے بعد ایک تابوت کی شکل میں گوپامئو لایا گیا اور اس مسجد میں جس کا انتساب آپ سے اب تک ہے سپرد خاک کر دیا گیا۔

"حاجی محمد انور الدین"

تاریخ و سن ولادت تو محفوظ نہیں، لیکن ان کا مولد و منشا قصبہ گوپامئو ضلع ہردوئی ہی ہے۔ ابتدائی تربیت خاندانی بزرگوں سے ملی اور مبادیات کتب علما، خاندان سے پڑھیں، پھر دہلی کا سفر اختیار کیا جو اس زمانہ میں مقر علماء کبار تھا اور انھیں کے حلقات درس میں بیٹھ کر علوم و فنون متداولہ کی تکمیل کی۔ باہنر باکمال بنے بادشاہ وقت کی نظر انتخاب نے انھیں تاڑلیا اور شاہجہاں کے دربار سے منسلک ہو کے رہے۔ شہنشاہ کی طرف سے تسبیح خانہ کی مہتممی اور نظامت سے نوازے گئے۔ علاوہ ازیں جاگیر بھی آذوقہ کے لیے عطا کی گئی۔ حاجی صاحب ان مفوضہ خدمات کو ۱۰۶۸ھ تک بطرز خوش اسلوبی و فرح بدستور انجام دیتے رہے۔ لیکن جب اورنگ زیب عالمگیر اور ان کے بھائیوں میں چپقلش شروع ہوئی اور خانہ جنگیوں کا آغاز ہوا تو کچھ انقباض خاطر اور اگلی فضا مفقود ہونے کے باعث درباری خدمات سے مستعفی ہو گئے اور وطن آکر وہاں ہی اقامت گزیں ہو گئے۔ لیکن ان کے علم و ہنر کی فانوس کی جگمگاہٹ اور شمع معرفت کی کرنیں دلی پہونچ کے رہیں۔ ادھر عالمگیر تخت نشین ہوا، جھگڑے

۱۔ تذکرہ علماء ہند

فساد بہت حد تک نابود و ناپید ہوئے اور پھر اورنگ نشیں اورنگ زیب نے ان کے پاس طلبی کا پروانہ بھیج کے طلب کر لیا۔ نوازشات بیکراں سے سرافراز اور وقتی داد و دہش سے نواز کے مستقل جاگیران کے حصہ میں لکھ دی اور ان کی شخصیت اور علم و معرفت کے مناسب ایک عالی قدر منصب عطا کر دیا[۱]۔

دوران ملازمت شاہی کسی شاہی کام کی انجام دہی کے لیے حرمین شریفین کی زیارات سے مشرف ہونا تھا کہ حج ایسا لگا کہ تین سال تک وہاں کا قیام نہ چھوٹا سلطان ابراہیم (ترکی) اور سلطان مصطفےٰ ثانی (ترکی) نے جو اس عہد کے وہاں فرمانروا تھے مدینۂ منورہ میں روضۂ اطہر کی "خدمت فراشی" پر سرفراز فرمایا اور بطور سند فرامین جاری کر دیے جو ترکی زبان میں ہیں اور اب تک ان کے ورثا کے قبضہ میں چلے آتے ہیں[۲]۔ آپ کی وفات اورنگ آباد دکن میں ۵ رمضان المبارک ۱۱۱۱ھ کو ہوئی اورنگ آباد میں برائے چندے میت کو محفوظ کر کے بشکل تابوت ان کے وطن گوپامئو پہونچایا گیا اور انکے جدامجد حضرت مخدوم عبدالحیٔ فاروقی قنوجی (خلیفہ حضرت بندگی نظام الدین امیٹھوی) کے مزار کے پائین لا کے دفن کیا گیا[۳]۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کو ان کی وفات سے ایک غیر معمولی دھچکا لگا اور بہت ہی غمگین رہے ان کی خاص الخاص خدمات سے محرومی آپ کے لیے ایک بڑے صدمہ کا موجب تھی جس کو انھوں نے ان کے بیٹے محمد جان جہاں خاں کے نام ایک مکتوب میں ظاہر بھی کیا ہے۔ مکتوب یہ ہے:۔

> شرافت و نجابت مرتبت اعتماد و رفعت منزلت زبدۂ خانہ زادان یک رنگ فدوی خاص الخاص با فرہنگ لائق العنایات والاحسان محمد جان جہاں مورد مراحم و عنایات والد بودہ بداند کہ درین اوان ملامت اقتران وقوع ارتحال فدوی خاص باختصاص شیخ اقدس حاجی محمد انور الدین خان بہادر ملال خاطر شد کہ مرد خدا ترس و شخص دیندار بود و خدمات بادشاہی را بدیانت و درستی سرانجام داد و مارا از خود راضی داشت خدایش بیامرزد بہچو اشخاص درین زمانہ کمتر اند۔ بیت
>
> آنچہ بر جستیم و کم دیدیم و بسیارست و نیست نیست در معنی بجز انساں کہ بسیارست و نیست

[۱] تزک والاجاہی [۲] حوالہ سابقہ [۳] تصریح الانساب مخطوطہ [۴] خلاصۃ الانساب قلمی۔

باید کہ آں زبدۂ خانہ زادان راضی برضائے الٰہی باشد و توجہات ما بدولت و اقبال را بحال خود روز افزوں داند و خود را بحضور اشرف داخل رساند[1]

"محمد جان جہاں خان"

یہ حضرت شیخ اقدس حاجی محمد انور فاروقی سابق الذکر کے صاحبزادے ہیں۔ اپنے والد کی وفات کے بعد ان کا الحاق بھی دربار عالمگیری سے ہوگیا تھا۔ یہ اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد بیحد پژمردہ اور متفکر و پریشاں خاطر رہتے کہ ایک رات خواب دیکھا اور وہ یہ تھا

کہ خود بزیارت پدر بزرگوار رفتہ دیکہ بر قدادہ نشستہ و مجرد دو چادر شدن فرمودہ کہ پہلوئے قبرم بغلط خوانی قرآن از مردم مرا تنگ نمودہ نمی توانی کہ دفع ایں کراہت بر گردانی عرض کرد کہ ایں کار موجب فخر و عزت جاودانی ست آئندہ کار بند احتیاط آں خواہیم بود۔ باز فرمود کہ اقامت بے حاصلت دریں جائے وگوارائے رنج دعا از جہت و پابدامن کشیدن در عین تحصیل فوائد سیر و سفر آئین مصلحت نیست دکشائش باب روزیت در گرد عزیمت لشکر شاہی است و کفلک در کامت سعد سر براہی۔

اور اسی خواب میں باپ کی یہ باتیں سن کے محمد جانؒ نے جواب جو دیا وہ یہ تھا:

کہ اندیشہ عدم آشنائی اہل لشکر غار دامان ست و برآمد کار در ہجوم اغیار غیر امکان[2]

پھر سے باپ نے جواب دیا

کہ بتوکل خدا طاؤس بہ لشکر ظل سبحانی روی و مسعود پژوهش معقد شوی و مخلص خان امیر واسطہ کار در برآمد مدعایت را مددگار خواہد شد۔

یہ خواب دیکھنا تھا کہ نہ وہ طبیعت میں انقباض رہا اور نہ پریشاں خاطری، تفکرات کا وہ عالم جس سے شبانہ روز دوچار رہتے سب دور ہوگیا سکون قلبی میسر آیا اور اطمینان دامن ہاتھ لگا۔ خواب میں باپ نصیحتوں کو گوش نیوش سے سن کے رخت سفر مہیا کرنا شروع کر دیا اور کوچ کی تیاریوں میں لگ گئے۔

---

[1] تزک والا جاہی برہان الدین۔ [2] حوالہ سابق۔

سفر اختیار کیا اور بعد چندے بادشاہ تک رسائی حاصل کی قسمت کی یاوری تھی اور وقت کی مساعدت کہ اپنے والد مرحوم شیخ اقدس کی خدمات اور مناصب و جاگیر سے نواز دیئے گئے اور وہاں پہونچ کے اپنی شجاعت اپنی ذہانت اور ذکاوت کے موقعہ موقعہ سے وہ جوہر دکھلائے کہ شاہ وقت تو شاہ وقت درباری بھی داد دیئے بغیر نہ رہے اور پھر دربار عالمگیر سے الحاق کیا ہوا کہ عہد محمد شاہ تک کبھی منقطع ہونے کی نوبت نہ آئی۔ پھر جب گردش افلاک سے دربار کی حالت میں تغیرات رونما ہونے لگے اور تدریجی تنزل کے آثار ہویدا ہونا شروع ہوئے تو دل میں بیزاری پیدا ہوئی اور رفتہ رفتہ اتنی بڑھی کہ ترک علائق کر کے نظام الملک کی ہمراہی اور رفاقت میں حیدر آباد چلے گئے، وہاں صوبہ کرناٹک پایان گھاٹ (مدراس) کی نظامت ان کو تفویض کر دی گئی۔ اور جب فرانسیسیوں سے صوبہ والوں کی جنگ ہوئی تو فرانسیسی گورنر ڈوپلے کے مقابلہ میں شہید کر دیئے گئے۔ باقی رہے نام اللہ کا۔

بقیہ معارف الحدیث صفحہ ۱۴

کھانے کے لیے ہمارا جی چاہا تو ہم نے اس میں کھا لیا (اور روزہ توڑ دیا) آپ نے فرمایا کہ اس کی جگہ کسی دن قضا روزہ رکھو۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نفلی روزہ توڑ دینے کی صورت میں اس کی قضا کے طور پر روزہ رکھنا چاہیئے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ قضا واجب ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب نہیں صرف مستحب ہے۔

ترجمہ

از وحید الدین خاں

لبرل اسلام

(آخری قسط)

[مسٹر آصف فیضی کی کتاب "اے ماڈرن اپروچ ٹو اسلام" کے چوتھے باب کا ترجمہ ـ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے دینی افکار کے مطالعہ کے طور پر]

ضمنی قاعدے | قرآن یا شریعت میں جب ایک حکم دیا جائے تو یہ طے کرنا ضروری ہے کہ وہ ایک قانونی حکم ہے یا اخلاقی ہدایت۔ اگر وہ ایک قانونی حکم ہے تو ریاست اُسے بزور نافذ کرے گی۔ اور اگر وہ اخلاقی ہدایت ہے تو اسٹیٹ طاقت کے ذریعہ اس کا نفاذ نہیں کر سکتی۔ گزشتہ اصولوں کی روشنی میں ایک بار یہ بات طے ہو چکی ہے کہ قرآن میں واضح طور پر قانونی نوعیت کے احکام ہیں اس لیے اب یہ سوال اہم ہو جاتا ہے کہ خدا کے قانون کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی۔ میں ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ اس تشریح پر محتاط نظر ثانی کی ضرورت ہے قرآن انسانی عمل کے بارے میں کبھی ایک بنیادی ضابطہ مقرر کرتا ہے، کبھی وہ کوئی ضمنی حکم دیتا ہے۔ جو کسی خاص وقت یا حالات سے متعلق ہے، اس کی کوئی دائمی قدر و قیمت نہیں ہے یا وہ کبھی شاعرانہ زبان تمثیل یا قصہ کہانی کے انداز میں بولتا ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے :-

هو الذی انزل علیك الکتاب منه آیات محکمات هن ام الکتاب واُخر متشابهات۔ آل عمران ـ ،

ایسی حالت میں ہم اس نتیجے تک پہونچنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ ایک تعبیر کرنے کا مسئلہ ہے اور یہ کہ قانون کو بدلا جا سکتا ہے گر مذہب زیادہ پائدار چیز ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ تحقیق کرنے کے لیے کہ یہ حکم قرآن کا ایک واضح حکم ہے، جیسے شراب اور سود کی حرمت،

ہمیں ایک خاص طریقے کی پیروی کرنی ہوگی، وہ طریقہ یہ ہے۔ ۱۰۲

۱۔ اسلام سے پہلے کون سا قانون یا رواج پایا جاتا تھا ــــــ پیغمبر کی اصلاحات کا اندازہ کرنے کے لیے سب سے پہلے تمام موجود شہادتوں کا جانچنا ضروری ہے۔ صرف مسلم مصنفین پر اعتماد کرنا کافی نہیں ہوگا۔ اسی کے ساتھ ہمیں اسلام سے پہلے کے ادب، کتبے، دستاویزات، سامی بولیوں، عبرانی، سریانی اور حبشی زبان، یونانی، لاطینی اور دوسرے ذرائع سے حاصل شدہ شہادتوں پر غور کرنا ہوگا۔ یہ تحقیق بیسویں صدی کے علمی ذرائع ہی تک محدود رہنی چاہیے۔

۲۔ پیغمبر نے کس طرح اس کی اصلاح کی کوشش کی؟ ــــــ اس سلسلے میں ٹھیک ٹھیک ان حالات کا مطالعہ کرنا ہوگا جن حالات میں اسلامی احکام وجود میں آئے، مثلاً وقت کا قانون، کھانے پینے کے آداب، نماز، وضو اور غسل کے مسائل، روزہ رکھنا اور زکوٰۃ دینا۔ سامی معلومات سے پوری طرح آگاہ ہوکر تاریخی اصول کے مطابق قرآنی آیتوں کا مطالعہ کرنا ہوگا اور پھر از سر نو آیات کی صحیح تفسیر متعین کرنی ہوگی۔ قدیم علماء اور ائمہ کی تفسیر کو بلا بحث آخری سند کے طور پر نہیں قبول کیا جا سکتا۔ ۱۰۳

۳۔ ان اصلاحات کے نتائج کیا ہوں گے؟ ــــــ یہاں عورتوں کے مسئلہ کو بطور مثال لیا جا سکتا ہے۔ اسلام میں نکاح کا قانون بعض ضروری تحفظات کے ساتھ عورت کے حق میں ہے۔ اور اسی طرح وراثت کا قانون بھی۔ پھر کیوں ایسا ہے کہ تقریباً تمام اسلامی ملکوں میں عورتیں منقولہ جائداد کے حق سے رواجاً محروم کردی گئی ہیں۔ یہ صورت حال ہندوستان، انڈونیشیا، مصر، ایران اور شمالی افریقہ میں ہر جگہ ہے۔ اور جو چیز سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے وہ یہ کہ عورت نہ صرف اپنے قرآنی حقوق سے محروم ہے بلکہ وہ مرد سے کمتر سمجھی جاتی ہے اور مخصوص سیاسی حقوق کے لیے غیر موزوں قرار دی گئی ہے۔ مسلم ملکوں کے مشاہدے سے یہ تکلیف دہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عورت، مرد کے ہاتھ میں کھلونا ہے نہ کہ زندگی کی ساتھی اور ہمدم و شریک عمل۔ اس کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ عمل اسلام کے خلاف ہے یا اسلامی روح کے منافی ہے۔ ضروری ہے کہ حقیقت کا مقابلہ کیا جائے، مسئلہ کی گہرائی تک جایا جائے، نامناسب تعبیرات کو ترک کردیا جائے۔ اور مسلم عوام کی از سر نو تربیت کی جائے۔ قرآن کی آیت:

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض۔

نساء - ۳۴

کو نئی تفسیر میں خالص مقامی حیثیت دینی چاہیے اور ایک ایسا حکم قرار دینا چاہیے جو صرف زمانۂ قدیم میں قابلِ نفاذ تھا۔ اس کے وسیع انطباق پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے، ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ اس کی تفسیر یہ کریں کہ یہ حکم ان حالات کے لیے ہے جو کہ بعثت کے وقت عرب کے قدیم سماج میں تھے اور اب جدید زندگی (MODERN LIFE) میں وہ قابلِ انطباق نہیں ہیں۔

۴۔ بعد کی صدیوں میں احکام کی تعبیر اور ان کا نفاذ مختلف قانونی مکاتبِ فکر میں کس طرح ہوا؟ ——— دو احکام جن کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ باہم بہت زیادہ مربوط ہیں۔ جدید مآخذ، خاص طور پر آزاد اور تنقیدی جائزوں کی چھان بین اس مقصد سے کرنی چاہیے کہ معلوم ہو کہ فوری نتائج کیا تھے۔ نیز احکام کے تاریخی ارتقاء کا جائزہ لینا چاہیے۔ کیا وہ غلط فہمی کا شکار ہوئے، یا ان میں تبدیلی کر دی گئی یا انھیں ختم کر دیا گیا۔ کیا وہ سیاسی اور ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیے گئے۔ یہ چند سوالات ہیں جو اس سلسلے میں پیدا ہوتے ہیں۔

۵۔ پرسنل لا کی موجودہ حالت کیا ہے؟ جدید تصورِ انصاف نے جو اعلیٰ معیار مقرر کیے ہیں، ان کے لحاظ سے ان میں کیا نقص ہے، کس حد تک ان قوانین کو برقرار رکھا جا سکتا ہے، انھیں بدلا جا سکتا ہے یا منسوخ کیا جا سکتا ہے، تاکہ ان کو سماجی عدل کے جدید تصورات کے مطابق بنایا جا سکے اور مسلم گروہ کی سماجی خوش حالی کو ترقی دی جا سکے؟ ——— تعبیر کا یہ طریقہ ہندستان کے پرسنل لا سے بحث کرتا ہے۔ اسی قسم کا طریقہ دینیاتی اور اخلاقی قوانین پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے۔

اگر اس تنقیدی طریقہ کے مطابق شریعت کے پورے ڈھانچہ کا جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہے کہ مذہب کے قدیم اور جامد سانچے کی جگہ ایک نیا پروٹسٹنٹ اسلام (PROTESTANT ISLAM) جنم لے گا جو بیسویں صدی کی زندگی کے حالات سے مطابقت رکھتا ہو گا۔ وہ ماضی کے سوکھے ہوئے درخت کو کاٹ ڈالے گا اور مستقبل کو پرامید شکل میں دیکھ رہا ہو گا۔ اس نئے

مذہب کا نام رکھنے کے لیے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تاہم اگر اس کوئی نام دیا جا سکے تو اس کو لبرل (آزاد) اسلام (LIBERAL ISLAM) کہنا صحیح ہوگا۔ ۱۰۴

نتائج

جدید دُنیا نے انسان کو جو سب سے بڑا تحفہ دیا ہے وہ آزادی (FREEDOM) ہے۔ سوچنے کی آزادی، بولنے کی آزادی، عمل کرنے کی آزادی۔ یہ آزادی قانون کے ذریعہ محدود کر دی گئی ہے۔ قانون کہتا ہے کہ ہر انسان کی آزادی دوسرے انسان کی آزادی کے ساتھ بندھی ہوئی ہے اس لیے ہم دوسرے لوگوں کو برا نہیں کہہ سکتے، یہ ہتک عزت ہے، ہم ریاست کو برا نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ بغاوت ہے۔ تنقید کو ہتک عزت اور بغاوت نہیں بننا چاہیئے جائز تنقید کے حدود اور بے بنیاد الزام جو ہتک عزت اور بغاوت تک جا پہونچے وہ عدالتوں کے ذریعہ نہایت صحت کے ساتھ متعین کر دیا گیا ہے۔ مگر اس سے الگ جدید دور خیال، گفتار اور عمل کی آزادی پر زور دیتا ہے۔ ۱۰۵

اب جہاں تک مذہبی اصول کا تعلق ہے اسلام کیا کرے گا۔ وہ اجتہاد کا دروازہ بند کرتا ہے وہ یہ اصول مقرر کرتا ہے کہ قانون داں چند زمروں میں تقسیم ہونے چاہئیں اور فکر کی کوئی آزادی نہیں ہے۔ حالیہ ہندوستانی مصنفین میں سے اقبال اور عبدالرحیم نے اس اصول کے خلاف بغاوت کی اور کسی نے ابھی تک علماء کے غضب کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کی ہے۔ تقریباً دس سال پہلے کی بات ہے کہ پاکستان میں فسادات ہوئے اور ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھایا گیا پاکستان کے چیف جسٹس نے متعدد علماء سے اسلام اور اس کے بنیادی اصولوں کے بارے میں سوالات کیے۔ چیف جسٹس کے تجزیہ کے مطابق بعض علماء دوسرے علماء کی رائے میں کافر تھے۔ یہ ہے وہ درجہ جہاں ہمارا فکری جمود پہونچ چکا ہے۔ اسلام اپنی قدیم تعبیر میں وہ لچک (RESILIENCE) کو کھو چکا ہے جو جدید فکر اور جدید زندگی کے ساتھ ہم آہنگی کے لیے درکار ہے۔ ہمایوں کبیر اپنے ایک حالیہ مقالہ میں لکھتے ہیں۔

"دور جدید کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی ایک ایسے عقیدے کا تقاضا کرتی ہے۔۔۔

نوعیت میں عقلی اور اپنی وسعت میں عالم گیر ہو۔

(RATIONAL IN NATURE AND UNIVERSAL IN CONTENT)

وہ لوگ جو خدا پرست ہیں وہ خدا کے تصور میں کائناتی مفہوم کا ایک نظری عکس پاتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو خدا پر عقیدہ نہیں رکھتے وہ انسانی عظمت (HUMAN DIGNITY) کے تصور میں مقصدیت کو پا لیتے ہیں۔ سچائی، حسن اور خوبی، اقدار (VALUES) کی وہ بنیادیں ہیں جو ایک انفرادی ذات سے زیادہ وسیع اور پائیدار ہیں۔ ان قدروں سے ہم آہنگی انسان کو بلند ہمتی اور قربانی پر ابھارتی ہے، خارجی دنیا کے بارے میں ہمارا علم مسلسل بڑھ رہا ہے۔ اس کو ہماری اپنی ذات کے بارے میں بڑھتے ہوئے علم سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ سقراط کا مقولہ کہ علم نیکی ہے، آج سے پہلے کبھی اتنا سچا نہیں تھا۔"

پر لکھتے ہیں :۔

"سائنسی ترقی نے انسان کے ہاتھ میں اس کی خواہش اور اس کی ضرورت کے مسائل حل کرنے کی کنجی دے دی ہے۔ یہ اب ہمارے اختیار میں ہے کہ بھوک اور بیماری پر فتح حاصل کر سکیں۔ اسی طرح یہ بھی یکساں طور پر ہمارے اختیار میں ہے کہ انسانی سماج کو تباہ کر دیں بلکہ درحقیقت طبعی دنیا کو۔ علم بذاتِ خود ایک غیر جانبدار چیز ہے۔ ہمارا علم تخریب کے لیے استعمال ہوگا یا تعمیری مقاصد کے لیے اس کا انحصار اس عقیدہ پر ہے جو ہمیں متحرک کرتا ہے۔ اب ہمارے عقیدے کو الہام یا کسی پر اسرار ذریعہ پر مبنی نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کو شخصی حدود سے پار کر جانا چاہئے؛

OUR FAITH CAN NO LONGER BE BASED ON REVELAT-
-ION OR MYSTERY, BUT IT MUST TRANSCEND THE
LIMITATIONS OF THE SELF (P-106)

خارجی دنیا کی نوعیت اور انسانی شخصیت کے بارے میں ایک عقلی معرفت، مختلف نقطۂ نظر کے درمیان رواداری، دوسرے انسانوں کے ساتھ شفقت اور اتحاد، یہ ایک عقیدہ

کے لازمی اجزا ہیں جو آج کل پیچیدہ اور دُکھ بھری دُنیا میں ہماری امیدوں کا واحد سہارا ہے۔"[1]

اسلام میں فکری آزادی کے منجمد ہونے کی ایک نمایاں شہادت مذکورۂ بالا یہودی مصنف ربی اگناز میبام کی کتاب (THE JEWISH MISSION) میں ملتی ہے۔ وہ ایک ترقی پسند یہودی ہے اور اپنی پوزیشن کی مدافعت میں کہتا ہے کہ یہودی تورات کو نہیں چھوڑ سکتے۔ مگر تورات جہاں تک اس کے دیوانی اور فوجداری قوانین کا تعلق ہے، اس نے جدید یہودیوں کی زندگی میں اپنا عمل ختم کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اسلام کا عقیدہ ہے نہ کہ یہودیت کا کہ وحی الٰہی قانون ہے۔ موجودہ زمانے کے علمائے یہود جب یہ کہتے ہیں کہ تورات کا ایک حکم بھی منسوخ نہیں ہو سکتا تو وہ یہودی معلم سے زیادہ علمائے اسلام کے مشابہ ہوتے ہیں۔ وہ آگے کہتا ہے کہ اسلام نے بربری قوموں کو تہذیب سکھائی۔ مگر بڑی مہنگی قیمت پر ـــ یہ کہ کسی کو آزادی نہیں۔ اسلام ایک کلیت پسندی کا مذہب ہے۔ اور سچی یہودیت آزادی کے بغیر نشو و نما نہیں پا سکتی۔ ۱۰۰

یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ سچا اسلام بھی ہر معاملہ، ہر اصول اور ہر عقیدہ میں فکری آزادی کے بغیر نشو و نما نہیں پا سکتا۔ جیسے لوتھر نے عیسائیت میں عقیدے کی بندشوں کو توڑ دیا اور شخصی تعبیر کے حق کا دعویٰ کیا۔ اور ترقی پسند یہودی اپنی قوم کے لیے اصلاح یافتہ یہودیت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح لبرل اسلام کو تسلیم کیا جانا چاہیے۔ اور قدامت پرست لوگوں کو ان کی جگہ دینی چاہیے۔ ہم قدامت پرست حضرات کا احترام کرتے ہیں۔ پھر یہ کیسے صحیح ہوگا کہ مذہب کی آزاد تعبیر (LIBERAL INTERPRETATION) کو کفر کے ہم معنی سمجھا جائے۔ پورے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ علما خواہ کچھ کہیں مگر ہر وہ شخص جو سنجیدگی سے اپنے کو مسلمان کہتا ہے، وہ مسلمان ہے۔ کوئی شخص اس کے عقیدے پر معترض ہونے کا حق نہیں رکھتا اور نہ اس کو اسلامی برادری سے خارج کر سکتا ہے۔ موجودہ آزادی کے زمانے میں فتویٰ تکفیر کا ہمارا نا

---

[1] "Faith For a complex world"
The American Scholar 1957, 419

ہتھیار استعمال کرنا ایک عجیب و غریب قسم کی خلاف زمانہ حرکت (ANACHRONISM) ہے یہ نصیحت اور اصلاح کی کوشش کے بغیر آدمی کو دور کر دیتا ہے۔ عقیدہ ایک ذہن و ضمیر کا معاملہ ہے اور یہ ایک ایسا نشانہ ہے جو عقیدہ میں ذہنی آزادی کو تسلیم کرتا ہے۔ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ کہ کسی بات کو پورے تجزیئے کے بعد غلط قرار دیا جائے۔ نہ یہ کہ فلاں شخص کافر ہے۔ ۱۰۷

جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

"ہمارے یہاں بڑے بڑے مذاہب ہیں اور انھوں نے انسانیت پر عظیم اثرات ڈالے ہیں۔ تاہم اگر ادب کے ساتھ اور کسی کو برا کہے بغیر مجھے اظہار خیال کی اجازت ہو تو میں کہوں گا کہ ان مذاہب نے انسان کے ذہن کو جمود، خیال پرستی اور تعصب میں مبتلا کر دیا ہے۔ انھوں نے جن باتوں کی تعلیم دی ہے وہ اچھی ہو سکتی ہے مگر جب یہ دعویٰ کیا جائے کہ آخری بات کہی جا چکی ہے (THE LAST WORD HAS BEEN SAID) تو سوسائٹی جمود میں مبتلا ہو جاتی ہے۔" لہ

دوسروں کے ساتھ میرا بھی احساس ہے کہ اسلام اب متحرک نہیں رہا ہے۔ وہ موجودہ زمانے میں لوگوں کی صحیح رہنمائی نہیں کر رہا ہے۔ اور اس کے اصولوں کی ایک نئی تشریح اب فوری ضرورت کی چیز بن گئی ہے۔ یہ چیلنج ہے جو مسلمانوں کو صحیح روح کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ مذہبی اعمال بے روح رسمیں بن کر رہ گئے ہیں۔ اچھے خاصے مسلمانوں (DECENT MUSLIMS) کی بہت بڑی تعداد نماز روزہ کے روایتی طریقہ میں اپنی تسلی کا سامان نہیں پاتی۔ وقت کے مطابق مذہب کے اوپر اچھی کتابیں نہیں لکھی جا رہی ہیں۔ عورتوں کے ساتھ معاشی اور اخلاقی اعتبار سے برا سلوک ہو رہا ہے اور رجعت پسند علماء کے فتوؤں کی وجہ سے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی ان کو سیاسی حقوق نہیں دیے جا رہے ہیں۔ اور مسلمان حتیٰ کہ جن ملکوں میں وہ اکثریت میں ہیں، معاشی اعتبار سے مفلس ہیں، تعلیمی معاملے

لہ What is culture — Orient Review V-2, No-5, May 1957, P.9

ٹیکھے ہیں۔ روحانی لحاظ سے دیوالیہ پن میں مبتلا ہیں اور اپنے لیے "تحفظات" کا مطالبہ کر رہے ہیں! کہ بہت سے قوانین جو دورِ قدیم میں مفید تھے اب وقت کے پیچھے چلے گئے ہیں اور کسی جدید ریاست میں اسلام کی مذہبی حکومت قائم کرنے کی فضول کوشش یا زندگی کو پرانے اسلام کے مطابق بنانے کی جدوجہد ناکامی پر منتج ہوگی۔

اور آخری بات یہ ہے کہ گہرائی کے ساتھ جائزہ لینے کا وقت آگیا ہے۔ اب اسلام کی ازسرِنو تشریح کرنی ہوگی۔ ورنہ اس کا روایتی ڈھانچہ اس کو اس طرح لے ڈوبے گا کہ پھر اس کا سنبھالنا محال ہوگا۔ ۱۰۸

اسلام ایک عرب کی تعلیمات کے ذریعہ دنیا میں پھیلا جو مکہ میں رہتا تھا۔ وہ ایک غریب آدمی تھا جس کو اپنی ضروریات زندگی کے لیے کام کرنا پڑتا تھا، اس کا نام محمدؐ تھا۔ اس نے ایک بڑی عمر کی خاتون خدیجہؓ سے نکاح کیا۔ جس نے انھیں وفادار اور ریا نہ دار پایا تھا۔ وہ ایک شریف، مہربان اور سچا آدمی تھا اور الامین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ وہ مشاہدۂ نفس میں مشغول رہتا تھا۔ وہ ایک غار میں چلا جاتا اور کئی کئی دن عبادت کرتا رہتا۔ جب وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچا تو اس کو ایک پکار سنائی دی۔ خدا نے اس سے کلام کیا اور اس نے ہم کو بتایا۔ قرآن اس کے عقیدہ خدا کی ایک شہادت ہے۔ محمدؐ ہماری طرح ایک آدمی تھے مگر انھوں نے کلام پیش کیا وہ خدا کا کلام تھا۔ ۱۰۹

پیغمبر نے ہم سے اسی طرح کلام کیا جیسے ایک انسان دوسرے انسانوں سے کلام کرتا ہے نہ کہ ایک خدا کی طرح جو اپنے عبادت گزاروں سے خطاب کر رہا ہو۔ انھوں نے ہمیں فروتنی، سچائی، اخوت، جرأت، فیاضی، وفاداری، زیردستوں کی حمایت سکھائی۔ انھوں نے کہا "اے لوگو! میری باتوں کو غور سے سنو اور اس کو سمجھو۔ یقیناً ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ پیغمبر نے کہا۔ "اے خدا کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا؟" اور لوگوں نے جواب دیا۔ "ہاں"۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ بلند پیغام دیا، ہم کو چاہیے کہ اس پیغام کو ہم آج کے لحاظ سے سمجھیں، اس کو ماضی کے اعتبار سے نہ دیکھیں اور نہ اس اعتبار سے کہ وہ متعین ہو گیا۔ میں خدا پر اعتقاد رکھتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ کائنات خدا نے بنائی ہے۔ اور یہ کہ

کائنات کے اندر نظم و ضبط ہے۔ خدا پر عقیدہ اور نظم کائنات پر عقیدہ، یہ دو میرے عقیدہ کے بنیادی اجزاء ہیں۔ میں عقیدہ رکھتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے ایک پیغمبر (MESSENGER) تھے۔ اور یہ کہ وہ دنیا کے دوسرے عظیم معلمین (TEACHERS) کی طرح تھے۔ نہ ان سے بڑے اور نہ ان سے چھوٹے۔

قولوا آمنا باللہ وما انزل الینا وما انزل الی ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اوتی النبیّون من ربھم لا نفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون۔ بقرہ۔ ۱۳۶

اپنشد، بدھا، موسیٰ اور عیسیٰ کی تعلیمات مجھے گہرے طور پر متاثر کرتی ہیں۔ میں تمام مذہبوں اور عام عقائد کا احترام کرتا ہوں۔ میں اسلام کے بڑے بڑے علماء کی عزت کرتا ہوں مگر ان کا اندھا مقلد نہیں ہوں۔ میرا عقیدہ میرا اپنا ہے ـــ ایک ایسا عقیدہ جو زندگی کے بارے میں میرے اپنے نقطۂ نظر، میرا اپنا فلسفہ، میرا اپنا تجربہ، میرے اپنے وجدان کے تحت بنا ہے۔ میں ہر مسلمان بلکہ درحقیقت ہر انسان کو یہ حق دیتا ہوں کہ وہ اپنا عقیدہ بنائے۔ لکم دینکم ولی دین۔

TO YOU, YOUR RELIGION; TO ME MINE. (P. 110)

میں یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ ۱۱۰

میرا عقیدہ ہے کہ قرآن خدا کا ایک پیغام ہے۔ یہ خدا کی آواز ہے جس کو محمد نے سنا۔ محمد نے اس کو محمد کے الفاظ میں (IN THE WORDS OF MUHAMMAD) اور محمد کی تقریروں میں عربی زبان میں ہمیں دیا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہر دور میں ان الفاظ کی نئی تشریح کی جائے گی اور نئیں از سرِ نو سمجھا جائے گا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہر مسلمان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اس پیغام کو اپنے آپ کے لیے سمجھے۔ میں اسلام کے عظیم علماء و مفسرین کی قدر کرتا ہوں۔ مگر میں ادب کے ساتھ ان سے معافی چاہتا ہوں اگر میں ان کے عقائد کو پوری طرح قبول نہ کر سکوں۔ کیونکہ عقیدہ درحقیقت ایک شخص کی ذاتی ضمیر کا معاملہ ہے۔ میں اپنا ضمیر دوسروں کے قبضہ میں نہیں دے سکتا ہر عہد کے اہل علم کا فرض ہے کہ وہ اپنے دور کے لحاظ سے اسلام کی تشریح کریں۔ شاہ ولی اللہ ... اقبال نے ان کا اقرار کیا ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ مذہب کو قانون سے الگ کر دینا چاہیئے۔ میں عقیدہ رکھتا ہوں کہ مذہب اور قانون کے میدان بالکل الگ الگ ہیں۔ میں زندگی کے لیے سچائی، حسن اور خوبی، اخوت و انسانیت، وفاداری، عالی ہمتی اور فروتنی پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں اسلام کے طریق عبادت کو مانتا ہوں مگر ایک بے روح عبادتی رسم کی طرح اس کو عائد کرنے کا منکر ہوں۔ جس کی کوئی معنویت جدید زندگی میں باقی نہیں رہ گئی ہے۔ عبادت نوجوانوں کو ایک رسم کی طرح نہیں سکھانا چاہیئے۔ بلکہ اس کو ایک علیم و خبیر خدا کے سامنے ظاہر ہونے والا جذبہ ہونا چاہیے۔

چونکہ میں مسلمان ہوں، میں اسلام کی تین زبانوں کے حسن اور ان کے قیمتی خزانوں سے گہرے طور پر متاثر ہوا ہوں۔ اول عربی۔ اس کے بعد فارسی اور ترکی۔ اسی طرح اُن دوسری زبانوں سے بھی جو خدا کی حمد اور پیغمبر کی محبت کے ترانے گاتی ہیں۔ اُردو بہت تیزی سے اسلام کی چوتھی زبان بن رہی ہے۔ اگرچہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئی اور اس کا ادب ہندو اور مسلم کی مشترک کوشش کا نتیجہ ہے۔ وہ اسلامی موضوعات، جیسے مذہب، تاریخ اور قانون سے بھی کافی مالا مال ہے۔ میں ہندوستانی اسلام (INDIAN ISLAM) کی روح کو سمجھنے کے لیے اردو کو ترقی دینے کی پُر زور وکالت کرتا ہوں۔

میں دنیا بھر کے مسلمانوں کی تعمیر، آرٹ، موسیقی، شاعری، دست کاری سے متاثر ہوا ہوں۔ میں اس رشتہ سے آگاہ ہوں جو ان چیزوں کو میری رُوح اور میرے شعور کے ساتھ حاصل ہے۔ میں مسلمانوں کے اخلاق اور تواضع کی بہت قدر کرتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام، انسان کے ہر قسم کے حالات کے لیے ایک مذہب ہے۔ شہزادہ کے لیے بھی اور بھکاری کے لیے بھی، جاہل کے لیے بھی اور عالم کے لیے بھی، وہ ایک جنتری کے لیے بھی ویسا ہی ہے جیسے البیرونی اور ابن خلدون کے لیے!!!

پیغمبر کا گزر ایک بار کچھ لوگوں پر ہوا۔ آپ نے انھیں سلام کیا اور پوچھا تم کون ہو؟ انھوں نے جواب دیا ہم مومن ہیں۔ آپ نے پھر سوال کیا کہ کیا تمھارے پاس اپنے ایمان کا کوئی ثبوت ہے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا، پیش کرو۔ انھوں نے جواب دیا: "ہم خوشحالی کے وقت خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور سختی کے وقت صبر کرتے ہیں، اور ہم تقدیر پر [illegible]

رکھتے ہیں۔" آپ نے فرمایا۔ "بلاشبہ" تم لوگ مومن ہو۔" اور میرا دعویٰ ہے کہ میں بھی اسی راہ کا ایک حقیر مسافر ہوں۔

اسلام، سچائی، حسن اور خوبی پر زور دیتا ہے۔ اسلام نے ادب، سائنس اور فلسفہ کی جو خدمت کی ہے اتنی بہت کم تہذیبوں نے کی ہے۔ اس نے ایک عظیم تہذیب پیدا کی۔ اسلام کے علماء نے یونانی اور سنسکرت سے کتابوں کا ترجمہ کیا، اور اسلامی سائنس ہی دراصل جدید سائنس کی بانی ہے۔ جمالیات کے دائرے میں اس نے آرٹ، موسیقی اور تعمیرات کو ترقی دی۔ اخلاقیات کے باب میں انسانی اخوت کا اعلان کیا اور بڑی حد تک اس پر عمل کرکے دکھایا۔ اس طرح اس نے جدید جمہوری تصور کے لیے راستہ صاف کیا۔ اس نے بین الاقوامی قانون کی بنیاد رکھی۔ اس کا طریقۂ زندگی جو کہ شریعت میں بتایا گیا ہے وہ قانون مذہب اور اخلاقیات کا ایک قیمتی خزانہ ہے۔ شریعت کی مثال ہمارے لیے ویسی ہی ہے جیسے توراۃ یہودیوں کے لیے اور دھرم ہندوؤں کے لیے۔

تقریباً سات صدیوں تک تہذیب کی خدمت کرنے کے بعد اسلام تاریکی میں چلا گیا۔ اس کی روح مذہبی دیوانگی کی نذر ہو گئی۔ اس کی دینیات پر تعصب چھا گیا۔ اس کی طاقت کلیت پسندی نے ختم کر دی۔ پچھلی دو صدیوں سے اسلام کو ان بندھنوں سے آزاد کرنے کی کوشش جاری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اسلام ایک ایسی ظالمانہ حکومت کے قید خانہ میں ہے جہاں ہمیں کارروائی کی اجازت نہیں۔ آئیے ہم خوش خلقی، شفقت، اخوت، رواداری اور عقلیت کی اس روشن اسپرٹ کو قید سے نکالیں۔ جدید انسان اس کو اپنے درمیان پاکر خوش ہوگا۔ ۱۱۲

مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد نے سنہ ۱۹۴۲ء میں کہا تھا اور ہم ہر زمانے کے لیے ان کے آتشیں الفاظ کو موزوں سمجھتے ہوئے یہاں نقل کرتے ہیں:-

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے۔ اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔

اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی رُوح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے۔ اور یہ سرزمین اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی۔ اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہونچا دیا۔"

خطبۂ صدارت انڈین نیشنل کانگرس (رام گڑھ۔ مارچ ۱۹۴۰ء) ۲۶-۲۷

Cover Printed at A.O. Press Aminabad Park, Lucknow.

سنہ آغاز ۱۹۳۴ء

الفرقان لکھنؤ

مرتبہ

عتیق الرحمن سنبھلی

مسئول

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساڑھے

قرآن آپ سے ــــ کیا کہتا ہے؟

تالیف ــ مولانا محمد منظور نعمانی

بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آبِ حیات ہے،
لیکن ہماری دنیا اس سے ناآشنا ہے یہانتک کہ اسکو "کلامِ الٰہی" ماننے والی
امت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے

(یہ کتاب)

اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔

- یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
- جس میں ۴۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
- خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
- بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ قرآن کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔

نہایت اعلیٰ کتابت وطباعت، مجلد [illegible]

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

(فی کاپی ۶۰ پیسے)

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

سالانہ چندہ
دیگر ممالک سے ...... ۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے ...... ۱½ پونڈ

پوسٹل آرڈر بغیر کراس کیے
رجسٹری سے آنا چاہیے

جلد ۳۴	بابتہ ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ مطابق مارچ سنہ ۱۹۶۶ء	شمارہ (۱۱)

اگر اس دائرہ میں ○ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ مارچ تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کاغذ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیجیے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، ان کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے [illegible] پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے درمیان نامہ و پیام کی راہ کھل گئی۔ تاشقند سمجھوتے سے اگر وہ مسائل خدانخواستہ حل نہ بھی ہو سکیں جن سے جنگ کے بادل اٹھ کر تیئیس (۲۳) دن مسلسل دونوں ملکوں کی سرحدوں پر خون برسا گئے، تب بھی فوری طور پر اتنا ہی فائدہ کیا کم ہے کہ جو نئے مسائل اس جنگ نے پیدا کر دیے تھے وہ اتنی تیزی سے ہٹتے جا رہے ہیں جن کا تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ انھیں میں سے ایک مسئلہ یہ ڈاک اور تار کی بندش تھی جس نے دونوں طرف کے کروڑوں انسانوں کو ایک مسلسل اضطراب اور بے چینی کا شکار بنا دیا تھا۔ لوگ اس جنگ کے تشویشناک پس منظر میں عزیزوں اور دوستوں کی خیر و عافیت جاننے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ اور ان کے علاوہ ہزاروں وہ تھے جو ادھر اور ادھر پھنسے ہوئے مختلف مصائب سے گزر رہے تھے، انھیں بھی اس سمجھوتے کی بدولت اپنے اپنے مأمن و مسکن کی راہ مل گئی۔ کیا یہ فائدہ کچھ قابلِ قدر نہیں ہے۔

پاکستانی دوستوں کے متعلق سن رہے ہیں کہ وہ جنگ بندی اور اس سمجھوتے سے خوش نہیں ہیں لیکن وہ اگر ہم ہندوستانی مسلمانوں کا ردعمل جاننا چاہیں تو شاید بلا کسی استثنار کے حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ان دونوں باتوں پر انتہائی مسرت ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بہتر مفاہمت اور خوشگوار تعلقات مسلمانانِ ہند کی دلی آرزو ہے۔ یقیناً سب سے پہلے اس لیے کہ بظاہر اسباب و امکانات ان کی زندگی کی خوشگواری اسی پر موقوف ہے۔ مگر اس میں کسی خود غرضی کے ایسے جذبے کا شائبہ تک نہیں ہے جو دوسرے متعلق لوگوں کی فلاح و بہبود سے بے نیاز ہو، ہندوستان کے مسلمان خلوص کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان و پاکستان کی مجموعی فلاح بھی اسی میں ہے اور تعلقات کی خرابی ان دونوں میں سے کسی کو بھی پریشانی کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم بالکل نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ اہلِ پاکستان کس بنیاد پر جنگ بندی اور تاشقند

سمجھوتے کو ناپسند کر رہے ہیں۔ پاکستان کا کہنا یہ ہے کہ اس نے جنگ نہیں چھیڑی تھی۔ ہندوستان نے "مجاہدین کشمیر" کے خلاف کارروائی میں کشمیر کی جنگ بندی لائن کو پار کیا، جب یہ حملہ صرف اس کا جواب تھا، جس کے بعد ہندوستان نے خود پاکستان پر حملہ کر دیا اور یہاں بھی صرف اپنے دفاع میں پاکستان نے جنگ لڑی۔ سوال یہ ہے کہ اس صورت حال میں پاکستان کے لیے کیا جواز اور کیا معقولیت تھی کہ وہ جنگ کو جاری رکھنے پر اصرار کرے اور اقوام متحدہ کی جنگ بندی کی اپیل کو اس یقین دہانی کے باوجود نہ مانے کہ اس کے تمام علاقے اسے واپس مل جائیں گے، جبکہ ہندوستان نے بھی اس شرط کو تسلیم کر لیا ہو؟۔

اچھا جواز اور معقولیت کی بات بھی چھوڑیے۔ یا کوئی جواز نکال لیجیے۔ مگر نتائج و واقعات کے لحاظ سے مسئلہ پر غور کیجیے۔

جنگ کے جو حقائق ہمارے سامنے ہیں ان میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ طرفین کا پلہ برابر رہا۔ اگر ہم اس سے بھی آگے جا کر یہ مان لیتے ہیں کہ پاکستان کا پلہ بھاری ہونے لگا تھا یا اس کے امکانات کم از کم پیدا ہو گئے تھے۔ مگر کیا اس حد تک کہ کوئی فیصلہ کن نتیجہ پاکستان نکال سکے؟ ایسی بات تو سوچنے سمجھنے والے لوگ نہیں کہہ سکتے۔ ہندوستان، آبادی، وسائل، رقبہ اور فوج کے لحاظ سے پاکستان سے چار پانچ گنا زیادہ ہے۔ جرمنی اپنی ساری برتری، بہادری اور جوشِ جنگ کے باوجود روس کی ایسی ہی وسعتوں میں گم ہو کر رہ گیا۔ کیا یہ سامنے کی نظیر بھی معاملہ فہمی کے لیے کافی نہیں ہے؟۔

شاید یہ سوچا جا رہا ہو کہ ہم کو صرف کشمیر لے لینا تھا۔ باقی ہندوستان سے کوئی مطلب نہ تھا۔ اور اس کے لیے ہماری طاقت اور جغرافیائی حالات ساعد تھے۔ مگر یہ تو جب سوچا جا سکتا تھا کہ جب ہندوستان کو بھی آپ اس پر راضی کر سکتے کہ کشمیر اگر ہم لے لیں تو معاملے کو ختم سمجھا جائے اور جنگ کی بساط لپیٹ دی جائے۔ لیکن ہندوستان نے تو پہلے ہی لمحے میں آپ کو زبان سے نہیں عمل سے بتا دیا تھا کہ کشمیر کی جنگ ہندوستان اور پاکستان کی مکمل جنگ ہو گی، صرف کشمیر کے علاقہ میں اس کا فیصلہ نہیں ہو جائے گا۔ پھر یہ معاملہ کشمیر میں آپ کی کامیابی سے ختم کیسے ہوتا؟۔

جس پہلو سے بھی غور کیجیے جنگ کو بظاہر اسباب و حالات ایک دن غیر فیصل شدہ حالت میں ہی ختم ہونا تھا اور اس کے بعد کسی سمجھوتے کے بجائے جو دونوں کے تن تناؤ باقی رکھنے کا مطلب یہ ہوتا کہ اسی طرح کی لاحاصل جنگ کا ایک دور پھر چلے، جو کسی بھی ملک کے ذمہ دار اور ہوشمند لوگوں کے سوچنے کی بات نہ تھی۔

پھر تاشقند جیسے سمجھوتے کے خلاف شور و غوغا کی ضرورت ہی کیا ہوسکتی تھی؟

ہمارا خیال تو یہ ہے کہ اس جنگ نے دونوں ملکوں کے لیے اس طرح کے خیالات کی کوئی ادنیٰ سی گنجائش بھی باقی نہیں رکھی ہے کہ ان کے درمیان کا کوئی ایسا مسئلہ جس میں دونوں سخت ہوں یکطرفہ طور پر یعنی جنگ سے حل کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اب ایک صورت تو یہ ہے کہ مسائل اور ان کی الجھنوں کو یونہی چھوڑ دیا جائے اور جس طرح فوجوں کی پوزیشنوں کے اعتبار سے ۵ اگست ۱۹۶۵ء سے پہلے کی صورت بحال کر دی گئی ہے، تعلقات کے اعتبار سے بھی اسی تاریخ سے قبل والے حالات کی بحالی پر بس کر دی جائے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ تعلقات میں وہ خوشگوار اور مصالحت جویانہ انداز اختیار کیا جائے اور الجھنوں کو سلجھا دینے کے لیے وہ گرمجوشی دکھائی جائے جس کی آنچ سے اختلافات کی سختی میں نرمی پیدا ہو، اپنی اپنی آن کے بجائے ایک دوسرے کے جائز مفادات اور برحق مطالبات کے احترام کا جذبہ بڑھے، اور جارحانہ عدم ضبط کی کم اندیشی اور کج نظری پر وہ دور اندیشانہ انداز نظر غالب آجائے جو پڑوسیوں کے حسن تعلق کی قیمت کو سمجھے اور اس کے لیے حق و انصاف کے ہر مطالبہ کو ماننے کیلئے تیار ہو ــــ تاشقند اعلانیے میں ہمیں اختلافات کے حل کی یہی حکمت عملی نظر آتی ہے۔ اور یقین کرنا چاہیے کہ طرفین اگر اس پر مضبوطی سے کاربند رہے تو یہ اپنے بہترین نتائج تک پہنچے گی۔ لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ دونوں طرف کے عوام اپنی حکومتوں کو پورا پورا تعاون دیں۔ نہ یہ کہ ان کی راہ میں روڑا اٹکائیں۔

ہم اپنے پاکستانی دوستوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں حالیہ جنگ نے پاکستان سے تعلقات کی درستی کا بہت طاقتور احساس پیدا کیا ہے۔ اور پاکستان سے حسن تعلق کی خواہش رکھنے والا طبقہ جو ممتاز اہل فکر پر مشتمل ہونے کے باوجود ابتک بہت بے اثر اقلیت تھا، اب اس کی آواز اور یہاں کی حکومت کی آواز میں رسمی اور کسی حد تک ضروری تکلفات کے علاوہ کوئی فرق نہیں رہ گیا، پاکستان سے نفرت کے علمبردار نہایت طاقتور اور کثیر التعداد ہونے کے باوجود اس معاملے میں ملک کے غالب احساسات کے آگے صاف طور پر جھکے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ بڑا سانحہ ہوگا اگر اہل پاکستان نے ان بہترین لمحات کی قدر نہ کی۔ اور اپنی حکومت کو اس نئی حکمت عملی کے آزمانے کا موقع نہ دیا۔

اس گفتگو کے کچھ پہلو اور بھی ہیں۔ خدا نے چاہا تو وہ آئندہ ماہ کی صحبت میں!

مَعَارِفُ الحَدِیث

کِتَابُ الاَذکَارِ وَالدَّعَوَات

اسی سلسلۂ معارف الحدیث میں "کتاب الطہارۃ" کے بالکل شروع میں "حجۃ اللہ البالغہ" کے حوالے سے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد نقل کیا جاچکا ہے۔ کہ

> اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے مجھے یہ حقیقت سمجھادی ہے کہ فلاح وسعادت کی جس شاہ راہ کی طرف دعوت دینے کے لیے انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی (جس کا نام شریعت ہے) اگرچہ اس کے بہت سے ابواب ہیں اور ہر باب کے تحت سیکڑوں ہزاروں احکام ہیں، لیکن اپنی اس بے پناہ کثرت کے باوجود وہ سب بس ان چار اصولی عنوانوں کے تحت آجاتے ہیں۔ طہارت، اخبات سماحت، عدالت۔

یہ لکھنے کے بعد شاہ صاحبؒ نے ان چاروں میں سے ہر ایک کی حقیقت بیان کی ہے جس کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ بلاشبہ ساری شریعت انہی چار شعبوں میں منقسم ہے۔

کتاب الطہارۃ کے شروع میں حضرت شاہ صاحبؒ کے اس سلسلۂ کلام کا صرف وہ حصہ [illegible] کے ساتھ نقل کیا گیا تھا جس میں انھوں نے طہارت کی حقیقت بیان فرمائی تھی۔ اخبات کی حقیقت کے بارہ میں جو کچھ انھوں نے فرمایا ہے اس کو مختصر الفاظ میں [illegible] سکتا ہے کہ وہ

"تکبیر اور خوف و محبت کی کیفیات اور رضا جوئی و عنایت طلبی کے جذبہ کے ساتھ اللہ ذوالجلال والجبروت کے حضور میں ظاہر و باطن سے اپنی بندگی و نیازمندی اور محتاجی و رحمت طلبی کا اظہار ہے" ——— اسی کا دوسرا معروف عام عنوان عبادت ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے سعادت کے ان چاروں شعبوں پر حجۃ اللہ البالغہ مقصد دوم میں ابواب الاحسان کے ذیل میں بھی کلام فرمایا ہے۔ وہاں فرماتے ہیں کہ ان میں سے پہلی چیز یعنی طہارت کی تحصیل کے لیے وضو اور غسل وغیرہ کا حکم دیا گیا ہے اور دوسری بنیاد یعنی اخبات کی تحصیل کا خاص وسیلہ نماز اور اذکار اور قرآن مجید کی تلاوت ہے۔ (۱)

بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ فی الحقیقت ذکر اللہ ہی اخبات کا مخصوص وسیلہ ہے اور نماز اور تلاوت اور اسی طرح دعا بھی اس کی خاص خاص شکلیں ہیں۔

بہر حال نماز اور ذکر اللہ اور تلاوت کلام مجید ان سب کی غرض و غایت اس مبارک صفت کی تحصیل و تکمیل ہے جس کو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اخبات کے عنوان سے ادا کیا ہے اس لیے یہ سب ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں ———

نماز کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آپ کے ارشادات بحمد اللہ اللہ کی توفیق سے اس سلسلہ کی تیسری جلد میں پیش کیے جا چکے ——— تلاوت اور اذکار و دعوات کے متعلق حدیثیں اب پیش کی جا رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ لکھنے والے اپنے اس گنہگار بندے کو اور پڑھنے والے حضرات کو ان احادیث پاک پر عمل کرنے اور پورا نفع اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔

قرآن مجید کی عظمت و فضیلت

قرآن مجید کی بے انتہا عظمت کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کلام اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی حقیقی صفت ہے۔

---

(۱) ابواب الاحسان۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم صفحہ ۲۹۔

واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی ہے، یہاں تک کہ زمینی مخلوقات میں کعبۃ اللہ اور انبیاء علیہم السلام کی مقدس ہستیاں اور عالم بالا و عالم غیب کی مخلوقات میں عرش، کرسی، لوح و قلم، جنت اور جنت کی نعمتیں اور اللہ کے مقرب ترین فرشتے۔ یہ سب اپنی معلوم و مسلّم عظمت کے باوجود غیر اللہ ہیں اور مخلوق ہیں۔ لیکن قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی اور اس سے الگ کی کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ اس کی حقیقی صفت ہے جو اس کی ذات عالی کے ساتھ قائم ہے۔

یہ اللہ پاک کا بے انتہا کرم اور اس کی عظیم ترین نعمت ہے کہ اس نے اپنے رسول امین کے ذریعہ وہ کلام ہم تک پہونچایا اور ہمیں اس لائق بنایا کہ اس کے پاک کلام کی تلاوت کر سکیں اور اپنی زبان سے اس کو پڑھ سکیں، پھر اس کو سمجھ کر اپنی زندگی کا راہنما بنا سکیں۔

قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طویٰ کی مقدس وادی میں ایک مبارک درخت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا کلام سنوایا تھا، کتنا خوش قسمت تھا وہ بے جان درخت جس کو حق تعالیٰ نے اپنا کلام سنوانے کے لیے بطور آلہ کے استعمال فرمایا تھا۔ جو بندہ اخلاص اور عظمت کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے اس کو اس وقت شجرۂ موسوی والا یہ شرف نصیب ہوتا ہے اور گویا وہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے کلام مقدس کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ انسان اس سے آگے کسی شرف کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اس مختصر تمہید کے بعد قرآن مجید کی عظمت و فضیلت کے بیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجۂ ذیل چند حدیثیں پڑھیے!

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْاٰنُ عَنْ ذِكْرِیْ وَمَسْأَلَتِیْ اَعْطَيْتُهُ اَفْضَلَ مَا اُعْطِى السَّائِلِيْنَ وَفَضْلُ كَلَامِ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلٰى سَائِرِ الْكَلَامِ كَفَضْلِ اللّٰهِ عَلٰى خَلْقِهٖ ـــــ رواہ الترمذی والدارمی والبیہقی فی شعب الایمان

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو قرآن نے مشغول رکھا جس

ذکر سے اور مجھ سے سوال اور دعا کرنے سے، میں اس کو اس سے افضل عطا کروں گا جو سائلوں اور دعا کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں اور دوسرے اور کلاموں کے مقابلہ میں اللہ کے کلام کی ویسی ہی عظمت و فضیلت حاصل ہے جیسی اپنی مخلوق کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کو۔ (جامع ترمذی، سنن دارمی، شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) اس سلسلۂ معارف الحدیث میں پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ جب کسی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے کوئی بات فرمائیں اور وہ بات قرآن مجید میں نہ ہو تو اصطلاح میں ایسی حدیثوں کو "حدیث قدسی" کہتے ہیں ___ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بھی اسی طرح کی ہے ___ اس میں دو باتیں فرمائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کے جس بندہ کو اللہ تعالیٰ کے کلام پاک سے ایسا شغف ہو کہ وہ دن رات اسی میں لگا لپٹا رہتا ہو، یعنی اس کی تلاوت میں، اس کے یاد کرنے میں، اس کے تدبر اور تفکر میں یا اس کے سیکھنے سکھانے میں اخلاص کے ساتھ مشغول رہتا ہو، اور قرآن پاک میں اس ہمہ وقتی مشغولیت کی وجہ سے اس کے علاوہ اللہ کے ذکر، اس کی حمد و تسبیح اور اس سے دعائیں کرنے کا موقع ہی اس کو نہ ملتا ہو، تو وہ نہ سمجھے کہ وہ کچھ خسارے میں رہے گا اور ذکر و دعا کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ جو کچھ عطا فرماتا ہے وہ اس کو نہ پا سکے گا ___ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ ایسے بندوں کو میں اس سے زیادہ اور اس سے بہتر دوں گا جو ذکر کرنے والے اور دعائیں مانگنے والے اپنے بندوں کو دیتا ہوں۔

دوسری بات اس حدیث میں یہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ کے کلام کو دوسرے کلاموں کے مقابلہ میں ویسی ہی عظمت و فضیلت حاصل ہے جیسی کہ خود اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے مقابلہ میں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کی صفت قائم ہے۔

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ اِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّهَا سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ قُلْتُ مَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ كِتَابُ اللّٰهِ فِيْهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ

هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ مَنْ تَرَكَهُ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدَى فِي غَيْرِهِ أَضَلَّهُ اللّٰهُ وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِينُ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيمُ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ هُوَ الَّذِي لَا تَزِيغُ بِهِ الْأَهْوَاءُ وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْأَلْسِنَةُ وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا يَنْقَضِي عَجَائِبُهُ هُوَ الَّذِي لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ إِذْ سَمِعَتْهُ حَتَّى قَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ" مَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ وَمَنْ عَمِلَ بِهِ أُجِرَ وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدَلَ وَمَنْ دَعَا إِلَيْهِ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا۔ آپ نے ایک دن فرمایا، "آگاہ ہو جاؤ ایک بڑا فتنہ آنے والا ہے! میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس فتنہ کے شر سے بچنے اور نجات پانے کا ذریعہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کتاب اللہ، اس میں تم سے پہلی اُمتوں کے (سبق آموز) واقعات ہیں اور تمہارے بعد کی اس میں اطلاعات ہیں۔ (یعنی اعمال و اخلاق کے جو دنیوی و اُخروی نتائج و ثمرات مستقبل میں سامنے آنے والے ہیں قرآن مجید میں اُن سب سے بھی آگاہی دے دی گئی ہے۔) اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں قرآن میں اُن کا حکم اور فیصلہ موجود ہے، (حق و باطل اور صحیح و غلط کے بارے میں وہ قولِ فیصل ہے، وہ فضول بات اور یاوہ گوئی نہیں ہے۔ جو کوئی جابر و سرکش اس کو چھوڑے گا (یعنی غرور و سرکشی کی راہ سے قرآن سے منہ موڑے گا) اللہ تعالیٰ اُس کو توڑ کے رکھ دے گا۔ اور جو کوئی ہدایت کو قرآن کے بغیر تلاش کرے گا اس کے حصے میں اللہ کی طرف سے صرف گمراہی آئے گی۔ یعنی وہ ہدایت حق سے محروم رہے گا۔ قرآن ہی حبل اللہ المتین یعنی اللہ سے تعلق کا مضبوط وسیلہ ہے اور محکم نصیحت نامہ ہے اور وہی صراطِ مستقیم ہے، وہی وہ حق مبین ہے جس کے اتباع سے خیالات کجی سے محفوظ رہتے ہیں اور زبانیں اس کو گڑبڑ نہیں کرسکتیں (یعنی

جس طرح اگلی کتابوں میں زبانوں کی راہ سے تحریف داخل ہو گئی اور محرفین نے کچھ کا کچھ پڑھ کے اس کو محرف کر دیا اس طرح قرآن میں کوئی تحریف نہیں ہو سکے گی، اللہ تعالیٰ نے تاقیامت اس کے محفوظ رہنے کا انتظام فرما دیا ہے) اور علم والے کبھی اس کے علم سے سیر نہیں ہوں گے (یعنی قرآن میں تدبر کا عمل اور اس کے حقائق و معارف کی تلاش کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا اور کبھی ایسا وقت نہیں آئے گا کہ قرآن کا علم حاصل کرنے والے محسوس کریں کہ ہم نے علم قرآن پر کامل عبور حاصل کر لیا اور اب ہمارے حاصل کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا، بلکہ قرآن کے طالبین علم کا حال ہمیشہ یہ رہے گا کہ وہ علم قرآن میں جتنے آگے بڑھتے رہیں گے اتنی ہی ان کی طلب ترقی کرتی رہے گی اور ان کا احساس یہ ہوگا کہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے وہ اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے جو ابھی ہم کو حاصل نہیں ہوا ہے۔) اور وہ قرآن کثرت مزاولت سے کبھی پرانا نہیں ہوگا (یعنی جس طرح دنیا کی دوسری کتابوں کا حال ہے کہ بار بار پڑھنے کے بعد ان کے پڑھنے میں آدمی کو لطف نہیں آتا، قرآن مجید کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے وہ جتنا پڑھا جائے گا اور جتنا اس میں تفکر و تدبر کیا جائے گا اتنا ہی اس کے لطف و لذت میں اضافہ ہوگا) اور اس کے عجائب (یعنی اس کے دقیق و لطیف حقائق و معارف) کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ قرآن کی یہ شان ہے کہ جب جنوں نے اس کو سنا تو بے اختیار بول اٹھے۔

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّهْدِیْ	ہم نے قرآن سنا جو عجیب ہے رہنمائی
اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ۔	کرتا ہے بھلائی کی۔ پس ہم اس پر ایمان لے آئے

جس نے قرآن کے موافق بات کہی اس نے سچی بات کہی اور جس نے قرآن پر عمل کیا وہ مستحق اجر و ثواب ہوا اور جس نے قرآن کے موافق فیصلہ کیا اس نے عدل و انصاف کیا اور جس نے قرآن کی طرف دعوت دی اس نے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کی۔

(جامع ترمذی و سنن دارمی)

(تشریح) یہ حدیث قرآن کریم کی عظمت و فضیلت کے بیان میں بلاشبہ نہایت جامع

حدیث ہے، اس میں جو کلمات اور جو جملے وضاحت طلب تھے ان کی وضاحت ترجمہ ہی میں کر دی گئی ہے۔

عَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ ۔ ——— رواہ البخاری

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! تم میں سب سے بہتر اور افضل وہ بندہ ہے جو قرآن کا علم حاصل کرے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے۔ (صحیح بخاری)

تشریح) قرآن مجید کو کلام اللہ ہونے کی حیثیت سے جب دوسرے کلاموں پر اس طرح کی فوقیت اور فضیلت حاصل ہے جس طرح کی اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر حاصل ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا سیکھنا سکھانا دوسرے تمام اچھے کاموں سے افضل و اشرف ہوگا۔ علاوہ ازیں یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے اہم پیغمبرانہ وظیفہ وحی کے ذریعہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ سے لینا، اس کی حکمت کو سمجھنا اسے دوسروں تک اس کو پہنچانا اور اس کو سکھانا تھا اس لیے اب قیامت تک جو بندہ قرآن مجید کے سیکھنے سکھانے کو اپنا شغل اور وظیفہ بنائے گا وہ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص مشن کا علمبردار اور خادم ہوگا اور اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص الخاص نسبت حاصل ہوگی۔ اس بنا پر قرآن پاک کے متعلق اس کا سب سے افضل و اشرف ہونا ظاہر ہے لیکن یہ فضیلت انہی کی ہے جو قرآن مجید کا سیکھنا سکھانا اخلاص کے ساتھ اللہ کے لیے کریں اگر کسی نے کسی دنیوی غرض کے لیے قرآن کے سیکھنے سکھانے کو اپنا پیشہ بنایا تو حدیث پاک میں ہے کہ وہ ان بدنصیبوں میں سے ہوگا جو سب سے پہلے جہنم میں جھونکے جائیں گے اور اس کا ایندھن بنیں گے۔ العیاذ باللہ۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ لَا حَسَدَ اِلَّا عَلٰى اثْنَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ يَقُوْمُ بِهٖ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا صرف دو آدمی قابلِ رشک ہیں (اور ان پر رشک آنا برحق ہے) ایک وہ جس کو اللہ نے قرآن کی نعمت عطا فرمائی بس وہ دن اور رات کے اوقات میں اس میں لگا رہتا ہے ۔ اور دوسرا وہ خوش نصیب آدمی جس کو اللہ نے مال و دولت سے نوازا اور وہ دن اور رات کے اوقات میں راہِ خدا میں اس کو خرچ کرتا رہتا ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) دن اور رات میں قرآن میں مشغول ہونے اور لگے رہنے کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ اس کے سیکھنے سکھانے میں لگا رہتا ہے، دوسرے یہ کہ نماز میں اور بیرون نماز اس کی تلاوت کرتا رہتا ہے، تیسرے یہ کہ فکر و اہتمام کے ساتھ اس کے احکام و ہدایات پر عمل کرتا رہتا ہے۔ حدیث کے الفاظ "فَهُوَ يَقُوْمُ بِهٖ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ" اس طرح کی سب شکلوں پر حاوی ہیں ـــــ قرآن پاک کی عظیم نعمت کا شکر یہی ہے کہ بندہ اس کو اپنا شغل اور اپنی زندگی کا دستور بنالے۔

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ ۔ رواہ مسلم

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب پاک (قرآن مجید) کی وجہ سے بہت سوں کو اونچا کرے گا اور بہت سوں کو نیچے گرائے گا۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی صفتِ قائمہ اور بندوں کے لیے اس کا فرمان اور عہد نامہ ہے۔ اس کی وفاداری اور تابعداری اللہ تعالیٰ کی وفاداری اور تابعداری ہے۔ اسی طرح اس سے انحراف اور بغاوت اللہ تعالیٰ سے انحراف اور سرکشی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ جو قوم اور جو امت خواہ وہ کسی نسل سے ہو، اس کا کوئی بھی رنگ اور کوئی بھی زبان ہو، قرآن مجید کو اپنا راہنما بنا کر اپنے کو اس کا تابعدار بنائے گی اور اس کے ساتھ وہ تعلق رکھے گی جو کلام اللہ ہونے کی حیثیت سے اس کا حق ہے، اللہ تعالیٰ اس کو دنیا اور آخرت میں سربلند کرے گا۔ اور اس کے برعکس جو قوم اور امت اس سے انحراف اور سرکشی کرے گی وہ اگر بلندیوں کے آسمان پر بھی ہوگی تو نیچے

گزاری جائے گی ——— اسلام اور مسلمانوں کی پوری تاریخ اس حدیث کی صداقت کی گواہ اور اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی آئینہ دار ہے ——

اس حدیث میں "اَقْوَاماً" کے لفظ سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ عروج و زوال کے اس الٰہی قانون کا تعلق افراد سے نہیں بلکہ قوموں اور اُمتوں سے ہے۔ واللہ اعلم

عَنْ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ حَرْفاً مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ فَلَہٗ بِہٖ حَسَنَۃٌ وَالْحَسَنَۃُ بِعَشْرِ اَمْثَالِھَا لَا اَقُوْلُ "الٓمّٓ" حَرْفٌ، اَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِیْمٌ حَرْفٌ ——— رواہ الترمذی

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے قرآن پاک کا ایک حرف پڑھا اس نے ایک نیکی کمائی اور یہ ایک نیکی اللہ تعالیٰ کے قانون کرم کے مطابق دس نیکیوں کے برابر ہے (مزید وضاحت کے لیے آپ نے فرمایا) میں یہ نہیں کہتا (یعنی میرا مطلب یہ نہیں ہے) کہ "الٓمّٓ" ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے (اس طرح "الٓمّٓ" پڑھنے والا بندہ تیس نیکیوں کے برابر ثواب حاصل کرنے کا مستحق ہوگا)۔

(جامع ترمذی، سنن دارمی)

تشریح) اللہ تعالیٰ کا یہ کریمانہ قانون کہ ایک نیکی کرنے والے کو دس نیکیوں کے برابر ثواب عطا ہوگا، واضح طور پر قرآن مجید میں بھی بیان فرمایا گیا ہے۔ سورۂ انعام میں ارشاد ہے۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشْرُ اَمْثَالِھَا۔ (الانعام۔ ع ۲۰)　　جو بندہ ایک نیکی لے کر آئے گا اس کو اس جیسی دس نیکیوں کا ثواب دیا جائے گا۔

مندرجہ بالا حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو یہ خوشخبری سنائی ہے کہ جو بندہ اخلاص کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرے گا تو حروف تہجی کے ہر حرف کی تلاوت ایک نیکی شمار ہوگی جو اجر و ثواب کے لحاظ سے دس نیکیوں کے برابر ہوگی ——— اسی حدیث کی بیہقی کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نہیں کہتا کہ بسم اللہ ایک حرف ہے، بلکہ ب ایک حرف ہے،

(باقی صفحہ (۳۶) پر)

حضرت شاہ عبد الرحیم فاروقی دہلوی رح

حالات ، ملفوظات ، مکتوبات

از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

حضرت شاہ عبد الرحیم فاروقی دہلویؒ کی بابرکت شخصیت سے اور ان کی ذات گرامی سے کون اہل علم اور اہل دل واقف نہیں ؟ جنھوں نے تقریباً ساٹھ سال دہلی میں رہ کر تشنگان علم دین اور طالبان معرفت کو اسرار شریعت اور رموز طریقت کے اسباق پڑھائے ہیں۔ حقائق و معارف کے دُر ہائے نایاب تقسیم کیے ہیں، اپنے ذاتی صلاح و تقوی کی بلندی کے ساتھ اصلاح و ارشاد، تزکیۂ قلب اور تلقین حکمت میں اپنے اوقات بسر کیے ہیں۔ جنھوں نے اتباع شریعت اور متابعت سنت کا پورا پورا التزام کرتے ہوئے خالص درویشانہ اور متوکلانہ انداز میں اپنی پوری عمر گزاری ہے۔ جنھوں نے خانقاہ اور مدرسہ کے معتدلانہ امتزاج سے علمی و روحانی محفلوں کو ایک بدلی تازہ اور حیات خوش آئند بخشی ہے ۔ جن کے نفس گرم کی تاثیر سے بہت سے اعلیٰ کردار انسان نمودار ہوئے جنھوں نے اسلام اور انسانیت کو فائدہ پہونچایا ۔ جن کے فیوض و برکات کی ایک عظیم الشان یادگار ان کے صاحبزادے حجۃ اللہ فی الارض حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہیں۔ جنھوں نے اسلامی علوم و فنون، اور ایمانی و احسانی حقائق کی اشاعت کو اپنا نصب العین قرار دیا، جنھوں نے اپنی تصانیف اور اپنے تلامذہ و رفقاء کے ذریعے فلاح دارین اور کیف دوام کے سامان مہیا کر دیئے، جن کے تعلیمی و روحانی کارنامے آج بھی عالم گیر اور ہمہ گیر ہیں اور انشاء اللہ تعالیٰ ان کے حکمت مآب نظریات کی آفاقیت تا قیام قیامت روشن و

برقرار رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ذہن و فکر کا اندازہ اس وقت تک پوری طرح نہیں ہو سکتا جب تک ان کے ماحول، خاندان خصوصاً ان کے والد ماجد کی سیرت ساز شخصیت سے اچھی طرح واقفیت نہ ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تقریباً ۹۰ صفحات کا ایک رسالہ اپنے والد ماجد کے حالات میں لکھا ہے جس کا نام بوارق الولایۃ ہے اور جو انفاس العارفین میں مندرج ہے۔ اس رسالہ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے والد ماجد کے حالات و ملفوظات اس انداز سے لکھے ہیں کہ اگر حضرت شاہ عبد الرحیمؒ اپنی خود نوشت سوانح عمری لکھتے تو شاید اس سے زیادہ جامع اور پر کیف نہ ہوتی ــــ میں چاہتا ہوں کہ اس رسالے کا خلاصہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے اس کے ساتھ ساتھ انفاس رحیمیہ اور ارشاد رحیمیہ سے بھی کچھ اقتباسات لے کر حضرت شاہ عبد الرحیم فاروقی دہلویؒ کے حالات و کلمات طیبات کا ایک مجموعہ اور مرقع پیش کرنے کی سعادت حاصل کر دوں ــــ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمام ناظرین کو بزرگوں کے حالات و اقوال سے مستفیض فرمائے (آمین) کیا عجب ہے ان اکابر دین کی برکت سے عشق الٰہی، شوق اتباع سنت اور ذوق طلب آخرت کا کوئی ذرہ ہمارے قلوب میں بھی پیدا ہو جائے ــــ

حضرت شاہ عبد الرحیمؒ کے والد ماجد

آپ کے والد ماجد حضرت شیخ وجیہ الدین فاروقی شہیدؒ ہیں ــــ جو کمال تقویٰ و شجاعت سے موصوف اور سپاہیانہ انداز میں رہنے والے درویش صفت انسان تھے ــ مالی اور اقتصادی حیثیت سے ایک متوسط قسم کے وضع شخص تھے ــــ درباری امراء کی رفاقت اور لشکر شاہی کی ملازمت میں اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارا مگر جذبۂ دینداری ان کے ہر عمل و کردار سے ظاہر ہوتا تھا ــ ہر رات قرآن مجید کے دو سپارے تلاوت کرنا ان کا ایسا معمول تھا کہ سفر و حضر میں اور کسی حال میں ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ جب قوت بصر ضعیف ہو گئی تو جلی قلم سے لکھا ہوا قرآن حاصل کر لیا جو سفر میں بھی ساتھ رہتا تھا۔ سفر میں اپنے گھوڑے کو کھیتوں سے ہٹا کر چلاتے تھے اس خوف سے کہ کہیں گھوڑا کسی کی کھیتی میں منہ نہ ڈال دے اور اسے پامال نہ کر دے ــــ حضرت شاہ عبد الرحیمؒ بیان فرمایا کرتے تھے کہ

میرے والد ماجد اپنے خادموں، ملازموں اور گھاس بیچنے والوں تک سے ایثار ہی اور انصاف کا معاملہ کرتے تھے کہ متقیانِ زمانہ میں وہ کم پایا جاتا ہے ۔۔۔ اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ وہ راہِ سلوک میں بھی گامزن ہو گئے تھے اور اُن کے حالات میں بہت بلندی آگئی تھی ۔۔ شیخ وجیہ الدین شہیدؒ کی شجاعت و جرأت کے بہت سے عجیب و غریب واقعات انفاس العارفین میں لکھے ہوئے ہیں ۔۔۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنے والد ماجد کی زبانی اپنے دادا کی شہادت کا واقعہ بھی تفصیل سے لکھا ہے ۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شہادت سے کچھ دنوں پہلے حضرت شہیدؒ ایک رات تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے ۔ اس نماز میں سجدہ اتنا طویل کیا کہ شاہ عبدالرحیمؒ کو یہ گمان ہوا کہ شاید ان کی رُوح پرواز کر گئی ہے ۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو استفسار کرنے پر فرمایا کہ مجھ پر ایک بیہوشی طاری ہوئی جس میں شہیدوں کے حالات پر مجھے مطلع کیا گیا ان کے درجات و مثوبات سے مجھے اس قدر مرغوب ہوئے کہ میں نے حضرت حق سے الحاح و زاری کے ساتھ اپنی شہادت کی درخواست کی تا آنکہ اس دُعا کی اجابت و قبولیت میرے اوپر منکشف ہو گئی اور بجانب دکن اشارہ ہوا کہ جائے شہادت وہاں ہے ، باوجودیکہ فوجی ملازمت ترک کر چکے تھے مگر اس واقعے کے بعد انھوں نے از سرِ نو اسبابِ سفر فراہم کیا ۔ گھوڑا خریدا اور دکن کی طرف متوجہ ہو گئے ۔۔۔ گمان یہ تھا کہ اُس وقت کے ایک مشہور غیر مسلم باغی سردار سے مقابلہ ہو گا لیکن ایسا نہیں ہوا ۔۔۔ جب بُرہان پور پہونچے تو ان پر منکشف ہوا کہ موضع شہادت کو پیچھے چھوڑ آئے ہو ، بُرہان پور سے رجوع کیا ، اثنارِ راہ میں تاجروں کے ایک مختصر سے قافلے سے ملاقات ہوئی جو صفتِ صلاح و تقویٰ سے متصف تھے ، ان کے قافلے میں شریک ہو گئے اور قصبۂ ہنڈیا سے دہلی ۔۔۔ واپس جانے کا ارادہ تھا کہ ایک بڑھا غیر مسلم سامنے آیا جو اُفتاں و خیزاں چل رہا تھا آپ کو اس کے حال پر رحم آیا ، دریافت فرمایا کہاں کا قصد ہے اس نے کہا میں دہلی جا رہا ہوں ، فرمایا اچھا روزانہ کچھ دام اپنے خرچ کے لیے ہمارے آدمیوں سے لے لیا کرنا ۔ در حقیقت وہ بڈھا ڈاکوؤں کا جاسوس تھا ۔ جب سرائے نورنگا میں پہونچے تو اُس جاسوس نے اپنے ساتھیوں کو خبر کر دی ۔ ڈاکوؤں کا ایک بڑا گروہ سرائے میں داخل ہوا ۔ حضرت شیخ وجیہ الدین اس وقت تلاوتِ کلام مجید میں مشغول تھے ۔ ڈاکوؤں میں سے دو ایک نے آگے بڑھ کر دریافت کیا کہ وجیہ الدین کون ہے

جب معلوم ہوگیا کہ یہی ہیں تو انھوں نے کہا کہ ہمیں تم سے کچھ نہیں کہنا ہم جانتے ہیں کہ تمھارے پاس کچھ مال نہیں ہے اور تم نے ہمارے ایک آدمی کے ساتھ سلوک بھی کیا ہے — لیکن یہ تاجر فلاں فلاں قیمتی سامان اپنے ہمراہ رکھتے ہیں ہم ان کو لوٹیں گے — حضرت شہیدؒ نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ جیتے جی اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ساتھیوں کو لٹتا اور غارت ہوتا دیکھیں خود پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ ان سے لڑنے پر آمادہ ہوئے اور شجاعت کے جوہر دکھائے۔ مگر اتنی کثیر جماعت کے مقابلے میں کیا کر سکتے تھے بالآخر شہید ہوئے اور اسی سرزمین میں دفن ہوئے — حضرت شاہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ ان کے والد ماجد شہادت کے بعد اسی دن شام کو دہلی میں ان کے سامنے متمثل ہوئے تھے — اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میرا ارادہ تھا کہ ان کے جسد کو دہلی میں منتقل کردوں لیکن انھوں نے متمثل ہوکر منع فرمادیا —

حضرت شاہ عبدالرحیم کی ننھیال

شیخ رفیع الدین محمد ابن شیخ قطب العالم ابن حضرت شیخ عبدالعزیز شکربار دہلویؒ آپ کے نانا تھے — شیخ رفیع الدین محمد کے والد ماجد شیخ قطب العالم کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے آغاز سلوک میں مدتوں ان کی خانقاہ میں قیام کرکے ان سے تعلیم حاصل کی ہے — اسی زمانے میں حضرت شیخ قطب العالمؒ پر ایک رات یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ نصیب خواجہ بخارا میں ہے — اسی وقت آپ نے حضرت خواجہ سے فرمادیا تھا کہ تم کو مشائخ بخارا طلب کر رہے ہیں چنانچہ وہ بخارا روانہ ہوگئے اور وہاں حضرت خواجہ امکنگیؒ سے سب کچھ حاصل کیا — جب حضرت خواجہؒ واپس آگئے تو خود شیخ قطب العالمؒ نے حضرت خواجہ سے روحانی فیض حاصل کیا — شیخ قطب العالمؒ کے صاحبزادوں میں سب سے بڑے صاحبزادے شیخ رفیع الدین محمدؒ تھے۔ انھوں نے طریقۂ چشتیہ قادریہ اپنے والد ماجد سے اخذ کیا تھا اور شیخ نجم الحقؒ کی صحبت سے بھی مستفیض ہوئے تھے — بعدہ اپنے والد بزرگوار کی ترغیب و تاکید سے حضرت باقی باللہؒ کی صحبت میں باالتزام پہنچنے لگے — حضرت خواجہ کو شیخ رفیع الدین محمد کی جانب بہت التفات تھا۔ شیخ رفیع الدین محمد جب حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے [illegible] شرف قبولیت بخشا جاتا تھا [illegible] حضرت خواجہ [illegible]

شیخ رفیع الدین محمد کا عقد نکاح

شیخ رفیع الدین محمدؒ کا دوسرا نکاح جب شیخ محمد عارف ابن شیخ عبد الغفور اعظم پوریؒ (خلیفۂ قطب عالم حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ) کی صاحبزادی سے ہونا قرار پایا تو مجلس نکاح میں شرکت کے لئے شیخ رفیع الدین محمدؒ نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہؒ سے عرض کیا۔ حضرت خواجہ نے اپنے ضعف کا عذر فرمایا اس پر شیخؒ نے عرض کیا کہ اگر حضرت والا تشریف نہیں لے جائیں گے تو میں بھی نہیں جاؤں گا ـــــ مجبوراً حضرت خواجہؒ اعظم پور بارٹہ (ضلع بجنور) نزد پھرایوں تشریف لے گئے۔ انفاس العارفین میں لکھا ہے کہ اس طرف کے صوفیائے کرام نے جب حضرت خواجہؒ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو جوق جوق استقبال کے لئے آئے۔ تقریباً تو کوس سے اہل اللہ، حضرت خواجہؒ کی ملاقات کے اشتیاق میں کھنچ کھنچ کر اعظم پور بارٹہ پہونچ گئے تھے ـــــ اس طرح ایک چھوٹے سے قصبے میں ایک عجیب روحانی مجلس منعقد ہوئی ـــــ حضرت شاہ ولی اللہ اس واقعے کو نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد کی والدہ ماجدہ (جوکہ شیخ رفیع الدین محمدؒ کی صاحبزادی تھیں) انھیں اعظم پور کے شیخ محمد عارفؒ کی نواسی تھیں ـــــ

حضرت شاہ عبد الرحیم کے ابتدائی حالات اور تعلیم

حضرت شاہ عبد الرحیم تقریباً ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ جب ہوش سنبھالا تو تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔ بچپن ہی سے آثار رشد و صلاحیت آپ کے اطوار سے نمایاں تھے خود بیان فرمایا کرتے تھے کہ میرے ماموں شیخ عبد الحئیؒ ایک اونچے درجے کے درویش مزاج نیک الذہن اور متقی بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے لڑکوں کی تربیت میں بہت کوشش کی مگر وہ متاثر نہیں ہوتے تھے اس بات سے ـــــ ان کو بہت غم تھا۔ میرے بچپن کے زمانے میں ایک دن ماموں صاحب نے مجھے دیکھا کہ میں دستار زانو پر رکھے ہوئے دھیان کے ساتھ قاعدے کے مطابق مسنون طریقہ پر وضو کر رہا ہوں تو بہت خوش ہوئے اور خدا کا شکر ادا کیا اور یوں فرمایا کہ میں اپنی اولاد کے اندر تربیت کا اثر نہ ہونے کی وجہ سے فکر مند تھا کہ کہیں ہمارے اسلاف کی نسبت منقطع نہ ہو جائے ـــــ اب معلوم ہوا کہ ہمارے خاندان میں اسلاف کی نسبت خصوصیت کا حامل موجود ہے ـــــ اگر اولاد [illegible] [illegible] کیا غم ہے اولاد دوسری [illegible]

انفاس العارفین میں ہے کہ آپ نے خود فرمایا کہ میں نے عربی کے ابتدائی رسائل سے لے کر شرح عقائد اور حاشیۂ خیالی تک اپنے بھائی شیخ ابو الرضا محمدؒ سے پڑھے اور چند دیگر کتب میرزاہد ہرویؒ سے پڑھی ہیں۔

حضرت خواجہ خردؒ سے تلمذ

حضرت خواجہ خردؒ سے بھی تھوڑی سی تعلیم حاصل کی ہے اس کا واقعہ اس طرح بیان فرمایا کہ جب میں اپنے بھائی سے شرح عقائد اور حاشیۂ خیالی پڑھ رہا تھا تو میں نے ایک مقام پر ایک اعتراض کیا بھائی نے اس کا جواب دیا اس کے بعد پھر سوال وجواب ہوتا رہا اور ایک مناظرے کی سی شکل پیدا ہو گئی جس سے طرفین میں کچھ رنجش سی پیدا ہو گئی میں نے اس کتاب کا پڑھنا موقوف کر دیا۔ اتفاقاً ہم دونوں بھائی حضرت خواجہ خردؒ کی خدمت میں گئے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ خیالی کہاں تک ہو گئی میں نے کہا کہ دو ہفتے سے میں نے اس کا پڑھنا تو موقوف کر دیا ہے، فرمایا کیوں؟ میں نے عرض کیا کہ احکام نماز و روزے سے تو آگاہی ہو گئی ہے اب اس سے زیادہ تعلیم میسر نہیں ہے اس بات پر اور زیادہ اہتمام سے وجہ دریافت کی آخر کار اصل وجہ معلوم ہو گئی فرمایا اچھا ہمارے پاس پڑھو اور اس بات کو بڑی تاکید سے فرمایا۔ میں صبح کو کتاب آپ کے پاس لے گیا آپ نے درس دیا جب میں نے وہ اعتراض آپ کے سامنے پیش کیا تو آپ نے اس کو بہت پسند فرمایا اور قوت اعتراض کا اظہار اور اعتراف کیا۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی درس دیا چوتھے دن فرمایا کہ تمہارے نانا شیخ رفیع الدین محمدؒ نے مجھ کو بھی تین دن ہی تک پڑھایا ہے میں بھی تم کو تین دن سے زیادہ درس نہیں دوں گا پھر حضرت خواجہ خردؒ نے اپنے تین دن کے اسباق کا عجیب واقعہ سنایا (جو انفاس العارفین میں درج ہے) اور ساتھ ہی ساتھ حضرت خواجہ خردؒ نے شیخ رفیع الدین محمدؒ کی یہ کرامت بھی بیان فرمائی کہ تین دن درس دینے کے بعد حضرت شیخؒ نے فرمایا کہ اگر تمہیں فن تصوف کی تحقیق مقصود ہے تو پھر سے کچھ میں تمہارے مکان پر آ کر پڑھا دیا کروں گا مجھے یہ گوارا نہیں کہ تم یہاں آنے کی زحمت اٹھاؤ۔ میں نے عرض کی کہ میرا یہاں آنا حضرت ضروری نہیں کرتا اور حضرت کی تکلیف بھی منظور نہیں ہے تو ایسی معلوم ہوا کہ آپ سے تعلیم حاصل کرنے کا مقصد ختم ہوا۔ [illegible] خوش ہو کر فرمایا کہ ایک صورت اور بھی ہے اس کے بعد [illegible]

میں تشریف لائے اور ایک جگہ متعین کی اور فرمایا تصوف کی کوئی سی بھی مشکل کتاب ہو تم کو یہاں بیٹھ کر اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے ۔ اگر کتاب حل نہ ہو تو میرا ذمہ ہے ۔ اس کے بعد کسی کتاب میں کوئی مشکل پیش آتی تھی میں اس جگہ بیٹھ کر مطالعہ کرتا تھا مشکل حل ہو جاتی تھی ۔ اگر ایک بالشت بھی اس جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ بیٹھتا تھا تو وہ دوسرے مواضع کی حیثیت رکھتی تھی ۔ جب حضرت خواجہ خوردؒ نے یہاں تک بیان فرمایا تو حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نے عرض کیا کہ وہ تین سبق تو اس کرامت کے ساتھ مقید تھے اگر آپ بھی کوئی تصرف فرمادیں تو بہت اچھا ہو ۔ فرمایا کہ میں تمھارے متعلق یہ کہتا ہوں کہ اب اگر آئندہ تمھیں کسی کتاب کے مطالعے میں مشکل پیش آجائے تو تم میرے بارے میں یہ کہنا کہ فلاں نابکار نے میری راہ لوٹ لی ۔ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ فرمایا کرتے تھے کہ بحمداللہ اس کے بعد مجھے مطالعہ میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی اگرچہ میں نے تکمیل میرزاہد کے پاس کی مگر وہاں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا حاصل کی ہوئی چیز کو حاصل کر رہا ہوں ۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ ایک کتاب کا اول حصہ ابھی پڑھ رہا ہوں اور اس کے آخری حصے کو پڑھا دیتا تھا ۔

مرزا محمد زاہد سے تلمذ آپ نے مرزا زاہد ہرویؒ سے معقولات اور علم کلام کی کتابیں پڑھیں جس زمانے میں حضرت شاہ اورنگ زیب عالمگیر آگرے میں تھے مرزا محمد زاہد ہروی محتسب لشکر کی حیثیت سے وہیں رہتے تھے آپ بھی اپنے والد ماجد شیخ وجیہہ الدین شہیدؒ کے ہمراہ ۔ آگرہ چلے گئے تھے ۔

اس زمانۂ تعلیم کے بہت سے واقعات انفاس العارفین میں مختلف مقامات پر لکھے ہوئے ہیں ۔ انفاس العارفین میں حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی زبانی ایک جگہ لکھا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ شرح مواقف اور تمام کتب کلامیہ واصولیہ میں نے مرزا زاہد ہروی سے پڑھی ہیں وہ میری جانب بہت توجہ فرماتے تھے ۔ اگر کسی دن میں نے یہ کہہ کر کہ آج میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے سبق ناغہ کرنا چاہا تو فرماتے تھے میاں سبق ناغہ نہیں ہونا چاہیئے ایک دو سطر ہی پڑھ لو ۔

مرزا محمد زاہد کا تقویٰ ایک دلچسپ واقعہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نے فرمایا کہ مرزا محمد زاہد نے ماہ رمضان میں ایک دن میری دعوت کی ۔ میں ان کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا جب مغرب کا وقت ہوا تو ایک کباب فروش آیا اور کبابوں سے بھرا ہوا

ایک خوان ان کے سامنے لاکر رکھدیا اور کہا کہ میں یہ کباب بطور نذرانہ لایا ہوں مرزا زاہد نے تبسم فرمایا اور کہا کہ اے شخص نہ میں تیرا پیر ہوں اور نہ استاد ہوں پھر نذرانہ کس بات کا ہے؟ تیری کوئی نہ کوئی غرض ہے، اپنی غرض بیان کر اس نے کہا میں کوئی غرض نہیں رکھتا مرزا زاہد ہروی نے بہت تاکید سے کباب لانے کی وجہ دریافت کی بالآخر معلوم ہوا کہ اس کی دوکان راستہ پر ہے مرزا ہروی کے سپاہیوں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ اُس کی دوکان یہاں سے ہٹا دیں ــــ یہ سُن کر آپ نے فرمایا کہ اچھی بات ہے ہم کل کو ایک شخص بھیجیں گے تاکہ وہ انصاف کرے۔ پھر فرمایا کہ اب جاؤ (اور کباب بھی لے جاؤ) کباب فروش نے کہا کہ یہ کباب تو میں نے آپ کے لئے بنائے ہیں اب تو میں ان کو بیچ بھی نہیں سکتا ہوں اس لئے کہ اس وقت اسقدر کباب کوئی بھی نہیں خریدے گا آپ نے اپنے لڑکوں کے معلم کو آواز دے کر بلایا اور فرمایا کہ ان کبابوں کی قیمت کا اندازہ کر دو اور ہمارے گھر سے دام ادا کر دو۔ معلم نے آٹھ آنے قیمت تجویز کی۔

شاہ عبد الرحیمؒ صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے استاد سے آہستہ سے کہا کہ جناب عالی آپ کی غرض تو یہ ہے کہ رشوت سے اجتناب ہو مگر آپ کا مقصد کسی طرح پورا نہیں ہو رہا ہے اس لئے کہ ان کبابوں کی قیمت تو مجوزہ قیمت سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے یہ شخص صرف آٹھ آنے لینے پر اس لئے راضی ہو گیا کہ اس کی ایک غرض وابستہ ہے۔ مرزا زاہد کو تنبہ ہوا اور کباب فروش کو اپنے پاس بلا کر دریافت فرمایا کہ سچ سچ بتا گوشت، مصالحہ اور ایندھن کس قیمت کے تھے اور تیری اجرت کتنی ہوئی ــــ جب حساب ہوا تو کبابوں کی قیمت ساڑھے تین روپے بیٹھی۔ یہی رقم اس کو دی گئی اس کے بعد مرزا زاہد نے معلم کو بلا کر ڈانٹا اور فرمایا کہ تم یہ چاہتے تھے کہ میں روزے کو حرام طریقے سے حاصل کئے ہوئے کھانے سے افطار کروں؟ ــــ یہ کون سی عقلمندی اور کہاں کی ہمدردی تھی؟ بعدہٗ وہ کباب تناول فرمائے ــــ

مرزا زاہد کا مختصر حال حضرت شاہ ولی اللہ کے قلم سے

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے انفاس العارفین میں مرزا زاہد کا مختصر حال اس طرح قلمبند فرمایا ہے۔

مرزا محمد زاہدؒ ہروی قاضی اسلم کے فرزند تھے۔

ـــــــــــــــ

عہ مرزا محمد زاہد صاحب حواشی مشہور ہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو ونما پائی اپنے والد قاضی اسلم اور دیگر فضلائے وقت سے تحصیل علم کی۔ شاہجہاں کے زمانے میں تحریر وقائع کابل کی خدمت پر مامور ہوئے

[باقی اگلے صفحہ پر]

قاضی اسلم جہانگیر کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے جہانگیر نے ان کو قاضی القضاۃ کا عہدہ دیا تھا۔

مرزا محمد زاہد ملا محمد فاضل بدخشانی کے شاگرد تھے۔ ابتدائے جوانی میں کابل پہونچ کر ملا صادق حلوائی سے بھی تلمذ کیا تھا۔ بعد ازاں طوران جا کر مرزا محمد جان شیرازی کے فیض صحبت سے مستفیض ہوئے اور فنون حکمت کو بڑی وسعت سے حاصل کیا جو مرزا محمد جان کے ارشد تلامذہ میں سے اور مشہور زمانہ اساتذہ میں سے تھے۔ پھر لاہور وارد ہوئے اور تفسیر و اصول کو ملا جمال لاہوری سے پڑھا جو کہ عربیت میں یگانۂ روزگار تھے۔ آخر میں وہ حاوی علوم عقلیہ و نقلیہ ہو گئے۔ آپ نے تیرہ سال کی عمر میں تمام علوم سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ جودت ذہن اور استقامت فہم میں اپنے زمانے کے اندر بے نظیر تھے۔ آپ کی تصانیف میں حسب ذیل کتابیں مشہور اور طالبان علم کے درمیان رائج ہیں۔

حاشیۂ شرح مواقف، حاشیہ شرح تہذیب، حاشیۂ تصور و تصدیق، ان کے علاوہ بھی اور تصانیف ہیں۔

غالباً حاشیہ شرح مواقف کا مسودہ میرے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے پڑھنے کے زمانے میں تھا اور اس کا مبیضہ کابل میں کیا گیا ہے۔ مرزا زاہد نے جب منصب احتساب سے استعفاء دیا تو کابل چلے گئے اور وہیں گوشۂ عزلت اختیار کر لیا۔ مرزا محمد زاہد صوفیاء کے مشرب صافی سے بھی بہرۂ تام رکھتے تھے اور اکابر طریقت میں کسی ایک بزرگ کے صحبت یافتہ بھی تھے۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اور عہد عالمگیری میں احتساب عسکر سلطانی عہدۂ صدارت کابل سے ممتاز ہوئے اور کابل ہی میں ۱۱۰۱ھ میں وفات فرمائی۔

(ماخوذ از مہر جہانتاب قلمی مؤلفہ حکیم سید فخر الدین حسنی رائے بریلویؒ)

عہ۔ حضرت خواجہ کوہی مجو سرخیل مشائخ خراسان تھے آپ کے مورث اعلیٰ تھے۔ ہرات میں پیدا ہوئے اور وہاں کے اکابر علماء سے علم حاصل کیا بعد تکمیل آگرہ آئے اور قضائے کابل سے ممتاز ہوئے، پھر ان کو قضائے عسکر سلطانی پر مامور کیا گیا۔ جہانگیر کے بعد شاہجہان نے ان کو اسی عہدے پر فائز رکھا۔ ۱۰۴۰ھ میں مستعفی ہو کر آگرہ چلے گئے وہیں رحلت فرمائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ (ماخوذ از مہر جہانتاب)

تجدید مذہب کی صحیح صورت کیا ہو سکتی ہے؟

وشو ہندو دھرم سمیلن پر ایک لمحۂ فکریہ

(از ——— صوفی نذیر احمد کاشمیری)

ابھی ابھی "وشو ہندو دھرم سمیلن" کا پہلا اجلاس ختم ہوا ہے۔ اس میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن جیسے فلسفی اور مفکر سے لے کر کم از کم تین مٹھوں کے شنکر اچاریوں نے شرکت کی اور اپنی اپنی صلاحیتوں تک سب نے حصہ لیا ہے۔ تجدید مذہب کی یہ کوشش ہندو مہا سبھا کے زیر اہتمام ہوئی ہے۔ کاش ہندو مہا سبھا سیاست سے کافی فاصلے پر رہ کر اس کوشش کو اپنا زمین و آسمان بنالے۔ جو لوگ سیاست سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں وہ جن سنگھ وغیرہ جماعتوں میں شریک ہو جائیں۔

مذہب انسانی کی حقیقت کیا ہے

انسانی مذہب انسان کی اس مخصوص اخلاقی و روحانی فطرت کا اجتماعی اظہار ہے جو اسے باقی انواع مخلوقات سے امتیاز دے کر ایک معین نوع بنا دیتی ہے۔ مگر یہ فطرت ہر فرد انسانی میں پیدائشی طور پر موجود رہتی ہے گر بالکل ایک بیج کی طرح ہوتی ہے، کمزور حالت میں ہوتی ہے۔ نہایت ابتدائی حالت میں ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسان میں حیوانی جبلت بھی ہوتی ہے جو بڑی قوت کی حالت میں ہوتی ہے۔ مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنی اخلاقی و روحانی مخصوص فطرت کی تربیت کے لئے اتنا قوی کر دے کہ انسان اپنے کاروبار کو حیوانی جبلت کے بجائے وہ خلقی و اخلاقی شعور و رجحانات کے ماتحت چلا سکے۔ مذہب کے ساتھ جہاد و عدم جہاد اور کام [illegible] کی جو حقیقت ہے یہ سب چیزیں حیوانی جبلت کے فری

مطالبات پر پابندیاں ہیں اور اخلاقی و روحانی شعور و احساس کو قومی و ہمہ گیر کرنے کے ذرائع ہیں۔ پھر یہ سارا سلسلہ رضا کارانہ ہے جبری نہیں ہے۔ جبر سے اخلاقی و روحانی فطرت کی تربیت و تکمیل کا امکان نہیں ہے۔ پھر اس مخصوص اخلاقی و روحانی فطرت کا انسان کے علاوہ باقی انواع مخلوقات میں کوئی نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ آپ ذہین سے ذہین کسی حیوان کے سو پچاس بچوں کو جمع کر لیں اور پورے دس برس تک انھیں اخلاقیات و روحانیات پر لکچر دیتے رہیے۔ پابندیاں بھی عائد کرتے جائیں۔ وہ دس برس گزر جانے پر بھی ان اخلاقیات و روحانیات اور زندگی کے حال و مستقبل پر ان کے اثرات کو سمجھنے سے یکسر قاصر ہوں گے۔ لیکن آپ یہی عمل سو پچاس انسانی بچوں پر کریں تو آپ تھوڑے ہی عرصہ میں انھیں فرشتوں کے مشابہ پائیں گے۔ یہی چیز شرافت نوع انسانی کی بنیاد ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اس لیے کہ وہ اخلاقی و روحانی فطرت لے کر پیدا ہوا ہے جبکہ یہ فطرت باقی انواع مخلوقات میں نادر ہے۔ موجودہ دور کی دہریت اباحیت اور لا دینیت اس فطرت انسانی کو ختم کر کے انسانی بستی کو پھر سے حیوانیت میں شامل کر دینے کی کوشش میں عالمگیر طور پر مصروف ہے اور دہریت کی انتہا پسند صورت کا نام کمیونزم ہے۔ وہ پوری قوت سے نوع انسانی کے مذہبی ادارے کو ختم کر دینے کے درپے ہے۔ اس کے تین مرکزوں (پیکنگ، ماسکو، بلگریڈ) کو ہندوستان کے لیے خاص کر اور آزاد مشرق کے لیے بالعموم مکہ و مدینہ اور کاشی و متھرا بنانے کی گزشتہ پندرہ بیس برسوں سے کوشش ہو رہی ہے۔ دہریت کی اعتدال پسند صورت وہ ہے جسے سیکولر جمہوریت کہا جاتا ہے وہ مذہب پر کھلا حملہ کر کے خطرہ مول نہیں لیتی، البتہ عملی کاروبار کے ہر شعبے سے مذہب کو بے دخل کرنے کے درپے رہتی ہے۔

ایک توضیح طلب سوال

اگر انسانی کاروبار کا محرک MOTIVE اخلاقی و روحانی شعور و احساس نہ رہے تو ظاہر ہے کہ پھر یہ محرک حیوانی جبلت ANIMAL INSTINCT ہی ہوگی اور جب یہ جبلت ہی محرک ہی تو پھر عمل کی سطح پر صلح کے بجائے فساد، امن کے بجائے جنگ، تعاون کی بجائے تقابل، محبت کے بجائے نفرت، صبر و ضبط کے بجائے بے صبری و جلد بازی، سچ کے بجائے جھوٹ، اخلاص کے بجائے خود غرضی، عدل کے بجائے ظلم کا کاروبار انسانی پر چھا جانا ایک یقینی امر ہوگا۔ یہ ہے فساد انسانی کی اصلی بنیاد اور مذہب نے اس فساد کے خلاف جنگ

جاری رکھی ہے۔ اگر اس مسلسل کوشش کے باوجود نوعِ انسانی میں فساد جاری رہا ہے تو اس کا سبب مذہب نہیں جیسا کہ مذہب دشمن طبقوں نے ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اس کا سبب لامذہبیت رہی ہے۔ چاہے ظاہر میں اس نے مذہب ہی کی شکل کیوں نہ اختیار کرلی ہو۔ اگر تعصب و خودغرضی نے کسی کو اندھا نہ کر دیا ہو تو اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔

مظاہر مذہب میں اختلاف کیوں رہا ہے

(الف) مذہب کی حقیقت کے متعلق اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کے پیش نظر اسے سارے عالمِ انسانی کے لیے ایک ہونا چاہیے نہ کہ جتنے آدمی یا جتنے کنبے اور قومیں اور ملک ہوں اُن کا اپنا جدا جدا مذہب ہو، درحقیقت یہی ایک مشکل ہے جسے موجودہ دور کی مذہبی دنیا کو حل کرنا ہے جس کے بعد صدیوں کے لیے عالمگیر امنِ انسانی کا دور دورہ ہوگا۔ بدھ ازم، عیسائیت اور اب ہندو ازم نے بھی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک غیر شعوری انداز پر عالمگیر امن بحال کرنے کے لیے اپنا اپنا حصہ ادا کرنا شروع کر دیا ہے۔ خدا کرے ان سب تحریکوں کا رُخ اصل خطرے کو دور کرنے کی طرف رہے۔ لامذہبیت کے مقابل ان کا رُخ بالکل صاف صاف دوست و دشمن کا سا رہے۔ اور آپس میں ان کا انداز باہمی خیر اندیشی و صدق و اخلاص اور افہام و تفہیم کا رہے۔ اتحادِ انسانی مذہب کا ابدی نصب العین رہا ہے۔ یہ اپنی اصل میں اخلاقی و روحانی نوعیت کا اتحاد ہے۔ اور ثانوی حیثیت سے اسے مادی اتحاد بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اخلاقی بنیادوں کا انکار کر کے اتحاد کے دعوے کرتے ہیں وہ محض خود فریب ہیں یا اپنے اغراض کے لیے دنیا کو فریب دے رہے ہیں۔ اس لیے کہ اخلاقی و روحانی بنیادوں کا انکار کرنے کے بعد جبلّتِ حیوانی کی فرماں روائی ہو جاتی ہے اور اس کا آئین جنگ و فساد ہے نہ کہ امن و اخوت۔ جسے اس میں شک ہو اسے مارکسی امت کی تاریخ پر غور کرنا چاہیے۔ ان لوگوں نے افہام و تفہیم و اصلاح و تعاون وغیرہ سارے انسانی ذرائع کا صاف صاف انکار کرتے ہوئے طبقاتی جنگ کو حصولِ مقصد کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے اور اس طرح ساری زندگی کو بھی قانونِ جنگل کا پابند کرنے کی عالمگیر کوشش شروع کر رکھی ہے۔

(ب) اس بات کو پوری طرح اپنی ذہنی گرفت میں کر لیا جائے کہ مذہب انسان کی روحانی و اخلاقی سرشت کو حیوانی جبلت پر غالب کرنے کا مدعی ہے اور اس کی یہ فطرت قطعاً عالمگیر ہے۔ اس کو کل اذہان سے کوئی بنیادی اور اصولی تعلق نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اس کی غرض و غایت انسان

ساری داخلی زندگی کے ساتھ ہی اس کے خارجی ماحول کو بھی اسی اخلاقی و روحانی رنگ میں رنگ دیا رہا ہے۔ لہٰذا اسے ہر ہر مقام کے اکثر حالات و مقامی عادات و اطوار کو بھی اپنے اعتقاد میں لینا ہوتا تھا۔ اسی اختلاف ماحول کے باعث اس میں اختلاف پیدا ہوا اور پھر اس کے ساتھ اور اسباب بھی شامل ہوتے گئے۔ سب سے بڑا سبب انسان میں مذہبی حس کا دھیما پڑ جانا ہے۔ اسی سے تجدید مذہب کی ضرورت لاحق ہوتی رہی ہے اور پھر مذکورہ صدر اسباب کے باعث اس میں اختلافات کے سبب یہ تجدید کی کوشش خود مستقل مذہب بن جاتی رہی ہیں۔ ان اختلافات کا سب سے زیادہ پیچیدہ نمونہ ہندوازم ہے۔ جس کی نہ تو کوئی تعریف ممکن ہے نہ اسے اخلاقی و روحانی فرائض و واجبات کے سلسلے میں متعین کیا جا سکتا ہے۔

(ج) آج کے عالمگیر حالات کو دیکھتے ہوئے مذہب کی سب سے زیادہ متعین صورت اسلام کا ایک عالمگیر رب العالمین کا اعتقاد اور ایک عالمگیر بھائی چارے کا عملی نظام ہے۔ آج مسلمانوں میں نسل و رنگ و وطن نے جس قسم کے اختلافات پیدا کر رکھے ہیں وہ سب راقم کے سامنے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی محمد رسول اللہ نے عالمگیر رب العالمین اور عالمگیر بھائی چارے کی جو دعوت دی تھی اس کا ایک ایک حرف ابھی اس طرح دنیا کے سامنے ہے کہ مسلمانوں کے سارے اختلافات کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے کوئی قوم و ملت اس کو قبول کر سکتی ہے اور اسے اپنی تجدید و اصلاح مذہبی کا ذریعہ بھی بنا سکتی ہے۔ اور سارے عالم انسانی کے اتحاد کی دعوت کا ذریعہ بھی بنا سکتی ہے۔ ہندوازم یا بالفاظ صحیح برہمن ازم کے سب سے زیادہ معین خد و خال اس کا لاکھوں دیوی دیوتاؤں کا اعتقاد اور ذاتوں اور فرقوں کا عملی نظام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر سارے عالم انسانی کا اتحاد تو ایک طرف رہا خود ہزاروں کوششوں کے باوجود ہندوستانی معاشرے کا اتحاد بھی ممکن نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسلام کے ایک عالمگیر انسانی بھائی چارے کے نظام سے ایک ہندو کو پہنچتے ہی ایک تضاد محسوس ہونے لگتا ہے لیکن یہ حالت تو خود عرب کے بت پرستوں کو بھی محسوس ہوئی تھی اور انھوں نے پیغمبر اسلام پر تعجب سے اعتراض کر دیا تھا۔ "اجعل الآلھۃ الھاً واحداً ان ھٰذا لشیٔ عجاب"۔

اس نے (محمدؐ) تو سب دیوی دیوتاؤں کو ایک ہی معبود بنا دیا یہ عجیب بات ہے۔ (القرآن)

حقیقت یہ ہے کہ بالکل ہندوستان ہی کی طرح پورے عرب میں بھی ہر ہر قبیلے کا اپنا اپنا دیوی دیوتا تھا اور پھر ان سب میں جنگ و فساد کا سلسلہ جاری تھا۔ لہٰذا جب پیغمبر اسلام نے ایک عالمگیر

رب العالمین اور ایک عالمگیر انسانی بھائی چارے کا پیام دیا تو ایک طرف تو آپ کو اپنے پروہت خاندان کو اس میں زوال نظر آیا اور دوسری طرف تمام عرب قبائل نے بھی اس میں اپنے اپنے دیوی دیوتاؤں کا زوال محسوس کیا اور سب نے مل کر اوپر کا اعتراض کر دیا۔ یہ بھی سبب تھا کہ وہ پیغمبر اسلام کے مقابل کوئی مثبت پروگرام نہ لا سکتے تھے۔ لہٰذا صرف اس منفی نوعیت کے اعتراض پر اپنی مخالفت کو جمع کرنا شروع کر دیا جو عرب کے علاوہ دو ہزار برس سے پیچھے کی تاریخ انسانی پر نظر ڈالی جائے تو اس میں یہی کنبہ واریت اور یہی اپنے اپنے دیوی دیوتاؤں کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ جوں جوں انسان کا تنظیمی دائرہ وسیع سے وسیع ہوتا گیا توں توں توحید خدا اور اخوت انسانی کا تصور واضح سے واضح تر ہوتا گیا۔ محمد رسول اللہ پر یہ دونوں اصول اپنی عالمگیر شکل میں نقطۂ کمال پر پہونچے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہونچنے پر آپ نے مہاجروں میں اور انصار میں ایک ایک فرد کا بھائی چارہ قائم کیا۔ پھر مزید اطمینان حاصل کرنے کے بعد دنیا کے تمام ان لیڈروں اور رئیسوں کو جن تک اپنے پیغام کو پہونچانا آپ کے لیے ممکن تھا آپ نے جو خطوط لکھے ان میں اکثر اوقات قرآن مجید کی آیت ذیل لکھی ہوتی تھی۔

یااھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمۃٍ سواءٍ بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ۔

(اے آسمانی الہام کو ماننے والو آؤ ایک ایسی بات پر اتحاد کریں جو ہم میں اور تم میں برابر ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک اللہ کے سوائے کسی چیز کو نہ پوجیں نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو اپنا معبود بنائیں)

اس پیغام میں ہر قسم کے شرک کے ساتھ ہی سب قسم کی شرکانہ پروہت گیری کا خاتمہ تھا۔ اس وقت تو شاید یہ بات نرالی تھی مگر آج جبکہ وطنوں اور قوموں کی سابقہ حدود مسمار ہو کر پورا عالم ایک ہونے کے لیے مجبور ہو رہا ہے تو اس پیغام کو پورے صدق دل سے قبول کرتے ہوئے ایک طرف اپنی ذات پات کے خاتمے کا ذریعہ بنانا اور دوسری طرف ہندوستان کے لاکھوں تیاگی سادھوؤں کو اس کی حقیقت سمجھا کر سارے عالم انسانی کے اتحاد کے لیے ساری دنیا میں پھیلا دینا آج زمانے کی

معلوم ہوتا ہے۔ یہی وہ پیغام ہے جو ایک طرف عالمگیر دہریت کا علاج کر سکتا ہے تو دوسری طرف نسل و وطن کے سارے اختلافات کا خاتمہ کرتا ہوا وحدت انسانی کے ہزاروں برس کے زرّیں خواب کی عملی تعبیر پیش کر سکتا ہے جو کہ اول درجہ کے اخلاقی و روحانی انقلاب کے لیے ضروری ہوتی ہیں تمدّن و ثقافت کی پیچیدگیوں میں اُلجھ جانے کے بعد قومیں کسی بڑی اخلاقی و روحانی مہم کو سر کرنے کی صلاحیتوں سے عام طور پر محروم ہو جایا کرتی ہیں۔ وہ ناچ رنگ شراب کباب کے اخلاق کش مشاغل سے آگے شاذ و نادر ہی قدم بڑھا سکتی ہیں۔ لیکن اگر کسی ملک یا قوم میں بدوی صلاحیتیں موجود ہوں اور انھیں کسی زندہ اخلاقی و روحانی نصب العین سے باندھ دیا جائے تو پھر ہر کرامت ممکن ہو جاتی ہے۔ مذہب انسان کی اخلاقی و روحانی فطرت کو ہمہ گیر کرنے کا میڈیم ہے جب ملکی و مادّی ماحول کی مجبوریاں تھی تو اسے نسل و وطن و قوم کے دائرے میں محدود رکھنے کے کچھ معنی ہو سکتے تھے۔ اگرچہ یہ اخلاقی و روحانی سرشت اس وقت بھی اپنی حقیقت میں عالمگیر تھی۔ مگر حالات کی مجبوری سے ان کا اجرا APLICATION کنبے یا مخصوص نسل و وطن کا پابند ہو سکتا تھا۔ یہ مذہب کی ایک سکڑی ہوئی ابتدائی شکل تھی۔ لیکن آج خالص مادّی حالات خود اس بات کا تقاضا کر رہے ہیں کہ مذہب ایسا میڈیم اختیار کرے جو ساری دنیا سے لوکل ازموں کا بھی خاتمہ کر سکے اور عالمگیر انسانی بھائی چارے کا عملی ڈھانچہ بنے۔ خداوند کریم ہندوستان کے لاکھوں تیاگی سادھوؤں کو اس پیام رحمت کو پورے اخلاص سے قبول کرنے اور پوری خیراندیشیٔ انسانی سے عالمگیر کرنے کی مہم میں مصروف کر دے (آمین)۔ گزشتہ ستر اسی برس سے ہندو قوم کے ضمیر میں یہ خیال ایک مجمل اور مبہم سی شکل میں مسلسل کارفرما رہا ہے کہ اسے دنیا میں کوئی مشن انجام دینا ہے، مگر ابھی تک یہ متعین نہ ہو سکا کہ یہ مشن کیا ہے۔ موجودہ سارے حالات کا تجزیہ سامنے رکھتے ہوئے یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ مشن صرف یہی ایک عالم گیر رب العالمین اور عالم گیر انسانی بھائی چارے کا پیغام ہے جسے آج عالم گیر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ عرب کی بُت پرست اور کنبہ پرست بستی نے جب اسے قبولا اور جب تک صدق دل سے اسے چلایا اس کے نتائج ساری دنیا پر نمایاں ہیں۔ اب اگر اس حق کو ایک دوسری کنبہ پرست و بُت پرست قوم قبول کرتی ہے تو انشاء اللہ باقی ماندہ کام بھی پورا ہوگا اور عالمگیر وحدتِ انسانی کے خواب کی عمدہ تعبیر ہو جائے گی۔

ہندوازم میں ہزاروں برسوں سے یہ روایت مسلسل زندہ رہی ہے کہ مذہب کی ہر شکل انسان کی نجات کا ذریعہ بن سکتی ہے بشرطیکہ انسان اسے اخلاص کے ساتھ قبول لے اور ایمانداری سے اس پر عمل کرے۔ میرے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ پانچ چھ ہزار برس پہلے جو مذہبی تاریخ کنبے کی تنظیم سے شروع ہوتی تھی اس میں آئندہ کی ترقی کے ہر صحیح قدم اور ہر وسیع افق نگاہ رکھنے والی مذہبی کوشش کے لیے راستہ کھلا رہے اس لیے کہ مذہب اپنے مادی ماحول کی مجبوریوں کے اعتبار سے مختلف عبوری شکلیں اختیار کرتا ہوا وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا یہاں تک کہ وہ ساری انسانیت کو ایک ہی اخلاقی نظم ونسق کا پابند کر لے۔ لہٰذا ہر سچا مذہبی مصلح جہاں ماضی کی ساری صداقتوں کو اپنے پیام میں محفوظ رکھنے پر مامور ہوتا رہا وہاں وہ مستقبل کی مزید وسیع تر کوششوں کے لیے نشاندہی کرجاتا تھا۔ کم ازکم ایسے امکانات کے لیے پوری گنجائش چھوڑ جاتا تھا۔ لہٰذا اس روایت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ اسے ماضی کے ناقابل عمل اوہام، کروڑوں ذاتوں اور کروڑوں خداؤں سے نجات کا ذریعہ بنایا جائے۔ اور مذہب کی سب سے زیادہ جامع اور حالات انسانی سے مطابقت رکھنے والی صورت کو اپنایا جائے۔ لہٰذا راقم "وشو ہندو دھرم سمیلن" کے سب ارکان سے گزارش کرے گا کہ وہ میری ان گزارشات پر غور فرمائیں۔ ضرورت ہو تو اس کی مزید تشریح کا مجھے موقع دیں۔ گزشتہ ۲۲ برسوں سے اسی ایک یقین کو سینے میں دابے ہوئے کشمیر سے مدراس تک اور آسام سے کوئٹہ تک گھومنے میں گزارے ہیں اور آج اس کا آخری موقع محسوس ہوتا ہے۔ پنڈت نہرو کی سرکردگی میں جس ہندوستان کو جنم دینے کی کوشش کی گئی تھی وہ اگر جنم لیتا تو بام مارگی اور دہریہ ہندوستان ہوتا۔ اور اب وشو ہندو دھرم سمیلن" کے ذریعہ جس ہندوستان کو بیدار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے وہ مذہبی ہندوستان ہے۔ یہ ہزاروں برس کا ہندوستان ہے جو مذہبی رہا کبھی بیمار کبھی تندرست۔ کبھی ایک رنگ میں اور کبھی دوسرے رنگ میں، مگر مذہبی رہا۔ وہ لامذہب نہیں رہا۔ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ صدر جمہوریہ ہند نے سیکولرازم کو اپنے پاؤں کی بیڑی بننے نہیں دیا۔ خدا اس کوشش کو ہندوستان کی پوری روح کو بیدار کرنے کا ذریعہ بنائے اور اسی بیداری کو صحیح راستے پر ڈالنے کا بھی سامان وہ خود ہی کرے۔ ہندوستان اور اس کے ساتھ ہی سارے وہ ایشیائی مشرقی ممالک کو جو گزشتہ پندرہ بیس برسوں سے آزاد ہوئے ہیں اور ابھی تک دہریت کے نئے امپریل ازم کے قبضے میں نہیں آئے وہ آج ایک

عالمگیر رب العالمین کے اعتقاد اور ایک عالمگیر انسانی بھائی چارے کی اس دعوت کے ماتحت ایک آزاد دینی و مذہبی بلاک کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ جونہی اس تنظیم جدید کا آغاز ہوا ویسے ہی نیا امپریل ازم اس آفتاب کے سامنے اسی طرح خود دیکھتے دیکھتے ناپید ہو جائے گا جس طرح مادی کُہر مادی آفتاب کی گرمی و روشنی کے سامنے ناپید ہو جاتا ہے۔

ہندوازم اور کمیونزم کا کھلا تضاد

(۱) ہندوازم سارے نظام کائنات کا اصل الاصول اور مستقل بنیاد روح کو بناتا ہے اور مادے کو صرف ایک نمود بے بود قرار دیتا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ یا تو مادے کو بالکل قابل توجہ قرار نہیں دیتا اور اگر معاشرتی مجبوریوں سے توجہ دیتا بھی ہے تو اسے بالکل دوسرے درجہ پر رکھ کر۔ وہ مایا کا جال ہے۔

(۲) اس کے مقابل کمیونزم سارے نظام کائنات کی بنیاد اور اصل الاصول صرف مادّے کو قرار دیتا ہے۔ اور روح کا یا تو منکر ہے یا اسے مادّے کی ایک دوسرے درجہ کی خاصیت قرار دیتا ہے، اگر اسے قابل توجہ قرار نہیں دیتا۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہندو مفکر اور مذہبی لوگ اس بات پر کوئی بھی توجہ نہیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ خالص اس فکری بنیاد پر انھیں کمیونزم اور مادیت کا سب سے بڑا دشمن ہونا چاہیئے تھا۔ یہ عجیب ترین مصیبت ہے کہ ہندو قوم کے سیاسی مدبرین نے پہلے تو چین کو آزاد مشرق میں گھسیٹنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی اور اب وہ یہی کچھ روس کے لیے کر رہے ہیں یہ ایک تاریخی سانحہ ہے۔

(۳) مندرجہ دونوں نقطہائے نگاہ کے مقابل اسلام ایک طرف ساری کائنات کے لیے ایک رب العالمین کا اعلان کرتا ہوا اور نوع انسانی کو اپنے حسن عمل کے ذریعہ اس رب العالمین کا مقرب قرار دے کر روحانی ارتقائے انسانی کی ساری شاہراہ کو کھلا رکھتا ہے تو دوسری طرف سارے نوع انسانی کو ایک بھائی چارہ قرار دے کر تاریخ انسانی کے سارے اخلاقی تصور کو ہر پہلو سے محفوظ کر لیتا ہے۔ ادھر نوع انسانی صرف اس اخلاقی و روحانی شعور و احساس و کردار کا نام ہے۔ اس کے علاوہ انسانی زندگی میں جو خاصیتیں ہیں ان میں سے بعض میں انسان حیوانات سے مشابہ ہے بعض میں نباتات سے اور بعض میں جمادات سے، یہ خصوصیات شرافت انسانی کی بنیاد نہیں ہیں۔ انسانی شرافت کی بنیاد صرف اخلاقی و روحانی شعور و احساس و کردار ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام کا یہ مطلق دعویٰ نہیں کہ وہ کوئی نئی چیز ہے۔ بلکہ اس کا دعویٰ ہے کہ پورے مذہب انسانی کی صرف یہی اصل ہے جس کی

تلقین کرنے کے لیے ہر ملک ہر قوم اور ہر شہر و قریے میں خدا کے بندے کام کرتے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ اسلام کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ اگر عالم گیر توحید خدا کے اعتقاد کے ساتھ مذاہب میں بت پرستی کی ملونی کردی گئی ہے تو یہ انسان کی اپنی جہالت و کمزوری تھی۔ ایسے ہی اگر عالم گیر اخوت انسانی کے خالص اخلاقی تصور کو نسل و وطن کی مختلف جغرافیائی حد بندیوں میں سے کسی نے جکڑ لیا ہے تو یہ قوموں اور ملتوں کی اپنی خود غرضی تعصب کنبہ پروری و تنگ نظری کا نتیجہ تھا۔ مذہب و دین کو اس سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔

اس سلسلے میں قرآن مجید کے ذیل کے اعلانات قابل غور ہیں۔

"کان الناس امۃ واحدۃ"۔ نوع انسانی صرف ایک امت تھی۔ (القرآن)

"ان ھذہٖ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون"۔ یہ تمہاری امت (نوع انسانی مراد ہے) ایک ہی اُمت ہے اور میں تمہارا رب ہوں "میری بندگی کرو" (میرے آئین کو مانو) (القرآن)

"یا ایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ وجعلنٰکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم"۔۔۔ اے نوع انسانی ہم نے تم کو ایک ماں باپ سے پیدا کیا اور مختلف قبائل میں بانٹ دیا۔ مگر یہ صرف تعارف کے لیے۔ رہا انسان کا اشرف ہونا تو اس کا دارومدار خوف خدا پر ہے (آئین خدا کی پابندی پر) (القرآن)

"ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا کل حزب بما لدیھم فرحون"۔ اور مشرکوں میں سے وہ نہ بنو جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا۔ فرقے فرقے ہو گئے ہر گروہ اپنے جمع کئے ہوئے پر خوش ہو (القرآن)

اُمید ہے کہ یہ چند حوالے کفایت کر جائیں گے۔

سب سے پہلی اور آخری بات بھی یہ ہے کہ نوع انسانی ایک برادری ہے ان کا وہی اپنا ایک ہی آئین فلاح و نجات ہے اور وہ ایک عالمگیر رب العالمین کا اعتقاد اور ایک عالمگیر انسانی بھائی چارے کا نظام ہے۔ اس کو عالم گیر کرنے پر انسانی امن و سلامتی کا دارومدار بھی ہے اور اسی پر نوع انسانی کے ارتقاء و فلاح کی بھی بنیاد ہے۔ آؤ پورے صدق و اخلاص سے اسے قبول کرلیں اور پوری خیراندیشی انسانی سے اسے عالم گیر بھی کریں۔ تعصب و تنگ نظری انسان کو ہلاکت کی راہ پر لیے جا رہے ہیں۔ ان کا علاج ایک عالم گیر خدا اور ایک عالم گیر انسانی بھائی چارے کے نظام کا قیام ہے۔ اس کی تشریح پر کوئی دفتر موجود [illegible] خدا اس کی اشاعت عالم گیر کا سامان کرائے۔

بقیہ معارف الحدیث

ں ایک حرف ہے، م ایک حرف ہے۔ اور میں نہیں کہتا کہ "الم" ایک حرف ہے۔ بلکہ الف لام میم الگ الگ حروف ہیں۔

اللہ تعالیٰ یقین کی دولت نصیب فرمائے۔ اس حدیث میں کلام پاک کی تلاوت کرنے والوں کے لیے بڑی ہی خوشخبری ہے۔
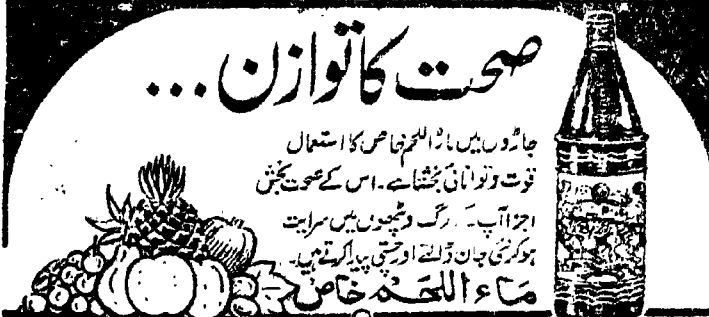
بقیہ دربار عالمگیری

۵۔ نواب نجیب اللہ خاں بہادر۔

جیسا کہ پہلے گزرا محمد جان خان بہادر کو شہادت فرانسیسی گورنر جنرل دوپلے کے مقابلہ میں حاصل ہوئی۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے محمد علی خاں ان کے جانشین ہوئے۔ مولانا احمد اللہ شاہ انھیں کے شہرۂ آفاق پوتے تھے جن کا مدراس سے آکے انگریزوں نے یو، پی میں مقابلہ کیا اور سخت مقابلہ اور بالآخر پوایان (لکھیم پور) کے راجہ سے انگریزوں نے سازش کر کے ان کو شہید کیا۔ رحمہ اللہ

مؤتمر اسلامی

مقالہ چہارم

اجتماعی اجتہاد اور ایک فقہی مجلس کا قیام

آج کے دور میں اسلامی زندگی کی حتمی ضرورت

الشیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء - پروفیسر دمشق یونیورسٹی

آج دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کو، چاہے وہ ایک آزاد و خود مختار قوم کی حیثیت میں ہوں یا محکوم اقلیت کی حالت میں، اپنی اجتماعی اور اقتصادی زندگی، بلکہ عباداتی معاملات میں بھی زمانے کی جدید ایجادات، تجارت، صنعت اور اقتصادیات میں نئے نئے طریقوں اور وسیلوں کے رواج اور اجتماعی عادتوں اور پیمانوں میں انقلابی تغیرات کی بنا پر کتنے ہی نئے احوال و مسائل کا سامنا ہے۔ جن مسلمانوں کو اپنی شریعت کا حکم جاننے کی فکر ہے وہ ان امور میں حکم شریعت دریافت کرنے کے لیے ان لوگوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جنھیں وہ عالم دین کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن کہیں انھیں یہ جواب ملتا ہے کہ جن معاملہ میں نص شریعت موجود نہیں اس میں کیا جواب دیا جا سکتا ہے؟ اور کہیں لوگ گہرے غور و فکر کے بجائے سطحی نظر سے کام لے کر الگ الگ جوابات دے دیتے ہیں جن میں ایک تحریم کی طرف جاتا ہے تو دوسرا تحلیل کی طرف۔ اور سائل بیچارے اپنی پھر اسی پریشانی میں مبتلا رہ جاتے ہیں کہ کیا فیصلہ کریں اور زندگی کے ان عملی سوالات سے کس طرح عہدہ برآ ہوں؟

شریعت اور اجتہاد | شریعت کیا ہے؟ وہ افراد اور جماعت کے لیے ایک قانون کی شکل میں اجتماعی طلب ہے جس کا کام حقوق میں عدل قائم کرنا، ظلم کو روکنا، مفسدتوں کو دور کرنا، زندگی کو تمام منفعتوں کو حاصل کرنا جن میں کوئی شرعی مانع نہ ہو، اس کے ساتھ اخلاقی یا

اجتماعی لحاظ سے فساد انگیز باتوں پر یکسر بندش لگاتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ کے احکام میں شریعت کا ایک خاص اور مرکزی نقطۂ نظر ہے۔ عبادات میں ایک نقطۂ نظر ہے۔ معاملات میں ایک نقطۂ نظر ہے۔ حکومت اور سیاست میں ایک نقطۂ نظر ہے۔ مفاسد کی روک تھام میں ایک نقطۂ نظر ہے۔ اسی طرح ضرورت و مصلحت کے باب میں ایک مرکزی نقطۂ نظر ہے اور ان سب میں قدر مشترک کے طور پر شریعت کا جو مقصد کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی پوری زندگی کے لیے اعتدال کی ایسی راہ وسط بنائی جائے جس میں نہ تو سختی، پیچیدگی اور غلو فی الدین کی ہمت افزائی ہو اور نہ ان اعمال کے لیے ڈھیل اور چشم پوشی جن کی ممانعت شرعی دلائل سے ثابت ہوتی ہے۔

شریعت کی اس حقیقت کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے احکام کے اعتبار سے ابدی اور ہمہ گیر طور پر تمام قدیم و جدید احوال و واقعات پر حاوی ہو۔ اور کسی بھی سوال کا جواب دینے سے عاجز نہ ہو ــــ اور یہی واقعہ بھی ہے! یہ کام فقہ کی مدد سے انجام پاتا ہے، جو اس اجتماعی طب (شریعت) کی جنرل ڈسپنسری ہے۔ اور جس میں ہر وقت ہر مرض کی دوا موجود ہے۔ لیکن اس دواخانے سے کوئی بھی دوا نکالنے کے لیے لازماً تلاش و تجسس کی بھی ضرورت ہوگی اور کسی وقت فن آمیزش و مرکب سازی .... سے کام لینا بھی ناگزیر ہوگا۔ یہ کردار اجتہاد کا ہے۔ اور اس طور پر اجتہاد فقہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

اجتہاد ہر ایک کا کام نہیں اس میں ایک طرف شریعت کے وسیع علم کی ضرورت ہے اور دوسری طرف اس گہری فقہی بصیرت کی جو شارع کی نص اور فقیہ کی قیاسی رائے کی قیمت و حرمت میں فرق کر سکے۔ اور اسی کے ساتھ زیر نظر معاملات کو ان کے حقیقی رُخ سے دیکھ سکے۔ تاکہ اجازت یا ممانعت کا جو حکم بھی دیا جائے وہ شریعت کے اصول اور دلائل پر مبنی ہو نہ کہ سطحیت پرستی اور سہل انگاری کے اس اصول پر جو آج بہت عام ہو گیا ہے کہ نئے امور میں ہمیشہ سلبی موقف ہی اختیار کرنا زیادہ قرین تقویٰ اور شایان دینداری ہے۔

یہ منفی انداز فکر دراصل علم کا نہیں عجز اور قصور علم کا موقف ہے اور یہ دین کے لیے اسی قدر نقصان دہ ہے جس قدر کہ شریعت کے جادۂ حق سے منحرف گروہوں کی وہ جرأت نہ جسارت جو وہ منافقانہ اغراض یا شریعت کا کام ہی تمام کر دینے کی نیت سے شریعت کے

اصولوں کو نظرانداز کرنے اور من مانے دلائل گھڑ کر پیش کرنے میں دکھلاتے ہیں شریعت کا نام لے کر بلا کسی صحیح دلیل کے سلبی موقف اختیار کرلینا یقیناً ان بیمار اور منافقانہ ایجابی فیصلوں سے مختلف نہیں ہے جن میں خوف خدا اور نیک نیتی سے بے نیاز ہو کر علم کا بدترین استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک میں اگر حرام کو حلال کرنا ہے تو دوسرے میں حلال کو حرام کرنا، اور شریعت کا جمال اور حکیمانہ کردار ان دونوں ہی صورتوں میں مسخ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اجتہاد میں ان دونوں غلط رجحانوں کے امکان کے پیش نظر ہی یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ مجتہد کی زندگی میں جہاں ورع و تقویٰ اور دینی صلاح کے واضح آثار ہونے چاہئیں وہاں اسے اصول شریعت کے راسخ علم اور حکمت و بصیرت سے بھی بہرہ ور ہونا چاہیے۔

چند نئے مسائل جن میں شرعی حکم کیلئے اجتہاد کی ضرورت ہے

ایسے مسائل کی ایک بڑی تعداد ہو چکی ہے جو خاص کر اس زمانے نے پیدا کئے ہیں اور ان کے بارے میں حکم شرعی کا فیصلہ کرنے کے لیے اجتہادی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر ان میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ بیمہ (انشورنس)

آج بیمہ کی معاملت پوری دنیا میں رائج ہے۔ اسلامی ملک بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ عام زندگی میں بالخصوص اقتصادی سرگرمیوں سے اس کا چولی دامن کا ساتھ ہو چکا ہے۔ ایک نہیں اس کی متعدد صورتیں یکساں طور پر شائع ذائع ہیں۔ ایک صورت مال کے بیمے کی ہے جو مختلف خطرات کے پیش نظر کرایا جاتا ہے۔ دوسری صورت علیٰ ہذا ذمہ داریوں کے بیمے کی ہے تیسری صورت نئے وسائل سفر ہوائی جہاز وغیرہ کے مسافروں کی زندگی کا بیمہ خود ان وسائل کی مالک کمپنیوں کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ چوتھی صورت زندگی کا وہ بیمہ ہے جو لوگ از خود اپنی موت کے بعد پسماندگان کی بہبودی کے خیال سے کراتے ہیں بس ایک ایسا عظیم اقتصادی اور قانونی معاملاتی نظام جو اس حد تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کی زندگی میں جاری و ساری ہے کوئی جواز نہیں کہ اس کا دو ٹوک شرعی حکم مخفی رہے اور مختلف لوگ بغیر اس

اہمیت وغایت اور انواع واطوار کے گہرے مطالعے اور بغیر کافی وشافی شرعی دلائل کے اسکے بارے میں مختلف فقہی رایوں کا اظہار کرتے رہیں اور وہ عوام الناس جو اپنے آپ کو دین کا پابند رکھنا چاہتے ہیں، ایک شدید کشمکش میں مبتلا رہیں کہ ضرورت کا احساس ایک طرف کھینچتا ہے اور گناہ کا خوف دوسری طرف۔

اور اسی طرح اس کا بھی جواز نہیں کہ بیچ کے اس جدید نظام کے بارے میں کوئی انفرادی اجتہاد شریعت کا موقف معین کرے۔ اگرچہ وہ شخص واحد کتنا ہی اہل کیوں نہو۔ کیونکہ اس زمانے میں انفرادی اجتہاد کو جائز رکھنے میں کچھ قباحتیں ہیں جنھیں ہم آگے بیان کریں گے۔ ایں اس معاملے میں شریعت کا حکم اجتماعی اجتہاد کے ذریعے سامنے آنا چاہیئے جس میں عالم اسلامی کے منتخب اہل علم اور عصری بصیرت سے بہرور اہل تفقہ حصہ لیں۔

۲۔ تجارتی کمپنیوں کا مسئلہ

یہ وہ بڑی بڑی کمپنیاں ہیں جن میں حصہ داروں کے نام مذکور نہیں ہوتے اور دوسرے شرکا سے کسی براہ راست معاملت کے بغیر آدمی اس میں حصہ دار ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کاروبار میں حصہ شریک ہوتا ہے نہ کہ حصہ دار۔ چنانچہ وہ آزاد ہوتا ہے کہ جس وقت چاہے اپنا حصہ فروخت کردے۔ اور پھر جو شخص اس حصے کو خریدتا ہے وہ اسکی ملکیت اور اس کے تمام منافع کے استحقاق میں بائع کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔

یہ بڑے پیمانے کے پیداواری کاموں کے لیے چھوٹے چھوٹے سرمایوں کو منفعت بخش بنانے اور ان سے غیر معمولی سرمایہ مہیا کرنے کے لئے شراکت کا ایک نظام ہے کیونکہ اس پیمانے کا سرمایہ مہیا کرنا فرد واحد کی بساط سے باہر ہے جب کہ بڑے بڑے پیداواری منصوبوں کے لئے یہ ناگزیر ہے پس شریعت اسلامی اور اسکی فقہ کا حکم ان کمپنیوں کے بارے میں اور اس کے حصوں کی مندرجہ بالا صورت کے ساتھ خرید و فروخت کے بارے میں کیا ہے؟ جبکہ یہ بھی معلوم ہے کہ یہ کمپنیاں بینکوں سے معاملت کے بغیر بھی نہیں رہ سکتیں۔!

۳۔ بینک کی ملازمت

بعض علماء بینک کی کلیریکل ملازمت کو بھی ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ بینک

کی آمدنی سود پر مشتمل ہوتی ہے اور بعض کا فتویٰ ہے کہ اس دور میں یہ ملازمت اختیار کیجا سکتی ہے۔ کیونکہ آج کل خود حکومت کی ملازمت کا معاملہ بھی یہی ہے کہ سرکاری خزانہ جس سے تنخواہ ملتی ہے اس میں شراب کے ٹیکس جیسی حرام مدوں سے آمدنی ہوتی ہے۔ پس یہ عموم بلویٰ کا مسئلہ ہے کہ آدمی بچ نہیں سکتا۔ ورنہ ملازمت کے ذریعہ زندگی گزارنے کا راستہ نایاب اور دیانت دار نوجوانوں پر تو بند ہی ہو جائے گا۔ اور صرف وہ لوگ اس ذریعہ معاش پر قابض ہو جائیں گے جنھیں حلال و حرام سے کوئی سروکار نہیں ! ___ پس ضرورت ہے کہ بینکوں کی کلیریکل ملازمت یا اس جیسی دوسری خدمات کے بارے میں شریعت کا حکم معلوم ہو سکے کہ یہ وقت کا سوال ہے۔

۴۔ ہوائی جہاز کے ذریعے بیت اللہ جانے والوں کیلئے احرام کا مسئلہ

جیسا کہ سب جانتے ہیں حرم مکی کے چاروں طرف کچھ مقامات (میقات) مقرر ہیں جن سے ساکنین حرم کے علاوہ کسی شخص کو حج یا عمرہ کا احرام باندھے بغیر گزر کر اس حرم میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن اس زمانے میں ایسے وسائل نقل و حمل ایجاد ہو گئے ہیں جو زمین سطح سمندر پر چلنے کے بجائے پرندوں کی طرح ہوا کے دوش پر چلتے ہیں یعنی ہوائی جہاز، اور آج ہزاروں حجاج انہیں کے ذریعہ بیت اللہ کا قصد کرتے ہیں۔ یہ جہاز بہت سے انتہائی سرد ملکوں سے حجاج کو لے کر چلتے ہیں اور جدّہ میں آکر اترتے ہیں جو کہ اندرون میقات ہے۔ پس ان لوگوں پر کس جگہ سے احرام باندھنا واجب ہوگا ؟ کیا وہ حالت پرواز ہی میں میقات کے مقابل آجانے پر احرام باندھیں، جیسا کہ بحری مسافر کرتے ہیں ؟۔ لیکن یہ بحری مسافروں کے برعکس ہوائی مسافروں کے لیے تو بہت دشوار ہے۔ ہوائی جہاز کے اندر غسل، نماز اور تبدیل لباس سکے مراحل کیسے آسان ہو سکتے ہیں ؟ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ اپنے وطن ہی سے احرام باندھ کر ہوائی جہاز میں سوار ہوں تو یہ ان لوگوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہو جائے گا جو کسی سرد ملک سے سفر کر رہے ہوں ! تیسری شکل یہ ہے کہ یہ جدہ پہونچ کر (یعنی منطقہ حرم کے اس پہلے مقام پر جہاں جہاز اترے) احرام باندھیں۔ اور یہی سہولت

کی شکل ہے۔ چنانچہ بعض فقہاء اسی پر فتویٰ دیتے ہیں اور ان کی رائے کا مبنیٰ یہ ہے کہ میقات سے احرام باندھنے کے نصوص کا تعلق خشکی سے آنے والوں سے ہے۔ رہے ان جدید وسائل سفر کے ذریعہ ہوا کے دوش پر آنے والے تو ان کے میقات کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے۔ پس وہ سرزمین حرم کے اندر جہاں پہلا قدم رکھیں گے وہیں سے احرام ان پر لازم ہوگا۔ اور یہ فقہ کے اس قاعدہ کی بنا پر کہ تنگی دور کی جائے۔ اس کے برعکس کچھ علما کا فتویٰ یہ ہے کہ حالتِ پرواز ہی میں میقات کے محاذی خطے سے احرام باندھنا ضروری ہے چاہے جو بھی پریشانی ہو۔ یہ مسئلہ بھی اجتماعی اجتہاد سے ایک قطعی فیصلے کا طالب ہے۔

۵- حج کی قربانی

حج ہی کے سلسلے میں ایک حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ حجاج کی روز افزوں کثرت کی بنا پر جتنے بڑے پیمانے پر قربانیاں ہوتی ہیں ان کو فقراء و مساکین کے استفادہ کے لیے محفوظ کئے جانے کا کوئی انتظام فی الحال نہیں ہے، جو کہ ان کا مصرفِ مقصود ہے چنانچہ یہ ضائع بھی جاتی ہیں۔ اور حجاج کے خیموں کے درمیان نیز عام راستوں پر اس سے مضرِ صحت گندگی بھی پھیلتی ہے پس کیا اس وقت تک جب تک کہ ایک سائنٹفک مذبح کے لوازم، ذبیحہ کی نقل و حمل کے کافی وسائل، کولڈ اسٹوریج اور گوشت کو خشک کرنے کے کارخانوں کا انتظام نہ ہو جائے، عارضی طور پر یہ جائز ہوگا کہ حجاج بجائے قربانی کرنے کے حرم ہی کے اندر قربانی کی قیمت نکال کر فقراء کو تقسیم کر دیں؟ اس لئے کہ شریعت اضاعت اور گندگی کو پسند نہیں کرتی اور اس میں عارضی طور کے استثنائی حالات کے لئے استثنائی احکام کا قاعدہ موجود ہے!

اصطلاحِ فقہاء میں اجتہاد کی حقیقت

فقہی تعریف کے اعتبار سے اجتہاد کا مطلب ہے، شریعت کے تفصیلی دلائل سے شرعی احکام کا استنباط۔ اور اس کا لازمی مفہوم یہ ہے کہ ہر پیش آسکنے والی بات کا حکم شریعت میں موجود ہے، اور ایک مجتہد کو اس حکم تک پہنچانے کے لیے 'دلائل (رہنما ذرائع) کا ایک مکمل

نظام بھی شریعت نے قائم کر دیا ہے۔

شریعت کے اس نظام دلائل کے چار ارکان ہیں :-

۱۔ نصوص قرآن۔ اور ۲۔ نصوص حدیث۔ (ان تمام وجوہ دلالت کے ساتھ جو ان دونوں میں قرار دیئے گئے ہیں) ۳۔ کسی دور کے علماء امت کا اجماع۔ ۴۔ قیاس

ان چار بنیادی ارکان کے ساتھ اثبات احکام کے تین ضمنی اصول بھی ہیں جنھیں کتاب سنت ہی نے معتبر قرار دیا ہے۔

(الف) استحسان۔ یہ کسی مسئلہ میں حکم شرعی کے اثبات کا وہ طریقہ ہے جس میں متعین اصولِ قیاس کو ترک کر کے کسی قابل لحاظ سبب کی بنا پر کوئی استثنائی حکم دیا جاتا ہے۔

(ب) استصلاح۔ یا قاعدۂ "مصالح مرسلہ"۔ یعنی ان انتظامی اور اصلاحی ضرورتوں کے مطابق کوئی قانون وضع کرنا جن میں نصوص خاموش ہوں اور اصول قیاس کی بھی کوئی مخالفت نہ لازم آتی ہو۔

(ج) عرف۔ کسی سوسائٹی کا وہ عرف عام جو شریعت کے نصوص اور قواعد واصول سے متصادم نہ ہو (ایسے عرف کو بھی متعلق مسئلے میں شرعی حکم کی بنیاد بنایا جاتا ہے)

الغرض اجتہاد کے اس مفہوم اور ادلۂ شرعیہ کی اس توضیح کی روشنی میں اب ہم اس جگہ پر آجاتے ہیں کہ اسلامی قانون سازی میں اجتہاد کے کردار پر بحث کر سکیں۔

اجتہاد کا کردار

اجتہاد کے کردار کی اس بحث میں مفید ہوگا کہ پہلے ہم اسلامی شریعت اور اس کی فقہ میں اجتہاد کے مقام کو سمجھ لیں۔ اور اس ذیل میں ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ اجتہاد اسلامی شریعت کے لئے بمنزلہ روح اور اس کی فقہ کے لئے سرچشمۂ حیات ہے۔ یہ بات سوچی بھی نہیں جا سکتی ہے کہ شریعت اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے اور اس کی فقہ ایک ایسی زندہ فقہ ہو جو انسانی زندگی کے مسائل ومعاملات کی پوری کفالت کر رہی ہو۔ درانحالیکہ اجتہاد بر سر کار نہ ہو یہی وجہ ہے کہ اجتہاد

کا شعبہ شریعت کے ساتھ ہی ساتھ وجود میں آیا۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر اجتہاد سے کام لیا اور آپ کی نگرانی اور رہنمائی میں آپ کے اصحاب نے بھی یہ فریضہ ادا کیا۔ حضرت معاذ بن جبل صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور و معروف ہے کہ جب حضور نے ان کو اہل یمن کے لیے معلم اور قاضی بنا کر روانہ کیا اور پوچھا کہ — تم ان لوگوں کے درمیان میں فیصلے کس طرح کرو گے؟

— حضرت معاذ نے جواب دیا کہ کتاب اللہ سے!

— فرمایا، اگر اس میں فیصلہ نہ ملے؟

— کہا، تب اس کے رسول کی سنت سے!

— ارشاد ہوا، کہ اگر اس میں بھی کچھ نہ ملا تب؟

— اس کا جواب معاذ نے دیا، کہ تب میں اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا اور اس معاملے میں کوئی کوتاہی نہ کروں گا (یعنی پوری کوشش سے کام لے کر اس فیصلے تک پہونچنے کی جدوجہد کروں گا جو روح شریعت سے قریب تر ہو)

— حضور نے اس جواب کی تحسین فرمائی اور کہا "تعریف ہے اس اللہ کی جس نے اپنے رسول کے رسول کو اپنی مرضی کی راہ سجھائی"!

اچھا اب آئیے ہمارے اس دعوے کی طرف کہ اجتہاد روح شریعت اور جان فقہ ہے! ہمارے اس دعوے کے روشن دلائل اسلام کے وہ مقاصد و خصائص ہیں جن کو اجتہاد سے ایک ربط خاص ہے۔ آئیے اسلام کے ان مقاصد و خصائص پر ایک نگاہ ڈالیں۔

اسلام کا مقصد اور اس کے خصوصی اوصاف

(الف) کتاب وسنت کے نصوص شاہد ہیں کہ اسلام کا مقصد اور مطمح نظر حیات انسانی کی وہ ہمہ گیر اصلاح ہے جس سے نہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی شعبہ باہر ہے اور نہ حال و مستقبل کا کوئی گوشہ۔ یہ اسلام کے بارے میں ہر مسلمان کا عقیدہ ہے اور اس سے جس قدر بھی کوئی انحراف کرے گا اسی قدر اسلام سے باہر ہو جائے گا۔

(ب) اسلام کے اس مقصد سے اس کے تین خصوصی اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ آخریت :۔ یعنی اسلام اللہ کی آخری شریعت ہے اور اس کا رسول خاتم الرسل ہے۔ پس اسلام کے بعد کوئی شریعت نہیں جو اسے منسوخ کرے اور نہ اسکے رسول کے بعد آنے والا کوئی رسول۔

۲۔ دائمیت :۔ یعنی اسلامی دعوت کسی خاص وقت تک کے لیے محدود نہیں ہے کہ اس وقت کے بعد موقوف ہو جائے اور اس کے بعد نوع انسانی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے کہ اسلامی شریعت سے بے نیاز ہو کر خود اپنے طور پر زندگی کی تنظیم کرے۔

۳۔ جامعیت :۔ یعنی اسلامی شریعت کے وہ اصول و احکام جن سے اسلام کا قانونی نظام ترتیب پاتا ہے ان تمام حالات و واقعات کو محیط ہیں جو وجود میں آچکے ہوں یا آسکتے ہوں۔ اور اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ ہر زمان و مکان کے لیے قانون سازی کی ضرورت کو پورا کریں ۔ چنانچہ فقہ کی کتابوں میں علماء شریعت نے جگہ جگہ مختلف مناسبتوں سے یہ بات دہرائی ہے کہ حال یا مستقبل میں پیش آنے والا کوئی معاملہ یا واقعہ ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ شریعت میں اس کا حکم نصوص سے یا قیاس و اجتہاد سے نہ ملتا ہو۔ اور وہ احکام کی پانچ قسموں یعنی ایجاب، استحسان، اباحت، کراہت اور تحریم میں سے کسی ایک کے اندر داخل نہ ہوتا ہو۔

نتیجہ :۔

اگر اسلام کے مقصد اور اس کے خصائص کے بارے میں یہ سب صحیح ہے تو پھر ہمارے اس دعوے کو کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں ہے کہ اجتہاد شریعت اسلامی کی روح اور اسکی فقہ کے لیے سرچشمۂ حیات ہے۔ اس لیے کہ اسلامی شریعت کو "آخری' دائمی اور جامع" مان کر یہ بات ناقابل تصور ہے کہ اس میں اجتہاد کا عمل ہر دم رواں نہ ہو۔

علامہ شہرستانی اپنی کتاب "الملل والنحل" میں رقم طراز ہیں:

الحوادث والوقائع فی العبادات	عبادات و معاملات میں نت نئے
والتصرفات لا تقبل الحصر والعد	حوادث و واقعات کی کوئی حد بندی
ونعلم قطعاً انہ لم یرد فی	ممکن نہیں (یعنی یہ ایک غیر متناہی سلسلہ ہے)
کل حادثۃ نص ولا یتصور	اور یہ بات وثوق کے ساتھ معلوم

ذالك ايضاً و النصوص اذا كانت	ہو کہ ہر پیش آمدہ صورت حال کے حکم
متناهية والوقائع غير متناهية	میں نص موجود ہے اور نہ ہو سکتی تھی۔
وما لا يتناهى لا يضبطه ما	یعنی نصوص متناہی ہیں اور واقعات کا
يتناهى علم قطعاً ان الاجتهاد	سلسلہ غیر متناہی۔ پس واجب ہے کہ
والقياس واجب الاعتبار حتى	شریعت میں اجتہاد اور قیاس کی بھی جگہ
يكون بصدد كل حادثة اجتهاد۔	ہو جس سے ہر نئے مسئلے کا حل نکل سکے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اجتہاد کا ٹھہراؤ خصائص شریعت کے منافی ہے۔ اس ٹھہراؤ کا مطلب یہ ہے کہ فقہ کی حرکت رک جائے اور مسلمانوں کو جن نت نئے مسائل و حوادث کا سامنا ہو ان کے بارے میں فقہ سے شرعی رہنمائی ملنا بند ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات شریعت کے ان اوصاف سے کوئی جوڑ نہیں کھاتی کہ وہ دائمی ہے اور تمام حالات میں رہنمائی کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اب آئیے شریعت میں اجتہاد کے عملی کردار پر نظر ڈالیں۔ (باقی آئندہ)

دربارِ عالمگیری

(از ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی کاکوروی لکھنؤ یونیورسٹی)

(۸)

یہی محمد جان جہاں فاروقی تھے جنھیں دربار عالمگیری میں آنے اور بادشاہ کی نگاہِ کرم پڑنے کے ساتھ ان کے والد بزرگوار محمد انور فاروقی کا منصب عطا ہوا خدمات تفویض ہوئیں۔ جاگیر سے انھیں سرفراز فرمایا گیا اور مفوضہ دیگر امور کا انھیں انچارج بنا دیا گیا۔ محرر بیشی یا میر منشی نے فرمان کے مسودہ کو مبیضہ بنا کے اور اسے ایک ترتیب اور تنسیق کے ساتھ لکھ کے پیش گاہ ہمایوں میں رکھا کہ دستخط شاہی سے مزین ہو جائے۔ بادشاہ کی جب نام پر نگاہ پڑی تو محمد جہان میں سے "ج" کا نقطہ قلم تراش سے مٹا کے اس کی جگہ "خ" کا اوپر نقطہ لگا دیا تاکہ ان کی ہستی اور ان کا وجود دوسرے اسی نام کے ایک شخص کے ساتھ ملتبس اور مشکوک نہ ہو جائے اور انھیں فی الجملہ ایک وجہ امتیاز حاصل رہے۔

بخشی فرد اسمش برائے زینت دستخط خاص بہ نظر اشرف گذرانید۔ بادشاہ بدست مبارک خود از قلم تراش نقطۂ "جیم" از آں حک نمود و نقطۂ "خا" بنیاد و فرمود کہ چوں در ملازمین ما امیرے موسوم بہ "جان جہان خان" با جیم ہست نام فرزند حاجی "محمد انور الدین خان بہادر" خان جہان خان با خا ر باید بود۔[1]

گویا بالفاظ دیگر پہلی ہی باریابی میں "خان" کا خطاب انھیں دے دیا گیا۔ کہ بہادری علاوہ

---

[1] تزک والا جاہی۔

کے افراد اسی دوران بغاوت اور سرکشی پر آمادہ ہوئے بادشاہ نے کسی امیر کی اہلیت کا جائزہ لے کر اسے ان بدسگالوں کی تنبیہ اور تہدید کے لیے سربراہ مقرر کر کے روانہ کیا لیکن مقدرات کی دگرگونی کہ ان کے مقابلہ میں شاہی فوج کے قدم اکھڑ گئے اور ان کے حملے میں ثبات اور استحکام مفقود ہونے کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ واقعہ نگار نے جو کلی اور جزئی معاملات کو گوش ہمایونی میں روزانہ پہونچاتا رہتا تھا اس نے اس صورت حال کی اطلاع دی وزیر مملکت جملۃ الملک اسد اللہ خاں تھے یہ واقعہ نگار کی اس رپورٹ کو لے کے دربار شاہی میں حاضر ہوئے تاکہ مزید کمک بھیجنے کا فرمان حاصل کر سکیں۔ اسد اللہ خاں وزیر پریشاں خاطر اور پراگندہ دماغ سے ہو گئے تھے انھیں شاہی پروگرام اور وقتی مشاغل شاہی کا مطلق خیال نہ رہا انھیں اس الجھن اور پریشانی میں یہ دھیان نہ آیا کہ عالمگیر اس وقت عبادت الٰہی میں لگے اور ریاضت میں پڑے ہوں گے سخت متفکر تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ ادھر بادشاہ کی ایسی اہم مشغولیت ادھر اعانت اور فوری اقدام کی حاجت نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن مجبور ہو گئے کہ بلا اصالۃً حاضری کی جگہ کسی کا واسطہ اور توسط اختیار کریں اور نیابۃً اپنا مافی الضمیر بادشاہ تک پہونچائیں۔ حالانکہ یہ بات ان کی آن اور شان کے خلاف ہی تھی لیکن چاروناچار انھیں خان جہاں خاں کو پیغام رسانی کا ذریعہ بنانے پر مجبور ہوئے۔ اس لیے کہ اس وقت "تسبیح خانہ" کی داروغگی حاصل ہونے کے بعد ہی شاہی خلوت خاص میں در آسکتے تھے۔

ناچار از نواب سراج الدولہ بہادر کہ در آں اوقات فقط محمد خان جہان خطاب و عہدہ داروغگی "تسبیح خانہ" و چیکاری دیوان خانہ داشت و بمقام معینہ خویش نشستہ خواہش توسط عرض مدعا نمود[1]

محمد خان جہاں گو کہ مرعوب خاطر تھے تاہم موقعہ کی اہمیت سمجھ کے بڑھے اور عرض مدعا گزار نے یہ عصر و مغرب کا درمیانی وقت تھا، اور بادشاہ کا معمول تھا کہ اس وقت ذکر خدا اور رسول کے سوا کوئی اور بات زبان سے نہ نکالیں۔ محمد خان جہاں کی عرضداشت سن کے ساکت و صامت رہے، ادھر یہ عرض مدعا کرتے رہے اور ادھر بادشاہ

---

[1] حوالہ سابق الذکر۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم واللہ اکبر

کے ورد و وظیفہ میں لگے تھے۔ جواباً ان کے کان میں یہ آوازیں آئیں ان سے کچھ خفی اشارات کا انتزاع کرکے اور صاف جواب سے مایوسی حاصل کرکے الٹے قدموں واپس ہوئے اور وزیر سے کہا

رحمٰن خان و رحیم خان دو رسالہ دار خاص چوکی کا با رسالۂ اکبری متعین حضور با اعانت لشکر رواں گردیدہ[1]

وزیر اسد اللہ خان نے محمد خان جہاں کی یہ گفتگو سنتے ہی رحمٰن خان اور رحیم خان نامی دونوں رسالداروں کو طلب کیا اور شاہی محافظ دستہ یعنی رسالۂ اکبری کے ہمراہ معہ افواج ماتحت فوراً محاذ پر روانہ کر دیا۔

عالمگیر کا معمول تھا کہ عشا کی نماز کے بعد دربار منعقد کرتے اور نوبت بہ نوبت انواع و اقسام مشاغل ملکی پر متوجہ ہوتے۔ اسد اللہ خان کو اب موقعہ ہاتھ آیا کہ بجائے نیابتہً عرض کرنے کے اصالتہً ہی ماجرا گوش ہمایوں تک پہونچا دیں چنانچہ انھوں نے ان دونوں رسالداروں کی روانگی اور رسالۂ اکبری کی قیادت کا حال بے کم و کاست عرض کیا۔ بادشاہ نے اظہار تعجب کرکے فرمایا

"رسانندۂ حکم کیست و سند تحقیقش چیست"

وزیر نے تفصیل سے روداد بیان کی اور حقیقت حال سے آگاہ کر دیا۔ عالمگیر کی نگہ التفات محمد خان جہاں پر پڑی اور استصواب کیا۔ محمد خان جہاں نے کہا

"چون قرأت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم واللہ اکبر بعالم سکوت تسبیح خانہ خلاف معمول برابر عرض حال لشکر سامعہ نوازی فرمود بقیاس آنکہ فعل بادشاہی خالی از کار نہ باشد و کلام خسروی ہیچ گاہ سامع را بہرہ مقصود نہ نمود۔ درک فدوی کہ مستعد کامیابی بود از الفاظ متبرکہ مسعود اقتباس اشارات نام رسالہ داران و رسالہ مشخصہ نمود"

بادشاہ کو خان جہاں خان کی یہ درایت رسائی طبع اور پرواز ذہنی سن کے غیر معمولی مسرت اور خوشی و شادمانی ہوئی اور نہایت عمدہ اور اچھے الفاظ میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکے اور زبان

---

[1] مسعود ساقی

شاہی سے تحسین و آفرین کے وہ جملے نکلے جو شاید ہی پہلے نکلے ہوں اور افراط خوشی میں مزید دو ہزاری منصب اور دو ہزار سوار سے نواز دیا۔ اور اس پر مستزاد "بہادر" کا خطاب بھی عطا کیا۔

"بادشاہ ازیں معنی بہ بہایت مسرور او را مشمول احراز تحسین و آفرین ساخت و بعطائے خطاب والانامه ارش و بازدیاد خطاب "بہادر" و منصب دو ہزار و دو ہزار سوارش نواخت چنانچہ مخاطب "محمد خان جہان انوار الدین خان بہادر گردید۔"

محمد خان جہان کی اس رسائی طبع نے ان کا برابر ساتھ دیا اور یوماً فیوماً بادشاہ کے دل اور دماغ میں ان کے تقرب اور خصوصیت کے مدارج بڑھتے ہی چلے گئے۔

"در روز بروز پایۂ درجاتش بتصاعد گرائید و در زمان شاہ عالم بہادر شاہ خلف اکبر محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ انار اللہ برہانہ آرائش امورات عمدہ مقبول بارگاہ خلافت و مفتخر بافزائش منصب و خطاب "شہامت جنگ" گردید و در اوقات محمد شاہ بادشاہ بدرجۂ اعلائے امارت و ازدیاد مناصب و سازداری خطاب "سراج الدولہ" بعہدۂ نیابت وزیر رسید۔[۵]"

محمد شاہی عہد آیا تو فرمان شاہی کے مطابق نواب آصف جاہ نظام الملک بہادر کے ہمراہی اور رفاقت میں دکن تشریف لے گئے وہاں بھی مہام امور کے ذمہ دار قرار دیے گئے بادشاہ کی نظر استحسان نے انھیں صوبۂ حیدر آباد کی نظامت بالکلیہ تفویض کردی اور اس کا فرمان یوں جاری کیا گیا۔

"امارت و ایالت مرتبت رفعت و ابہت منزلت، شیر بیشۂ روز جنگ منہدم ساز بنیان شقاوت آہنگ دریائے شجاعت و مردانگی گوہر معدن معدلت و فرزانگی فدوی خاص باختصاص بے ریو رنگ سراج الدولہ محمد خان جہان انوار الدین خان بہادر شہامت جنگ بعنایات بادشاہانہ و نوازشات خسروانہ معزز و مباہی بودہ بداند کہ دریں ایام میمنت آغاز مسرت فرجام عرضداشت آں فدوی خاص باختصاص متضمن تاخت دیدہ شد

۵۔ مصدر سابق الذکر

بہادرانہ وکوشش مردانہ برگروہ شقاوت پژوہ وتحصیل زر بادشاہی از خیرہ سران نشاء بیراہی از نظر استادگان پایہ سریر خلافت بگزشت وباعث فراوان تحسین وموجب بیکران آفرین گشت"

(بیت) ایں کارانہ تو آید و مردان چنیں کنند
بر دست وبازوئے تو ہزار آفریں کنند

دریں اوان سعادت توامان وزمان بہجت اقتران انداہ خانہ زاد پروری وقدوی نوازی آں لائق العنایات والاحسان را بہ صوبہ داری فرخندہ بنیاد حیدرآباد سرفراز وسربلند فرمودیم۔

باید کہ شکر سپاسی ایں مواہب عظمی بہ تقدیم رسانیدہ در تنسیق وتنظیم امور صوبہ بارکہ مذکور سرگرم نوکری بادشاہی باشد وعنایات ونوازشات مابدولت واقبال بر حال خود روزافزوں داند"

اس کے بعد محمد جان جہان کو صوبہ ارکاٹ کی نظامت بھی سپرد کی گئی یشاعر زمانہ محمد اسمٰعیل خاں ابجدی نے اپنی ایک منظوم تصنیف "انورنامہ" میں اس اعزاز کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

چون نواب ما انورالدین امیر
بحکم شہنشاہ روشن ضمیر
گرفتہ نظامت ز آصف نژاد
ہماں ملک کرناٹک زیرباد

ستتر سال کی عمر تھی کہ ۱۱۶۳ھ میں رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔

ان کی اولاد ذکور میں یہ پانچ اشخاص آتے ہیں۔

۱۔ نواب عبدالسلام "افراسیاب خاں بہادر۔
۲۔ نواب محمد محفوظ خاں "شہامت جنگ" بہادر
۳۔ نواب امیرالہند والاجاہ محمد علی خاں "دلاور جنگ" ظفر جنگ بہادر۔
۴۔ نواب نصیرالدولہ عبدالوہاب خاں "نصرت جنگ" بہادر

(باقی صفحہ (۳۲) پر ملاحظہ ہو)

پاکستانی خریداروں سے

۱۔ ستمبر ۶۵ء میں آپ حضرات کو "حضرت مولانا محمد یوسف نمبر" روانہ کیا گیا تھا مگر جنگ چھڑ جانے کے باعث وہ عرصے کے بعد دفتر کو واپس آگیا۔ آپ سب کے لیے نمبر کی کاپیاں محفوظ ہیں۔ مگر یہ اس خیال سے نہیں بھیجی جا رہی ہیں کہ اس عرصے میں پتہ نہیں آپ میں سے کتنوں کا پتہ بدل گیا ہو۔ پتے میں کسی تبدیلی کی اطلاع کا انتظار ۳۱ مارچ تک کر کے یکم اپریل کو یہ کاپیاں روانہ کر دی جائیں گی۔ جو حضرات نمبر کے لیے رجسٹری فیس 55 / پیسے لاہور کو بھیج کر اطلاع دیدیں گے اُن کی کاپی بلا انتظار روانہ کر دی جائے گی — ایک مقام کے خریدار اگر ایک ساتھ اپنی کاپیاں منگائیں تو ایک رجسٹری فیس ہی کافی ہے۔

۲۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ڈاک کب تک بند رہے گی۔ اس لیے نمبر کے بعد آپ کے حصے کا رسالہ نہیں چھپوایا جاتا تھا۔ اس لیے ان درمیانی پرچوں کی فرمائش صرف وہ حضرات کریں جو فائل رکھتے ہیں۔ باقی خریداروں کی مدت خریداری میں اضافہ کر دیا جائے گا۔

۳۔ جن حضرات کو اس پرچے میں صفحۂ اوّل پر سُرخ نشان سے ختم مدت کی اطلاع دی جا رہی ہے وہ وی، پی کا انتظار نہ فرمائیں بلکہ فوراً زرِ سالانہ مع رجسٹری فیس برائے نمبر (مبلغ 7/50) لاہور کو بھیج کر ایک کارڈ کے ذریعے ہمیں اطلاع دے دیں۔

۴۔ لاہور کو چندہ وغیرہ بھیجتے وقت اور ہمیں اطلاع دیتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ انتہائی ضروری ہے۔ یہ نمبر آپ کے پتے کے ساتھ لکھا یا چھپا ہوتا ہے۔

(منیجر)

الفرقان کی ملکیت اور دیگر تفصیلات

فارم نمبر ۴

(دیکھئے رول نمبر ۸)

۱۔ مقام اشاعت — کچہری روڈ لکھنؤ — ۲۔ وقفہ اشاعت — ماہانہ

۳۔ پرنٹر کا نام
۴۔ پبلشر کا نام
۵۔ ایڈیٹر کا نام
۶۔ مالک کا نام

} محمد منظور نعمانی

شہریت — ہندوستانی — پتہ — کچہری روڈ لکھنؤ

میں (محمد منظور نعمانی) اعلان کرتا ہوں کہ مذکورۂ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کی حد تک بالکل صحیح ہیں۔

دستخط محمد منظور نعمانی

۲۸ فروری ۶۶ء

کتب خانہ الفرقان کی مختصر فہرست

یکم جنوری ۱۹۶۶ء مطابق رمضان ۱۳۸۵ھ

ہماری اپنی مطبوعات

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے

قیمت ۳۷/-

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

دوسری دفعہ نظر ثانی اور مفید اضافہ و ترمیم کے بعد چھپا نیا ایڈیشن (انگریزی اور ہندی ایڈیشن بھی تیار ہو چکا ہے) اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو کوئی خاص مقبولیت و تاثیر عطا فرمائی ہے۔ اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کیلئے یہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور عمل ان شاء اللہ کافی ہے۔ زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت شیریں اور پر تاثیر، کتابت و طباعت اعلیٰ اور معیاری ..... مجلد ۲/۵۰

ہندی ایڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد ۳/- ، انگریزی ایڈیشن ۵/-

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اسکی روح و حقیقت سے واقف ہونے کیلئے اور اپنی نماز میں خشوع کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں کلمۂ طیبہ کی حقیقت کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے

قیمت ۱/-

معارف الحدیث

یعنی احادیث نبوی کا ایک جدید مجموعہ، مع ترجمہ و تشریح

جو دور حاضر کے مسلمانوں کی ذہنی و فکری حالت کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔

احادیث نبوی کی جو اصل غرض و غایت اور روح ہے یعنی اصلاح و ہدایت اور تزکیہ و تربیت، مؤلف نے پوری کوشش کی ہے کہ یہی غایت مقصود اس کتاب کی بھی رہے اور ارشادات نبوی کے جو اثرات صحابۂ کرام پر پڑتے تھے ان کا کوئی عکس اس کتاب کے ناظرین پر بھی پڑے۔ اس کے ساتھ ہر حدیث سے متعلق سوالات کے علمی و تحقیقی جوابات عام فہم انداز میں۔ ابھی تک تین جلدیں تیار ہو گئی ہیں۔

جلد اول ـــــ ایمان و آخرت کے بیان کی حدیثیں

قیمت مجلد ۴/- غیر مجلد ۳/-

جلد دوم ـــــ تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کی حدیثیں

قیمت مجلد ۴/۵۰ غیر مجلد ۳/۵۰

جلد سوم ـــــ طہارت اور نماز کے ابواب کی حدیثیں

قیمت مجلد ۵/- ، غیر مجلد ۴/-

اسلام و کفر کے حدود اور قادیانیت

از مولانا نعمانی

قیمت ۵۰/-

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

از مولانا نعمانی

قیمت ۵۰/-

برکات رمضان

از مولانا محمد منظور نعمانی

اسلام کے اہم رکن صوم رمضان اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال۔ وظائف، تراویح، اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور انکی روحانی تاثیرات کا نہایت مؤثر شوق انگیز بیان اور حکیم امت شاہ ولی اللہ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے عقل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن

قیمت ۔۔۔ ۷۵/-

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید اصغر حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے شروع میں مولانا نعمانی کی طرف سے پیش لفظ ہے۔

قیمت ۔۔۔ ۷۵/-

حضرت مولانا محمد الیاس رح اور ان کی دینی دعوت

تالیف: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی شروع میں علامہ سید سلیمان ندوی کا فاضلانہ مقدمہ قیمت مجلد -/۳

غیر مجلد ۲/۵۰

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس رح

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔ ۱/۵۰

امام ولی اللہ دہلوی رح از مولانا عبید اللہ سندھی قیمت -/۱

دین و شریعت

از: مولانا محمد منظور نعمانی

یہ "اسلام کیا ہے؟" سے اونچی سطح کی کتاب ہے جس میں توحید، آخرت اور رسالت، نماز، روزہ اور زکوٰۃ و حج، اخلاق و معاملات، دعوت جہاد، سیاست و حکومت، اور احسان و تصوف کے مباحث پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ اور عقل و وجدان ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے ارباب نظر نے اس کو اسلام پر ایک تشفی بخش اور جامع و مانع کتاب قرار دیا ہے۔ کتابت و طباعت معیاری۔۔۔۔ قیمت مجلد۔۔۔۔۔۔۔۔ -/۳

دین و شریعت کا انگریزی اڈیشن بھی تیار ہو گیا ہے مجلد ۲/۵۰

آپ حج کیسے کریں؟

(مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی)

(مفید اضافات کے ساتھ جدید اڈیشن)

حج و زیارت کے موضوع پر اب تک اردو میں بیشمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب اپنی اس خصوصیت میں اب بھی ممتاز اور منفرد ہے کہ حج کے احکام اور اس کا پورا طریقہ بھی یہ بہت آسان اور دلنشین طریقے پر بتاتی ہے اور ذوق و شوق اور عشق کا وہ جذبہ بھی پیدا کرتی ہے جو حج کی روح اور جان ہے۔ قیمت مجلد -/۲

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

از مولانا محمد منظور نعمانی

قرآن پاک نے نوع انسانی کو جن چیزوں کی طرف خاص دعوت دی ہے یہ کتاب قرآن پاک کی اس دعوت و پکار کی ترجمان ہے۔ ۵۰ ابواب میں متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور مدلل پر زور تشریحات کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ مجلد ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ -/۲

مکتوبات خواجہ محمد معصوم رح

حضرت مجدد الف ثانی رح کے بعد آپ کی مسند اصلاح و ہدایت کو آپ کے خلیفہ اور صاحبزادے خواجہ محمد معصوم رح نے سنبھالا اور آپ کے کام کو تکمیل تک پہونچایا۔ آپ ہی کی تربیت نے اورنگ زیب عالمگیر رح کو تخت حکومت پر مجاہد فی سبیل اللہ اور ذاتی زندگی اور معاشرت میں فقیر بنایا آپ کے مکتوبات کا جو ذخیرہ فارسی میں تھا اس کو تلخیص کے ساتھ اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ قیمت مجلد -/۳

تذکرہ مجدد الف ثانی رح

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رح کے اس عظیم تجدیدی کارنامے کی تعیین و تفصیل جس کی وجہ سے امت نے آپ کو بجائے ایک صدی کے پورے ایک ہزارے کا مجدد مانا۔ اس کے علاوہ آپ کی سوانح حیات اور دین کی راہ میں قربانیاں اور اسلام میں مقام تجدید کی حقیقت۔

(یہ الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر کا کتابی اڈیشن ہے)

قیمت ۔۔۔۔ مجلد ۔۔۔۔ -/۴

آسان حج

اسے آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں" کا مکمل خلاصہ سمجھئے کم تعلیم یافتہ حضرات کے لیے حج کا بہترین معلم اور رہنما ہے جیبی سائز آفسٹ کی بہترین طباعت، جدید اڈیشن۔ قیمت -/۶۰

شاہ اسمٰعیل شہید رح اور معاندین کے الزامات

مولانا محمد منظور نعمانی کے قلم سے ان الزامات کا تحقیقی جواب۔

قیمت ۔۔۔۔ -/۷۵

فیصلہ کن مناظرہ

اکابر علماء دیوبند پر مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے [illegible] الزامات کا محققانہ جواب مولانا نعمانی کے قلم سے [illegible]

ہندوستان کا پہلا سفرنامہ حجاز۔ از حاجی رفیع الدین صاحب مرادآبادی رح۔ ترجمہ مولانا نسیم احمد صاحب فریدی [illegible]

دوسرے اداروں کی قابل مطالعہ کتابیں

قرآن پاک سے متعلق

قاموس القرآن

از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی۔ تمام الفاظ قرآنی کے معانی اور ان کی مکمل صرفی و نحوی تشریح اور اہم الفاظ پر مدلل و مفصل نوٹ۔ ۸۰۰ صفحات

قیمت مجلد -/۹

قصص القرآن

از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مرحوم — قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے جو عبرت آموز واقعات بیان ہوئے ہیں، علمی، تاریخی، اور جغرافیائی مباحث کے ساتھ ان کی پوری تحقیق، مکمل چار جلدوں میں

جلد اول -/۵ ، جلد دوم -/۴

جلد سوم ۵/۵۰ ، جلد چہارم -/۶

مجلد کے لیے فی جلد -/۱ کا اضافہ

قرآنی شخصیتیں

از مولانا عبدالماجد دریابادی

قرآن مجید میں جن شخصیتوں کے نام آئے ہیں ان کا مختصر تحقیقی تعارف

قیمت ۲/۲۵

حیوانات قرآنی

از مولانا دریابادی۔ قرآن پاک میں مذکورہ حیوانات کا تذکرہ اور ضروری معلومات۔ -/۲

جغرافیہ قرآنی

قرآن مجید میں مذکورہ مقامات و [illegible] ۱/۲۵

قصص و مسائل

[illegible] قیمت -/۱

بشریت انبیاء

قرآن مجید سے بشریت انبیاء علیہم السلام کا قابل دید اثبات۔ از مولانا دریابادی۔ قیمت ۲/۲۵

فہم قرآن

از مولانا سعید احمد اکبر آبادی

مدلل طور سے بتایا گیا ہے کہ بغیر حدیث کے قرآن پاک کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

قیمت ۲/۲۵

وحی الٰہی

از مولانا اکبر آبادی قیمت -/۲

قرآن اور تعمیر سیرت

از ڈاکٹر میر ولی الدین ایم اے پی، ایچ، ڈی۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات ضرور مطالعہ کریں۔

مجلد -/۶ غیر مجلد -/۵

قرآن اور تصوف

از ڈاکٹر ولی الدین قیمت -/۳

لغات القرآن

اردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ و لغات کی مفصل تشریح۔ جلد اول -/۵ دوم -/۵

سوم ۵/۵۰ چہارم -/۵

مجلد کے لیے فی جلد ایک روپیہ [illegible]

[illegible] قیمت -/۱

حدیث پاک سے متعلق

بخاری شریف کامل (اردو)

تین جلدوں میں۔ مجلد -/۲۵

زبدۃ البخاری

اسانید اور مکررات حذف کر کے بخاری شریف کی احادیث کا ترجمہ۔ -/۱۲

ترمذی شریف (اردو)

دو جلدوں میں۔ مجلد -/۱۶

مشکوٰۃ شریف (اردو)

دو جلدوں میں۔ مجلد -/۱۶

مختصر شعب الایمان

از امام بیہقی۔ ترجمہ اردو قیمت -/۱

جنت کی کنجی

مولانا احمد سعید دہلوی ۳/۲۵

دوزخ کا کھٹکا

مولانا احمد سعید صاحب ۲/۲۵

بستان المحدثین

کتب حدیث کا تعارف اور ائمہ حدیث کا تذکرہ۔ از شاہ عبدالعزیز صاحبؒ۔ قابل دید کتاب ہے۔ مجلد -/۵

شرح شمائل ترمذی

از شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا دام ظلہ، علمی اور تحقیقی ہونے کے ساتھ بڑی پر تاثیر کتاب ہے قیمت -/۷

ترجمان السنہ

از حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ اردو میں حدیث کی نہایت [illegible]

شرح ہے۔ جلد اول -/۸

جلد دوم -/۹ جلد سوم ۱۰/۵۰

مجلد کے لیے فی جلد -/۲ کا اضافہ

الادب المفرد (ترجمہ اردو)

امام بخاریؒ کا مرتب کردہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات کا قابل دید مجموعہ [illegible]

کتاب الآثار (مترجم اردو)

قیمت .... -/۶

موضوعات کبیر

موضوع حدیثوں کے بیان میں ملا علی قاریؒ کی مشہور کتاب کا اردو ترجمہ ۸/۲

فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا مختصر رسالہ تفصیلی شرح کے ساتھ

قیمت -/۱۵

لغات الحدیث (اردو)

مشہور خادم حدیث مولانا وحید الزماں صاحبؒ کی مرتب کردہ [illegible] حدیث جو اپنے موضوع پر اساتذہ اور طلبہ کے لیے لاثانی [illegible] چھ ضخیم جلدوں میں

قیمت مکمل -/۴۲

مختصر شمائل ترمذی

قیمت [illegible]

تاریخ و سیرت

رحمۃ للعالمین [کامل ۳ جلد]

از قاضی سلیمان منصور پوری رح
سیرت پر بے نظیر مقبول اور محبت آفریں کتاب ہے۔ تعارف سے بے نیاز ہو۔ قیمت کامل -/۲۰

اسلام (آغاز و ارتقا)

(از حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی)
قیمت -/۶

اصح السیر

مولانا عبدالرؤف دانا پوری مرحوم کی تالیف کردہ نہایت محققانہ اور مستند سیرت نبویؐ۔ قیمت -/۱۰

خطبات مدراس

حیات نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر علامہ سید سلیمان ندوی رح کے خطبات جو مرحوم کے علم و تحقیق کا نچوڑ ہیں
قیمت -/۳

رحمت عالم

از مولانا سید سلیمان ندوی رح
یہ کتاب خاص طور سے مدارس اور اسکولوں کے طلبہ کے لیے لکھی گئی تھی
قیمت - ۱/۷۵

سیرت محمدیہ

از سر سید احمد خان مرحوم
صوبہ یو۔ پی کے ایک انگریز گورنر سر ولیم میور نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک کتاب لائف آف محمد لکھی تھی جو زہر افشانیوں اور افترا پردازیوں سے لبریز تھی۔ سر سید مرحوم نے لندن میں بیٹھ کر اسکے جواب میں "سیرت محمدیہ" لکھی۔ تاریخی اور معرکۃ الآرا کتاب ہو قیمت مجلد -/۱۲

سیرۃ الرسول

مصری فاضل ڈاکٹر محمد حسین ہیکل کے قلم سے۔ ترجمہ مولانا محمد وارث کامل۔ قیمت - -/۱۲

صدیق اکبر

از مولانا سعید احمد اکبر آبادی
مولانا شبلی مرحوم کے "الفاروق" کے بعد اردو زبان میں سیرت صدیق اکبر کا جو خلا محسوس ہوتا تھا اسکو اس کتاب نے کما حقہ پر کر دیا ہو۔ ندوۃ المصنفین کی شائع کردہ ہے۔ قیمت -/۸

حضرت ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط

بڑی فاضلانہ قابل مطالعہ کتاب ہے -/۵
حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط مجلد -/۸

تاریخ ملت

شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی
عہد رسالت سے سلاطین ہند تک گیارہ حصوں میں
قیمت مکمل سٹ غیر مجلد ۳۱/۵۰ مجلد [illegible]

ترجمہ تاریخ الخلفاء (سیوطی)

خلافت راشدہ سے مصر کے فاطمی خلفاء تک کی تاریخ
قیمت - -/۱۲

خلافت بنو امیہ

امام ابن الاثیر جزری کی تاریخ کامل سے اردو ترجمہ از سید ہاشم ندوی۔ خلافت بنو امیہ کے بارے میں سوچنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہو۔ دور بنی امیہ کا سارا سیاہ و سفید آپ کو اس میں ملے گا۔ حصہ اول ۴۱ھ سے ۹۳ھ تک قیمت ۹/۷۵
حصہ دوم ۹۳ھ سے ۱۳۲ھ تک۔ قیمت ۱۰/۷۵

تاریخ فاطمین مصر

از ڈاکٹر زاہد علی (آکسفورڈ) مصنف نے یہ کتاب خود فاطمی مصنفین کی قلمی کتابوں سے اخذ کرکے لکھی ہو۔ حصہ اول ۸/۷۵، حصہ دوم - ۸/۷۵

تاریخ فیروز شاہی

آٹھویں صدی ہجری کے ہندوستانی بادشاہ فیروز شاہ تغلق کی مکمل سوانح حیات اور اس کے پرشکوہ عہد حکومت (۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ) کا قابل اعتماد تذکرہ جو اسی دور کے ایک مصنف نے قلمبند کیا ہے (اردو ترجمہ) قیمت ۸/۲۵

خلفائے راشدین اور اہلبیت کے باہمی تعلقات

از مولانا احتشام الحسن کاندھلوی
قیمت ۱/۷۵

دعوت اسلام

مصنفہ سر تھامس آرنلڈ
ترجمہ از مولوی عنایت اللہ دہلوی
پڑھنے کے قابل کتاب ہو۔ -/۹

تاریخ فلاسفۃ الاسلام

تصنیف محمد لطفی جمعہ
ترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین پی ایچ ڈی
کندی، فارابی، بو علی سینا، امام غزالی، ابن رشد، ابن خلدون جیسے فلاسفۂ اسلام کے حالات اور ان کے خاص افکار و نظریات اور دنیا پر ان کے اثرات۔ قیمت ۸/۷۵

علمائے اسلام

از مولانا عبدالسلام ندوی۔
کامل -/۱۲

ہزار سال پہلے

از مولانا سید مناظر احسن گیلانی رح
چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے سیاحوں نے جو کچھ اپنے سفر ناموں اور تالیفات میں لکھا مولانا گیلانی مرحوم کے ذہن رسا نے ان سے اخذ کرکے یہ مرقع مرتب کیا تھا۔
قیمت ۴/۲۵

نظام الملک طوسی

قیمت -/۱۲

حیات انور

سوانح حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ [illegible]

مغلیہ دورِ حکومت

چار حصوں میں

یعنی خافی خان نظام الملک کی "منتخب اللباب" کا اردو ترجمہ

از محمود احمد فاروقی

حصہ اول۔ بابر سے جہانگیر تک ۵۰/۷

حصہ دوم۔ دور شاہجہانی ۲۵/۸

حصہ سوم۔ دور عالمگیری ۱۱/-

حصہ چہارم۔ شاہ عالم سے محمد شاہ تک ۱۰/-

اقبال نامہ جہانگیری

جہانگیر کے دورِ حکومت کی مکمل تصویر

تصنیف معتمد خاں بخشی ترجمہ محمد زکریا

مائل۔ قیمت مجلد ۶/۰۵

شاہجہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیب

مصنفہ ڈاکٹر برنیر (فرانسیسی)

ترجمہ خلیفہ محمد حسین قیمت ۱۲/-

مآثر عالمگیری

ترجمہ مولوی فدا علی طالب ۹/۷۵

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات

از پروفیسر خلیق احمد نظامی

قیمت مجلد ۱۰/- غیر مجلد ۸/-

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

رفیق دار المصنفین ۶/۰

بزم صوفیہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن ۱۳/۵۰

ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن ۳/۲۵

گجرات کی تمدنی تاریخ

(مسلمانوں کے عہد میں)

مولانا ابو ظفر ندوی ۶/۰

مختصر تاریخ ہند

مولانا ابو ظفر ندوی قیمت۔

سفینۃ الاولیاء

از۔ دارا شکوہ۔ ترجمہ اردو ۵/۷۵

مقدمہ ابن خلدون

فلسفہ تاریخ پر عدیم النظیر کتاب اردو ترجمہ متعلقہ نقشوں اور تصویروں سے مزین، قیمت ۱۵/-

تاریخ غرناطہ

لسان الدین محمد الخطیب الغرناطی کی کتاب "الاحاطہ فی اخبار غرناطہ" کا سلیس اردو ترجمہ۔ از حکیم احمد اللہ ندوی قیمت ۱۱/-

خلیفہ عبد الرحمٰن الناصر

اندلس میں اسلامی حکومت کی صبح درخشاں خلافت بعد مرکزی انتشار کے طلوع ہوئی تو عبد الرحمٰن الناصر کا صبح نصف النہار تھا۔ ۵/۵۰

سفرنامہ ابن بطوطہ مکمل

ترجمہ رئیس احمد جعفری قیمت ۱۲/۵۰

امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی

(از مولانا گیلانی مرحوم)

قیمت مجلد ۱۲/-

سیرت ائمہ اربعہ

قیمت

سیرۃ النعمان

(از علامہ شبلی نعمانی)

قیمت مجلد ۴/- غیر مجلد ۳/-

امام اعظم ابو حنیفہ

از مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری

قیمت ۱/۷۵

آئینہ حقیقت نما

از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

انگریزوں نے سیاسی اغراض کے تحت مسلمان بادشاہوں کے ظلم و ستم کی جو داستانیں تاریخ کا جزو بنا دی تھیں جنھوں نے ہندوؤں کو آج تک مسلمانوں کا دشمن بنا رکھا ہے مؤلف نے اس کتاب میں ان سب کا پردہ چاک کیا ہے ۱۲/-

تاریخ دعوت و عزیمت

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی مشہور کتاب جو مجددین و مصلحین امت کے تذکروں پر مشتمل ہے۔

جلد اول۔ پہلی صدی ہجری سے ساتویں صدی تک، جلد دوم آٹھویں صدی کے جلیل القدر مجدد امام ابن تیمیہ اور ان کے تلامذہ کی خدمات و حالات، جلد سوم حضرت نظام الدین اولیاء و خواجہ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کے کمالات اور اصلاحی و تجدیدی کارناموں کی تفصیل ہے، قیمت جلد اول زیر طبع

جلد دوم ۵/۰۰ جلد سوم ۵/-

حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی

از پروفیسر خلیق نظامی مجلد ۶/-

تذکرہ شیخ محمد طاہر پٹنی رح

قیمت ۱/۵۰

تذکرۃ الرشید (کامل ۲ جلد) از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی قیمت ۸/-

سوانح قاسمی (کامل ۳ جلد)

از مولانا گیلانی رح۔ قیمت ۱۵/-

تذکرۂ شیخ الہند رح

از مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ ۲/۵۰

حیات امام ابن القیم رح

بالکل نئی اور بلند پایہ کتاب قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ عبد العظیم شرف الدین کے قلم سے، مترجمہ سید رشید احمد ارشد۔ قیمت ۱۲/-

سوانح حضرت رائے پوری رح

امام ارشاد و معرفت حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری قدس سرہ کی سوانح حیات مولانا ابو الحسن علی ندوی کے قلم سے قیمت مجلد ۵/-

تذکرہ حضرت شاہ فضل رحمٰن رح

از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

قیمت ۲/۵۰

سیرت مولانا محمد علی مونگیری رح

مولانا مونگیری رح کی یہ سیرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی رہنمائی میں مولانا سید محمد حسنی اڈیٹر تعمیر حیات نے لکھی ہے۔ قیمت۔ مجلد ۶/-

مسلمانوں کا عروج و زوال

از مولانا سعید احمد اکبر آبادی

قیمت مجلد ۸/-

پیغمبر عالم ۔ مولانا عبدالصمد رحمانی ۵/۲۵
اسوۂ حسنہ ۔ مولانا ظفیر الدین مفتاحی ۳/-
حیات الصحابہ ۔ مولانا محمد یوسف (ترجمہ)
حصہ اول تا ہفتم ۲۲/-
اشاعت اسلام ۔ مولانا حبیب الرحمن
دیوبندی ۶/-
سوانح ابوذر غفاریؓ ۔ مولانا مناظر احسن
گیلانی ۲/-
الفاروق ۔ علامہ شبلی نعمانی ۸/-
المامون ۔ " " ۳/۷۵
الغزالی ۔ " " ۵/۲۵
آثار امام شافعیؒ ۔ شیخ ابو زہرہ
مصری ۱۲/-
العلم والعلماء ۔ مترجمہ مولانا عبدالرزاق
ملیح آبادی ۵/۵۰
آپ بیتی ۔ ظفر حسن ایبک ۵/-
انفاس قدسیہ ۔ مفتی عزیز الرحمن
بجنوری ۳/-
المدنیؒ ۔ مولانا راحت گل ۲/-
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و
زوال کا اثر ۔ مولانا ابوالحسن علی
ندوی ۸/۵۰
تاریخ اسلام پر ایک نظر ۔ مولوی
عبدالرحمن خاں ۔ ۶/۵۰
انقلاب روس ۔ م ۔ م ۔ جوہر ۷/-
بزم تیموریہ ۔ صباح الدین عبدالرحمن ۸/-
ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء
مفتی انتظام الدین شہابی ۱/۲۵
اسلام کی بہادر بیٹیاں
مسعودہ بیگم صاحبہ ۱/۵۰
تجلیات عثمانی ۔ پروفیسر انوار الحسن
شیرکوٹی ۱۰/۵۰
تزک تیموری ۔ سید ہاشم ندوی ۴/-
تذکرہ علمائے ہند ۔ از مولانا رحمٰن علی
صاحب ۔ ترجمہ محمد ایوب قادری ۱۸/-
تذکرہ امام غزالیؒ ۔ مولوی
مطیع الحق ۴/-

تذکرۂ شیخ مدنیؒ ۔ مولانا
راشد احمد عثمانی ۲/-
تواریخ حبیب اللہ ۔ مفتی
عنایت احمد ۲/-
حضرت معاویہ کی سیاسی زندگی
سید علی احمد عباسی
حالات مشائخ کاندھلہ
مولانا احتشام الحسن ۲/۵۰
حیات امداد ۔ پروفیسر انوار الحسن ۴/-
حیات وحید الزماں ۔ مولانا
عبدالحلیم چشتی ۴/-
حضرت مجدد الف ثانی ۔ ڈاکٹر
غلام مصطفیٰ خاں ۔ ۰/۷۵
سیر فریدیہ ۔ سر سید احمد خاں ۲/-
شاہ محمد غوث گوالیاری ۔ پروفیسر
محمد مسعود احمد ۶/۵۰
شہید کربلا پر ۔ قاضی زین العابدین
سجاد میرٹھی ۱/-
صحابہ کی انقلابی جماعت ۔ مولانا
عبدالصمد رحمانی ۲/۲۵
فاطمہ کا جہاز ۔ " " ۲/۲۵
علماء حق اور ان کی داستانیں
مفتی انتظام اللہ شہابی ۱/۲۵
فدرسکے چند علماء " " ۱/۵۰
غلامان اسلام ۔ مولانا سعید احمد
اکبرآبادی ۸/-
مخدوم جہانیاں جہاں گشت
محمد ایوب قادری ۷/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا
فوجی نظام
صباح الدین عبدالرحمن ۸/-
ہماری بادشاہی ۔ مولانا
عبدالسلام ندوی ۳/-
عہد اموی کا ہندوستان
(ترجمہ یونس احمر) ۱۲/-
عرب دنیا ۔ (سجاد احمد زبیری)
ترجمہ ۔ ۱۲/-

علمائے ہند کا شاندار ماضی

مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم
جمعیۃ علمائے ہند کی شہرۂ آفاق
کتاب کا آخری ایڈیشن قیمت ۵۰/-

علمائے صادقپور

از مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ
قیمت ۲/-

اسلامی حکومت کے نقش و نگار

مولانا ظفیر الدین مفتاحی
قیمت ۱/۷۵

تذکرۂ شاہ ولی اللہ

حضرت شاہ صاحبؒ کا سیاسی
ماحول اور ان کی علمی و تجدیدی خدمات
مولانا سید مناظر احسن کے قلم سے
قیمت ۔ ۴/۲۵

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

مصنفہ سید خورشید مصطفیٰ بی ۔ ایس
سی ۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں
اہل وطن کا جذبۂ ایثار و قربانی اور
اس کی واقعاتی تصویر پیش کرنے میں
یہ کتاب بے نظیر ہے ۔ قیمت ۔ ۸/-

۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ

قیمت مجلد ۵۰/۳ غیر مجلد ۲/۵۰

نقش حیات

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی
خود نوشت سوانح عمری جو حضرت
شیخ الہندؒ کی مجاہدانہ سرگزشت کا
بھی آئینہ ہے ۔
جلد اول ۔ ۵/- جلد دوم ۲/۵۰

مختلف موضوعات پر قابل مطالعہ کتابیں

اسلام اور مغربیت کی کشمکش

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
قیمت ۵/-

اسلام اور عربی تمدن

شاہ معین الدین احمد ندوی
قیمت

جمع و تدوین قرآن

سید صدیق حسن آئی سی ایس مرحوم
قیمت

بدعت کیا ہے

ردِ بدعت میں کئی عمدہ مقالوں کا
مجموعہ ۔ قیمت ۳/-

اسلام کا نظام حکومت

قیمت غیر مجلد ۶/- ، مجلد ۷/-

مسلمانوں کا نظم مملکت

قیمت غیر مجلد ۵/۵ مجلد ۶/۵

اسلام کا اقتصادی نظام

از مولانا حفظ الرحمن مرحوم مجلد ۸/-

اسلام کا زرعی نظام

قیمت غیر مجلد [illegible] مجلد [illegible]

اسلام کا نظام حکومت [illegible]

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم ۹/-

اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی ۶/-

علم جدید کا چیلنج۔ وحید الدین خاں صاحب ۵/-

اسلام اور مسیحیت۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری ۲/۵۰

آئینۂ تثلیث۔ مولانا کوثر نیازی قیمت ۱/۲۵

حضرت مسیح علیہ السلام۔ مولانا محمد مالک کاندھلوی ۲/-

آیات بینات۔ نواب محسن الملک مرحوم ۱۸/-

تحفۂ اثنا عشریہ۔ شاہ عبد العزیز رح ۱۵/-

تقویۃ الایمان۔ شاہ اسمٰعیل شہید رح ۴/-

اثبات النبوۃ۔ مجدد الف ثانی رح ۲/-

اعلام مرفوعہ (طلقات ثلثہ) مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی -/۷۵

رکعات تراویح ،، ،، ۱/۵۰

اصول تفسیر (ترجمہ) امام ابن تیمیہ ۱/۲۵

اصول حدیث۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی -/۲۵

براہین قاطعہ۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوری ۵/-

اسلامی سیاست۔ مولانا [illegible] ۳/-

اسلامی معاشرت۔ مفتی انتظام اللہ شہابی ۱/۲۵

اسلام اور نظام سرمایہ داری [illegible] -/۵۰

تاریخ علم فقہ۔ مفتی عمیم الاحسان ۲/۲۵

[illegible]

تقریر دلپذیر۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی ۲/۵۰

تقریر سیرت اول۔ مولانا احمد سعید دہلوی ۱/۷۵

تقریر سیرت دوم ،، ،، ۲/۵۰

تہذیب و تمدن اسلامی۔ رشید اختر ندوی ۶/-

تزکیۂ نفس۔ مولانا امین احسن اصلاحی ۶/-

تحقیق مذاہب۔ مولانا مطیع الحق صاحب دیوبندی ۲/-

تبلیغ دین۔ امام غزالی رح (ترجمہ) قیمت ۴/۵۰

تجلیات مدینہ۔ مولانا احتشام الحسن ۲/۵۰

تجلیات کعبہ ،، ،، ۳/-

جہاد اعظم کی تیاری۔ صوفی نذیر احمد کاشمیری ۲/-

حقوق الاسلام۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی ۲/-

خطبات بہادر یار جنگ ۴/۵۰

راہی اور رہنما۔ سید الطاف علی بریلوی ۶/-

رویت ہلال۔ مفتی محمد شفیع دیوبندی -/۶۲

رسول اللہ کے تین سو معجزات مولانا سعید احمد اکبرآبادی ۱/۷۵

عقائد اسلام۔ مولانا عبد الحق حقانی مرحوم ۳/-

اعیان الحجاج۔ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ۲/۵۰

رہنمائے قرآن۔ نواب نظامت جنگ مرحوم ۱/-

عروج و زوال کا الٰہی نظام مولانا محمد تقی امینی ۳/-

مسئلۂ اجتہاد ،، ،، ۳/-

[illegible]

اسلام کا نظام مساجد ۲/۵۰

اسلام کا نظام اراضی ۷/۵۰

حجۃ اللہ البالغہ حضرت شاہ ولی اللہ (مترجم) ۲۰/-

فتاوی

فتاوی مولانا عبد الحی کامل قیمت ۱۸/-

فتاوی دار العلوم دیوبند مکمل مرتبہ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ ۲ ضخیم جلدوں میں قیمت کامل مجلد ۳۶/-

فتاوی رشیدیہ کامل ۸/-

بہشتی زیور۔ ۱۳/۵۰

تصوف

مفتاح العلوم شرح مثنوی مولانا روم رح مولانا نذیر احمد عرشی ۹۱/-

الرسالۃ القشیریہ (عربی) ۱۶/-

مقالات احسانی۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی رح ۶/-

عبقات (عربی) از شاہ اسمٰعیل شہید۔ قیمت ۴/۵۰

ترجمہ عبقات (اردو) از مولانا گیلانی رح قیمت ۱۰/۵۰

انتخاب مکتوبات امام ربانی ۲/-

مکتوبات شیخ الاسلام (مدنی رح) مکمل ۳ جلد۔ اول ۹/- دوم ۶/- سوم ۴/۵۰

ارشادات شیخ الاسلام۔ مضامین و خطبات ۲/۵۰

بیان اللسان

عربی اردو ڈکشنری۔ از مولانا قاضی زین العابدین [illegible] مجلد [illegible]/-

تصانیف شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ

فضائل درود شریف حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی بالکل جدید تصنیف ہے۔ مطالعہ کر کے عشق و محبت کا ذائقہ حاصل کیجئے۔ قیمت ۱/۷۵

حکایات صحابہ ۱/۵۰

فضائل نماز -/۷۰

فضائل قرآن مجید -/۶۰

فضائل رمضان شریف -/۵۵

فضائل تبلیغ -/۳۰

فضائل حج ۲/۵۰

فضائل صدقات (مکمل مجلد) ۶/۵۰

بعض تصانیف حضرت حکیم الامت

تعلیم الدین مجلد ۱/۷۵

حیات المسلمین ،، ۱/۷۵

اصلاح الرسوم ،، ۱/۷۵

اعمال قرآنی ۱/۶۰

اشرف الجواب ۲/۲۵

دین کی باتیں ۲/۷۵

تصانیف مولانا عبد الباری ندوی

تجدید دین کامل ۶/-

معاشیات ۴/-

تجدید تصوف و سلوک ۶/-

تجدید تعلیم و تبلیغ ۳/-

نظام صلاح و اصلاح قیمت ۳/-

ALFURQAN (Regd N. L. 353) LUCKNOW.

Cover Printed at A.O. Press Aminabad Park, Lucknow.

33(12)
ترتیب
عتیق الرحمن

سالانہ چندہ
[دیگر م]مالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
۱½ پونڈ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

فی کاپی ...... ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

جلد ۳۳ | بابتہ ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ مطابق اپریل ۱۹۶۶ء | شمارہ ۱۲

اگر اس دائرہ میں ○ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ اپریل تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں، ڈاکخانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، ان کی اطلاع ۱۵ تاریخ تک آجانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

[illegible] محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

شیخ مصطفیٰ احمد زرقاء (استاذ دمشق یونیورسٹی) ہمارے اس دور میں عالم اسلام کے ممتاز اور نامور عالم دین ہیں، فقہ اور قانونِ اسلامی ان کا خاص موضوع ہے۔ گزشتہ سال رابطۂ عالم اسلامی کی دعوت پر جو مؤتمر مکۂ معظمہ میں حج کے موقعہ پر ہوئی تھی اس میں موصوف نے بھی ایک اہم مقالہ "دورِ حاضر میں اجتماعی اجتہاد کی ضرورت" پر پیش کیا تھا ـــ اس مقالہ کے ترجمہ کی پہلی قسط پچھلے مہینے کے الفرقان میں ناظرین کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں اور دوسری قسط جس پر مقالہ ختم ہو گیا ہے اس شمارہ میں شائع کی جا رہی ہے ۔ اس مقالہ کا جو اصل مقصد اور مدعیٰ ہے ہمارے خیال میں کسی صاحب علم و نظر کے لیے اس سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہو، لیکن شیخ موصوف نے اپنے اس مقالہ میں جہاں چند ایسے مسائل کا مثال کے طور پر ذکر کیا ہے جن میں ان کے نزدیک بحالات موجودہ اجتہاد کی خاص ضرورت ہے وہاں انھوں نے حج کی قربانی کو بھی انھی مسائل میں شامل کیا ہو۔ انھوں نے لکھا ہے کہ :-

"حج کے سلسلے میں ایک حل طلب مسئلہ یہ ہو کہ حجاج کی روز افزوں کثرت کی بنا پر جتنے بڑے پیمانے پر قربانیاں ہوتی ہیں ان کو فقراء و مساکین کے استفادہ کے لیے محفوظ کیے جانے کا کوئی انتظام فی الحال نہیں ہے جو کہ ان کا مصرف مقصود ہے، چنانچہ یہ ضائع بھی جاتی ہیں اور حجاج کے خیموں کے درمیان نیز عام راستوں پر اس سے مضر صحت گندگی بھی پھیلتی ہے۔ پس کیا اس وقت تک جب تک کہ ایک سائنٹفک مذبح کے لوازم، ذبیحہ کی نقل و حمل کے کافی وسائل، کولڈ اسٹوریج اور گوشت کو خشک کرنے کے کارخانوں کا انتظام نہ ہو جائے عارضی طور پر یہ جائز ہوگا کہ حجاج بجائے قربانی کرنے کے حرم ہی کے اندر قربانی کی قیمت نکال کر فقراء کو تقسیم کر دیں، اس لیے کہ شریعت اضاعت اور گندگی کو پسند نہیں کرتی اور اس میں عارضی طور کے استثنائی حالات کے لیے استثنائی احکام کا قاعدہ موجود ہے۔"

اگرچہ شیخ زرقاء نے یہ مسئلہ سوال ہی کے طور پر اور ایک عارضی ضرورت سے مشروط کر کے پیش کیا ہے، لیکن اس سے اتنا ضرور مفہوم ہوتا ہے کہ موصوف کے نزدیک اس کی گنجائش ہے۔

حیرت ہو کہ ان جیسے وسیع العلم اور بالغ النظر عالم دین نے اس کی گنجائش کیسے سمجھی۔ قربانی تو اسی طرح حج کے خاص اعمال اور مناسک و شعائر میں سے ہو جس طرح طوافِ بیت اللہ اور سعی بین الصفا والمروہ اور رمی جمار وغیرہ۔ اور اس میں غالباً کسی صاحب علم کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس قسم کے مناسک و شعائر اپنی خاص شکل اور

قالب کے ساتھ مطلوب اور مامور بہ ہوتے ہیں۔ اس لیے قربانی کے حکم کی تعمیل کسی حالت میں بھی فقراء و مساکین پر صدقہ کرنے سے نہیں ہو سکتی۔

علاوہ ازیں حجاج کی کثرت اور ان کی غالب اکثریت کی بے شعوری اور دینی و اخلاقی ناتربیتی کی وجہ سے صرف قربانی ہی میں بگاڑ نہیں آیا ہے بلکہ طواف اور سعی اور رمی جمرات میں بھی اسی طرح کے مکارہ اور منکرات سے سابقہ پڑتا ہے، لیکن اپنے پیدا کیے ہوئے ان مفاسد اور شنائع کی وجہ سے یہ تو نہیں سوچا جا سکتا ہے کہ جب تک ان خرابیوں کی اصلاح نہ ہو اس وقت تک طواف کے بجائے بس نماز پڑھ لی جائے اور دعا کر لی جائے۔ اور سعی اور رمی جمار کے بجائے بس اللہ کا ذکر کر لیا جائے، کیونکہ حدیث میں آیا ہے ——— انما جعل رمی الجمار والسعی بین الصفا والمروۃ لاقامۃ ذکر اللہ ۔ (ترمذی و دارمی)

اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ شریعت اسلامی میں قربانی کا گوشت خود کھانے اور دوسروں کو کھلانے کی اجازت بلکہ ترغیب دی گئی ہے (فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ——— سورہ حج) لیکن یہ اس کی حقیقت بلکہ اصل غرض و غایت بھی نہیں ہے۔ اگر اصل غرض و غایت فقراء و مساکین کی اعانت و امداد ہی ہوتی تو بجائے قربانی کے نقد یا ایسی جنس دینے کا حکم دیا جاتا جس سے وہ بیچارے اپنی زندگی کی ضروریات پوری کر سکتے۔ جیسا کہ عید الفطر میں صدقہ فطر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

قربانی دراصل نماز روزہ کی طرح ایک مستقل عبادت ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو جانور ہمارے لیے پیدا کیے ہیں جن سے ہم طرح طرح کے کام لیتے اور منافع حاصل کرتے ہیں اور اسلئے وہ ہمیں عزیز ہیں ہم ان کی جان اللہ کے نام پر قربان کریں اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں ان کی نذر پیش کریں۔

قربانی کا صدقہ و خیرات سے الگ ایک مستقل عبادت ہونا سورۃ البقرہ کی اس آیت سے بالکل ظاہر ہے جس میں یہ حکم بیان ہوا ہے کہ جب حاجی بیماری وغیرہ کی مجبوری کی وجہ سے وقت سے پہلے سر منڈا لے تو اسکو فدیہ دینا پڑے گا یہ فدیہ یا روزے ہوں گے، یا صدقہ، یا قربانی (فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ) اس جگہ نُسُك (قربانی) کو صدقہ سے الگ جس طرح بیان کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ قربانی صدقہ سے الگ عبادت کی ایک مستقل قسم ہے۔

عبادت کی یہ خاص شکل (قربانی) اگلی شریعتوں میں بھی تھی اور قرآن مجید سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام نے اپنی قربانی اس طرح بھی پیش کی کہ قربانی کا جانور اللہ کے نام پر ذبح کر کے قربانگاہ پر رکھ دیا گیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک غیبی آگ نازل ہوئی اور اس نے اس کو سوخت کر دیا اور اس طرح اس قربانی کی مقبولیت ظاہر ہو گئی۔ (آل عمران آیت ۱۸۳)[1] ——— اگر قربانی کا اصل مقصد فقراء و مساکین کی اعانت مانا جائے تو پھر ان انبیاء علیہم السلام کی قربانی بے معنی ہو جاتی ہے۔

شریعت محمدیہ میں حج کی قربانی اور اسی طرح عید الاضحیٰ کی قربانی دراصل اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یادگار ہیں اور اس کا مقصد حضرت خلیل کے اس کردار کی کسی درجہ میں نقل کرکے

(۱) انبیاء علیہم السلام کی اس سوختنی قربانی کے متعدد واقعات بائبل قدیم میں بھی موجود ہیں۔ ۱۲

اُن کے ساتھ تشبہ اور اپنے کو اُن کے زمرہ میں ظاہر کرنا اور "اِنَّ صَلوٰتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o" والے اُن کے حنیفی مسلک سے اپنی وابستگی ظاہر کرنا ہے"(1) ــــ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ انعام فرمایا تھا کہ اُن کے لخت جگر اسمٰعیل علیہ السلام کی جگہ ایک جانور کی قربانی قبول فرمائی تھی۔ (وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ) اب قیامت تک ہر ابراہیمی اور ہر محمدی کی قربانی خاص کر منیٰ میں ہر حاجی کی قربانی اُسی "ذبح عظیم" کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ صدقہ سے یہ مقاصد کہاں پورے ہو سکتے ہیں۔

قرآن مجید میں حج کے سلسلہ میں قربانی کا بیان زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ سورۃ حج میں کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے یہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیم کو حکم دیا کہ تم لوگوں کو حج کے لیے بلاوا دو اور پکارو۔ وہ پیدل اور سواریوں پر حج کو آئیں گے تاکہ یہاں کے منافع اور برکات حاصل کریں اور قربانی کے معلوم دنوں میں اللہ کے نام پر اُن جانوروں کی قربانی کریں جو ہم نے ان کو عطا فرمائے ہیں۔ (لِیَشْہَدُوْا مَنَافِعَ لَہُمْ وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَہُمْ مِّنْ بَہِیْمَۃِ الْاَنْعَامِ (الآیۃ)

پھر اسی سلسلۂ بیان میں چند آیتوں کے بعد فرمایا گیا ہے

وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ جَعَلْنَا مَنْسَکًا لِّیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلٰی مَا رَزَقَہُمْ مِّنْ بَہِیْمَۃِ الْاَنْعَامِ۔	اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کا طریقہ مقرر کیا ہے تاکہ وہ اللہ کا نام لے کر قربانی کریں اُن جانوروں کی جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائے ہیں۔

پھر ایک ہی آیت کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰہَا لَکُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ لَکُمْ فِیْہَا خَیْرٌ فَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہَا صَوَآفَّ ج (سورۃ الحج۔ رکوع ۴ و ۵)	اور قربانی والے اونٹوں کو ہم نے قرار دیا ہے تمہارے لیے شعائر اللہ یعنی عبادتِ الٰہی کی نشانی اور یادگار، تمہارے لیے ان جانوروں میں بڑی بھلائی ہے پس تم ان کو ذبح کرتے وقت قطار میں کھڑا کر کے اللہ کا نام لیا کرو (اور اسی کے نام پر ان کا خون بہایا کرو)

ان آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ اصل مطلوب اور مامور بہ اللہ کے نام پر جانوروں کی قربانی اور اراقۂ دم ہے۔ فقراء و مساکین کو قربانی کے جانور کی قیمت دے دینے سے اس حکم کی تعمیل نہیں ہو سکتی۔

(1) حضرت شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں "والسر فی الهدی التشبہ بفعل سیدنا ابراہیم علیہ السلام فیما قصد من ذبح ولدہ فی ذات اللہ الکامل طاعۃ لربہ وتوجہا الیہ والتذکر لنعمۃ اللہ بہ وبابیہم اسماعیل علیہ السلام"۔ ترجمہ از الفرقان ملحوظ رہے

اس لیے عارضی طور پر بھی اس تجویز کو قبول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے اس زمانہ میں منیٰ میں قربانیاں جس طرح ضائع کی جاتی ہیں اور حاجیوں کی غلط کاری کے نتیجہ میں جس طرح وہاں گندگی پھیلتی ہے وہ بجائے خود بڑا قابلِ فکر مسئلہ ہے۔ اس سلسلہ میں ایک کام تو کرنے کا یہ ہے کہ موسم حج میں بہت پہلے سے اس بارہ میں حاجیوں کو ہدایات دینے کا خاص اہتمام کیا جائے اور یہ ذمہ داری ہر ملک سے آنے والے صاحب علم اور صاحب شعور حجاج خود لیں۔ اور رضاکارانہ طور پر لوجہ اللہ یہ خدمت انجام دیں۔ اور سعودی حکومت معلمین پر اس بارہ میں خاص ذمہ داری ڈالے۔

دوسرا کام حکومت ہی کے کرنے کا یہ ہے کہ قربانی کے گوشت و پوست کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے جن انتظامات اور جس طرح کے کارخانوں کی ضرورت ہے وہ ان کا بندوبست کرے! اللہ تعالیٰ نے سعودی حکومت کو اتنے وسائل دیئے ہیں کہ ان انتظامات کا کرنا اس کے لیے دشوار نہیں ہے۔

مَعَارِفُ الْحَدِيْث

(مُسَلسَل)

ماہر قرآن کا مقام :-

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ وَالَّذِيْ يَقْرَءُ الْقُرْآنَ وَيَتَتَعْتَعُ فِيْهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهٗ اَجْرَانِ

رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے قرآن میں مہارت حاصل کرلی ہو (اور اس کی وجہ سے وہ اس کو ــــ حفظ یا ناظرہ ــــ بہتر طریقہ پر اور بے تکلف رواں پڑھتا ہو) وہ معزز اور نیکوکار فرشتوں کے ساتھ ہوگا۔ اور جو بندہ قرآن پاک (اچھا یاد اور رواں نہ ہونے کی وجہ سے زحمت اور مشقت کے ساتھ) اس طرح پڑھتا ہو کہ اس میں اٹکتا ہو تو اس کو دو اجر ملیں گے (ایک تلاوت کا اور دوسرے زحمت اور مشقت کا۔)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں سفرہ کا جو لفظ ہے اس سے اکثر شارحین نے حامل وحی فرشتے مراد لیے ہیں اور بعض حضرات نے اس سے انبیاء و رسل علیہم السلام مراد لیے ہیں۔ اور لفظی معنیٰ میں ان دونوں ہی کی گنجائش ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے جو بندے قرآن کو کلام اللہ

یقین کرتے ہوئے اس سے شغف رکھیں اور کثرت تلاوت اور اہتمام کی وجہ سے قرآن پاک سے ان کو خاص مناسبت اور مہارت حاصل ہو جائے ان کو انبیاء و رسل کی یا حامل وحی فرشتوں کی معیت اور رفاقت حاصل ہوگی ـــــ اور جن ایمان والے بندوں کا حال یہ ہو کہ صلاحیت اور مناسبت کی کمی کی وجہ سے وہ قرآن کو رواں نہ پڑھ سکتے ہوں بلکہ تکلف کے ساتھ اور اٹک اٹک کے پڑھتے ہوں اور اس کے باوجود اجر و ثواب کی امید پر تلاوت کرتے ہوں ان کو تلاوت کے اجر و ثواب کے علاوہ اس زحمت و مشقت کا بھی ثواب ملے گا۔ اس لیے ان کو اپنی اس حالت کی وجہ سے شکستہ دل نہ ہونا چاہیئے۔

قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کا انعام :-

عَنْ مَعَاذِ الْجُهَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَعَمِلَ بِمَا فِيْهِ أُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ضَوْءُهُ أَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِيْ بُيُوْتِ الدُّنْيَا لَوْ كَانَتْ فِيْكُمْ فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِيْ عَمِلَ بِهٰذَا ـــــــــ رواہ احمد و ابوداؤد

حضرت معاذ جہنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے قرآن پڑھا اور اس میں جو کچھ ہے اس پر عمل کیا قیامت کے دن اس کے ماں باپ کو ایک ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سورج کی اس روشنی سے بھی زیادہ حسین ہوگی جبکہ وہ روشنی دنیا کے گھروں میں ہو اور سورج آسمان سے ہمارے پاس ہی اتر آئے ـــــ (اس کے بعد حضور نے فرمایا) پھر تمہارا کیا گمان ہے خود اس آدمی کے بارہ میں جس نے خود یہ عمل کیا ہو۔ (مسند احمد سنن ابی داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ قرآن کے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے والے کے والدین کو جب ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سورج کی روشنی سے بھی حسین تر ہوگی تو سمجھ لو کہ خود اس قرآن پڑھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا کیا عطا فرمایا جائے گا۔

قیامت میں قرآن پاک کی شفاعت و وکالت :-

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِقْرَءُوا الْقُرْاٰنَ فَاِنَّہٗ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ شَفِیْعًا لِاَصْحَابِہٖ اِقْرَءُوا الزَّهْرَاوَیْنِ الْبَقَرَۃَ وَسُوْرَۃَ اٰلِ عِمْرَانَ فَاِنَّهُمَا تَاْتِیَانِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ کَاَنَّهُمَا غَمَامَتَانِ اَوْ غَیَایَتَانِ اَوْ فِرْقَانِ مِنْ طَیْرٍ صَوَافَّ تُحَاجَّانِ عَنْ اَصْحَابِهِمَا، اِقْرَءُوْا سُوْرَۃَ الْبَقَرَۃِ فَاِنَّ اَخْذَهَا بَرَکَۃٌ وَتَرْکَهَا حَسْرَۃٌ وَلَا یَسْتَطِیْعُهَا الْبَطَلَۃُ ــــــــــ رواہ مسلم

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ ارشاد فرماتے تھے کہ قرآن پڑھا کرو، وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کا شفیع بن کر آئے گا ــــ (خاصکر) "زہراوین" یعنی اس کی دو اہم نورانی سورتیں البقرہ اور آل عمران پڑھا کرو۔ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کو اپنے سایہ میں لیے اس طرح آئیں گی جیسے کہ وہ ابر کے ٹکڑے ہیں یا سائبان ہیں یا صف باندھے پرندوں کے پرے ہیں۔ یہ دونوں سورتیں قیامت میں اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے مدافعت کریں گی ــ (آپ نے فرمایا) پڑھا کرو سورہ بقرہ کیونکہ اس کو حاصل کرنا بڑی برکت والی بات ہے اور اس کو چھوڑنا بڑی حسرت اور ندامت کی بات ہے، اور اہل بطالت اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک پڑھنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ قرآن اپنے "اصحاب" کے لیے بارگاہِ خداوندی میں شفاعت کرے گا۔ "اصحاب قرآن" وہ سب لوگ ہیں جو قرآن پاک پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس سے تعلق اور شغف کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت کا وسیلہ یقین کرتے ہوئے اس سے خاص نسبت اور لگاؤ رکھیں۔ جس کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ مثلاً کثرت سے اس کی تلاوت کریں، اس میں تدبر و تفکر

اور اس کے احکام پر عمل کرنے کا اہتمام رکھیں یا اس کی تعلیم و ہدایت کو عام کرنے اور پھیلانے کی جد و جہد کریں ان سب کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت ہے کہ قرآن ان کے حق میں شفیع ہوگا۔ ہاں اخلاص یعنی نیت شرط ہے۔

اس حدیث میں قرآن پاک کی قرأت و تلاوت کی عمومی ترغیب کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کی تلاوت و قرأت کی خصوصیت کے ساتھ بھی ترغیب دی ہے اور فرمایا ہے کہ قیامت میں اور حشر میں جب ہر شخص سایہ کا بہت ہی محتاج اور ضرورت مند ہوگا، یہ دونوں سورتیں بادل یا سایہ دار چیز کی طرح یا پرندوں کے پرے کی طرح اپنے اصحاب پر سایہ کیے رہیں گی اور ان کی طرف سے وکالت اور جوابدہی کریں گی ــ اور آخر میں سورۂ بقرہ کے متعلق مزید فرمایا کہ اس کے سیکھنے اور پڑھنے میں بڑی برکت ہے اور اس سے محرومی میں بڑا خسارہ ہے۔ اور اہل بطالت اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس آخری جملہ میں "بطلۃ" کا جو لفظ ہے جس کا ترجمہ "اہل بطالت" سے کیا گیا ہے ــ اس حدیث کے بعض راویوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد "ساحرین" ہیں اور مطلب یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کی تلاوت کا معمول رکھنے والے پر کبھی کسی جادوگر کا جادو نہیں چلے گا ــ سورۂ بقرہ کی اس خاصیت اور تاثیر کا اشارہ اس حدیث سے بھی ملتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے شیطان اس گھر سے بھاگنے پر مجبور ہوتا ہے[1] ــــ بعض شارحین نے یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ اہل بطالت یعنی ناحق کوش لوگ سورۂ بقرہ کی برکات حاصل نہ کرسکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر ان برکات کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ واللہ اعلم

عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ يُؤْتَى بِالْقُرْآنِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاَهْلِهِ الَّذِيْنَ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ بِهٖ تَقْدُمُهٗ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ وَآلُ عِمْرَانَ كَاَنَّهُمَا غَمَامَتَانِ اَوْ ظُلَّتَانِ سَوْدَاوَانِ بَيْنَهُمَا شَرْقٌ اَوْ كَاَنَّهُمَا فِرْقَانِ مِنْ طَيْرٍ

---

(۱) ان الشیطان ینفر من البیت الذی یقرء فیہ سورۃ البقرۃ ــــ رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ

صَوَافَّ تُحَاجَّانِ عَنْ صَاحِبِهِمَا ــــــــــــ رواہ مسلم

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپ فرماتے تھے کہ قیامت کے دن قرآن کو اور ان قرآن والوں کو لایا جائے گا جو اس پر عامل تھے سورۂ بقرہ اور آل عمران (جو قرآن کی سب سے پہلی سورتیں ہیں) وہ پیش پیش ہوں گی (محسوس ہوگا) گویا کہ وہ بادل کے دو ٹکڑے ہیں یا سیاہ رنگ کے دو سائبان ہیں جن میں نور کی چمک ہے۔ یا صف باندھے پرندوں کے دو پرے ہیں اور وہ مدافعت اور وکالت کریں گی اپنے سے تعلق رکھنے والوں کی۔ (صحیح مسلم)

تشریح) اس حدیث کا مضمون قریب قریب وہی ہے جو حضرت ابو امامہ کی مندرجۂ بالا حدیث کا ہے۔ ذرا تصور کیا جائے قیامت اور میدان حشر کی ہولناکیوں کا۔ کیسے خوش نصیب ہوں گے اللہ کے وہ بندے جو قرآن پاک سے خاص تعلق اور شغف اور اس کے احکام کی فرمانبرداری کی برکت سے حشر کے اس پر ہول میدان میں اس شان سے آئیں گے کہ اللہ کا کلام پاک ان کا شفیع و وکیل بن کر ان کے ساتھ ہوگا اور اس کی سب سے پہلی اور اہم نورانی سورتیں بقرہ اور آل عمران اپنے انوار کے ساتھ ان کے سروں پر سایہ فگن ہوں گی ــــ ان احادیث پر مطلع ہو جانے کے بعد بھی جو بندے اس سعادت کے حاصل کرنے میں کوتاہی کریں بلاشبہ وہ بڑے محروم ہیں وماظلمہم اللہ ولٰکن کانوا انفسہم یظلمون۔

خاص خاص سورتوں اور آیتوں کی برکات:-

بعض حدیثوں میں خاص خاص سورتوں اور آیتوں کے فضائل و برکات بھی بیان فرمائے گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو امامہ باہلی اور حضرت نواس بن سمعان کی مندرجۂ بالا حدیثوں میں پورے قرآن کی فضیلت کے ساتھ خاص طور سے سورۂ بقرہ اور آل عمران کی فضیلت بھی بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح دوسری بعض سورتوں اور خاص خاص آیتوں کے فضائل و برکات بھی مختلف مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں۔ فرمایا ہے

اس سلسلہ کی بھی چند حدیثیں درج کی جا رہی ہیں۔

سورۃ الفاتحۃ :-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِاُبَیِّ ابْنِ كَعْبٍ اَتُحِبُّ اَنْ اُعَلِّمَكَ سُوْرَةً لَمْ یُنْزَلْ فِی التَّوْرَاةِ وَلَا فِی الْاِنْجِیْلِ وَلَا فِی الزَّبُوْرِ وَلَا فِی الْقُرْاٰنِ مِثْلُهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَیْفَ تَقْرَءُ فِی الصَّلٰوةِ قَالَ فَقَرَأَ اُمَّ الْقُرْاٰنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ مَا اُنْزِلَتْ فِی التَّوْرَاةِ وَلَا فِی الْاِنْجِیْلِ وَلَا فِی الزَّبُوْرِ وَلَا فِی الْقُرْاٰنِ مِثْلُهَا وَاِنَّهَا سَبْعٌ مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنُ الْعَظِیْمُ الَّذِیْ اُعْطِیْتُهٗ

رواہ الترمذی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُبی بن کعب سے فرمایا کہ کیا تمھاری خواہش ہے کہ میں تم کو قرآن کی وہ سورت سکھا دُوں جس کے مرتبہ کی کوئی سورت نہ توراۃ میں نازل ہوئی نہ انجیل میں نہ زبور میں، اور نہ قرآن ہی میں ـــــ اُبی نے عرض کیا کہ ہاں حضور مجھے وہ سورت بتا دیں! آپ نے فرمایا تم نماز میں قرأت کس طرح کرتے ہو! اُبیؓ نے آپ کو سورۂ فاتحہ پڑھ کر سنائی (کہ میں نماز میں یہ سورت پڑھتا ہوں اور اس طرح پڑھتا ہوں) آپ نے فرمایا قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تورات، انجیل، زبور میں سے کسی میں اور خود قرآن میں بھی اس جیسی کوئی سورت نازل نہیں ہوئی۔ یہی وہ "سبع من المثانی والقرآن العظیم" ہے جو مجھے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) قرآن مجید سورۂ حجر کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے خاص انعامات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے: "وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ

وَالْقُرْآنَ الْعَظِيْمَ" (اور ہم نے تم کو سات آیتیں وظیفہ کے طور پر بار بار دہرائی جانے والی عطا کیں اور قرآن عظیم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ بالا حدیث میں اس آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ "سبعٌ من المثانی والقران العظیم" سورۂ فاتحہ ہی ہے اور یہ ایسی عظیم الشان اور عظیم البرکت سورت ہے کہ اس درجہ کی سورت کسی پہلی آسمانی کتاب میں بھی نازل نہیں کی گئی اور قرآن میں بھی اس کے درجہ کی کوئی دوسری سورت نہیں ہے۔ یہ پورے قرآن کے مضامین پر حاوی ہے۔ اسی لیے اس کو "ام القرآن" بھی کہا جاتا ہے۔ اور اسی لیے اس کو قرآن کا افتتاحیہ قرار دیا گیا ہے اور ہر نماز کی ہر رکعت میں اس کا پڑھنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس حدیث کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ جس بندہ کو سورۂ فاتحہ یاد ہے اور اخلاص کے ساتھ اس کا پڑھنا اس کو نصیب ہوتا ہے اسکو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی دولت اور نعمت نصیب ہے۔ چاہیے کہ وہ اس کی قدر و عظمت کو محسوس کرے اور اس کا حق ادا کرے۔

سورۂ یٰسٓ :-

عَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارِ الْمُزَنِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَرَءَ يٰسٓ اِبْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰى غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ فَاقْرَءُوْهَا عِنْدَ مَوْتَاكُمْ ——— رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت معقل بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اللہ کی رضا کے لیے سورۂ یٰسٓ پڑھی اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ لہٰذا یہ مبارک سورۃ مرنے والوں کے پاس پڑھا کرو۔

(شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) اس حدیث میں مرنے والوں کے پاس (عند موتاکم) یٰسٓ شریف پڑھنے کے لیے جو فرمایا گیا ہے اُس کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ مرنے والے کے پاس اُس کے آخری وقت میں یہ سورۃ پڑھی جائے، اور اکثر علماء نے یہی سمجھا ہے اور اس لیے یہی معمول ہے،

لیکن دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مرجانے والے کی قبر پر یہ سورت پڑھی جائے تاکہ یہ اس کی مغفرت کا وسیلہ بن جائے۔

عَنْ عَطَاءِ بْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ قَالَ بَلَغَنِیْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَرَأَ یٰسٓ فِیْ صَدْرِ النَّهَارِ قُضِیَتْ حَوَائِجُہٗ۔

رواہ الدارمی مرسلاً

عطا ابن ابی رباح تابعی سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ مجھے یہ بات پہونچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بندہ دن کے ابتدائی حصہ میں یعنی علی الصباح سورہ یٰسٓ پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کی حاجتیں پوری فرمائے گا۔

(سنن دارمی)

سورہ واقعہ :-

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ الْوَاقِعَةِ فِیْ کُلِّ لَیْلَةٍ لَمْ تُصِبْہُ فَاقَةٌ اَبَدًا وَکَانَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ یَاْمُرُ بَنَاتَہٗ یَقْرَأْنَ بِھَا فِیْ کُلِّ لَیْلَةٍ۔

رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہر رات سورہ واقعہ پڑھا کرے اسے کبھی فقر و فاقہ کی نوبت نہیں آئے گی۔ (نیچے کے راوی بیان کرتے ہیں) کہ خود حضرت ابن مسعود کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنی صاحبزادیوں کو اس کی تاکید فرماتے تھے اور وہ ہر رات کو سورہ واقعہ پڑھتی تھیں۔ (شعب الایمان للبیہقی)

سورۃ الملک :-

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

إِنَّ سُورَةً فِي الْقُرْآنِ ثَلٰثُونَ آيَةً شَفَعَتْ لِرَجُلٍ حَتّٰى غُفِرَ لَهُ وَهِيَ تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ ——— رواہ احمد والترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کی ایک سورت نے جو صرف تیس آیتوں کی ہے اس نے ایک بندے کے حق میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں سفارش کی یہاں تک کہ وہ بخش دیا گیا اور وہ سورہ ہو تبارک الذی بیدہ الملک۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

الٓمّٓ تنزیل :-

عَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَا يَنَامُ حَتّٰى يَقْرَءَ الٓمّٓ تَنْزِيْلُ وَتَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ۔

——— رواہ احمد والترمذی والدارمی

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک نہیں سوتے تھے جب تک کہ "الٓمّٓ تنزیل" اور "تبارک الذی بیدہ الملک" نہ پڑھ لیتے۔ (یعنی رات کو سونے سے پہلے یہ دونوں سورتیں پڑھنے کا حضور کا معمول تھا)۔ (مسند احمد، جامع ترمذی، سنن دارمی)

حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلویؒ

از ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

راہ سلوک پر گامزنی خود بیان فرمایا کرتے تھے اور ارشاد رحیمیہ میں بھی تحریر کیا ہے کہ میں نو، دس سال کا تھا کہ خواجہ ہاشم نام کے ایک بزرگ بخارا سے دہلی آئے اور ہمارے محلے میں آکر ٹھہرے۔ انھوں نے مجھ کو تختی یا کاغذ پر اللہ اللہ لکھنے کی تلقین کی کچھ عرصے بعد فرمایا اب خیال سے دل کے ارد گرد اسم ذات کو لکھا کرو۔ اس کی اتنی مشق کم سنی ہی میں ہو گئی تھی کہ میں جب شرح عقائد حاشیہ خیالی پڑھتا تھا اس وقت میں نے حاشیۂ عبدالحکیم کو نقل کرنے کا ارادہ کیا، تو کم و بیش ایک جزو پر اسم ذات ہی لکھتا چلا گیا اور مجھے یہ خیال ہی نہ رہا کہ حاشیہ عبدالحکیم لکھنے کے لئے بیٹھا ہوں ——— فرماتے تھے کہ خواجہ ہاشمؒ نے دو ایک باتوں سے میرا امتحان لیا اور بالآخر یہ فرمایا کہ تمہاری استعداد اونچی ہے تم بہت عالی ہمت ہو ——— میں چاہتا ہوں کہ تم فی الحال اشغال صوفیہ میں سے کوئی شغل اختیار کرلو۔ چنانچہ انھوں نے شغل کتابت اسم ذات کی تلقین کی جس کا ذکر ہو چکا ———

فرمایا کرتے تھے کہ میں بارہ تیرہ سال کا تھا کہ حضرت زکریا علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خواب میں دیکھا انھوں نے ذکر اسم ذات، تلقین فرمایا۔ اس سے ایسی کیفیت، قلب پر طاری ہوئی کہ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا ——— فرماتے تھے اس کے بعد میں نے حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار دہلوی کو خواب میں دیکھا وہ فرما رہے ہیں اے فرزند! اس وقت تک کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا جب تک حضرت خواجہ تم کو قبول نہ فرمالیں ——— اس کے بعد تم کو اختیار ہے ———

حضرت خواجہ خردؒ سے خواب کا ذکر

فرمایا کرتے تھے کہ اس خواب کے بعد میں حضرت خواجہ خردؒ کی خدمت میں گیا اور تعبیر دریافت کی اور یہ بھی عرض کیا کہ اس شہر دہلی کے اکابر میں اس وقت آپ کے علاوہ کوئی بھی لقب خواجہ سے ملقب نہیں ہے۔ اس پر حضرت خواجہ خرد نے فرمایا کہ تمہارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم کو خواجۂ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم سے بیعت منامی نصیب ہوگی۔ میں اس قابل کہاں ہوں کہ حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بارؒ نے مجھے خواجہ سے تعبیر فرمائیں ــــ

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت

فرماتے تھے کہ مجھے اس تعبیر کا انتظار رہتا۔ کثرت سے درود شریف پڑھتا تھا ایک رات درود پڑھتے پڑھتے بیہوش ہوگیا اور ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی اسی حالت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ سرکار دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے بیعت فرمایا اور نفی واثبات کی تلقین فرمائی ــــ

حضرت خواجہ خرد سے بیعت کی درخواست اور اُن کا مشورہ

اس واقعے کے چند روز بعد میں نے حضرت خواجہ خرد سے عرض کیا کہ آپنے جو بات ارشاد فرمائی تھی وہ تو حاصل ہوگئی اب اس کے بعد میرے بارے میں کیا مشورہ ہے۔ فرمایا کہ ظاہر میں بھی کسی سے بیعت ہوجانا چاہیئے۔ میں نے عرض کیا کہ میں آپ سے بیعت ہونا چاہتا ہوں اس پر حضرت خواجہ خرد نے فرمایا کہ میں تم کو بہت عزیز اور دوست رکھتا ہوں میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہاری بیعت مجھ سے ہو ــ میں نے کہا میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ دوستی، بیعت قبول نہ کرنے کا سبب کیسے ہوگئی؟ اس بات پر آپ نے فرمایا کہ بھائی مجھ سے کبھی کبھی بعض ایسے امور کا ارتکاب ہوجاتا ہے جو حکم شرع کے مطابق نہیں ہوتے اور اتباع سنت میں بھی قدرے تساہل کرجاتا ہوں ایسا نہ ہو کہ تم پر اس کا اثر پڑے اور تمہارا قدم مجھ سے بیعت ہوجانے کے رشتے سے جادۂ شرع سے کچھ لغزش کرجائے۔ ہاں میری صحبت میں رہ سکتے ہو فائدہ پہونچانے میں کوئی کمی نہ کروں گا ــــ پھر میں نے عرض کیا اچھا آپ جس بزرگ سے فرمائیں میں اس سے متوسل ہوجاؤں فرمایا کہ اگر حضرت شیخ آدم بنوری قدس سرہٗ کے خلفاء میں سے کسی بزرگ سے بیعت ہوجاؤ تو بہت ہی مناسب ہے اس لئے کہ یہ حضرات، اتباع شریعت، ترک دنیا اور تہذیب نفس میں امتیاز تام رکھتے ہیں ــــ میں نے عرض کیا کہ ہمارے پڑوس میں (محلہ کوشک نرور دہلی میں) سید عبداللہ ؒ خلیفۂ حضرت شیخ

آدم بنوریؒ مقیم ہیں، فرمایا بس وہی غنیمت ہیں اُن ہی سے رابطہ پیدا کرلو۔۔۔

حضرت حافظ سید عبداللہ اکبر آبادیؒ سے تعلق

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نے فرمایا کہ میں نے اس مشورے پر عمل کیا اور حضرت حافظ سید عبداللہ اکبر آبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا باوجودیکہ وہ اپنے آپ کو بہت چھپاتے تھے اور ذوقِ گمنامی اُن پر غالب تھا مگر پہلی مرتبہ جانے پر بیعت فرمالیا اور اپنے فیوض و برکات سے مستفیض فرمایا۔ (بالآخر طریقۂ نقشبندیہ میں اپنا خلیفہ بنایا اور شرفِ اجازت سے سرفراز کیا)

حالات حضرت حافظ سید عبداللہ بزبان شاہ عبدالرحیم

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ اپنے پیر و مرشد کا ذکر کثرت سے فرمایا کرتے تھے جو انفاس العارفین میں تفصیل سے موجود ہے۔ یہاں چند باتیں لکھتا ہوں فرماتے تھے کہ حضرت سید عبداللہؒ، دراصل قریہ کھیرکی کے رہنے والے تھے جو علاقۂ بارہہ میں ہے۔ بچپن ہی میں آپ کے والدین کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ خدا طلبی کا جذبہ کم سنی ہی میں آپ کے اندر تھا۔ اولیاء اللہ کی تلاش میں سفر کرتے اور گشت لگاتے رہتے تھے۔ اسی تلاش و جستجو میں پنجاب کے علاقے میں پہونچ گئے۔ وہاں ایک بزرگ سے ملے جو اعلیٰ درجے کے قاری تھے ایک مسجد میں جو جنگل میں واقع تھی متوکلانہ رہتے تھے۔ آپ اُن کی خدمت میں رہے اور راہ سلوک کو طلب کیا ان بزرگ نے فرمایا۔

"میاں تلقین و ارشاد تو تم کو ایک دوسرا ہی شخص کرے گا جس کے پاس ان شاء اللہ تعالیٰ تم مستقبل قریب میں پہونچوگے۔۔۔ میرے پاس تو تم قرآن مجید حفظ کرلو" چنانچہ آپ نے اس جنگل کی مسجد میں ایک مدت تک مقیم رہ کر قرآن حفظ کرلیا اور ساتھ ہی ساتھ استاد سے نیکی اور تقویٰ کے طور طریقے بھی سیکھ لئے۔۔۔ حضرت سید عبداللہؒ فرمایا کرتے تھے میں جب حفظِ قرآن سے فارغ ہوگیا تو ان بزرگ نے مجھے رخصت کردیا اور فرمایا جاؤ جہاں کہیں صاحب ولایت مل جائے اس کی خدمت میں انتہائی کوشش سے کام کو پورا کرنا۔۔۔۔ اس کے بعد آپ سامانہ میں شیخ ادریس سامانیؒ کی خدمت میں پہونچے۔ شیخ ادریس سامانیؒ ایک متوکل بزرگ تھے اپنے پاس لوگوں کی آمد و رفت پسند نہیں کرتے تھے۔۔۔ سلسلۂ قادریہ میں منسلک تھے حافظ سید عبداللہؒ نے جب دروازے کی زنجیر کھٹکھٹائی تو شیخ نے اندر ہی سے یہ فرمایا کہ کہیں اور جاؤ میرے پاس وہ

شخص رہ سکتا ہے جو بالکل مردہ ہو اس کو طعام ولباس کی فکر نہ ہو آمیزش خلق سے کنارہ کش ہو اور ضروری کاموں کے علاوہ میرے دروازے سے نہ ہلے ــــ آپ نے یہ سب شرطیں قبول کرلیں اور وہاں رہ کر سلوک طے کیا ــــ پھر تو شیخ ادریس سامانی نے آپ کی طرف بہت زیادہ توجہ مبذول فرمائی اسی اثنار میں شیخ کے صاحبزادے نے حافظ صاحب سے قرآن مجید یاد کرنا شروع کردیا اس کی وجہ سے توجہ اور دوبالا ہوگئی آپ نے بھی شیخ کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ــ شیخ کے لئے استنجے کے ڈھیلے مہیا کرتے تھے نیز شیخ اور اہل بیت شیخ کے کپڑے جمعرات کے دن نہر پر جاکر دھوتے تھے ــــ

بعد وفات شیخ ادریس سامانی آپ حضرت شیخ آدم بنوریؒ خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں پہونچے، ان کو بھی ایک عالی مقام، پابند شریعت، عظیم المرتبہ اور قوی التاثیر بزرگ پایا ــ ان کے طریقے کو پسند کرکے اُن ہی کے ہوگئے، مدتوں ان کی صحبت اٹھائی، بہت کچھ فیض پایا، بالآخران کے خلیفۂ مجاز ہوئے ــــ

حضرت سید عبداللہؒ حافظ کلام اللہ تو تھے ہی زبردست قاری اور تجوید کے ماہر بھی تھے۔ قرآن مجید اس انداز میں پڑھتے تھے کہ سامعین بیخود ہوجاتے تھے ــــ ایک بار دتاریاں دارالشکوہ میں سے دو قاری حضرت سید عبداللہؒ کی قرأت کا امتحان لینے آئے اور آپ کی قرأت سُن کر حیران وششدر رہ گئے ــــ

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کا بیان ہے کہ حضرت حافظ رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے بارہا یہ الفاظ سُنے ہیں "کفش بر سر کشف"۔ مُراد یہ تھی کہ کشف وکرامت کا کوئی اعتبار نہیں اصل چیز استقامت ہے ــــ حضرت حافظؒ پر اخفاء وخمول کا غلبہ تھا۔ معمولی حیثیت میں رہتے تھے ــ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے ممتاز نہیں رکھتے تھے ــــ بسا اوقات ضعیفوں کا کام کاج خود جاکر انجام دیتے تھے۔

حضرت سید عبداللہؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ آدم بنوریؒ نے جب عزم حج کیا تو میں نے بھی ہمراہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا ــــ پیر و مرشد نے فرمایا کہ تمہارا ہندستان رہنا ضروری ہے اور ایک حکمت کی بنا پر ضروری ہے جو آگے چل کر تمہیں معلوم ہوگی ــــ

فرمایا کہ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ حکمت تمہاری (شاہ عبدالرحیمؒ کی) تربیت تھی جو میرے ذریعے انجام پانا تھی ـــــ

حضرت سید عبداللہؒ نے ایک بار شاہ عبدالرحیمؒ سے فرمایا کہ تم جب بچے تھے اور بچوں میں کھیلا کرتے تھے اسی وقت سے میری طبیعت کا رجحان تمہاری طرف تھا ـــــ میں دعا کیا کرتا تھا کہ اے اللہ تو اس بچے کو اپنے اولیاء میں سے کر دے اور اس بچے کے کمالات میرے ذریعے سے ظاہر فرما ـــــ الحمدللہ اس دعا کا ثمرہ ظاہر ہو گیا ـــــ

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت سید عبداللہؒ مجھ سے کوئی خدمت نہیں لیتے تھے۔ ایک روز میرے دل میں یہ خیال گذرا کہ پیرو مرشد آخر مجھ سے خدمت کیوں نہیں لیتے ـــــ پھر میں یہ بات عرض کرنے کے لئے آپ کے زاویے میں گیا۔ گرمی کا وقت تھا آپ کرتا جسم سے اتارے ہوئے تھے جب مجھے دیکھا تو فرمایا بہت اچھے آئے ـــــ میری پیٹھ سے میل دور کر دو میں خوش ہو کر پوری محنت سے اس خدمت کو انجام دینے لگا۔ درمیان میں فرمایا میاں تم پورے ہاتھ کو کیوں تکلیف دیتے ہو دو انگلیوں سے بھی یہ کام ہو سکتا ہے۔ پھر فرمایا بس ہو خدمت، شرط طریق ہے وہ وجود میں آگئی اب آئندہ دل میں اس بات کا کبھی خیال نہ لانا ـــــ میں نے اپنے تمام ظاہری و باطنی حقوق صحبت تم کو معاف کر دئے" ـــــ

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نے فرمایا کہ جس زمانے میں عالمگیر اورنگ زیب آگرے میں تھے اور میں بھی بغرض تعلیم آگرے میں تھا اس وقت حضرت سید عبداللہؒ بھی سید عبدالرحمٰن کی رفاقت میں وہیں چلے گئے تھے۔ آگرے ہی میں حضرت حافظ سید عبداللہؒ کو مرض الموت لاحق ہوا ـــــ وصیت فرمائی کہ مجھے مقبرۂ غریباں میں دفن کرنا تاکہ کوئی میری قبر کو نہ پہچان سکے ایسا ہی کیا گیا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں پیرو مرشد کی وفات کے روز مرض شدید میں مبتلا تھا مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ ہمراہ جنازہ جا سکوں۔ جب صحت و قوت بحال ہو گئی تو ایک دوست کو ہمراہ لیکر قبر مبارک کی زیارت کے لئے گیا اس دوست نے ہر چند غور کیا مگر اُن کی قبر کو نہ پہچانا ـــــ اندازے سے ایک قبر کی طرف اشارہ کر دیا کہ شاید یہ قبر ہے۔ میں نے وہاں بیٹھ کر قرآن پڑھا ـــــ پس پشت سے آواز آئی قبر یہ ہے ـــــ مگر خبردار جو سورۃ شروع کی ہے اس کو ختم کر کے اور اس کا ثواب اسی قبر والے

کو پہونچا کر پھر ادھر کو متوجہ ہونا جلدی نہ کرنا ــــ میں نے سورۃ کو ختم کرنے کے بعد اس دوست سے کہا بھائی غور کرو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی قبر میری پشت کی جانب تو نہیں ہے اس نے سوچ کر کہا واقعی میں نے غلطی کی ان کی قبر تمہاری پشت کی جانب ہی ہے۔ میں وہاں جا کر بیٹھ گیا اور قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ چونکہ حزن وملال کی کیفیت میرے اوپر طاری تھی اس لئے قرآن کی قرأت میں قواعد کو ملحوظ نہ رکھ سکا۔ اندرون قبر سے ایک آواز آئی کہ فلاں فلاں جگہ تم نے غلطی کی ہے۔ قرأت کے معاملے میں احتیاط ضروری ہے ــــ

حضرت خواجہ خردؒ سے اخذ فیض | حضرت شاہ عبد الرحیمؒ نے فرمایا کہ میں جب حافظ سید عبد اللہؒ سے بیعت ہو گیا تو آپ کے فیض صحبت سے مستفیض ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت خواجہ خردؒ کے فیض صحبت سے بھی مستفیض ہوتا رہتا تھا۔

تین کرامت آمیز اسباق کا ذکر تو پہلے گذر ہی چکا ہے اس کے علاوہ بھی بہت سے واقعات انفاس العارفین میں حضرت خواجہ خرد سے متعلق حضرت شاہ عبد الرحیمؒ کی زبانی درج ہیں جس طرح اسراریہ میں سید کمال سنبھلیؒ نے پیر و مرشد حضرت خواجہ خردؒ کے چشم دید حالات تحریر کئے ہیں اسی طرح حضرت شاہ عبد الرحیمؒ نے اُن کے تذکرے کے ذیل میں اپنے آنکھوں دیکھے واقعات بیان فرمائے ہیں۔

حضرت خواجہ خرد سے متعلق چند واقعات | فرمایا کہ خواجہ خردؒ برابر اپنے انگوٹھے سے انگلیوں پر کچھ لکھتے رہتے تھے پڑھاتے وقت بھی اور بات کرتے وقت بھی ــــ ایک دن میں نے ان سے دریافت کر لیا کہ آپ یہ کیا کیا کرتے ہیں فرمایا کہ یہ ایک عمل ہے جس کو کیا کرتا ہوں ابتدائے حال میں اللہ اللہ لکھنے کی مشق کی تھی اب بھی کبھی کبھی عادت قدیمہ کے مطابق وہ مشق جاری ہو جاتی ہے ــــ

فرمایا کہ ایک دن خواجہ خردؒ اپنے اصحاب واحباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے خود پلنگ پر تھے اور تمام آدمی بوریے پر ــــ اس موقع پر میں خدمت اقدس میں پہونچ گیا میری بہت زیادہ تعظیم و تکریم کی ــــ خود پلنگ کی پائنتی کی جانب بیٹھ گئے اور مجھے اصرار کر کے سرہانے

لہ تذکرہ مشاہیر اکبر آباد کے مولف نے اس واقعہ کو انفاس العارفین سے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ جب وفات کے قریب مزار کا یہ حال تھا تو اب کیا پتہ چل سکتا ہے۔ ۱۲

بٹھایا۔ ہرچند میں نے عذر کیا مگر نہیں مانے اس بات سے تمام حاضرین متحیر ہو گئے ــــــ آخرکار خواجہ خُردؒ کے صاحبزادے خواجہ رحمت اللہؒ سے نہ رہا گیا انھوں نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ اس مجلس میں ان سے زیادہ معمر اور قابل تعظیم لوگ بھی موجود ہیں پھر ان کی تخصیص میں کیا مصلحت ہے؟ ــــــ فرمایا کہ میں نے یہ معاملہ اس لئے کیا ہے تاکہ تم میرے اس طرز عمل کو دیکھ لو اور جس طرح میں نے اُن کی تعظیم کی ہے تم بھی کیا کرو ــــــ جب میں ان کے نانا شیخ رفیع الدین محمدؒ کے گھر پہونچتا تھا تو وہ بھی میرے ساتھ ایسی ہی تعظیم کا معاملہ کرتے تھے حالانکہ وہ میرے استاد تھے اور میں نے اُن سے فیوض حاصل کیے تھے ــــــ اور جب شیخ رفیع الدین محمدؒ حضرت والد ماجد خواجہ محمد باقی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو حضرت والد ماجدؒ ان کے ساتھ یہی طریقہ تعظیم برتتے تھے اگرچہ شیخ رفیع الدین محمدؒ آپکے مرید و خلیفہ تھے مگر چونکہ ابتدائے سلوک میں ان کے والد شیخ قطب العالمؒ کی خدمت میں رہ کر کچھ کتابیں پڑھی تھیں اور فوائد حاصل کیے تھے اس لئے استاد زادہ ہونے کی حیثیت سے اپنے خلیفہ کی تعظیم کرتے تھے اب ہم کو بھی ان سے (شاہ عبدالرحیمؒ سے) اسی طرح کا سلوک کرنا چاہئے۔

ایک دن کا واقعہ بیان فرمایا کہ ہم دونوں بھائی خواجہ خُردؒ کی خدمت میں حاضر تھے اُن پر بھوک کا غلبہ تھا اس بنا پر وہ درس بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اپنے گھر والوں سے دریافت فرمایا کہ گھر میں کچھ کھانا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ ایک بچے کے لئے تھوڑا سا کھانا پکایا ہے۔ فرمایا اُسی میں سے تھوڑا لے آؤ ایک چھوٹی سی صحنک میں بہت تھوڑا سا کھانا لایا گیا آپ نے ہاتھ دھوئے اور سب حاضرین سے عموماً اور ہم دونوں بھائیوں سے خاص طور پر مکرر فرمایا آؤ تناول کرو یہ کھانا ہم سب کو کفایت کرے گا۔ سب متعجب تھے۔ ہم دونوں نے تعمیل حکم کی اور آگے بڑھ گئے۔ اس کھانے کو ہم تینوں نے کھایا اور معتدل طریقے پر ہم دونوں بھی سیر ہو گئے پھر بھی صحنک میں قدرے کھانا باقی رہ گیا وہ بچے کے لئے واپس کر دیا ــــــ

فرمایا ایک شخص جس کا نام بھجن یار خاں تھا ٹھاٹ کا لباس پہن کر خواجہ خُردؒ کی خدمت میں حاضر ہوا ــــــ اس وقت اتفاق سے آپ کے گھر میں کوئی فرش نہیں تھا لوگ زمین پر بیٹھے تھے۔ بھجن یار خاں بھی زمین پر بیٹھ گیا۔ حاضرین مجلس میں سے کسی نے

خواجہ خردؒ کے کان میں کہا کہ حضرت! یہ ہمن یار خاں ہے۔ اس کی تعظیم و توقیر فرمائی جائے۔ آپ نے باآوازِ بلند جواب میں فرمایا۔ "اگر یار ہے تو محتاجِ تعظیم نہیں اور اغیار ہے تو لائقِ تعظیم نہیں" ــــ یہ الفاظ ہمن یار نے سُنے تو بہت خوش ہوا ــــ

فرمایا ــــ کہ خواجہ خردؒ اور خواجہ کلاں دونوں بچے ہی تھے کہ حضرت خواجہ محمد باقیؒ وفات پا گئے جب یہ دونوں بھائی بالغ ہوئے تو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں سرہند چلے گئے اور مدتوں وہاں رہے ــــ خواجہ کلاںؒ کے متعلق تو معلوم نہیں مگر خواجہ خردؒ نے حضرت مجدد الف ثانیؒ سے اخذِ طریقہ کیا اور اجازت بھی حاصل کی پھر دہلی واپس آ گئے ــــ خواجہ خردؒ نے خواجہ حسام الدین احمدؒ اور شیخ الہ داؤدؒ سے بھی (جو کہ حضرت خواجہؒ کے خلیفہ تھے) استفاضہ کیا۔ فرمایا ــــ حضرت خواجہ خردؒ نے اپنے آخری زمانے میں مجھ سے فرمایا کہ مجھ کو روضۂ خواجہ محمد باقی قدس سرہٗ میں اس جگہ دفن کرنا جہاں جوتیاں اُتاری جاتی ہیں ــــ اس بنا پر کہ میں حضرت خواجہؒ کا لڑکا ہوں مجھے احاطۂ مقبرہ میں دفن نہ کرنا کیونکہ میں اس جگہ کے لائق نہیں ہوں میں نے جواب دیا حضرت! یہ کام تو دوسرے لوگ انجام دیں گے میرا اختیار کیا چل سکے گا؟ فرمایا لوگوں سے یہ بات کہہ دینا۔ بعد وفاتِ خواجہ خردؒ میں نے وارثوں سے اس وصیت کا ذکر کیا کسی نے نہیں سنی۔

نسبتِ صوفیہ

(از افادات عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ دامت برکاتہم)

[حضرت مولانا ممدوح کا دستور ہے کہ اصلاحِ اُمت سے متعلق شریعت و طریقت کے اہم مسائل کو موضوع بنا کر اپنی خاص اصلاحی مجالس میں اُن پر تفصیلی گفتگو فرماتے ہیں، اس مجلسی خطاب میں موقع بہ موقع حضرت مولانا کتابیں کھول کھول کر ان کی عبارتیں بھی حاضرین کو سناتے جاتے ہیں — بعض اہل علم مسترشدین اس کو مقالہ کی شکل میں مرتب کرتے ہیں، پھر حضرت کی نظر سے گزرنے کے بعد اس کی اشاعت ہوتی ہے — مندرجۂ ذیل مقالہ "نسبتِ صوفیہ" کی نوعیت بھی یہی ہے — ہم اس کی خاص افادیت اور اہمیت کی بنا پر ماہنامہ "معرفت حق الہٰ آباد" سے اس کو نقل کر رہے ہیں —]

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے اپنی کتاب القول الجمیل میں لکھا ہے کہ:-

ثم لصاحب المداومة على السكينة احوال رفيعة تنوبه مرة وحرة فليغتنمها السالك وليعلم انها علامات قبول الطاعات وتاثيرها فى صميم النفس وسويداء القلب۔

(شفاء العليل ص ۹۵)

جاننا چاہیئے کہ سکینہ پر مداومت کرنے والے کے لیے حالات رفیعہ ہوتے ہیں جو نوبت بہ نوبت اس کو ملتے ہیں۔ لہذا سالک کو چاہیئے کہ اپنے ان حالاتِ رفیعہ کو غنیمت جانے اور یہ سمجھے کہ یہ حالات اس کی طاعات کے عند اللہ مقبول ہونے اور ان کے باطن نفس میں اثر کرنے کی علامات ہیں۔

اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ جانتے ہیں کہ سکینہ کسے کہتے ہیں؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نہ سکینہ کو جانتے ہیں اور نہ صاحبِ سکینہ کو پہچانتے ہیں اور نہ احوالِ رفیعہ ہی سے واقف ہیں اور یہ اس لیے کہ آج اس طریق کو لوگوں نے بدنی سمجھ رکھا ہے یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کو پا جاؤ تو بس اس کے بدن پر گرو اسی سے کامیاب ہو جاؤ گے۔ باقی اس میں کسی چیز کے جاننے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں اس بات کو اکثر کہا کرتا ہوں اسلیے کہ دیکھ رہا ہوں کہ لوگوں نے طریق کے علم و عمل کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور لطف یہ کہ پیری و مریدی بھی باقی ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کیونکہ مرید تو اسے کہتے ہیں جو اپنی رائے اور ارادہ کو فنا کرکے کسی کامل و مکمل شیخ سے اس لیے تعلق قائم کرے کہ وہ اس کو اس کی رعونت نفس (انانیت) سے نکال کر اللہ تعالیٰ کا عارف بنادے اور شیخ کے متعلق ابن عربیؒ اپنے زمانہ کا حال لکھتے ہیں کہ:۔

ان الزمان مشحون بالدعاوی	زمانہ لمبے چوڑے جھوٹے دعووں سے
الکاذبۃ العریضۃ فلا مرید	بھرا ہوا ہے نہ کوئی مرید ہی صادق اور سلوک
صادق ثابت القدم فی سلوکہ	میں ثابت قدم نظر آتا ہے اور نہ کوئی شیخ
ولا شیخ محقق ینصحہ فیخرج	ہی محقق نظر پڑتا ہے جو کہ مرید کی خیر خواہی
من رعونۃ نفسہ واعجابہ	کرے اور اس کو نفس کی رعونت اور خود رائی
برایہ ویعرب لہ عن طریق الحق	سے نکالے اور طریق حق اس کے سامنے
فالمرید یدعی المشیخۃ والریاسۃ	ظاہر کرے (چنانچہ جب کوئی شیخ کامل نہیں
وھذا کلہ تخبیط وتلبیس۔	رہ جاتا تو پھر) مرید ہی شیخوخت اور بڑائی
(آداب الشیخ والمرید ص۸)	کا مدعی ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب خبط و
	تلبیس ہے۔

لہٰذا شیخ محقق جب اس زمانہ میں نایاب تھا تو اب ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں جو کہ پہلے زمانے سے یقیناً اچھا نہیں ہے شیخ کامل کے وجود کا کیا حال ہوگا۔ پھر جب شیخ ہی کا وجود نہیں ہوگا تو مرید کہاں سے آجائیں گے۔ اسی کو کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں پیر بہت ہیں اور مرید کا پتہ نہیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ مرید بہت ہیں اور پیر کا پتہ نہیں۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے۔

اصل یہ ہے کہ طریق سے جہالت اور دین سے عدم مناسبت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ اس کی بھی خبر نہیں کہ طریق میں مقصود کیا ہے اور کون کون سی چیزیں غیر مقصود ہیں۔ اس نہ جاننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے مقصود کو تو چھوڑ ہی دیا اور غیر مقصود کو مقصود بنا لیا۔ اسی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شیخ اور پیر جو کہ وسیلہ اور ذریعہ تھا اس کو مقصود سمجھ لیا گیا۔ اور اس کے بدنی قرب کو کافی سمجھا گیا اور اللہ تعالیٰ سے صحیح نسبت اور شیخ جس نور اور دولت کا حامل ہوتا ہے اس کی جانب اصلاً توجہ نہیں رہی۔

طریق کا مقصد اور اس کا منتہا کیا ہے۔ نیز یہ کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے اس کے متعلق حضرت شاہ صاحبؒ نے اسی کتاب میں نہایت عمدہ کلام فرمایا ہے۔ اسی سے آپ کو سکینت کی تعریف بھی معلوم ہو جائے گی جس کا ذکر میں نے ابتدا میں کیا ہے۔ اس لیے پہلے حضرت شاہ صاحبؒ کی عبارت نقل کرتا ہوں اس کے بعد اس کی مزید توضیح کروں گا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ :-

مرجع الطرق کلھا الی تحصیل
ھیأۃ نفسانیۃ تسمی عندھم
بالنسبۃ لانھا انتسابٌ و
ارتباطٌ باللہ عز وجل و
بالسکینۃ و بالنور وحقیقتھا
کیفیۃٌ حالۃٌ فی نفس الناطقۃ
من باب التشبہ بالملائکۃ
او التطلع الی الجبروت۔
(القول الجمیل)

تمام مشائخ کے طریقوں کا مرجع یعنی
مقصد و منتہیٰ اور حاصل ایک ہیئت نفسانیہ
کی تحصیل ہے جسکو صوفیہ نسبت کہتے ہیں۔
(یہاں نفسانی سے مراد شہوانی نہیں ہو جو کہ
روحانی کے مقابلہ میں ہوتا ہو بلکہ نفس سے مراد
یہاں نفس ناطقہ انسانی ہے۔ پس ہیئت
نفسانی کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے نفس
میں حاصل شدہ ایک کیفیت اور حالت)
اسلئے کہ اسکے ذریعہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے
ساتھ نسبت اور ارتباط حاصل ہوتا ہے اس
نسبت کا ایک نام سکینہ ہے اور اسی کو نور بھی
کہا جاتا ہے اور نسبت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ

ایک کیفیت کا نام ہو جو نفس ناطقہ میں حلول
کر جاتی ہو جسکے سبب سے نفس کے اندر ایک ملکی
شان پیدا ہو جاتی ہو اور عالم بالا سے باتیں
اخذ کرنے کا ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہو۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان جب طاعات۔ طہارات اور اذکار وغیرہ پر مداومت کرتا ہو تو اسکی وجہ سے اسکے نفس میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہو جسکی وجہ سے اسکو ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کرنے کا ایک ملکۂ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی ملکہ کا نام نسبت، سکینہ اور نور ہے۔ اور حصولِ نسبت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ کو ادھر توجہ تام ہو گئی ہے اور اسکو حق تعالیٰ سے تعلق ہو گیا۔ ورنہ حق تعالیٰ کو تو بندہ سے نسبت ہوتی ہی ہے۔ جیسا کہ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

اتصالے بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس را با جان ناس

یعنی حق تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ ایک ایسا اتصال (یعنی نسبت) حاصل ہو جسکی نہ تو کیفیت کا بیان ہو سکتا ہو اور نہ کسی چیز پر اسکو قیاس کیا جا سکتا ہو لیکن اس نسبت کے حصول کے طریقے الگ الگ ہیں اور نسبت بطور قدر مشترک کے سبھی طرق میں پائی جاتی ہو اور وہ ایک ہی ہو جیسا کہ شفاء العلیل میں ہے کہ :۔

"حضور مع اللہ رنگ برنگ ہو جس کسی کو جس قدر تعلق اور محبت اور کسر نفس کی توفیق ہوگی اسی قدر اس میں ملکہ قویہ حاصل ہوگا اور نسبتیں بے شمار ہیں چنانچہ اشغال قادریہ، چشتیہ، اور نقشبندیہ وغیرہ سے غرض اسی نسبت کی تحصیل ہو اور اس پر دوام و مواظبت اور اس کے اندر استغراق ہے تاکہ نفس میں اس مواظبت اور توجہ دائمی سے ملکۂ راسخہ پیدا ہو جائے۔ (تاکہ اس کے بعد پھر غفلت اور ذھول کی گنجائش باقی نہ رہے اور ملکہ کی وجہ سے احکام شرعیہ پر چلنا آسان ہو جاتا ہے اور ملکات سیئہ کا اثر نہیں ہونے پاتا۔)

آگے شاہ صاحبؒ بطور دفع دخل کے یہ فرماتے ہیں کہ سلاسل اربعہ میں اشغال صوفیہ سے مقصود نسبت کی تحصیل ضرور ہے لیکن حصول نسبت ان میں منحصر نہیں ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ :۔

ولا تظنن ان النسبة لا تحصل الا بهذه الاشغال بل هذه طرق لتحصيلها من غير حصر فيها وغالب الرائ عندي ان الصحابة والتابعين كانوا يحصلون السكينة بطرق اخرى فمنها المواظبة على الصلوات والتسبيحات في الخلوة مع المحافظة على شريطة الخشوع والحضور ومنها المواظبة على الطهارة و ذكرها ذم اللذات وما اعده الله للمطيعين له من الثواب وللعاصين له من العذاب فيحصل انفكاك عن اللذات الحسية وانقلاع عنها ومنها المواظبة على تلاوة الكتاب وتدبر فيه واستماع كلام المواعظ وما في الحديث من الرقاق۔

(القول الجميل)

یہ گمان نہ کرنا کہ نسبت مذکورہ کی تحصیل کا ذریعہ محض یہی اشغال صوفیہ ہیں ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اشغال بھی تحصیل نسبت کا ایک طریقہ ہے جس طرح سے اس کے اور بھی طریقے ہیں چنانچہ ظن غالب اس فقیر کا یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین اس نسبت اور سکینہ کو دوسرے طریقوں سے حاصل کیا کرتے تھے مثلاً ایک طریق اس کا یہ تھا کہ پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور خلوت میں تسبیحات کا اہتمام و التزام فرماتے تھے اور ان تمام امور میں خشوع و خضوع اور حضور قلب کا خاص خیال رکھتے تھے نیز ایک طریقہ تحصیل نسبت کا یہ بھی تھا کہ (ظاہری وباطنی) طہارات پر مداومت رکھتے تھے۔ اسی طرح لذتوں کو توڑ دینے والی چیز یعنی موت کا ہمیشہ استحضار رکھتے تھے نیز اللہ تعالیٰ نے مطیعین کے لیے جو اجر و ثواب اور انعام و اکرام تیار کر رکھا ہے اور نافرمانوں کے لیے جو عذاب و شدائد مہیا کر رکھے ہیں، ان سب کو برابر پیش نظر رکھتے تھے جس کی وجہ سے لذات حسیہ سے وہ بالکلیہ چھوٹ جاتے تھے اور ان سب چیزوں نے ان کے قلب سے عیش دنیا کا قلع قمع کر دیا تھا اسی طرح سے ایک طریقہ حصول نسبت کا پابندی

کے ساتھ کتاب اللہ کی تلاوت اور اسکے
معنی میں غور کرنا اور واعظ ناصح کی بات
پر کان دھرنا اور صمیم قلب سے اس کا سننا
تھا۔ اسی طرح سے حدیث شریف کے وہ مضامین
جن سے قلوب میں نرمی پیدا ہو ان کا سننا بھی تھا۔

دیکھئے شاہ صاحبؒ نے طرق تحصیل نسبت کی یہاں کیسی وضاحت فرمادی یعنی یہ کہ حضرات صحابہ کرام نسبت کی تحصیل ان ہی تمام چیزوں سے فرماتے تھے۔ ورنہ عام طور پر یہ غلط فہمی ہو رہی تھی کہ حصول نسبت کا ذریعہ صرف مشائخ کے اذکار و مراقبات ہی ہیں۔ حالانکہ وہ بھی ایک طریق ہے۔ اس میں انحصار نہیں ہے۔

اس سے قبل شاہ صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ:-

والغرض من الاشغال تحصيل	اشغال صوفیہ سے غرض اسی نسبت کی تحصیل
نسبة والمواظبة عليها	اور اس پر دوام اور مواظبت اور اس میں
والاستغراق فيها حتى تكتسب	مستغرق رہنا ہو تاآنکہ نفس اس مواظبت
النفس منها ملكةً راسخةً۔	اور مداومت سے ملکہ راسخہ کسب کرلے۔

اور اس کے بعد آگے چل کر فرماتے ہیں (جہاں ان امور کا ذکر کیا ہے جن کے ذریعہ حضرات صحابہ و تابعین تحصیل نسبت فرماتے تھے) کہ:-

وبالجملة فكانوا يواظبون	حاصل کلام یہ کہ حضرات صحابہ و تابعین
على هذه الاشياء مدةً	اشیاء مذکورہ (یعنی اعمال شرعیہ) پر ایک کثیر
كثيرةً فتحصل ملكةٌ راسخةٌ	مدت تک مواظبت و دوام فرماتے تھے جس
وهيئةٌ نفسانيةٌ فيحافظون	کی وجہ سے ان کے اندر تقرب الی اللہ کا
عليها بقية العمر وهذا	ایک ملکہ راسخہ اور ہیئت نفسانیہ حاصل
المعنى هو المتوارث عن	ہو جاتی تھی۔ اسی پر یہ حضرات بقیہ عمر
رسول الله صلى الله عليه وسلم	محافظت فرماتے تھے جس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ

من طریق مشائخنا لاشك	کیفا وہ نسبت اور بڑھتی جاتی تھی، یہی
فی ذلك وان اختلف	وہ نسبت ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ
الالوان واختلفت طرق	وسلم سے ہمارے مشائخ کے واسطے متواتر
تحصیلها۔	چلی آرہی ہے جس میں ذرا بھی شک نہیں
(القول الجمیل)	اگرچہ الوان اسکے مختلف وتحصیل کے طریقے
	رنگ برنگ ہیں۔

اس میں تصریح ہے کہ سلف ملکۂ راسخہ حاصل کرتے تھے اور بقیہ عمر اس پر مداومت کرتے تھے، فقط نماز۔ روزہ پر بدون اس ملکہ کی تحصیل کے قناعت کیے ہوئے نہ تھے جیسا کہ اب ہو، بلکہ جب تک یہ ملکہ ان کو حاصل نہ ہو جاتا اسکی طلب میں گرما گرمی رہتی تھی اور جب یہ حاصل ہو جاتا تھا تو یہ نہیں کہ ان کو سکون ہو جائے اور وہ غافل اور سست پڑ جائیں۔ ایسا نہیں تھا، بلکہ اپنے امور باطنی میں اور زیادہ مستعد اور چاق وچوبند ہو جاتے تھے ؎

مکتبِ عشق کا دیکھا یہ نرالا دستور
اُس کو چھٹی نہ ملے جس کو سبق یاد رہے

حضرت شاہ صاحبؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ تحصیل ملکہ راسخہ متوارث اور منقول چلا آرہا ہو۔ جس طرح کہ نماز، روزہ بلکہ کل دین منقول چلا آرہا ہے اور فرما رہے ہیں کہ لاشك فی ذلك پس یہ قطعی اور اجماعی مسئلہ ہوا اہر قرن کا۔

اسی سلسلہ میں کہتا ہوں کہ جس طرح سے یہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلسل چلی آرہی ہے اسی طرح سے اخلاق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متوارث چلے آرہے ہیں۔ یعنی آپ کے اخلاق سے صحابہ متخلق ہوئے اور پھر ان سے تابعین اور پھر ان سے تبع تابعین اسی طرح مسلسل۔

لہذا جس طرح نسبت کی تحصیل ضروری ہے اسی طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے اور بتائے ہوئے اخلاق کے ساتھ اتصاف بھی ضروری ہے۔ اور میں تو اس چیز کو بہت دنوں سے سمجھ چکا ہوں بلکہ کھلی آنکھوں مشاہدہ کر رہا ہوں کہ اس زمانہ میں دین اور دنیا دونوں

کی فلاح حاصل کرنے کے لیے بجز تمسک بسنۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کوئی صورت نہیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی پر چل کر اور اسے اختیار کر کے آج ہمیں دنیا کی بھی فلاح مل سکتی ہے۔ ورنہ تو اہل دنیا پر فلاح کا دروازہ بند اور عافیت تنگ ہو گئی ہے اور ہوتی جائے گی۔ چنانچہ آج لوگ جو فسادِ منزل بلکہ فسادِ مدینہ کے فتنوں سے مفتون ہیں۔ اور یہ دیکھ رہے ہیں کہ جس قدر عوام پریشان ہیں خواص بھی اسی طرح سے پریشان ہیں اور اسبابِ راحت کے موجود ہوتے ہوئے بھی سکون معدوم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خدائی عذاب ہے جو مخلوق پر ان کی بداعمالیوں کی پاداش میں مسلط کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس عذاب اور ان فتن سے خلاصی کی صورت اور تدبیر اور حضرات کے نزدیک جو ہو اس کو وہ جانیں مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ سارا فساد اور نظام عالم کی جملہ خرابیوں کی اصل یہ ہے کہ فلاحِ عالم کے خدائی اصول اور اصلاحِ عالم کا نبوی طریق کا رشتہ ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ گیا ہے اور وہ رشتہ یہی تھا کہ علاوہ دین کے دنیوی امور میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن کے ساتھ تمسک کیا جاتا۔ (چنانچہ اسکے مخاطب وہی حضرات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں اور آپ کی تعلیمات میں آپ کی تصدیق کرتے ہیں) یہ نقلاً تو ثابت تھا ہی کیونکہ یہ بھی اُن امور میں سے ہے جو متوارث چلے آ رہے ہیں علاوہ ازیں عقلاً بھی۔ ہم آج اپنے حالات میں اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

نہایت افسوس ہے کہ جو چیز اس درجہ ضروری تھی وہ متروک ہی نہیں بلکہ اس کا انکار ہو رہا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ نماز روزہ باقی ہے اور یہ چیز باقی نہیں خون کے آنسو اس پر بہائے جائیں تو کم ہے۔ کیا صرف نماز روزہ ظاہری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے چلا آ رہا ہے؟ خشک ہی۔ اس میں یہ برکات نہیں تھے۔ یہ کیا خرابطہ ہے۔ یہ کہاں سے آیا؛ علماء نے اسکی تحصیل کو ضروری نہیں سمجھا اس لیے اس کا علم اور عمل ختم ہو گیا اناللہ وانا الیہ راجعون۔

یہاں ایک بات یہ سمجھ لیجئے کہ حضرات صحابہ حسب مراتب سب کے سب اس نسبت کے حامل تھے اور ان کا باہمی تفاضل اور ان کے درجات کا تفاوت اسی نسبت کے تفاوت سے تھا جسے جسقدر زیادہ اور قوی نسبت حاصل ہوتی تھی اسی قدر وہ افضل اور بلند مرتبہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ نماز روزہ ان کا عملِ ظاہر تھا اور یہ نسبت اس کا باطن تھا اور یہ حضرات اس ظاہر و باطن دونوں ہی کے

جامع تھے۔ اب صرف ظاہر دین تو کچھ ہے بھی مگر باطن اور روح ختم ہو چکی ہے۔

اور یہ جو فرمایا۔ کہ اس نسبت کے الوان اور طرق مختلف ہوتے ہیں تو اس کے متعلق یہ سمجھئے کہ سلف میں اس نسبت کی تحصیل کا طریق احکام شرعیہ کی پابندی تھی اور خلف میں اشغال وغیرہ اسکے لیے مقرر ہوئے مگر احکام شرعیہ ہر حال میں مقدم ہے۔

یعنی حضرات صحابہ تو اس نسبت کو مواظبت علی الصلوٰۃ و تسبیحات و مواظبت علی الطہارۃ مراقبۂ موت اور ثواب مطیعین اور عذاب عاصیین کے استحضار وغیرہ سے حاصل کرتے تھے اور بعد کے مشائخ نے لوگوں کی استعداد کو ضعیف پایا۔ اور یہ دیکھا کہ محض ان امور کے کرنے سے اب یہ نسبت نہیں حاصل ہو رہی ہے تو انھوں نے اشغال و مراقبات کا اضافہ کر دیا۔ اور ان کے ذریعہ نسبت پیدا کرنی چاہی۔ یہ تو طرق کا اختلاف ہوا۔ اور الوان کا اختلاف یہ تھا کہ مثلاً کسی نسبت میں محبت و شوق کا غلبہ ہوا اور کسی میں خوف کا، کسی میں فنا کا غلبہ رہا اور کسی میں بقا کا تو بظاہر نسبت کے یہ سب الوان مختلف معلوم ہوتے تھے۔ لیکن ان سب نے ہر ہر سالک کے اندر وہی حالت پیدا کر دی جس کا نام نسبت تھا۔ چنانچہ جس میں محبت اور شوق کا غلبہ ہوا اس نے بھی معصیت ترک کی اور اپنے تمام امور میں حق تعالیٰ کی رضا پیش نظر رکھی اور جس کے اندر خوف کا غلبہ ہوا اسنے بھی معاصی سے نفرت اور طاعت سے رغبت کی۔ یہی حال اور دوسرے الوان کا بھی ہوا۔ پس اس اختلاف کے باوجود مرجع سب کا واحد ہی رہا۔ یعنی ارتباط باللہ تعالیٰ جسکی تحصیل سب پر لازم تھی اور ہر شخص پر ضروری تھی۔ ان اشغال کے ذریعے نسبت کی تحصیل اور اس پر مواظبت اور اس میں استغراق اس درجہ کہ نفس ملکۂ راسخہ کا کسب کر لے اسلئے ضروری ٹھہری کہ جب نفس کو ملکۂ راسخہ حاصل ہو جائے گا تو پھر غفلت اور ذھول کی گنجائش باقی نہ رہ جائے گی اور اسی میں اسکی خیریت بھی ہے کیونکہ اگر ان اشغال کے ذریعہ ملکۂ حسنۂ طیبہ کا کسب نہ کیا گیا جس سے کہ طاعت میں سہولت اور معصیت سے نفرت ہو جائے تو اشغال دنیویہ میں انہماک کے سبب سے نفس ملکۂ خبیثہ ردیہ کسب کر لے گا جس سے نجات ملنی دشوار ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ یہ ظاہری طاعات (یعنی نماز روزہ) بھی اسکو اس سے نہ نکال سکیں گی۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ یہ سب طاعات بھی کرتا رہے گا اور دوسری جانب اسکے نفس میں یہ ملکۂ خبیثہ بھی موجود رہے گا جس سے خلاصی آخرت ہی میں ہو سکے گی۔

مذکورۂ بالا تفصیل سے نسبت کی توضیح اور اسکی ضرورت آپ کو معلوم ہوگئی، نیز یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اسی نسبت کا دوسرا نام سکینہ بھی ہو۔ یہ مشائخ کی اصطلاح ہے باقی علمار ظاہر بھی جو معنی نسبت سکینہ کے بیان کرتے ہیں وہ اسی کے قریب قریب ہو چنانچہ صاحب روح المعانی فانزل اللہ سکینتہ کے تحت لکھتے ہیں کہ وھی الطمانینۃ التی یسکن عند ھا القلوب یعنی سکینہ اس اطمینان کا نام ہے جسے پاکر قلوب تسکین حاصل کریں اور پھر کچھ دور کے بعد باب الاشارۃ میں لکھتے ہیں کہ :-

ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المومنین الایۃ۔ وکانت سکینتہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کما قال بعض العارفین من مشاھدۃ الذات وسکینۃ المومنین من معاینۃ الصفات۔

حق تعالیٰ کے ارشاد ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المومنین میں سکینہ جو آیا ہو اسکے متعلق بعض عارفین یہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکینہ آپ کا مشاہدۂ ذات تھا اور مومنین کا سکینہ صفات کا معائنہ تھا یعنی آپ اس حالت میں حق تعالیٰ کی ذات کے مشاہدے سے متلذذ تھے اور مومنین اللہ تعالیٰ کی صفات کا مراقبہ کرکے مطمئن تھے۔

آگے فرماتے ہیں کہ:-

ولھم فی تعریف السکینۃ عبارات کثیرۃ متقاربۃ المعنیٰ فقیل ھی استحکام القلب عند جریان حکم الرب بنعت الطمانینۃ بخمود آثار البشریۃ بالکلیۃ والرضا بالبادی من الغیب من غیر معارضۃ واختیار

مشائخ کے لیے سکینہ کی تعریف کے بیان میں مختلف تعبیرات ہیں۔ عنوان مختلف ہیں۔ لیکن معنیٰ اور مضمون قریب قریب سب کا ایک ہی ہو چنانچہ ایک قول یہ ہو کہ سکینہ اس قوت قلبیہ کا نام ہو جس میں اطمینان کی آمیزش ہو حق تعالیٰ کے حکم سننے کے وقت، اور اسکی وجہ سے انسان کے بشری تقاضے بالکلیہ سوخت ہو جائیں اور پردۂ غیب سے جو چیز ظاہر

ظاہر ہو بغیر کسی معارضہ کے اور بدون اپنا اختیار چلائے ہوئے انسان اس پر راضی ہو۔

وقيل هي القرار على بساط الشهود وبشواهد الصحو والتأدب بإقامة صفاء العبودية من غير لحوق مشقة ولا تحرك عرق بمعارضة حكم وقيل هي المقام مع الله تعالى بفناء الحظوظ۔

روح المعانی ص۹۳ ج۱۰

اور ایک قول یہ ہے کہ سکینہ اسے کہتے ہیں کہ انسان اپنے پورے ہوش وحواس کے ساتھ حق تعالیٰ کے شاہد کی بساط پر فائز ہو اور خالص عبودیت کی اقامت کے ادب سے متأدب ہو اس طرح پر کہ اس کو ان کی ادائیگی میں نہ تو کچھ تعب ہو اور نہ کسی حکم سے معارضہ کی رگ پھڑکے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ سکینہ اسے کہتے ہیں کہ انسان اپنے حظوظ کو فنا کرکے بقا باللہ حاصل کرلے

اور جس طرح سے حضرت شاہ صاحبؒ نے حضرات صحابہ وتابعین کے سلوک کا طریقہ اور تحصیل نسبت کے طرق اور ان کی تفصیل بیان فرمائی ہے اسی طرح سے حضرت مولانا گنگوہیؒ نے بھی نسبت احسان کے معنی بیان کیے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:-

"ہستی مطلق کو ہردم خیال میں پرورش کرنا اور بلاکیف حاضر موجود جان کر حیا وشرم کے ساتھ بندۂ مطیع رہنا مقصد اصلی ہے اور یہی احسان ہے۔ باقی زوائد۔"

اسی سلسلہ میں آگے صحابہ وتابعین کا سلوک بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

"سنو! کہ سلوک صحابہؓ وتابعینؒ وتبع تابعین میں تحصیل احسان اور اپنا بندۂ ناچیز بے اختیار رہنا اور من کل الوجوہ محتاج ذات غنی کا اور حضور اس کردگار بے نیاز محسن حیاد کا رہنا تھا۔ بندگی در بندگی، عجز در عجز، توکل در توکل، ہمت اطاعت و جان و مال بازی در رضا مولیٰ اس کا ثمرہ تھا نہ استغراق تھا نہ فنا تھی ـــــ متاخرین نے دوسرا راستہ نکالا کہ جس سے رابطہ حادث بالخالق کی کیفیت معلوم ہوجائے۔ سو بعد مجاہدات معلوم ہوا کہ سب مخلوقات اعلیٰ سے اخیر تک اپنے خالق سے مربوط اور اس کے وجود سے

موجود ہیں۔ یو حدت وجود یا بوحدت شہود علیٰ خلاف بینہم۔

پس اس ربط کے شہود کا نام جذب رکھا گیا اور انتہا راہ جذب اس نسبت کے انکشاف پر ہے۔ پس جذب کے معنی رجوع السالك الى حقيقة الحقائق واصل الاشياء۔ اور اس میں افناء انیا اور اپنے علم انانیت کا کر دینا مقرر ہوئے۔

اس راہ جذب کو جو حضرات مشائخ نے طے کیا اس کے بیان سے زبان عاجز ہے۔ گویا وہ کمالات اب کالعنقا ہوگئے۔ جس طرح سالک مجاہدہ کر کے کوئی مقام طے کرے ہنوز نکے آثار کے سوا ان کمالات سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی ان کا حوصلہ و ملکہ ملاء اعلیٰ سے ناشی تھا اب ملاء اعلیٰ سے بھی پوری مناسبت نہیں۔ مع ہذا راہ جذب ہے نہ درگاہ (یعنی جذب طریق ہے مقصد نہیں اس لیے) بعد طے راہ جذب کے وہی طریقہ صحابہ کو عبدیت کا مقام ہے اختیار کرنا و عبادت و عاجزی کا معاملہ کرنا واجب ہوتا ہے۔"

(مکتوبات رشیدیہ صفحہ)

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے صحابہ کے سلوک کی جو تفصیل بیان فرمائی بہت خوب ہے اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہو۔ بلاشبہ حضرات صحابہ کا یہی حال تھا لیکن حضرت نے یہ جو فرمایا کہ وہاں نہ استغراق تھا نہ فنا تھی تو اسکی کچھ توضیح کرتا ہوں وہ یہ کہ یہ صحیح ہے کہ جس نوع کا استغراق اور فنا متاخرین کو حاصل ہوا حضرات صحابہ کا فنا اس قسم کا نہ تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ حضرات فنا سے عاری تھے۔ ایسا نہیں تھا۔ ان حضرات نے بھی اپنے آپ کو کامل طور پر فنا کر دیا تھا۔ لیکن ان کے فنا میں شکر یہ تھا کہ بالکل ہی مغلوب الحال اور مستغرق ہو جاتے بلکہ ان کا فنا صحو کے ساتھ ساتھ تھا۔ پورے فانی اور پوری طرح باہوش۔ اور بعد کے لوگوں میں یہ جامعیت نہ تھی بلکہ ان کے فنا میں سکر کا انداز تھا۔ آپکے سامنے صحابہ کے فنا کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ حضرت زید بن حارثہؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنّیٰ تھے ان کا نکاح حضرت زینبؓ کے ساتھ ہوا تھا لیکن مزاج کی موافقت نہ ہوئی اور حضرت زیدؓ نے حضور سے شکایت کی اور کہا کہ میں ان کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ حضور نے منع فرمایا اور یہ فرمایا کہ اس نے میری خاطر سے اور اللہ اور رسول کے حکم سے تم کو اپنی طبیعت کے خلاف قبول کیا ہے اسلئے اب چھوڑ دینے کو وہ اور

اس کے عزیز اپنی دوسری ذلت سمجھیں گے۔ اس لیے خدا سے ڈرو اور جہاں تک ہو سکے نباہ کی کوشش کرو۔ لیکن موافقت نہ ہونی تھی نہ ہوئی اور آئے دن جھگڑے اور قضیے پیش آتے رہے۔ ادھر اللہ کو یہ منظور تھا کہ جاہلانہ رسم یعنی اپنے لے پالک کی بیوی کے ساتھ نکاح نہ کرسکنا اس کو اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے عملی طور سے ہم کردے تاکہ مسلمانوں کو آئندہ اس مسئلہ میں کسی قسم کا توحش باقی نہ رہے اس لیے جب زید نے ان کو طلاق دیدی اور عدت گزر گئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت زینب کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آسمان ہی پر کردیا جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا۔ یعنی پھر جب زید کا اس سے جی بھر گیا تو ہم نے آپ سے اس کا نکاح کردیا تاکہ مسلمانوں کو اپنے منھ بولے بیٹوں کی بیویوں کے نکاح کے بارے میں کوئی تنگی نہ رہے جب وہ ان سے اپنا جی بھر چکیں اور خدا کا یہ حکم تو ہونے والا تھا ہی۔

(بیان القرآن صلا ۹۷)

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آپ حضرت زینب کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو آیت سنائی اور پھر اس کے بعد ان کا شمار ازواج مطہرات میں ہونے لگا۔

یہ واقعہ صحابہ کے سامنے پیش آیا اور اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا اور اس میں شک نہیں کہ عجیب واقعہ تھا مگر وہ حضرات اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس طرح فنا کر چکے تھے کہ اسکے متعلق زبان سے کچھ کہنا تو درکنار کسی کو خطرہ اور وسوسہ کے درجہ میں بھی کوئی خیال نہیں گزرا اسکی کوئی نظیر غیر صحابی میں تو مل ہی نہیں سکتی۔

اب اس سے بڑھ کر کیا فنا ہوگی کہ اپنی رائے کو اللہ اور رسول کی رائے اور ارادہ کے بالکل تابع کردیا تھا اور فنا سے مراد حضرات مشائخ کی بھی ارادہ ہی کا فنا ہونا ہے یا رذائل کا فنا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں ان دونوں ہی کا بے مثال ثبوت موجود ہے۔

اسی طرح حضرت مولانا گنگوہی نے جذب (یعنی نسبت) کے معنی یہ بیان فرمائے کہ رجوع السالك الی حقیقة الحقائق واصل الاشیاء اور اسکے بعد یہ فرمایا کہ اس میں فنا اپنا اور اپنے علم وانانیت کا کردینا متقرر ہوئے۔ نہایت عمدہ بات فرمائی۔ بلاشبہ نسبت میں فنا علم اور

فنا وارادہ تو ہوتا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلقات سے بھی دل سرد ہو جاتا ہے اور سالک کا مطلوب صرف ذات باری اور رضائے باری تعالیٰ ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کو حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہٗ خلف الرشید حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ نے اپنے مکتوبات میں خوب خوب بیان فرمایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ طریق کو سالک کی نگاہوں میں محبوب کر دینے اور اس کی صعوبتوں کو برداشت کرنے اور حق تعالیٰ کی طلب میں سالک کو کھڑا کر دینے کا ان بزرگ کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ فنا کے مضمون کو تو اس دلکش عنوان سے بیان فرماتے ہیں کہ بس انسان کمر ہمت باندھ کر میدان میں کود ہی پڑے۔ چنانچہ مکتوب بست و دوم مکتوبات جلد سوم میں صوفیائے کرام کے طریق کی مدح فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:-

اللہ تعالیٰ بہ جمعیت و عافیت دارد و بر جادۂ شرع محمدی علیہ السلام و سنت احمدی مستقیم و مستدیم گرداند و از تعلقات دنیا و گرفتاری ماسوا محرر ساختہ در سرادقات معرفت و سرا پردۂ قرب خویش انس و الفت دہد۔ ایں معنیٰ در عالم اسباب وابستہ بسلوک طریقۂ صوفیہ عالیہ است ایں بزرگواران در محبت حق جل و علا از خود و از غیر خود گسستہ اند و در عشق او از آفاق و انفس گذشتہ ماسوا را در راہ او درباختہ و باو ساختہ اند اگر حاصل دارند او را دارند اگر واصل اند باو واصل اند باطن شان را بہیچ انقطاع از دون او تعالیٰ روئے دادہ است کہ اگر سالہا یاد ماسوا نمایند بیاد شان نیاید و از انانیت نفس بنوعے گذشتہ اند کہ خود کلمۂ انا را بر خود شرک می دانند۔	اللہ تعالیٰ تم کو جمعیت خاطر کے ساتھ عافیت رکھے اور شریعت محمدی و سنت احمدی علیہ السلام پر مستقیم و مستدیم رکھے اور دنیوی تعلقات سے دور اور ماسوی اللہ کے علائق سے نفور رکھے اور اپنے قرب و معرفت کے سرا پردہ کے ساتھ انس و محبت بخشے (دیکھو لوکہ اللہ تعالیٰ کا یہ قرب خاص جس کا نام نسبت ہے) یہ چیز اس عالم اسباب میں حضرات صوفیہ علیہ کے طریق پر چلنے سے حاصل ہو سکتی ہے چنانچہ ان بزرگوں نے حضرت حق جل و علا کی محبت میں نہ اپنے کو دیکھا اور نہ غیر کو بلکہ ریسے یک لخت خالی ہو گئے اور عشق مولیٰ میں اپنے نفس کو بلکہ سارے ہی جہان کو چھوڑ دیا اور ماسوی اللہ کو اللہ کے راستہ میں خیر باد کہہ کر خود کو ان کے ساتھ واصل کر لیا۔ اس طرح سے کہ اب اگر کسی سے تعلق رکھتے ہیں تو بس انہی سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی سے واصل ہیں تو انہی سے واصل ہیں چنانچہ ان حضرات کے باطن کو ماسوی اللہ

رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ ورجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ. خداوندا مرا ازیں قوم گرداں یا از نظارگیان ایں قوم گرداں کہ قوم دیگر را طاقت ندارم

ہر کس کہ ہوس ایں را دارد و تخم ایں اندیشہ در دل می کارد باید کہ ہمہ چیز را گذاشتہ صحبت ایں اکابر اختیار نماید و جان نثار لوازم طلبگاری کند و از ہر جا بوئے ازیں دولت بمشام جان برسد از پئے آں شود خوش گفتہ بود ؎

بعد ازیں مصلحت کار دراں می بینم
کہ روم بر در میخانہ و خوش بنشینم

(مکتوبات صفحہ ۴۶ ج ۲)

سے ایسا انقطاع کلی ہو جاتا ہے کہ اب اگر ماسوی کو سالہا سال یاد کریں تب بھی یاد نہ آئے. اسی طرح نفس کی انانیت اور رعونت سے ایسا نکل جاتے ہیں کہ اب اس کے بعد لفظ انا کا استعمال بھی ان کو شرک معلوم ہوتا ہے. یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ سے جو عہد باندھا تھا اس کو سچ کر دکھایا اور یہ وہ لوگ ہیں جنھیں تجارت اور بیع اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مشغول نہیں کرتی. خداوندا تو مجھے بھی اسی قوم میں سے کر دے یا کم از کم ان کی زیارت کرنے والوں ہی میں سے بنا دے کیونکہ ان دو کے علاوہ تیسری قوم میں ہونے کی طاقت نہیں رکھتا. اب جو شخص کہ طریق میں داخل ہونے کی ہوس رکھے اور طلب خدا کا بیج اپنے دل میں بونا چاہے تو اسکو لازم ہے کہ تمام چیزوں کو ترک کر کے مشائخ طریق کی صحبت اختیار کرے اور لوازم طلب کے آگے اپنی جان نثار کرے اور جس جگہ سے بھی اس دولت کی خوشبو اسکے مشام جان میں پہنچے اس کی تحصیل کے در پے ہو جائے. کسی نے خوب کہا ہے. اب اس کے بعد مصلحت کار اس میں سمجھتا ہوں کہ میخانہ کے دروازہ پر جا پڑوں اور خوشی خوشی وہیں ایام گزار دوں. وقیل فی ہذا المعنی

؎ مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

ایک دوسرے مقام پر قبض و بسط پر جو کہ سالک کے احوال میں سے ہیں اور طریق کے ارکان میں سے

میں کلام کرتے ہوئے نسبت کے متعلق فرماتے ہیں کہ کبھی اس کا ضعف سالک کے قبض کا سبب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

گاہ بود کہ ایں تنگی بجہت ضعف نسبت باطن باشد و چوں نسبت قوت پیدا نہ کردہ است گاہے ظہور می کند و گاہے مستور می شود۔ در حالت بعد صوری و غیبت از مرشد بیش از ملکہ نہ شدن نسبت ایں ضعف روئے می دہد و علاج آں صحبت راہبر است و توجہ او تا نسبت قوت پذیرد و ملکہ شود و بسر حد فنا رسد۔

(مکتوبات معصومیہ صفحہ ۱۶۴)

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قبض کا منشا نسبت باطنی کا ضعف بن جاتا ہے۔ کیونکہ نسبت جب قوی نہیں ہوتی تو کبھی اس کا ظہور ہوتا ہے اور کبھی وہ مستور ہو جاتی ہو۔ بالخصوص اس حالت میں جبکہ اپنے شیخ سے صوری اور ظاہری بعد بھی ہو۔ چنانچہ جب تک نسبت کا رسوخ نہ ہو جائے یعنی وہ ملکہ نہ بن جائے اس سے پہلے شیخ سے جدائی اس قسم کے ضعف کا سبب بن جاتی ہے۔ یعنی جب شیخ کی خدمت میں رہے گا تو نسبت میں قوت محسوس ہوگی اور جدا ہونے میں اس میں ضعف ہو جائے گا، اس کا علاج رہبر کامل کی صحبت اور اس کی توجہ ہے تاکہ نسبت قوی ہو کر ملکۂ راسخہ ہو جائے اور سالک فنا کی حد تک پہونچ جائے۔

اس کے بعد توجہ شیخ اور صحبت کامل کو مدار کار یعنی حصول نسبت اور ذریعہ تقویت نسبت قرار دے کر اس پر نہایت ہی زوردار کلام کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ نسبت کسی صاحب نسبت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

توجہ مرشد در صورت ثانیہ کہ بواسطہ زلت ظلمتے طاری شدہ باشد نیز نافع است توجہ پیر کامل کوہ کوہ ظلمات و کدورات را از ہر راہ کہ پیدا شدہ باشد از مرید صادق بر میدارد و تطہیر باطن او می فرماید و در قبض نیز ایں توجہ سود مند است بزودی در بسط

مرشد کامل کی توجہ دوسری صورت میں بھی یعنی جبکہ کسی معصیت اور لغزش کے سبب نسبت میں تاریکی آجائے نافع ہوتی ہے اس لیے کہ شیخ کامل کی توجہ ایسی چیز ہے کہ اگر ظلمات و کدورات کے پہاڑ کے پہاڑ ہر طرف سے نمودار ہو جائیں تو ان کو بھی مرید صادق سے دفع کر کے اس کے باطن کی تطہیر کر سکتی ہے۔

می آرد و راہ ترقی را برو سے می کشاید۔

وبالجملہ مدار کار بر صحبت و توجہ است
کہ با محبت و سپرد جمع شود از یکجانب محبت و
سپرد و از جانب دیگر توجہ۔

محبت تنہا بے توجہ راہبری تواند کہ نافع
شود ترقی بخشد اما توجہ محض بے محبت قلیل النفع
است۔

محبت است کہ معانی خفیہ پیر را جذب
می نماید و کمالات مخصوصہ او را بخود می کشد
و فنا فی الشیخ بلکہ فنا فی اللہ پیدا می آرد و
چوں از طرفین صفات مذکورہ پدید آید امید
است کہ راہ ترقی کشادہ شود و بزودی بمنزل
مقصود برسد و در راہ نماند۔

(صـ ۱۶۵)

اسی طرح سے شیخ کی یہ توجہ سالک کے لیے حالت قبض
میں بھی مفید ہے چنانچہ بہت جلد اس میں بسط پیدا
کرکے ترقی کا راستہ اس پر کھول سکتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ مدارکار وہ صحبت اور وہ توجہ ہے
جو کہ محبت یعنی عقیدت اور سپردگی کے ساتھ جمع ہو جائے
یعنی سالک کی جانب سے محبت اور حوالگی ہو اور
شیخ کی جانب سے توجہ۔

چنانچہ تنہا محبت بدون توجہ شیخ کے بھی رہبر
بن سکتی ہے یعنی نافع ہو سکتی ہے اور ترقی دے سکتی ہے
مگر محض توجہ شیخ بدون محبت طالب کے کچھ زیادہ
نفع بخش نہیں۔

یہ محبت ہی کا کرشمہ ہے کہ وہ تنہا شیخ کی توجہ
باطنی کو جذب کر لیتی ہے اور اسکے مخصوص کمالات
کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے اور فنا فی الشیخ بلکہ
فنا فی اللہ کا مقام حاصل کرا دیتی ہے۔ اور اگر صفات
مذکورہ یعنی محبت و توجہ جانبین سے ظاہر ہوتی ہیں
تو اب حصول نسبت کے بعد امید قوی ہو جاتی ہو کہ
ترقی کا راستہ کھل جائے اور جلد ہی منزل مقصود تک
رسائی ہو جائے اور سالک راستہ ہی میں نہ رہ جائے۔

پھر آگے کچھ دور کے بعد لکھتے ہیں کہ۔

پس باعث توقف سالک و سد راہ او
در این طریق ہیچ نشد غیر از سستی طالب طالب
صادق کہ در صحبت کامل رفتہ و شرائط

پس اس طریق میں سالک کے توقف کا سبب اور
اسکے حق میں مانع اور سد راہ کوئی اور چیز نہیں ہو
بجز سالک کی سستی کے چنانچہ جو طالب صادق کسی

طلب کہ اکابر بسیار دادہ اند بجا آورد امید است کہ البتہ واصل گردد۔

کامل کی صحبت میں پہونچ جائے اور وہ تمام شرائط بجالائے جنھیں اکابر طریق نے مقرر کیا ہے تو امید ہے کہ ضرور بالضرور واصل ہوجائے۔

(مکتوبات معصومیہ صفحہ ۱۶۶)

اس میں اس امر پر تنبیہ فرمائی کہ شیخ کامل کو پاکر بھی اگر سالک کامیاب نہیں ہو رہا ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ خود اس کے اندر کوئی علت اور مانع موجود ہے۔ اور علی العموم وہ مانع طالب کی کاہلی اور سستی اور اس کا شرائط طلب کا نہ بجالانا ہوتا ہے۔

ایک اور مقام پر سلوک کا مقصود بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

مقصود از سیر و سلوک شیخی و مریدی گرفتن نیست

مقصود ازاں ادائے وظائف بندگی است بے منازعت نفس۔

سیر و سلوک سے مقصود پیر بننا اور مرید بنانا نہیں ہے بلکہ وظائف بندگی کا اس طرح سے ادا کرنا ہے کہ نفس کی آمیزش اور منازعت باقی نہ رہے۔

و نیز مقصود نیستی و گمنامی است و زوال رعونت و انانیت امارہ کہ معرفت بداں مربوط است

ہر کہ بایں کس رجوع می کند و انابت می آرد او را از حق باز داشتہ بخود مشغول می سازد

و ہر کہ رجوع نمی آرد او را بحق می دارد ممنون او باید شد

اسی طرح سے طریق کا مقصود نیستی اور گمنامی کی تحصیل اور نفس کی سرکشی اور خود رائی کو دور کرنا ہے اس لیے کہ معرفت کا حصول اسی کے ساتھ وابستہ ہے اور جب ایسا ہے تو جو شخص ایسے شخص کی جانب رجوع ہوا اور اس سے تعلق کا اظہار کرے تو اس نے گویا اسکو حق تعالیٰ کی جانب سے پھیر کر اپنی جانب مشغول کر لیا اور جو شخص ایسے شخص کی جانب رجوع نہیں کرتا تو وہ اسکو حق تعالیٰ کے ساتھ رہنے کا موقع دیتا ہو لہذا اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

یارب ہمہ خلق را بمن بد خو کن

وز جملہ جہانیاں مرا یک سو کن

روئے دل من صرف کنی از ہمہ جہتے

در عشق خودم یکجہت و یکرو کن

(مکتوبات معصومیہ صفحہ ۹۸)

اے اللہ تو ساری مخلوق کو مجھ سے برگشتہ کر دے۔ ایسا کہ وہ میری جانب رُخ ہی نہ کریں اور اس طرح سے مجھے تمام دنیا والوں سے یکسو فرما دے۔

اور میرے دل کو ہر طرف سے پھیر دے۔

اور اپنے عشق میں مجھے یکسو اور ہمہ تن متوجہ فرمائے۔

دیکھئے یہاں حضرت خواجہ معصوم رحمۃ اللہ علیہ یہ جو فرما رہے ہیں کہ سیر و سلوک سے مقصود وظائف بندگی کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ نفس کی آمیزش اور منازعت باقی نہ رہے۔ یہ سکینہ ہی کی تعبیر ہے جس کا دوسرا نام نسبت ہو جیسا کہ میں نے روح المعانی سے سکینہ کی تعریف یہی بیان کی تھی کہ سکینہ اس قوت قلبیہ کا نام ہے جس میں طمانیت کی آمیزش ہو ایسی کہ احکام الٰہیہ سننے کے بعد انسان سے نفسانی تقاضے ختم ہو جائیں اور جو چیز بھی ظاہر ہو بدون معارضۂ نفس کے انسان اس پر راضی ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ سیر و سلوک سے مقصود اور اس کا منتہیٰ تحصیل نسبت ہی ہے اور جب کسی میں یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے تو پھر وہ شخص خود کو فنا ہی کر دیتا ہے اور اسی میں انسان کی خیریت ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا کمال ہو جیسا کہ خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ ایک مقام پہ لکھتے ہیں کہ:-

امید کہ آں برادر عزیز نیز بعافیت باشند و جمعیت صوری و معنوی متحقق بوند و از لفظ بمعنی آیند و از ظل باصل گرایند از ظل باصل شاہراہ است و مانع از وصول باصل توجہ ظل است بخود و اعراض او از اصل و چوں بسیر و سلوک بلکہ بمحض عنایت ازلی توجہ بخود رو بزوال آورد و بجائے اعراض اقبال باصل پیدا آید رشتۂ سعادت بدست افتد و متمسک بعروۂ وثقیٰ گردد ؎

چوں بدانستی کہ ظل کیستی
فارغی گر مردی و وگر نیستی

بعد از وصول ظل باصل و لحوق آں سالک را استہلاک و اضمحلال است و فنا

امید کرتا ہوں کہ برادر عزیز بھی بخیریت ہوں گے اور ظاہری و باطنی جمعیت کے ساتھ متصف نیز الفاظ سے معنی میں اور ظل سے اصل کی طرف آ گئے ہوں گے کیونکہ ظل سے اصل کی جانب شاہراہ گئی ہے۔ باقی اصل تک پہونچنے میں جو چیز ہے وہ ظل کا خود اپنی جانب توجہ کرنا اور اصل سے اعراض کرنا ہے اور اگر سیر و سلوک کے ذریعہ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کی عنایت ازلی کے سبب سے سالک کی توجہ ظل سے ہٹ کر اصل کی جانب ہو جائے اور بجائے اعراض کے اصل کی جانب اقبال ہو جائے تو سمجھنا چاہیے کہ سعادت کا رشتہ ہاتھ لگا اور سالک نے مضبوط کڑے کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔

جب تم نے یہ معلوم کر لیا کہ کس کے ظل ہو اور

نیستی و ایں معنی کمال است در حق او کمال او در سلب کمال است و خیریت او در انتفائے خیریت معرفت وابستہ بایں فنا است و قرب منوط بایں انکسار اذا تجلی اللہ بشیٔ خضع لہ۔

وبعد ازاں مستعد آں می شود کہ اورا از نزد خود حیات دہندہ و باخلاق خود متخلق سازند من قتلتہ فانا دیتہ و بہ تکمیل ناقصاں بازش گردانند کریمہ او من کان میتا فاحیینٰہ وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس۔ نشان حال او است آں زمان نعمت در حق او تمام شود و معنی خلافت بظہور آید ؎

ایں کار دولت است کنوں تا کرا دہند

(مکتوبات معصومیہ صد ۲۳)

تمھاری اصل کون ہو؟ تو بس اب تم فارغ ہو گئے مر جاؤ چاہے زندہ رہو مقصود حاصل ہے۔ ظل جب اصل سے مل جاتا ہو اور اسکے ساتھ پیوست ہو جاتا ہو تو سالک اپنے اندر اضمحلال استہلاک اور فنا اور نیستی کی کیفیت محسوس کرتا ہو اور یہ چیز اسکے حق میں کمال ہو اسلئے کہ سالک کا کمال ہی سلب کمال میں ہو اور اسکی خیریت ہی عدم خیریت میں ہو معرفت جس چیز کا نام ہو وہ اسی فنا سے وابستہ ہے۔ اور قرب اسی انکسار سے ملا ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی تجلی جب کسی چیز پہ ہوتی ہو تو وہ اسکے سامنے پست اور خاضع ہو جاتا ہو

اس فنا اور نیستی کے بعد نفس کے اندر اس بات کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ اسکو اپنے پاس سے زندگی بخشیں اور اپنے اخلاق کے ساتھ اس کو متخلق بنا دیں خود ہی ارشاد فرمایا ہے کہ جس کو میں قتل کرتا ہوں تو میں ہی اسکا خون بہا ہوں اور پھر اسکے بعد اس شخص کو ناقصوں کی تکمیل کیلئے مقرر فرما دیتے ہیں۔ دیکھو ارشاد فرماتے ہیں کہ "ایسا شخص جو پہلے مردہ تھا ہم نے اسکو زندہ بنا دیا اور ہم نے اسکو ایک ایسا نور دیا کہ وہ اسکو لیے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہو" چنانچہ اس آیت میں اسی شخص کے حال کی خبر ہو۔ اب اسوقت جاکر اسکے حق میں نعمت تمام ہوتی ہو اور خلافت کے معنی کا ظہور ہوتا ہو۔ یہ دولت اور سلطنت کا کام ہے اور ایک منصب عظیم ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ کب اور کسے عنایت فرماتے ہیں۔

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ خلافت باطنی کس قدر زبردست منصب ہو اور اسکے کتنے شرائط ہیں اب منصب تو لینا چاہتے ہیں لیکن شرائط و آداب نہیں اختیار کرنا چاہتے۔ صحیح طور پر مرید بھی نہیں ہوتے اور پیر بن جانا چاہتے ہیں۔ ع

"بہ بیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا"

(باقی)

اجتماعی اجتہاد اور ایک فقہی مجلس کا قیام

اس دور میں اسلامی زندگی کی حتمی ضرورت

(از شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء پروفیسر دمشق یونیورسٹی)

(دوسری اور آخری قسط)

شریعت میں اجتہاد کے کردار کو ہم دو زمانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک ماضی، دوسرا مستقبل۔ ان دونوں زمانوں میں اجتہاد کا کردار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

اجتہاد کا کردار ماضی میں

ماضی میں اجتہاد نے اپنا وظیفہ مکمل طور پر ادا کرتے ہوئے شریعت کی بہترین خدمت کی اور فقہ کا ایک عظیم محل بنا کر کھڑا کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا تھا اجتہاد کے عمل نے اسے بھر دیا۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے احکام کے باب میں چند سو قرآنی آیتوں اور تقریباً اتنی ہی حدیثوں کا ذخیرہ چھوڑا تھا۔ لیکن نصوص کے اس ذخیرے میں اپنی قلت تعداد کے ساتھ ساتھ ایک لچک اور عموم، اصولی جامعیت اور علت نمائی کی ایک ایسی نوعیت پائی جاتی تھی۔ اور قانون سازی کے لیے بنیادی اصول ان میں ودیعت ہو گئے تھے کہ ان سے فقہ اور اجتہاد کو آگے بڑھنے کا ایک مضبوط اساس مل گئی۔ مثلاً قرآن پاک میں ارشاد ہوا: یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَوْفُوْا

بِالْعُقُوْدِ" (اے ایمان والو قول و قرار کو پورا کرو) ـــــ یہ اجتہاد و فقہ کے کتنے ہی احکام کی اساس ہے ـــــ اور اسی طرح حضورؐ کا ارشاد "لا ضَرَرَ ولا ضِرار" اس میں ضرار کے معنی ہیں نقصان کے بدلے میں نقصان پہونچانا۔ پس مطلب یہ ہے کہ جو کسی دوسرے کا مال تلف کر دے بدلے میں اس کا مال تلف نہیں کیا جائے گا بلکہ نقصان کا معاوضہ دلایا جائے گا۔ یہی وہ مسلمہ قانونی اصول ہے جسے ماہرین قانون وضعی (Law of Torts) نقصان رساں فعل کی ذمہ داری سے تعبیر کرتے ہیں۔

صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں یعنی قرون ثلثہ میں جزیرۂ عرب اور دیگر اسلامی مفتوحات میں کے اہل اجتہاد کا کوئی شمار نہیں تھا، ہر مجتہد کے اپنے اصول اور اپنا طریقہ تھا جس سے وہ نصوص کا مطلب سمجھنے، ان سے احکام اخذ کرنے اور نئے واقعات کو ان پر تطبیق کرنے کا کام لیتا تھا۔ کسی اصول میں اتفاق سے یہ سب متفق ہو جاتے اور کسی میں اختلاف رہتا لیکن یہ سب طریقے صحیح اور معتبر تھے۔ اس طرح ان تین قرنوں میں جتنے مجتہد ہوئے اتنے ہی اجتہادی مذاہب وجود میں آئے اور ہر مذہب نے تمام ابواب پر مشتمل ایک مکمل شرعی قانون پیش کیا۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جو ارباب مذہب کی موت کے ساتھ ختم ہو گئے اور اُن کے صرف متفرق اقوال اختلاف فقہا کی کتابوں میں نظر آتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن میں امام مذہب کو ایسے شاگرد میسر آگئے جنھوں نے امام کے ایک ایک قول کی حفاظت کی، اس کی تدوین و توسیع کے فرائض انجام دیئے اور لوگوں نے ان کو قبول کیا۔ اس سے ان مذاہب کے حصے میں کمال بقا آئی اور نسلاً بعد نسلٍ ان کی خدمت و اشاعت ہوتی رہی ـــــ یہ مذاہب مذاہب اربعہ ہیں۔

مذاہب اربعہ کے استحکام سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ایک طرف یہ مذہب نہایت کامل و جامع تھے اور بڑی کثرت سے ان کی فقہ پر مشتمل کتابیں تیار ہو گئی تھیں۔ دوسری طرف زمانے کے اثر سے لوگوں میں شریعت و لغت کے اُن علوم میں مہارت حاصل کرنے کا ذوق گھٹ چکا تھا جن سے اجتہادی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ تر لوگوں نے ان مذاہب کی تقلید کا راستہ اختیار کر لیا اور دنیائے اسلام کے ہر گوشے میں انھی میں سے کسی ایک مذہب کا بول بالا تھا۔ ان مذاہب کے اکابر علماء نے محسوس کیا کہ فقہ کا یہ کامل ذخیرہ لوگوں کی ضرورت کے لیے کافی ہے اور دوسری

طرف اجتہادِ مطلق کے شرائط ہیچیدہ کمیاب ہیں جس سے یہ بات قدرتی ہے کہ جمہور امت میں ان شرائط کا ادراک بھی کمزور پڑے، اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ نااہل لوگ اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مدعی اجتہاد بن بیٹھیں)۔ چنانچہ ان علماء نے چوتھی صدی ہجری کے بعد سے اجتہاد کا دروازہ بند ہو جانے کا فتویٰ دے دیا۔ یہ فتویٰ اجتہادِ مطلق ہی کے بارے میں تھا۔ محدود اور مقید اجتہاد کی گنجائش باقی رکھی گئی، جس کا مطلب یہ تھا کہ اہلِ مذاہب ان مذاہب ہی کے دائرے میں تفریع و توسیع اور تخریج کے ذریعے نئے نئے مسائل سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ مدتوں نئے مسائل کا حل یا انہی مذاہب میں مذکور مسائل پر قیاس کر کے نکالا گیا یا استحسان کے ذریعے اور یا پھر "مصالح مرسلہ" کے اصول کا سہارا لے کر۔ پانچویں صدی میں فقہ حنفی کے اندر بیع الوفاء کے احکام اسی طریقے سے متعین ہوئے جس میں سود کا اشکال تھا۔ اسی طرح متاخرین مذاہب نے استحسان کے اصول پر ایک فتویٰ یہ دیا کہ جس شخص کا سارا مال قرض میں ڈوبا ہوا ہو اس کا کوئی مالی تصرف حتیٰ کہ وقف بھی نافذ نہیں۔ ہاں مگر اس شکل میں کہ قرضخواہ اجازت دے دے۔ اس حکم کی بنیاد یہ قرار دی گئی کہ قرضداروں کو وقف، ہبہ یا ایسے ہی دوسرے تصرفات کے ذریعے اس کا موقع نہ ملنا چاہیے کہ قرضخواہوں سے اپنا مال بچا لیں، علیٰ ہذا اور بہت سے مسائل۔

لیکن زمانے کے قانون نے اس مقید اجتہاد کے ساتھ بھی وہی کیا جو مطلق اجتہاد کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کی اہلیتیں بھی بتدریج گھٹتی چلی گئیں اور آخرکار وہ وقت آ گیا کہ فقہ تازہ بتازہ رہنمائی کے لحاظ سے مطلق بانجھ پن کا شکار ہو کر پرانے احکام و مسائل کے حفظ و تکرار کا نام ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ آج جن کو علماء اور فقہاء کہا جاتا ہے ان میں ایسے اشخاص تک پائے جاتے ہیں جو فقہ کی تعلیم میں دلائل احکام اور آراء و مذاہب پر گفتگو کو بھی پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ ایک غیر ضروری کام ہے۔

ہم نے دعویٰ کیا تھا کہ اجتہاد شریعت کی روح اور فقہ کی جان ہے، فقہ کی تاریخ کا یہ دور جس میں اجتہاد متروک ہوا اس کی صداقت کا نہایت ٹھوس اور واقعاتی ثبوت فراہم کر گیا ہے۔ اس ترک اجتہاد ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ خلافت عثمانی کے آخری دور سے ہمارے حکام نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ شریعت اور اس کا نظام فقہ اس دور کے تیز رفتار تقاضوں کا ساتھ دینے

اور وقت کی ضرورتوں کے مطابق قانون سازی کی صلاحیت کا ثبوت دینے سے عاجز ہے۔ لازماً وہ اجنبی قوانین کی طرف جھکے اور پھر اسلامی فقہ اپنے کتب خانوں میں دفن ہوتی چلی گئی۔ علمی لحاظ سے بھی اور عملی لحاظ سے بھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس انجام کے آثار ابن قیمؒ کے دور میں رونما ہونے شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کی تصنیف "الطرق الحکمیۃ" نیز "اعلام الموقعین" میں بھی اس موضوع پر نہایت نفیس کلام پایا جاتا ہے۔ انھوں نے بڑے درد کے ساتھ اہل مذاہب کے اس جمود اور شریعت میں اُن کے اس جمود کی پیدا کردہ تنگیوں کا ماتم کیا ہے جس نے امراء اور سلاطین کو اجنبی قوانین اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ حالانکہ شریعت میں فی نفسہٖ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کی پوری صلاحیت تھی جن سے مجبور ہو کر اور جن کے باب میں وقت کی اسلامی فقہ سے مایوس ہو کر ان حکام نے یہ اقدام کیا تھا ——— الغرض باب اجتہاد کا بند کر دیا جانا ایک عظیم مصیبت تھی جو شریعت اسلامی اور اس کے قابل فخر نظام فقہ پر نازل ہوئی۔ جب تک اسلام کے ان خصائص سے انکار نہ کیا جائے جن کا اوپر ذکر آیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ کسی کو اجتہاد کا دروازہ بند کر دینے کا حق نہیں، خود مذاہب اربعہ کے بعض نامور متأخرین اپنی کتابوں میں صراحت کرتے ہیں کہ جب کبھی کوئی عالم شرائط اجتہاد کا جامع ہو جائے اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ کسی مذہب کی تقلید کرے۔ البتہ عملی طور پر وہ اس امکان کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ بالفاظ دیگر اُن کے ہاں بھی باب اجتہاد کا کھلنا ممنوع نہیں بلکہ اس کی کنجی مفقود ہے۔ ساتویں صدی ہجری کے اکابر فقہاء شافعیہ میں علامہ عزّالدین بن عبدالسلامؒ کا ارشاد ہے کہ

> "انسداد باب اجتہاد میں فقہاء کے مختلف قول ہیں .... مگر یہ سب فاسد ہیں۔ اس لیے کہ اگر کوئی نئی بات پیش آجائے جس میں نص موجود نہیں ہے۔ یا سلف کا اس کے حکم میں اختلاف ہو تو لازم ہے کہ اس میں کتاب وسنت سے اجتہاد کیا جائے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی کچھ کہتا ہے تو وہ ہذیان ہے۔"

تاہم اس کی بھی ضرورت ہے کہ جن لوگوں نے اجتہاد کو موقوف کرنے کا فیصلہ کیا اُن کے موقف کا پس منظر ہمیں معلوم ہو اور اُن کی رائے سے اختلاف کے باوجود کسی قسم کی

ناانصافی ان کے ساتھ نہ ہو۔

ماضی میں اجتہاد کی ساخت اور اس کا مزاج

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد اجتہاد کا مزاج شورائی تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور ان کے بعد حضرت عمرؓ کا دستور یہ تھا کہ حقوق یا امور سیاست میں کوئی نئی غور طلب بات پیش آتی تو یہ حضرات تمام اہل الرائے اصحاب کو جمع کر کے ان کا مشورہ حاصل کرتے تھے، جیسا کہ قرآن کی ہدایت ہے کہ (وشاورهم فی الامر ـ یا ـ امرهم شوریٰ بینهم) اور جیسا کہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو ہدایت فرمائی تھی کہ جب مسلمانوں کو کوئی ایسی بات پیش آجائے جس کے بارے میں نہ کتاب اللہ میں کوئی نص ہو نہ سنت رسول میں تو

اجمعوله العالمین ولا تقضوا — اس کے لیے اہل علم کو جمع کرنا چاہیے،
فیه برای واحد — فرد واحد کی رائے سے فیصلہ نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن بعد کے دور میں جب اصحاب کرام اور تابعین مختلف ملکوں میں منتشر ہو گئے اور کسی مشورہ کے لیے سب کا اجتماع ممکن نہ رہا تو پھر اجتہاد کی ساخت انفرادی بن گئی۔ مگر اس وقت کے لوگوں اور عہد نبوت میں زمانے کے اعتبار سے زیادہ فاصلہ نہیں ہوا تھا۔ اس عہد میمون کا گہرا اثر طبیعتوں میں تھا، احادیث نبوی کی تشخص بہ تشخص روایت کا ایک عام غلغلہ تھا، حدیثی صحیفے الگ تیار ہو کر علماء میں پھیل رہے تھے۔ اور مطالعہ قرآن و حدیث، علم لغت اور ذوق تفقہ میں مسابقت کی وہ گرم بازاری تھی کہ بڑی تعداد میں لوگوں کی زندگیاں علم ہی کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھیں۔ قدرتی طور پر ایک صالح و ثقہ عالم اور اس کے غیر کے درمیان امتیاز بھی اس دور میں آسانی سے ممکن تھا لیکن جب عہد رسالت سے فاصلہ بڑھ گیا، علمی اہلیت اور صلاح و تقویٰ کے اوصاف نادر ہو گئے اور عالم و متعالم کے درمیان تمیز مٹنے لگی تو متبعین مذاہب اربعہ کو سنجیدگی سے خطرہ لاحق ہوا کہ لوگ کہیں شریعت میں فساد برپا کرنے، بدعات کو رواج دینے اور گمراہ عقائد کو مسموم کرنے کے لیے اجتہاد کی دکانیں سجا کر نہ بیٹھ جائیں، اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اجتہاد ضروریات کے لیے اجتہاد مقید سے آگے جانے کی

کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے فتویٰ دے دیا کہ اب اجتہادِ مطلق کا دروازہ بند ہے۔

"ماضی میں اجتہاد" کے تجزیہ کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاسیسِ فقہ کے اس ابتدائی دور میں ان مؤسسین کے انفرادی اجتہاد نے اُمت کو بڑی خیر و برکت سے مالا مال کیا۔ ان کے نیک عزائم اور مسلسل محنت سے شریعت کی زمین لہلہا اُٹھی، انھوں نے نصوصِ شریعت سے قانونی نظریات اور اُصولی قواعد مرتب کرکے ہماری فقہ کو ایک ترقی پذیر سرمایہ عطا کیا۔ ان قواعد و نظریات اور فرعی احکام سے جو لازوال فقہی سرچشمہ وجود میں آیا ہے یقیناً اس کی نظیر اقوامِ عالم میں نہیں ملتی۔ یہ سب پہلی تین صدیوں کے انفرادی اجتہاد کی دین ہے ــــــ اور پھر یہ بھی ایک خیر و حکمت ہی تھی کہ اس کے بعد فقہی انارکی اور دوسرے بعض مفاسد کا خطرہ محسوس کیا گیا تو باب اجتہاد بند کردیا۔ ہاں اس میں جو صحیح نہیں ہوا وہ یہ تھا کہ بندش کلّی طور پر کردی گئی۔ جو خطرات درپیش تھے ان کے انسداد کے لیے اجتہاد کو حرام کردینے کی ضرورت نہ تھی، اسے نئے سرے سے منظم کرنے اور انفرادی کے بجائے اجتماعی وظیفہ بنا دینے کی ضرورت تھی۔ اور یہی وہ شکل ہے جو اب مستقبل میں اختیار کی جانی چاہیے۔

اجتہاد کا کردار مستقبل میں

ماضی میں انفرادی اجتہاد ایک ضرورت تھی لیکن آج وہ ایک بڑی مضرت ہے، وہ قباحتیں جن کا چوتھی صدی ہجری میں صرف اندیشہ تھا اور جس کی وجہ سے فقہائے مذاہب نے باب اجتہاد بند قرار دے دیا تھا آج وہ امر واقعہ بن گئی ہیں۔ ایک بڑی تعداد میں واقعۃً دین فروش پیدا ہوگئے ہیں، جن میں بہت سے علم اور قوتِ بیان کے اعتبار سے خدا ترس علماء سے فائق ہی ہیں، خود ازہر* کے فضلاء میں آج ایسے افراد موجود ہیں جن کی کتابوں اور فتووں کے ڈھیر ثابت کررہے ہیں کہ انھوں نے اپنا علم دشمنانِ اسلام کے تصرف میں دے دیا ہے۔ اور اجتہاد و آزادئ فکر کے پردے میں اسلام کی بنیادوں کو ڈھانے کا وہ کام انجام دے رہے جو ان دشمنوں کے اپنے بس کا نہیں تھا۔ دونوں ہاتھوں سے دنیا کمانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور خدا کی ناراضگی کا ادنیٰ خیال بھی شاید

* جامع ازہر۔ عالم اسلام کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی دینی درسگاہ۔

انھیں نہیں گزرتا۔ پس اگر ہم اجتہاد کو زندہ کرنا چاہتے ہیں جو کہ شریعت کی رُوح اور اس کی فقہ کی جان ہے اور جو عصری مشکلات کو حل کرنے کے لیے ناگزیر ہے تو ان حالات کے تحت لازم ہے کہ اجتہاد کے ایک نئے اسلوب کی بنیاد ڈالیں۔ یعنی انفرادی اجتہاد کے بجائے اجتماعی یا جماعتی اجتہاد، جو کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے دور میں اجتہاد کا اسلوب تھا۔

اور اس کا راستہ یہ ہے کہ آج کل کی علمی یا لسانی مجلسوں (اکیڈمی) کی طرح ایک مجلس فقہ اسلامی کی تشکیل کی جائے جس میں ہر اسلامی ملک سے اس کے مشہور فقہاء کو لیا جائے جو علم دین اور عصری بصیرت کے جامع ہوں اور صلاح و تقویٰ کے اوصاف سے بھی متصف ہوں، نیز عصری علوم کے وہ ماہرین بھی اس میں شامل کیے جائیں جو مثلاً اقتصادیات، اجتماعیات، قانون اور ڈاکٹری وغیرہ میں اختصاص رکھتے ہوں اور ساتھ ہی دینی اعتبار سے پختہ مسلمان ہوں، تاکہ فنی مسائل میں یہ لوگ فقہاء کے لیے معلومات کا ایک قابلِ اعتماد ذریعہ بنیں، یہ تمام ارکانِ مجلس کُلّی طور پر اسی کام کے لیے فارغ ہوں۔ ایک بڑی لائبریری ان کے تصرف میں ہو اور معاشی کفالت کے لیے کافی مشاہرے انھیں ملیں۔ ان کا سارا وقت اپنے مقصد کے لیے مطالعے میں گزرے اور عصری مسائل و مشکلات میں سے جو موضوع بھی دعوتِ غور و فکر دے یہ اس میں شرعی حکم دریافت کریں۔ اس مجلس کو اپنی علمی بحثوں کے لیے ایک مستقل رسالہ بھی نکالنا چاہیئے۔ اور فقہ اسلامی کی ایک انسائیکلوپیڈیا حروف ابجد کی ترتیب سے اس نہج پر مرتب کرنی چاہیے جس نہج پر دوسرے قوانین کی انسائیکلوپیڈیا زتیا ہو رہی ہیں۔ (اس کی کچھ تفصیل ہم آگے کریں گے) مزید برآں اُن اُمّہات کتب فقہ کی ایک فہرست (کیٹلاگ) تیار کی جانی چاہیئے جن کا مطالعہ عصر حاضر میں اجتہاد کے لیے ضروری ہے۔

فقہی اکیڈمی اور ادارہ اس کے دائرۂ کار کا یہ تجزیہ ایک بڑے بجٹ کو چاہتا ہے جس کا قابلِ اعتماد حصول ذیل کے صرف دو طریقوں سے ممکن ہے۔

۱ــــ تمام مسلم ممالک کے عوام سے چندہ (لیکن موجودہ باہمی افتراق، مسلم عوام میں شعور کی کمی اور ان کے تعلیم یافتہ طبقوں میں اسلام سے کم دلچسپی کی وجہ سے یہ عملاً ناممکن ہے)

۲ــــ کوئی دولتمند اسلامی حکومت براہ راست اپنے طور پر اس تجویز کو اپنا لے اور اپنے سالانہ مالی بجٹ کا ایک حصہ اس کے لیے مخصوص کرے یا کسی عالمی اسلامی تنظیم کی معرفت جیسے کہ یہ رابطۂ اسلامی کی تنظیم ہے، جس کی دعوت پر ہم اس مبارک اسلامی دیار میں جمع ہیں۔

افسوس ہے کہ ایسی ایک فقہی اکیڈمی کے قیام کی تجویز مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس ہائے ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۱ء (منعقدہ کراچی) میں منظور ہوئی تھی لیکن وسائل کے عدم حصول سے یہ تجویز کاغذ ہی پر رہ گئی۔ کیونکہ اگر سب نہیں تو بیشتر اسلامی حکومتیں اور تمام مقاصد میں تو بڑی فیاضی سے خرچ کر سکتی ہیں لیکن نہیں خرچ کر سکتیں تو اسلام کے لیے نہیں خرچ کر سکتیں۔

فقہی انسائیکلوپیڈیا

فقہی انسائیکلوپیڈیا کی جو تجویز ہم نے اوپر رکھی، اس کی تفصیل یہ ہے کہ آجکل جس ڈھنگ سے ڈکشنریوں کے طرز پر جدید وضعی قوانین کے انسائیکلوپیڈیا تیار ہوئے ہیں، اسی ڈھنگ سے اسلامی فقہ کی انسائیکلوپیڈیا ترتیب دی جائے جس میں فقہی موضوعات کو کوئی بھی تلاش کرنے والا اس موضوع کے پہلے حرف کے ماتحت اسی طرح نکال سکے جس طرح لغوی کلمات کو اُن کے پہلے حرف سے ڈکشنری میں بلا دقت نکالا جا سکتا ہو۔ ان موضوعات پر مختلف مذاہب فقہ کا جو موجودہ موقف ہو اُسے ان کے تحت بیان کر دیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر مذہب کا عالم دوسرے مذاہب کے موقف سے بھی بآسانی واقف ہو سکے گا۔

اس عظیم علمی کام پر دراصل مستقبل میں فقہ اسلامی کی زندگی کا بہت کچھ انحصار ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے دمشق یونیورسٹی کے لا کالج (کلیۃ الشریعۃ) کو اس عظیم خدمت کا بیڑا اٹھانے کی توفیق عطا کی ہے چنانچہ وہاں نو سال سے علماء کی ایک کمیٹی (لجنۃ موسوعۃ الفقہ الاسلامی) قائم ہے جس نے اس انسائیکلوپیڈیا کا پورا نقشہ مرتب کر لیا ہے۔ مگر اگلے مراحل کے لیے روپے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اس معاملے میں توفیق دے گا جن پر اصلاً ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ بالخصوص اس اسلامی تنظیم "رابطۂ عالم اسلامی" سے امید کی جانی چاہیے کہ وہ اس کام کی طرف توجہ دیگی۔ اور ان وسائل کا انتظام کرے گی جن سے یہ تکمیل کو پہونچ سکے۔

دربارِ عالمگیری

(از ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی کاکوروی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی)

(۹)

ابراہیم بن ذوالفقار

اپنے عہد کے ایک ممتاز امیرِ کبیر تھے۔ عالمگیر کے سریر آرائے حکومت ہونے کے بعد
یے تدریجاً اپنی ممتاز صلاحیت و اہلیت کی بدولت وزارت کے درجہ پر فائز ہوئے اور شاہ عالم
ے عہد تک اسی منصب پر برقرار رہے، شاہ عالم نے انھیں وکیلِ مطلق کا درجہ دیا لیکن
رخ سیر کے زمانے کی وزارتی کشمکش نے انھیں عزلت گزینی پر مجبور کر دیا، تاحیات دلی میں
ن کا قیام رہا، مراسلت، مکاتبت اور شاہی فرامین کی تنظیم اور ترتیب میں انھیں طولیٰ
اصل تھا۔ علوم دینیہ پر بھی کامل دستگاہ تھی۔ ہمیشہ ہشاش بشاش رہتے اور کبھی چہرے
پر حزن و ملال کے آثار ظاہر نہ ہونے دیتے۔ ہر کہ و مہ سے بڑے اخلاق سے پیش آتے لباس
ابھی شوق تھا ان کے جسم پر معمولی کپڑا کبھی نہیں دیکھا گیا ۲۹ سال کی عمر پائی اور ۱۱۲۹ھ میں
ن کی وفات ہوئی۔ شاہ جہاں نے انھیں "جملۃ الملک" کے خطاب سے نوازا تھا حسن سیرت اور
سن صورت، پاک باطنی اور جمال ظاہری میں دوسروں پر فوقیت رکھتے تھے انھیں اس دربار
سے "اسد خاں" کا لقب بھی دیا گیا خاندانی اور حسب نسب کے اعتبار سے خاص علو اور خاصی
ضیلت کے حامل تھے۔ پہلے آختہ بیگی کے عہدہ پر رہے پھر ترقی کر کے بخشی گری کے منصب پر بٹھا دیے گئے[1]

---

[1] مآثر عمرا

ابراہیم بن علی الفارسی

یہ بڑے پایہ کے امیر تھے اور دولت و ثروت کے ساتھ ساتھ علمی فضل و کمال بھی رکھتے تاریخ اسلام پر خاصی نظر تھی، مذہباً اور مشرباً اہل تشیع میں سے تھے سنہ ۱۰۷۲ھ میں عالم گیر نے انھیں کشمیر کا گورنر بنا کے بھیجدیا تھا۔ کشمیری شیعوں نے ان کے منصب جلیل سے فائدہ اٹھایا اور آئے دن سنیوں کو اپنی دست درازیوں اور بیجا تعدیوں کا شکار بناتے رہے، عالمگیر کو یہ رپورٹیں ملیتں تاہم سیاستہً کچھ دن انھوں نے اغماض سے کام لیا لیکن بالآخر انھیں پہلے لاہور منتقل کیا اور پھر بہار بھیجدیا۔ حالات سدھرنے کے بعد ان کو دوبارہ کشمیر کی ایالت سپرد کی گئی اور آٹھ سال تک اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے اور اپنے دوران قیام اور عہد حکومت میں انھوں نے خوب خوب شہر آباد کئے اور زراعتی پیداوار کی ترقیوں میں ان کی مساعی مشکور رہیں۔ بظاہر دلداری اور دل جوئی اپنا شعار بنائے رہے لیکن جب پھر اہل السنت والجماعت اور اہل تشیع میں کشمکش کے واقعات رونما ہوئے اور شیعوں نے انھیں اپنا حامی اور مددگار سمجھ کے اہل سنت پر جور و ستم اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع کیا اور یہ ایک عالمگیر بلا اور مصیبت بن گئی تو شاہ عالمگیر کے ضبط و تحمل سے معاملہ باہر ہوگیا اور انھوں نے سنہ ۱۰۹۰ھ میں ان کو ہٹا کے بنگالہ بھیجدیا۔ وہاں عرصہ تک قیام کے بعد الہ آباد کی زمام حکومت ان کو تفویض کردی لیکن کشمیر کی آب و ہوا ان کو ایسی بھائی تھی کہ پھر بادشاہ کو متاثر کر کے کشمیر کی گورنری پر تیسری بار پہنچ گئے۔ لیکن اس بار ان کے افتاد طبع اور مزاج میں پورا پورا تغیر رونما رہا اور اسے سنہ ۱۱۱۸ھ تک نباھتے رہے اس بار ان کی عصبیت اور جا و بیجا حمایت پر چنداں حرف گیری نہیں ہوئی۔ آخری عمر میں گجرات کی گورنری پر مقرر کئے گئے۔ ان کا ستارۂ اقبال بلندی پر تھا اور بخت و نصیب ان کا پورا یاور۔ یہاں چندے قیام کے بعد زمانہ پلٹا۔ حکومت بدلی اور ما حول میں تغیرات رونما ہوئے عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم نے انھیں علی مردان خانؒ کہہ کے مخاطب کرنا شروع کردیا۔ یہی نام اُن کے باپ کا بھی تھا اور انھیں کا بخل کہ ان

بنا دیا لیکن اس عہدہ پر عرصہ تک فائز نہ رہ سکے بالآخر استعفا دے کے ابراہیم آباد میں آ کے رہنے لگے۔ ابراہیم آباد لاہور سے کوئی تیس میل پر ایک قصبہ تھا۔ یہاں انھوں نے لوگوں سے ملنا جلنا سب بند کر دیا عزلت نشینی اور گوشہ گزینی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ تصنیف تالیف کا بھی شوق تھا "بیاض ابراہیمی" کے نام سے سات جلدوں میں ایک کتاب لکھی تھی جس کی پہلی دوسری اور تیسری جلد میں خلفاء ثلثہ پر بحث کی اور چوتھی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کو موضوع سخن بنایا، پانچویں میں حضرت معاویہ رضؓ اور چھٹی میں حضرت علی اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کی امامتیں زیر بحث آئیں۔ بیاض ابراہیمی کی ساتویں جلد میں دوسرے فروعی مسائل لکھے گئے ہیں تقریباً سنہ ۱۱۲۱ھ میں ان کی وفات ہوئی[1]

مفتی ابوالبرکات دہلوی

ان کے والد بزرگوار کا نام حسام الدین تھا۔ یہ حنفی مذہب کے پیرو تھے۔ ان کی ولادت دارالحکومت دہلی میں ہوئی تھی اور اپنے عہد میں فقہاء حنفیہ میں ان کو ایک خاص الخاص درجہ حاصل رہا ان کی وسعت نظر درایت ذکاوت اور دقت آفرینی ان کے لئے وجہ امتیاز بنی شروع میں انھیں دارالخلافت کا مفتی بنایا گیا لیکن عہد عالمگیری میں ان کو منصب قضا تفویض کر دیا گیا تھا۔ ہیں ان کی ایک کتاب "مجمع البرکات" کے نام سے دو جلدوں میں ہے جو خاصی ضخیم ہیں اور اس کے دیباچہ میں یہ الفاظ درج ہیں۔

الحمد للہ الذی نور قلوب الموحدین بنور التوحید والایمان الخ

اس کتاب کا سبب تالیف یہ لکھا ہے۔

لما کانت الروایات اشتاتا متفرقۃ	چونکہ (فقہی) روایات منتشر تھیں میں نے
جمعتہا جمعا لیسہل الوقوف بہا و	انھیں اس طور سے جمع کر دیا کہ ان تک رسائی
منبتہا مرتبا لیتیسر الاطلاع علیہا	آسان ہو جائے اور ان کی ترتیب دی ہے تاکہ
فی ہذا المختصر الخ	خاطر یہ ہے کہ ان معاملات میں اس مختصر سے واقفیت کا حصول دشوار نہ ہو۔

---

[1] مآثر الامراء - محبوب الالباب

۱۱۱۶ھ میں اس کی تسوید اور تبییض سے فراغت پائی، انھیں فقہ اور اصول فقہ پر پورا پورا عبور تھا (رحمہ اللہ)۔ فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین میں بھی شمار کئے جاتے ہیں[1]

ابوالحسن تاناشاہ

یہ نسباً چغتائی تھے۔ ان کی ولادت اور نشو و نما حیدرآباد میں ہوئی۔ ۱۰۸۳ھ میں عبداللہ قطب شاہ کی وفات کے بعد تخت سلطنت پر بیٹھے لیکن حکومت کا نظم و نسق دو ایسے وزیروں کے ہاتھ میں رہا جنھوں نے پوری آزادی کے ساتھ رسوم کفر کا احیاء کیا اور قلمرو میں پوری جاہلیت کی شانیں پیدا کردیں۔ تاناشاہ کے اوقات ملاہی و ملاعب رقص و سرود، جام و مینا کے مشاغل میں گزرتے رہے یہ صورت حال عالمگیر کے لئے ناقابل برداشت تھی بالآخر انھوں نے اس صورت حال کے ختم کرنے کے لئے ایک جرار لشکر بھیجا جس نے بڑے گھمسان کے جدال و قتال کے بعد غلبہ حاصل کیا۔ تاناشاہ نے گولکنڈہ کے قلعہ میں پناہ لی، لشکر عالمگیری نے اس کا محاصرہ کیا اور سخت مدافعت کے بعد تاناشاہ اور اس کے ہمنوا مغلوب ہوئے تاناشاہ گرفتار کرکے دربار عالمگیری میں لائے گئے۔ عالمگیر نے انھیں دولت آباد کے قلعہ میں مقید رکھا اور اس طرح قطب شاہی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

تاناشاہ کا اس عہد کے ممتاز اور اکابر علما میں شمار ہوتا تھا ان کی ایک کتاب علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف پر نوٹ اور حواشی پر مشتمل ہے۔ مولانا حاجی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی سابق ٹریزرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے موروثی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ تاناشاہ نے اپنے اساتذہ وقت سے علوم متداولہ کی تحصیل کی اور درویشوں اور فقیروں کی صحبت کے بھی شروع شروع بہت ہی دلدادہ رہے۔ یہ مذہباً اور مشرباً شیعہ تھے۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے اور تواضع اور ایثار سے پیش آتے حسن معاشرت میں یکتائے زمانہ متصور ہوتے ۱۱۱۱ھ میں ۱۲ ربیع الاول دوشنبہ کا دن ان کی تاریخ وفات ہے۔ یہ ایک اتفاق اور قدرت خداوندی کا کرشمہ ہے کہ ۷۰ سال کی عمر پائی اور عمر کے ۵ دور گزرے وہ بھی اس طرح کہ ۱۴ سال لڑکپن کی لاپرواہیوں اور تغافل میں، ۱۴ سال علوم دینیہ کی تحصیل میں، اسی طرح ۱۴ سال صوفیا اتقیا اور اولیاء کی

[1] شمس التواریخ بحوالہ نزہت الخواطر

مجلسوں اور صحبتوں میں ۱۲ سال تخت مملکت پر اور بقیہ ۱۴ سال قلعہ دولت آباد میں اسارت وقید کی حالت میں۔ طبعاً شاعر بھی تھے اور ان کا فارسی اور ہندی کلام موجود بھی ہے۔

ابو محمد ملا محمد غوث کاکوروی

یہ ملک ابوالخیر ملک زادے کے بیٹے تھے، ان کی کنیت ابو محمد ہے ۱۰۵۶ھ میں پیدا ہوئے، اپنے عہد کے بڑے فاضل اور بڑے عالم تھے، درس و تدریس کے مشاغل میں اوقات گزاری کرتے۔ ملا محمد زماں کاکوروی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور مختصرات اور مطولات کتب کی تحقیق ان سے ہی کی، ملا ابوالخیر خیرآبادی سے بھی انہیں تلمذ حاصل رہا، ملا قطب الدین سہالوی سے درسیات کے علاوہ دوسری کتب پڑھیں، ملا یعقوب بنبانی سے لاہور جاکے حدیث کی سند لی، علوم متداولہ میں انہیں پوری مہارت حاصل تھی، بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں یگانۂ عصر شمار کئے گئے۔ شاہ میر لاہوری سے سلوک اور طریقت میں رجوع کیا اور ان سے ہی بیعت ہوئے۔ دار الحکومت دہلی میں زیادہ قیام رہا اور درس تدریس میں وہ کمال اور شہرت حاصل کی کہ دور دور سے تشنگان علوم ان کے حلقہ درس میں آتے اور سیراب ہوتے۔ تبحر علمی اور وسعت معلومات ونظر کی بدولت شاہ عالمگیر تک رسائی حاصل ہوئی اور فتاویٰ عالمگیری کے مولفین اور جامعین میں ان کو بھی شامل کر لیا گیا قاضی القضاۃ مولوی نجم الدین علی خاں بہادر اپنی کتاب "رشک ریاض" میں لکھتے ہیں۔

"ہرگاہ مکاسب علمیہ دست داد متوجہ اردوئے معلیٰ سلطانی گردید و در اندک مدت بہ تقریب عالمگیر اختصاص یافت چنانچہ آں شاہ پر تشرع سند نمودن کتب حدیث نبوت ایں علامۂ عصر بتوسط نواب عنایت اللہ خاں استدعا فرمودہ فہرست سلسلہ ایشاں طلب فرمودہ آثار رضائے جد بزرگوار ہم ازیں باب بظہور آمد۔ اما چوں شاہ درہ ایں مقدمہ باذہب موصوف بکار رفت فرمود کہ بعد اجابت ایں تقرب کہ بالاتر ازیں مرتبہ نہ باشد تحسین رخصت وطن و ملاقات اعزہ ماتجا بہ تعلقات از مملکت دکن کہ تحصیل جذبات آں صوب مطلوب می باشد از دائرہ مقدرت بندہ خارج خواہد بود قریب صلاح آنکہ قبائل ولواحق را طلب فرمایند و بمباشرت عہدئہ تلک بسر برند بنا بر علیہ الجناب از قبول ایں امر خطیر پہلو تہی کردند"

ملا غوث فطرۃً سلیم الطبع اور وجیہ تھے ان کے اخلاق کی دست ہر کہ ومہ کی زبانوں پر تھی۔ عالمگیر کے دربار میں جب جب باریابی ہوتی تو بڑی توقیر و تعظیم سے پیش آیا جاتا۔ بادشاہ کا تقرب اور مصاحبت حاصل ہونے کے باوجود طبیعت استغنا پسند تھی بارہ سال تک بادشاہ کے قیام دکن میں ہمراہ ہی رہے کچھ دنوں یہ بھی ہوا کہ شاہزادہ کام بخش کے یہاں میر سامان رہے تھے اور اس میں بھی پورا پورا اعتماد اور امتیاز حاصل رہا۔ صوبۂ اکبر آباد کے شعبۂ "احتساب" کے انچارج بھی رہے کچھ زمانہ بہادر شاہ کے ساتھ گزارا۔ الہ آباد میں صدر الصدور رہے۔ اسی زمانہ میں وہاں کے علماء وقت سے علمی مناظرے اور مناقشے بھی کئے فقہ و حدیث کے موضوع میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا یہی وجہ ہے کہ کوئی ان کے مقابلے میں گوئے سبقت نہ لیجا سکا۔ لکھنؤ میں بھی برائے چندے قیام رہا اور صوبہ اودھ کے جزیہ کا محکمہ انہیں کی نگرانی اور نظارت میں تھا۔ درس و تدریس سے چونکہ قلبی دلچسپی تھی اس لئے یہ سلسلہ خواہ کسی حال میں یا کسی منصب پر ہوں چھوڑا نہیں۔ طلبہ کا ایک ہجوم تھا جو سفر و حضر میں ہمیشہ ساتھ رہتا۔ مطالعہ کتب کا سلسلہ برابر جاری رہتا شاہ محمد وارث ابن حافظ ابو المعالی شیخ عبد اللہ بن شیخ امان اللہ اور مولوی غلام مرتضیٰ مولف جواھر الانشاء آپ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں کاکوری میں ایک مدرسہ اسلامیہ عربیہ کے لئے حکومت سے زمین کی درخواست کی جو منظور ہوئی اور اس کی معافی کا فرمان جاری کیا گیا۔ ان کی عمر نے وفا نہ کی ان کے نواسہ ملا حمید الدین نے مدرسہ کا اجرا کیا لیکن افسوس کہ اس کا اب نام و نشان بھی نہیں ہے۔

آپ اپنے تبحر علمی اور کمالات عملی میں نادرۂ روزگار رہے ہیں۔ اکتساب باطنیات طریقت و سلوک میں ہمیشہ کوشاں اور اوراد و وظائف میں اپنے پیر مرشد کی رہنمائی میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ ۶۲ سال عمر پائی اور صفر ۱۱۱۸ھ میں رہگزر رے عالم جاودانی ہوئے لکھنؤ میں وفات ہوئی اور ان کی میت کو ایک جم غفیر کی شالیعت میں کاکوری لایا گیا اور محلہ "مولوی محلہ" میں اپنے دیوان خانے کے صحن میں دفن کئے گئے۔ مزار کے گرد ایک خشتی حظیرہ بنا ہوا ہے قاضی القضاۃ مولوی نجم الدین خاں بہادر نے "ارفع اللہ منزلہ المتعال" سے مادۂ تاریخ وفات نکالا۔ اس کے بعد مولوی محمد عالم قیصری نے منظوم تاریخ